اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا

خطباتِ راشدی

جلد اوّل

افادات

ابو عمار زاہد الراشدی

ترتیب

قاری جمیل الرحمٰن اختر

الشریعہ اکادمی

گوجرانوالہ - پاکستان

الجمعیۃ الشرعیہ کا ری آدجانوالہ

خطباتِ راشدی

— جلد اوّل —

لائبریری الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

افادات:

ابوعمار زاہد الراشدی

ترتیب:

قاری جمیل الرحمٰن اختر

الشریعہ اکادمی

— گوجرانوالہ - پاکستان —

جملہ حقوق محفوظ

اہتمام: ——— حسن خاور

مطبع: ——— کیو وائی پرنٹرز

اشاعت: ——— طبع اوّل - جولائی، ۲۰۰۸ء

ناشر: ——— **الشریعہ اکادمی**

ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

فون: 055-4271741/400394

قیمت: ——— =/340 روپے

——— واحد تقسیم کار ———

فاران فاؤنڈیشن

علق پریس بلڈنگ، بالمقابل (PTV) اسٹیشن،

19۔اے ایبٹ روڈ، لاہور۔

فون: +92-42-6303244

ای میل: faran@wol.net.pk

لائبریری
الشریعہ اکادمی
۳۸۰۵

فہرس

ا۔	حرف اوّل قاری جمیل الرحمٰن اختر	۷
ب۔	پیش لفظ-۱ ڈاکٹر محمود احمد غازی	۹
ج۔	پیش لفظ-۲ مولانا محمد اسلم شیخوپوری	۱۱

خطبات

۱	قرآن فہمی کی اہمیت اور اس کے چند ناگزیر تقاضے	۱۷
۲	قرآن فہمی میں سنت نبوی ﷺ کی اہمیت	۲۷
۳	نبی اکرم ﷺ کی ذات ہی مسلمانوں کی زندگی کا محور ہے	۳۸
۴	کیا فہم قرآن کی کلاسیں ایک نیا فتنہ ہے؟	۴۶
۵	مشکلات و مصائب میں سنت نبوی ﷺ	۵۴
۶	نعمتوں کی ناشکری پر عذاب الٰہی کا ضابطہ	۶۰
۷	حضرات صحابہ کرامؓ اور ان کا اسوۂ حسنہ	۶۶
۸	اسلام میں سوشل ورک کی اہمیت	۷۰
۹	قرآن وسنت کی تعلیمات اور ہمارا اجتماعی طرز عمل	۷۷

۱۰	وحی کی ضرورت اور اس کی حقیقت و ماہیت	۸۴
۱۱	امام بخاریؒ اور بخاری شریف	۹۰
۱۲	نیکی اور اس کی حفاظت	۹۴
۱۳	جناب رسول کریم ﷺ کی دس نصیحتیں	۱۰۰
۱۴	زلزلہ کے تناظر میں گردش کرتے تین سوال!	۱۰۴
۱۵	اسلام کی مقرر کردہ سزائیں اور مغرب کے شکوک وشبہات	۱۱۱
۱۶	فکری و مسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو	۱۱۶
۱۷	اسلامی نظام اور ہمارا اجتماعی عمل	۱۲۴
۱۸	پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات	۱۲۹
۱۹	اسلامی احکام وقوانین کا مزاج واسلوب	۱۳۷
۲۰	جدید مغربی معاشرے کے لیے دینی مدارس کا پیغام	۱۴۰
۲۱	دینی مدارس کو درپیش چیلنج!	۱۴۵
۲۲	دورِ حاضر کے فتنے اور مدارس کی ذمہ داری	۱۵۷
۲۳	بچیوں کے دینی تعلیم کے مدارس اور نصاب تعلیم	۱۶۱
۲۴	حافظ قرآن کریم کا ایک بڑا اعزاز	۱۶۵
۲۵	خواتین کی علمی برتری کا خیر القرون میں اعتراف	۱۷۰
۲۶	فلاحِ انسانیت اور مدارس دینیہ (۱)	۱۷۵
۲۷	فلاحِ انسانیت اور مدارس دینیہ (۲)	۱۸۶
۲۸	فلاحِ انسانیت اور مدارس دینیہ (۳)	۱۹۸
۲۹	مغربی معاشرہ اور مسلمانوں کی نئی نسل کا مستقبل	۲۱۵

۳۰	سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم	۲۲۵
۳۱	جہاد، مستشرقین اور مغربی دنیا	۲۳۶
۳۲	کیا افغان مجاہدین کی جنگ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے؟	۲۴۳
۳۳	بیت المقدس ۔ تاریخی پس منظر	۲۴۹
۳۴	شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ	۲۵۳
۳۵	انسانی حقوق اور اسوہ نبوی ﷺ	۲۶۰
۳۶	عورت: ثقافتی جنگ میں مغرب کا ہتھیار	۲۶۵
۳۷	اسلام اور خواتین کے حقوق	۲۷۰
۳۸	انسانی حقوق کی خلاف ورزی کون کر رہا ہے مسلمان یا قادیانی؟	۲۷۵
۳۹	مسلم پرسنل لاء اور موجودہ عالمی صورتحال	۲۸۸
۴۰	انسانی حقوق کا مغربی تصور سیرت طیبہ کی روشنی میں	۲۹۶
۴۱	انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات	۳۰۲
۴۲	مسئلہ کشمیر اور عالمی سازشیں	۳۰۶
۴۳	ملی مسائل اور دینی قیادت	۳۱۰
۴۴	قادیانی مسئلہ اور تحریک ختم نبوت	۳۱۵
۴۵	قرنِ اول اور دور حاضر کے مدعیان نبوت	۳۲۷
۴۶	مغرب سے مکالمہ کی ضرورت، ترجیحات اور تقاضے	۳۶۷
۴۷	دور جدید کے فکری تقاضے اور علماء کرام	۳۷۵
۴۸	موجودہ عالمی صورتحال میں علماء کرام کی ذمہ داریاں	۳۸۲
۴۹	عالم اسلام پر مغربی فکر کی یلغار اور علماء کرام کی ذمہ داری	۳۸۸

۵۰	نفاذ شریعت کی جدو جہد اور مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں	۳۹۷
۵۱	محرم الحرام اور شہداء کی یاد	۴۰۵
۵۲	خطبۂ حجۃ الوداع	۴۱۱
۵۳	شادی اور اس کے سماجی اثرات	۴۸۴
۵۴	مسلمانوں میں فکر و شعور کی بیداری: وقت کا اہم تقاضا	۴۹۱
۵۵	عورتوں کے اسلامی حقوق اور ہمارا معاشرہ	۴۹۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اس وقت مارکیٹ میں مختلف اہل علم حضرات کے خطبات موجود ہیں جن کو پڑھ کر ایک کم علم بھی اپنے عقیدے اور عمل کو صحیح کر رہا ہے لیکن یہ خطبات جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہیں ان کو پڑھنے کے بعد نہ صرف عقیدہ وعمل کی اصلاح ہوگی بلکہ نظر وفکر کی بھی اصلاح ممکن ہے جس شخصیت کے یہ خطبات ہیں وہ محتاج تعارف نہیں ملک و بیرون ملک ان کا نام ایک جانا پہچانا ہے۔ وہ ایک عظیم باپ کے عظیم فرزند ہیں جن کو دنیا غزالی دوراں و محقق العصر ترجمان اہلسنت علماء دیوبند اور امام اہلسنت کے نام سے جانتی ہے میری مراد شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ ہیں جنہوں نے تقریباً پون صدی علوم نبوی سے جہان کو معطر کیا ہے ان کی نظر شفقت اور نظر عنایت مجلس میں بیٹھنے والے تمام شاگردوں پر ہوتی تھی لیکن خصوصیت کے ساتھ جس طرح ہر باپ کی نظر شفقت ہر بچے پر ہوتی ہے حضرت مدظلہ کی نظر کیمیا گر نے اپنے تمام صاحبزادوں کو ایک ہیرا بنایا اللہ تعالیٰ تمام کو اپنی عافیت میں رکھے حضرت شیخ الحدیث صاحب کے تمام صاحبزادے خوب خوب دین حق کی ترویج و اشاعت کا فریضہ کما حقہٗ ادا کرنے میں مشغول ہیں لیکن جن کے خطبات کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں وہ حضرت کے صاحبزادے ہونے کے ساتھ حضرت کے جانشین بھی ہیں اور ان کی مسند پر بیٹھ کر حدیث پڑھا رہے ہیں۔ میری مراد حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ ہیں۔ حضرت کے خطبات کا انداز بالکل منفرد ہے کیونکہ حضرت کی نظر قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کی صورت حال پر بھی ہے اس لیے ان کے خطبات میں ان کا رنگ زیادہ ہے۔ حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ ’’فن حدیث کے اصول و مبادی‘‘ کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں ’’میری لکھنے پڑھنے کے موضوعات میں اسلامی نظام کی اہمیت وضرورت مغربی فلسفہ وثقافت کی یلغار اسلام پر مغرب کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات وشبہات آج کے

عالمی تناظر میں اسلامی احکام وقوانین کی تشریح اسلامائزیشن کے علمی وفکری تقاضے، نفاذ اسلام کے حوالے سے دینی حلقوں کی ضروریات اور ذمہ داریاں، اسلام دشمن لابیوں کی نشاندہی اور تعاقب اور ان حوالوں سے طلبہ، دینی کارکنوں اور باشعور نوجوانوں کی راہنمائی اور تیاری کو اولین ترجیح کا درجہ حاصل ہو گیا تھا چنانچہ پنتالیس برس سے انہی موضوعات پر مسلسل لکھتا چلا آرہا ہوں۔'' حضرت کے اس مشن کی وجہ سے بعض ناعاقبت اندیش کچھ نوجوان لوگوں کے ذہنوں میں غلط قسم کی باتیں ڈالنے کی کوشش کرنے والوں کی خدمت میں اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجائے حضرت ہی کے الفاظ میں یہ کہنا چاہوں گا:

''میں بحمد اللہ تعالیٰ راسخ العقیدہ سنی، شعوری حنفی اور متصلب دیوبندی ہوں، اور اپنے دائرہ کار کو کراس کیے بغیر ان مسائل پر سنجیدہ کام کرنے والوں سے حتی الوسع تعاون اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہتا ہوں۔ اور اسی دائرے میں آخر وقت تک محنت کرتے رہنے کو اپنے لیے سعادت ونجات سمجھتا ہوں۔''

اتنی وضاحت اور کھلی عبارت کے بعد ان حضرات کو حضرت کے متعلق اپنا ذہن صاف کر لینا چاہیے حضرت کے خطبات کی یہ پہلی جلد ہے انشاء اللہ کوشش ہے کہ ایسی اور بھی جلدیں ترتیب دے کر آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں اس کے لیے آپ دعا بھی فرماویں اور اگر آپ کے پاس یا کسی دوست کے پاس حضرت کی کوئی کیسٹ ہو تو براہ کرم وہ بھی عنایت فرماویں دعا ہے کہ اللہ کریم اس میں جن جن حضرات کا تعاون ہے ان کے لیے ذریعہ نجات بنائے۔ اور برادرم حسن خاور صاحب جو اس کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں ان کے لیے زادِ راہ بنائے۔ آمین!!

قاری جمیل الرحمٰن اختر قادری نقشبندی مجددی
یکِ از خدام امام اہلسنت مدظلہ
۲۸۵۔ جی ٹی روڈ، باغبانپورہ لاہور

پیش لفظ-۱

از

ڈاکٹر محمود احمد غازی رئیس جامعہ الاسلامیہ العالمیہ۔اسلام آباد

سابق وفاقی وزیر مذہبی امور پاکستان

ایک مشہور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ دین اور شریعت کا علم ہر دور میں اہل علم کے ایک طبقے کے ذریعے محفوظ رہے گا جو اس علم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان غلط فہمیوں کی تردید بھی کرتے رہیں گے جو انتہا پسندوں اور غلو کاروں کے ذریعے پھیلیں گی، ان بے بنیاد باتوں کی تردید بھی کرتے رہیں گے جو اہل باطل کے ذریعے فروغ پائیں گی اور ان غلط تعبیرات وتصورات کی اصلاح بھی کرتے رہیں گے جو دین کے جاہل اور کم علم عقیدت مند پھیلائیں گے۔اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک مخلص اہل علم کی ایک تعداد ان تینوں ذمہ داریوں کو انجام دیتی چلی آرہی ہیں۔یہ انہی بابرکت نفوس کی مبارک کوششوں کا ثمرہ ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ آج بھی اپنی اصل تعلیم کے ساتھ موجود ہیں۔شریعت الٰہی کا روشن چہرہ آج بھی دنیا کے سامنے منور ہے۔اکابر اسلام کے تاریخ ساز کارنامے آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہیں۔

اہل علم کے اسی بابرکت قافلے کے ایک قافلہ سالار حضرت مولانا زاہد الراشدی ہمارے دور میں یہی فرائض سہ گانہ انجام دے رہے ہیں۔انہوں نے عرب وعجم اور مشرق ومغرب ہر جگہ اپنی فصیح اللسانی اور رواں قلم کے ذریعے اسلام کا مسلسل دفاع کیا ہے اور کر رہے ہیں۔انہوں نے دین اور شریعت کی تعلیمات پر کیے جانے والے اعتراضات کا ہمیشہ مؤثر اور مثبت جواب دیا ہے۔باطل پرست طبقات کی طرف سے جب بھی اسلام یا اسلامی تہذیب سے کوئی

غلط چیز منسوب کی گئی مولانا کے مؤثر اسلوب اور طاقتور قلم نے اس کی کمزوری کھول کھول کر عیاں کر دی۔ دین کے نادان دوستوں اور جاہل عقیدت مندوں کی کمزور تاویلات کے نتیجے میں جب بھی کسی کو دین وشریعت پر اعتراض کا موقع ملا مولانا زاہد الراشدی نے جرأت سے کام لے کر اس موقف کی کمزوری واضح کی۔

مولانا کی یہ فاضلانہ تحریریں پاکستان اور انگلستان کے بیسیوں اخبارات اور رسائل کی فائلوں میں منتشر بلکہ مدفون تھیں۔ اخبارات کی زندگی چند گھنٹوں اور رسائل کی زندگی چند دنوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اخبارات چند گھنٹوں میں اور رسائل چند دنوں میں ردی کی نذر کر دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی علمی وفکری تحریروں کو محفوظ رکھنے کا کوئی مؤثر بندوبست نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ مولانا راشدی کے قلم سے نکلے ہوئے یہ جواہر پارے وقت کے ساتھ ساتھ ضائع ہو جائیں۔

مجھے خوشی ہے کہ لاہور کے بعض علم دوست حضرات نے ان مضامین کی اہمیت کا احساس کیا اور ان کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کے یہ مقالات ومضامین اور تقاریر وخطبات متعدد جلدوں میں مرتب ہو کر محفوظ ہو جائیں گے اور اہل علم ودانش کے لیے دستیاب ہوں گے۔

مجھے اُمید ہے کہ مولانا زاہد الراشدی کے یہ وقیع خطبات ومقالات دور جدید میں دعوت و تبلیغ کے نئے اسلوب کو جنم دیں گے اور ان کی مدد سے ملک کے نوجوان علماء کرام تبلیغ دین کے ایک نئے اور منفرد ڈھنگ سے آشنا ہوں گے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی عمر، علم اور کوششوں میں برکت عطا فرمائے اور ان کی تحریروں اور تقریروں کو نتیجہ خیز اور مفید بنائے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی

صدر جامعہ

پیش لفظ-۲

از

مولانا محمد اسلم شیخوپوری، استاذ الحدیث جامعۃ الرشید۔ کراچی

تواضع اور کسرِ نفسی بھی جہالت پر پردہ ڈالنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جو لوگ کسی اتفاقی حادثہ یا محض فضل باری تعالیٰ سے مشہور ہو جاتے ہیں وہ اپنی ہیچ مدانی اور علمی کمزوری کا کتنے واضع الفاظ میں اعتراف کیوں نہ کریں، ان کے اعتراض کو حسن ظن رکھنے والے دوست ''تواضع'' پر ہی مہلول کرتے ہیں، اس ناچیز کا شمار بھی ایسے ہی ''مشہور'' لوگوں میں ہوتا ہے، نہ علم نہ عمل، نہ زبان نہ قلم، نہ کمال نہ جمال مگر اہل محبت میں برسرِ بام بٹھا رکھا ہے، چلیں عام لوگ تو سطحیت پسند ہوتے ہیں۔ ہر چمکتی چیز کو سونا اور ہر گہن گرج کو باران رحمت کی دلیل سمجھ لیتے ہیں لیکن اگر مخدوم محترم حضرت العلامہ مولانا زاہد الراشدی صاحب زید مجدھم جیسے پارکھ اور جہاں گرد انسان بھی حسن ظن میں مبالغہ فرمانے لگیں تو ناطقہ یقیناً سر بگریباں ہوگا، چند دن قبل جب بذریعہ ڈاک مجھے ''خطبات راشدی'' کا مسودہ اس حکم کے ساتھ موصول ہوا کہ ''ان خطبات پر کوئی بات واقعات یا مسلمات کے خلاف ہو تو اس کی نشاندہی کر دیں، نیز یہ کہ ان خطبات کے حوالہ سے پیش لفظ لکھ دیں'' تو میں کچھ دیر کے لیے ہونق سا بنا بیٹھا رہا، کیا مجھ جیسا طالب علم ایک ایسی شخصیت کے ارشادات و فرمودات پر مقدمہ لکھے گا جس کا شمار ملک کے ان چند گنے چنے علما میں ہوتا ہے جنہیں فیاض حقیقی نے بصارت اور بصیرت، علم اور عمل، قلم اور زبان، محبت اور محبوبیت جیسی گوناں گوں صفات سے نوازا ہے، ان کا مطالعہ صرف درسی کتابوں تک محدود نہیں بلکہ تاریخ و ادب، جدید و قدیم فلسفہ، معاشرت اور معیشت اور دوسرے مذاہب کے لٹریچر پر بھی ان کی گہری نظر ہے، ان کا تجزیہ اور تبصرہ سنی سنائی روایات اور حکایات پر مشتمل

نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک محقق کی نظر اور دانشور کی احتیاط اور گہرائی کارفرما ہوتی ہے۔

وہبی صلاحیتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کے لیے ایسے اسباب فراہم کر دیے کہ انہیں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے حضرات سے تبادلہ خیال کے مواقع ملتے رہے بلکہ سکھوں، ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی مکالمہ میں بھی انہوں نے کبھی قباحت نہیں سمجھی، برطانیہ اور امریکہ جیسے دجالی تہذیب میں مستغرق ممالک کے دورے بھی انہوں نے کثرت سے کیے۔ ان سب اسباب نے ان کے خیالات میں بڑی وسعت پیدا کر دی، مگر اس وسعت کے نتیجے میں نہ تو انہوں نے متفق علیہ مسائل میں اسلاف کے مسلک سے انحراف کیا اور نہ ہی آزاد خیال مذہبی سکالروں کی طرح اجتہاد کا دعویٰ کیا۔

حضرت مولانا کے خطابات میں قرآن وسنت کی روشنی کے ساتھ ان کے وسیع مطالعہ اور گہرے مشاہدہ کی چاشنی یکجا دکھائی دیتی ہے، مولانا کا حافظہ بھی غضب کا ہے جو بات یا منظر ایک بار ان کے ذہن میں اتر جائے اسے باہر نکلنے کی جگہ مشکل ہی سے ملتی ہے چنانچہ سالہا سال قبل اساتذہ سے سنی ہوئی اور جرائد ورسائل میں پڑی ہوئی باتوں کا وہ پوری اعتماد کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں۔

چونکہ مولانا کی طبیعت میں اپنے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی طرح ظرافت بھی خوب پائی جاتی ہے اور سلاست وروانی بھی انہیں وراثت میں ملی ہے اسی لیے نہ ان کی تقریر سننے والا اکتاہٹ کا شکار ہوتا ہے اور نہ تحریر پڑھنے والا!

''محرم الحرام اور شہداء کی یاد'' کے موضوع پر کی گئی تقریر کا یہ اکتباس پڑھیے اور لطف لیجیے:

''اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات عرض کرنا چاہتا ہوں جن دنوں ہمارے ہاں جولائی اور اگست کے روزے تھے، قومی اخبارات میں ایک صاحب کی طرف سے تجویز چھپی کہ جون جولائی کے روزے بھٹی پر کام کرنے والے مزدور اور کھیتی میں کام کرنے والے کاشتکار کے لیے بہت مشکل ہیں اس لیے علماء کرام کو چاہیے کہ وہ ''اجتہاد'' کر کے رمضان المبارک کو کسی مناسب موسم کے ساتھ مخصوص کر دیں۔ ان صاحب کی تجویز یہ تھی کہ فروری کے مہینہ کو رمضان المبارک قرار دے دیا جائے اور یکم مارچ کو عید الفطر کے لیے مقرر کر دیا جائے اس طرح نہ صرف روزے مناسب موسم میں مخصوص ہو جائیں گے بلکہ عید کا جھگڑا بھی ہمیشہ کے

لیے ختم ہو جائے گا، میں نے اس زمانہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس غریب کو اپنی تجویز کا تیسرا فائدہ یاد نہیں رہا کہ تیسویں روزے سے ہمیشہ کے لیے چھٹی مل جائے گی اور انتیسواں روزہ بھی چار سال بعد آئے گا"۔

تاریخ مذاہب پر ان کی نظر، وسعت مطالعہ، قوتِ استدلال اور حفظ و استحضار دیکھنا ہو تو "قرنِ اول اور دورِ حاضر کے مدعیان نبوت" کے موضوع پر دیے گئے ان کے لیکچر کا مطالعہ کیجیے، جس جامعیت، پختگی، مہارت اور ذہانت کے ساتھ انہوں نے اپنے موضوع کا احاطہ کیا ہے وہ بس انہی کا حصہ ہے، قدیم و جدید مشہور مدعیانِ نبوت کے علاوہ انہوں نے "امریکی نبی ایلیج محمد" اور اس کی تعلیمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، چونکہ اس کی تحریک اصل گوروں کے خلاف تھی اس لیے مولانا فرماتے ہیں کہ ان کے ابتدائی عقائد جو باقاعدہ کتابوں میں ہیں یہ ہیں "کہ گورے سارے شیطان کی نسل ہیں میں نے ان کی عربی کتاب میں پڑھا ہے کہ آدم كان اسود، نوح كان اسود، ابراهيم كان اسود، عيسىٰ كان اسود، محمد كان اسود، یہ سارے کالے ہیں، گورے شیطان کی نسل ہیں۔ میں نے جب پڑھا تو بڑا ہنسا، میں نے کہا کہ سیاسی گالی کے طور پر تو شاید میں بھی کہہ دوں کیونکہ انہوں نے ہمیں بھی بڑا تنگ کیا ہے لیکن عقیدے کے طور پر نہیں مگر ان کا عقیدہ ہے کہ گورے شیطان کی نسل ہیں اور کالے کیا ہیں؟ آدم کی نسل سے ہیں، ابتدا میں ان کا مذہب تھا کہ ہر سفید چیز حرام ہے، مچھلی حرام ہے، انڈا حرام ہے، سفید کپڑا حرام ہے۔"

سوچیے یہ معلومات ہماری خطبات کی مشہور کتابوں میں کہاں ملیں گی؟ ان خطبات کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے دیے گئے ہیں، جو گھسی پٹی حکایات، من گھڑت لطائف، وزن سے خارج اشعار اور بلا دلیل کیچڑ اچھالنے کے انداز کو برداشت نہیں کرتا اسی لیے قابل احترام خطیب نے کسی بھی خطبہ میں ایسی کوئی بات نہیں کی جو پایہ ثقاہت سے گری ہوئی ہو۔ کسی پر تنقید بھی کی ہے تو متانت، سنجیدگی، اعتدال اور استدلال کا دامن نہیں چھوڑا، مخالف کو قائل کرنے کے لیے ایسے مؤثر عقلی اور نقلی دلائل دیے ہیں کہ ایک غیر متعصب انسان ان کا وزن محسوس کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں (الا ماشاء اللہ) مخالف کو متنفر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، قائل کرنے کی نہیں۔

مختصر یہ کہ خطبات کی دنیا میں یہ بالکل منفرد انداز ہے جس کی مثال عام خطبات میں نہیں ملتی، خطبات کے اس مجموعہ سے، خطباء، علماء اور طلباء کو فکر کی نئی راہیں اور خطابت کا نیا مواد حاصل ہوگا، امید ہے کہ عوام وخواص کے حلقے میں اس مجموعہ کو محبت وعقیدت کے ہاتھوں سے لیا جائے گا اور ذوق وشوق کی نگاہوں سے پڑھا جائے گا۔

''الامر فوق الادب'' کا محاورہ بے حد پامال ہو چکا ہے مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ خامہ فرسائی محض تعمیل حکم میں کی گئی ہے ورنہ یہ طالب علم اپنے آپ کو اس خزینۂ علم وعرفان کی نقاب کشائی کے قابل ہرگز نہیں سمجھتا۔

محتاج دعا

(مولانا) محمد اسلم شیخوپوری

خطبات

بسم الله الرحمن الرحيم

قرآن فہمی کی اہمیت
اور
اس کے چند ناگزیر تقاضے

یکم اکتوبر ۲۰۰۴ء کو آکسفورڈ (برطانیہ) کی مدینہ مسجد سٹینلے روڈ میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کا خلاصہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ (القمر ۵۴:۱۷)

بعد الحمد والصلوٰۃ:

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے قرآن کریم سورۃ القمر کی ایک آیت تلاوت کی ہے اور اس کی روشنی میں کچھ ضروری گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو باتیں فرمائیں ہیں ایک یہ کہ ہم نے قرآن کریم کو ذکر کے لیے آسان کر دیا ہے اور دوسری یہ کہ استفہام کے انداز میں یہ کہہ کر ہمیں دعوت دی ہے کہ کوئی ہے جو اس کا ذکر کرنے والا ہو؟ یہاں ذکر سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے مین مفسرین کرامؒ نے عام طور پر دو باتیں کہی ہیں اور اپنے اپنے حوالہ سے دونوں باتیں درست ہیں، ذکر سے مراد یاد کرنا بھی ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو یاد کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے اور ذکر کا معنی نصیحت پکڑنا اور معنی ومفہوم کو سمجھنا بھی ہے کہ ہم نے اس مقدس کلام کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔

یاد اور حفظ کے لیے قرآن کریم کے آسان ہونے کا ہم کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ دنیا کی یہ واحد کتاب ہے جو یاد ہوتی بھی ہے اور یاد رہتی بھی ہے۔ بچے، بوڑھے،

جوان، مرد اور عورت سب اسے یاد کر لیتے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ اسے یاد رکھتے بھی ہیں۔ نو سال، دس سال بلکہ آٹھ اور سات سال کے بچے اور بچیاں قرآن کریم یاد کرتی ہیں اور ہر زمانے میں قرآن کریم حفظ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہوتی ہے۔ چند سال قبل ایک رسالے میں کسی ادارے کی سروے رپورٹ نظر سے گزری تھی کہ دنیا میں اس وقت قرآن کریم کے حافظوں کی تعداد نوے لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے جس میں دنیا کی کوئی اور کتاب اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

دوسرا معنی اس مقام پر ذکر کا مفسرین کرامؒ نے یہ کیا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے اور اس میں گفتگو کا ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ عام آدمی بھی اس کے مفہوم اور پیغام کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے عام لوگوں کو بات سمجھانے کے لیے بڑی آسان زبان اختیار کی ہے۔ حضرت امام ولی اللہ دھلویؒ قرآن کریم کی تفسیر کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گفتگو کے فطری اسلوب اور اصول کی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مخاطبین کی زبان اور ذہنی سطح کا لحاظ رکھا ہے اور یہی گفتگو کا فطری تقاضا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں عام لوگوں کے لیے مشاہدات کی زبان استعمال کی ہے جو تعلیم اور تفہیم کے لیے سب سے زیادہ آسان زبان ہوتی ہے۔ آپ حضرات آکسفورڈ جیسے بڑے تعلیمی مرکز میں رہتے ہیں۔ آپ اس بات کو بہتر طور پر جانتے ہیں کہ تعلیمی ماہرین جب چھوٹے بچوں کے لیے تعلیم کا نصاب تیار کرتے ہیں تو مشاہدات کی زبان سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ بچوں کو سب سے پہلے اردگرد کے ماحول اور اشیاء کا تعارف کرایا جاتا ہے اور ان کے مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ یہ انار ہے، یہ بکری ہے، یہ میز ہے، یہ درخت ہے، یہ انڈا ہے، یہ گیند ہے اسے مشاہدہ کی زبان کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ آسان زبان ہوتی ہے۔ اسی لیے بچوں کی تعلیم کا آغاز اسی سے کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی عام لوگوں کے لیے یہی زبان استعمال کی گئی ہے اور انسانوں کو ان کے اردگرد کے ماحول میں روزمرہ استعمال اور مشاہدہ میں آنے والی اشیاء کی طرف توجہ دلا کر ان کے ذریعہ عقائد سمجھانے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن کریم بار بار دعوت دیتا ہے آسمان

کی طرف دیکھو، بادل دیکھو، ان سے برستا پانی دیکھو، درخت اور سبزہ دیکھو، ان کے زمین سے اگنے کا منظر دیکھو، زمین کے مردہ ہونے اور پھر پانی کے ذریعہ اس کے زندہ ہونے کی کیفیت دیکھو، دن اور رات کے بدلتے ہوئے مراحل دیکھو اور جن جانوروں اور اشیاء کا تم روزمرہ استعمال کرتے ہو ان کا مشاہدہ کرو، اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت، اس کی صفات اور اس کی توحید کا عقیدہ سمجھانے کے لیے سب سے زیادہ زور کائنات اور ارد گرد کے ماحول اور اشیاء کے مشاہدہ اور ان پر غور و فکر کرنے پر دیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں فلسفہ والوں کے لیے فلسفہ اور معقولات والوں کے لیے عقلی مباحث کا سامان بھی موجود ہے لیکن عام لوگوں کو بات سمجھانے کے لیے بالکل سادہ اور عام سی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (العنکبوت ۲۹:۴۱) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شرک کے عقیدہ کی کمزوری سمجھانے کے لیے مکڑی کی مثال دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جس طرح مکڑی مضبوط چھت اور مستحکم دیوار پر ایک کمزور سا جالا تن کر اپنا الگ گھر بناتی ہے اور چھت اور دیوار کی مضبوطی پر اعتماد کرنے کی بجائے کمزور سا الگ سہارا تلاش کرتی ہے جو کمزور ترین گھر ہے اور ایک پھونک کی مار نہیں ہے اسی طرح مشرک بھی اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی قدرت اور اسکی صفات پر اعتماد کرنے کی بجائے اپنی تسلی کے لیے کمزور سے الگ سہارے تلاش کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے شرک کی حقیقت عام لوگوں کو سمجھائی ہے اور قرآن کریم کا عام طور پر اسلوب یہی ہے۔

اسی طرح اللہ رب العزت نے سورۃ القمر کی آیت کریمہ میں جو میں نے آغاز میں آپ کے سامنے تلاوت کی ہے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو یاد کرنے کے لیے بھی آسان کیا ہے اور سمجھنے کے لیے بھی آسان کر دیا ہے اور پھر اس کے بعد ہمیں یہ کہہ کر قرآن کریم یاد کرنے اور اس کو سمجھنے کی دعوت دی ہے کہ کیا کوئی اس کا ذکر کرنے والا ہے؟ کیا کوئی اسے یاد کرنے والا ہے؟ اور کوئی اس کو سمجھنے کے لیے تیار ہے؟ یہ بھی کسی بات کی دعوت دینے کا انداز ہوتا ہے اور ہمیں اس

دعوت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر دو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بہت سارے علوم ضروری ہیں اور ان علوم پر عبور حاصل کیے بغیر قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور دوسری یہ کہ جس شخص کو قرآن کریم کو تھوڑا بہت سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے وہ اتھارٹی بن کر بیٹھ جاتا ہے کہ اب اس کی تشریح بھی میں کروں گا، اس کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ لوگ اب اسی کی طرف رجوع کریں اور قرآن کریم کی تشریح کے حوالہ سے اسی کی بات کو حتمی سمجھیں۔ یہ دو انتہائیں ہیں اور انتہا پسندانہ رویے ہیں جو ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور دونوں درست نہیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی بات کو سمجھنا اور چیز ہے اور اس کو سمجھانا اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ کسی کلام کے مفہوم سے واقف ہونا اور چیز ہے اور اس کی تشریح کا حق رکھنا اس سے مختلف چیز ہے۔ سمجھنے کے تقاضے اور ہوتے ہیں اور سمجھانے کے تقاضے اور ہوتے ہیں۔ ہم دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور کنفیوژن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ عرض کروں گا کہ کسی بھی ملک کے عام شہری کے لیے اپنے ملک کے رائج الوقت قوانین سے واقف ہونا اور اس کے ضروری تقاضوں کو سمجھنا بطور شہری اس کی ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے۔ کوئی شہری قانون شکنی کا مرتکب ہو اور عدالت میں طلبی پر یہ کہہ دے کہ میں اس قانون سے واقف نہیں تھا اس لیے خلاف ورزی کا ارتکاب مجھ سے ہو گیا ہے تو کسی ملک کی کسی سطح کی عدالت اس عذر کو قبول نہیں کرے گی اور اس بنیاد پر اسے بری نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ ایک شہری کی حیثیت سے اپنے ملک کے قوانین سے آگاہ ہونا تمہاری ذمہ داری ہے اور ملک کے ہر شہری کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ملک کے قوانین سے آگاہ رہے لیکن اگر کوئی شخص قانون سے واقف ہے اور اسے سمجھتا ہے تو اسے اس وجہ سے قانون کی تشریح کا حق حاصل نہیں ہو جائے گا۔ وہ کسی عدالت یا فورم میں یہ کہے کہ میں قانون کو جانتا ہوں، سمجھتا ہوں اور اس کے بارے میں میرا مطالعہ وسیع ہے اس لیے میں قانون کی تشریح کا حق رکھتا ہوں تو اس کی یہ دلیل کسی جگہ بھی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ قانون کی تشریح، اس سے کسی بات پر استدلال اور اس پر آرگو کرنے کا معیار الگ ہے، اس کا پراسس جدا ہے اور اس کا طریق کار مختلف ہے، اس کے لیے ڈگری درکار ہے،

عدالت میں پیش ہونے کا لائسنس ضروری ہے اور تجربہ کے مقررہ معیار پر پورا اترنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کسی شخص کو محض مطالعہ اور قانون کو سمجھنے اور جاننے کی بنیاد پر قانون کی تشریح کا حق نہیں مل سکتا۔ یہی اصول قرآن کریم کے حوالہ سے بھی ہے کہ اس کو اس حد تک سمجھنا کہ اسکے احکام اور مفہوم سے آگاہی ہو اور قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھتے یا سنتے ہوئے معلوم ہو جائے کہ اس میں نماز کی بات ہے، روزے کی بات ہے، حلال وحرام کا مسئلہ ہے، جنت دوزخ کا تذکرہ ہے، کسی کام کا حکم دیا گیا ہے یا کسی بات سے منع کیا گیا ہے، یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کی ذمہ داری ہے اور یہ قرآن کریم کے حقوق میں سے ہے، قرآن کریم کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا پیغام ہے جو ہمارے لیے ہے اور اس کلام میں اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہم ہیں۔ پیغام کسی کا بھی ہو اس کا پہلا حق یہ ہوتا ہے کہ اسے پڑھا جائے اور سمجھا جائے، دفتر کا خط ہے، عدالت کا سمن ہے، کاروباری فرم کا لیٹر ہے، کسی دوست کی چٹھی ہے حتیٰ کہ کسی دشمن کا خط ہے تب بھی اس کا پہلا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ ہم اس کے مفہوم کو قبول کریں یا نہ کریں اور اس کی باتوں پر عمل کریں یا نہ کریں یہ بعد کی بات ہے لیکن کسی بھی پیغام کو وصول کرنے کے بعد ہم پر پہلا حق یہ ہوتا ہے کہ ہم اسے سمجھیں۔ اسی طرح قرآن کریم کو پڑھنا اور اس کو سمجھنا بھی قرآن کریم کے ان حقوق میں سے ہے جو بحیثیت مسلمان ہم پر عائد ہوتے ہیں۔

البتہ فہم قرآن کریم کے چند ضروری تقاضوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اور یہ قرآن کریم کے حوالہ سے کوئی الگ تقاضے نہیں ہیں بلکہ وہی فطری تقاضے اور ضروریات ہیں جو دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی بھی گفتگو کو سمجھنے اور اس کے صحیح مفہوم سے آگاہی کے لیے ناگزیر سمجھے جاتے ہیں مثلاً

(۱) کسی بھی گفتگو اور کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے آگاہی ہو، بات انگلش میں ہے تو انگلش زبان کا جاننا ضروری ہے۔ فارسی میں ہے تو فارسی جاننا ضروری ہے اور پشتو میں ہے تو پشتو زبان سے آگاہی کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔

(۲) دوسرے نمبر پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ متکلم کی منشا تک رسائی ہو کیونکہ بسا اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ سننے والے نے کلام کا مطلب کچھ اور سمجھا ہے لیکن متکلم کہتا ہے کہ میرا مطلب یہ

نہیں تھا ایسی صورت میں جبکہ سننے والے کے فہم اور متکلم کی منشا میں فرق ہو جائے تو متکلم کی منشا کو ہی ترجیح حاصل ہوتی ہے اور اسی کے بیان کو اس کے کلام کا صحیح مفہوم اور مصداق سمجھا جاتا ہے۔

(۳) تیسرے نمبر پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ گفتگو کے محل، موقع اور پس منظر سے بھی آگاہی حاصل کی جائے کیونکہ ایک ہی جملہ کا معنی ایک جگہ اور ہوتا ہے اور وہی جملہ کسی اور موقع پر دوسرے پس منظر میں بولا جائے تو اس کا معنی مختلف ہو جاتا ہے۔ کسی گفتگو کو اس کے پس منظر اور بیک گراؤنڈ سے ہٹ کر دیکھا جائے تو معنی مختلف ہوتا ہے اور جب اس کے پس منظر اور بیک گراؤنڈ کو سامنے لایا جائے تو اس جملہ اور کلام کا مفہوم اور مطلب یکسر تبدیل ہو جاتا ہے یہ امور قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان میں ہونے والی گفتگو کو سمجھنے اور اس کے صحیح معنی و مفہوم تک رسائی کے لیے یہ تینوں باتیں ضروری تصور کی جاتی ہیں۔ یہی باتیں قرآن کریم کے حوالے سے بھی ضروری ہیں اور ان کے بغیر قرآن کریم کو سمجھنے اور اس کا معنی و مفہوم متعین کرنے کی کوشش غلطی کا شکار ہو جاتی۔ مثلاً عربی زبان کا جاننا قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے اس کے بغیر قرآن کریم کو براہ راست سمجھنا ممکن نہیں ہے پھر عام عربی نہیں بلکہ وہ عربی جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ جس طرح کسی انگریزی اخبار کا مطالعہ کرنے کے لیے عام انگلش کافی ہے لیکن شیکسپئر کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کے معیار کی انگلش سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے بھی اس کے معیار کی عربی زبان کا جاننا ضروری ہے مگر صرف عربی سے واقف ہونا کافی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ عربی زبان کا جان لینا ہی قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے بلکہ عربی زبان کے ساتھ ساتھ متکلم کی منشا تک رسائی اور کلام کے پس منظر اور بیک گراؤنڈ سے آگاہ ہونا بھی اسی طرح ضروری ہے کیونکہ سامع کے فہم اور متکلم کی منشا کے درمیان اختلاف ہو جانا ایک فطری امر ہے اور ایسی صورت حال میں متکلم کی منشا معلوم کرنا اور اس کے مطابق کلام کا معنی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کے حوالہ سے اس موقع پر ایک اور نکتہ کو ذہن نشین کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم میں متکلم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن ہم تک یہ مقدس کلام اللہ تعالیٰ نے اپنے نمائندہ کے ذریعہ پہنچایا ہے اور وہ جناب نبی اکرم ﷺ ہیں۔ ہمارے سامنے قرآن کریم کے متکلم اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے جناب نبی اکرم ﷺ ہیں

اور قرآن کریم کا متن اور الفاظ انہی کے ذریعہ ہمیں ملے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم کی کسی آیت یا جملہ کا مفہوم طے کرتے ہوئے اگر متکلم کی منشا معلوم کرنا ضروری ہو جائے تو اس کے لیے بھی متکلم کے نمائندہ یعنی حضرت محمد ﷺ تک رسائی ضروری ہوگی اور جس طرح قرآن کریم کے الفاظ اور اس کا متن ہم نے ان سے حاصل کیا ہے۔ ان الفاظ اور متن کا مفہوم سمجھنے کے لیے متکلم کی منشا معلوم کرنے کی غرض سے بھی ہم ان ہی سے رجوع کریں گے اور وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ اور رسول ہیں اور ہم ان کی اس حیثیت پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ کسی آیت کا جو مفہوم بیان کریں گے وہ قرآن کریم کے اصل متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھا جائے گا۔ یہ بات میں محض فرضی طور پر نہیں کر رہا بلکہ صحابہ کرامؓ کے دور میں متعدد بار ایسا ہوا کہ قرآن کریم کی کسی آیت یا جملہ کا مفہوم طے کرنے میں الجھن پیش آئی تو صحابہ کرامؓ نے اس میں اللہ تعالیٰ کی منشا معلوم کرنے کے لیے جناب نبی اکرم ﷺ سے رجوع کیا اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی منشا اور مراد کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی آیات پیش کی جا سکتی ہیں مگر اس موقع پر وقت کے اختصار کی وجہ سے صرف ایک آیت کریمہ کا حوالہ دوں گا۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الانعام ۶:۸۲) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو خلط ملط نہ ہونے دیا۔ ان کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں“ اب یہاں امن، ہدایت اور ایمان کے لیے شرط یہ قرار پاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ ظلم کا اختلاط و التباس نہ ہو اور یہ بظاہر بہت سخت شرط ہے اس لیے کہ ظلم کا عام مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ظلم کہلاتی ہے جو کسی نہ کسی درجہ میں عام طور پر ہوتی رہتی ہے اور جس سے مکمل طور پر بچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے یہاں ظلم کا مطلب یہی سمجھا اور پریشان ہو گئے، ایسے مواقع پر صحابہ کرامؓ پریشان ہو جایا کرتے تھے اس لیے کہ وہ قرآن کریم کو سمجھتے تھے اور چونکہ سمجھتے تھے اس لیے ایسی کسی بات پر پریشان بھی ہوتے تھے۔ ہم نے سرے سے قصہ ہی نمٹا دیا کہ نہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی پریشان ہوتے ہیں۔ ہم نے قرآن کریم کو سمجھنا ہی چھوڑ دیا تاکہ پریشانی تک نوبت ہی نہ آئے۔ بہرحال صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے۔ آپس میں مشورہ کیا اور پھر جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی

پریشانی ان کے سامنے رکھ دی۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ گزارش کی کہ وأينالم يظلم يارسول الله؟ ہم میں سے کون ہے جس سے ظلم وزیادتی کا تھوڑا بہت ارتکاب نہیں ہوتا اور اگر امن اور ہدایت کے لیے ایمان کا ظلم سے بالکل خالی ہونا ضروری ہے تو یہ شرط پورا کرنا کس کے بس کی بات ہے؟ جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ تمہاری پریشانی بجا ہے مگر اس آیت میں ''ظلم'' کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ کی مراد وہ ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا: يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۣ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان ۳۱:۱۳) کہ بیٹا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اس لیے کہ ''شرک بہت بڑا ظلم ہے'' اب آیت کریمہ کا معنی یوں ہوا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کو خلط ملط نہ ہونے دیا ان کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یہ سن کر صحابہ کرامؓ کی پریشانی دور ہوگئی۔ اس آیت کریمہ میں ظلم کا جو معنی سننے والوں نے سمجھا تھا وہ متکلم کی منشا کے خلاف تھا اور متکلم کی منشا کی وضاحت کے لیے متکلم کے نمائندہ جناب نبی اکرم ﷺ سے رجوع کیا گیا اور ان کی وضاحت کے ساتھ آیت کریمہ کا مفہوم و معنی طے ہوا۔ اس لیے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی جاننے کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت و حدیث سے واقفیت بھی ضروری ہے اور مختلف آیات کریمہ کی انہوں نے جو تشریح و توضیح فرمائی ہے اس سے آگاہی لازمی ہے کیونکہ ان کی وضاحت کو متکلم کی منشا کی تشریح کا درجہ حاصل ہے اور اس کی موجودگی میں صرف سامعین کے فہم کو معیار قرار دے کر قرآن کریم کی کسی آیت کی صحیح تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح قرآن کریم کی کسی آیت کے صحیح مفہوم کی رسائی کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ کس موقع پر نازل ہوئی تھی اور اس کا پس منظر کیا ہے کیونکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کا ظاہری مفہوم مختلف ہے لیکن جب انہیں ان کے پس منظر اور شان نزول کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو مفہوم بدل جاتا ہے اس پر بھی بہت سی آیات قرآنیہ پیش کی جاسکتی ہیں جن میں سے ایک آیت کریمہ پیش کرنا چاہوں گا۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۱۵۸) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ

کرے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کے درمیان بھی چکر لگائے"۔ یہاں "فلا جناح علیه أن یطوف بهما" (پس کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کے درمیان چکر لگائے) کے جملہ سے بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حج اور عمرہ دونوں میں سعی ضروری نہیں ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ صفا مروہ کی سعی حج اور عمرہ دونوں میں ضروری ہے اور اس کے بغیر نہ حج مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی عمرہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بھانجے اور شاگرد حضرت عروہ بن زبیرؓ نے یہ اشکال حضرت عائشہؓ کے سامنے پیش کیا تو حضرت ام المومنینؓ نے اس آیت کریمہ کا شان نزول بیان کیا جس سے بات واضح ہوگئی۔ انہوں نے بتایا کہ جاہلیت کے دور میں جو لوگ حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ آتے تھے وہ بیت اللہ کا طواف تو سارے ہی کرتے تھے مگر صفا مروہ کی سعی سب نہیں کرتے تھے۔ قریش اور ان کے حلیف قبائل صفا مروہ کی سعی کرتے تھے مگر مدینہ منورہ کے قبائل اوس اور خزرج اور بعض دوسرے قبائل صفا مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ ان کا موقف غالباً یہ تھا کہ یہ سعی حضرت ہاجرہؑ کی یاد ہے جو قریش کی ماں تھیں اس لیے یہ ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ وہ اس کی بجائے مناۃ نامی بت کی نیت کرتے تھے جو قدید کے مقام پر تھا اور صفا مروہ کی سعی کو اپنے لیے درست نہیں سمجھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد مناۃ کو نبی اکرم ﷺ نے ختم کرا دیا تو انصار مدینہ یعنی اوس اور خزرج نے جناب نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں (یعنی صرف قریش کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں) اس لیے جو بھی حج یا عمرہ کے لیے آئے وہ صفا مروہ کی سعی میں کوئی حرج محسوس نہ کرے۔ بخاری شریف کی ایک اور روایت کے مطابق حضرت انس بن مالکؓ نے بھی یہی وضاحت فرمائی جو انصار مدینہ میں سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم صفا مروہ کی سعی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اُسے جاہلیت کی رسوم میں شمار کیا کرتے تھے چنانچہ ہماری اس غلط فہمی کو قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں دور کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کا ظاہری معنی مختلف ہے لیکن حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ نے اس کا پس منظر بیان کیا تو معنی اس سے بالکل مختلف ہوگیا اور امت نے اسی معنی کو قبول کیا جو اس پس منظر اور بیک گراؤنڈ میں متعین کیا گیا ہے۔ اسے آج کی اصطلاح میں پس منظر اور بیک گراؤنڈ کہا جاتا ہے جبکہ شرعی اصطلاح میں اسے

شان نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ شان نزول کوئی نہ کوئی صحابی رسولؓ ہی بیان کرے گا، کسی آیت کا شان نزول حضرت عائشہؓ بیان کریں گی، کسی کا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کریں گے، کسی کا حضرت انسؓ بیان کریں گے، کسی آیت کا پس منظر حضرت جابرؓ بیان کریں گے اور کسی کا کوئی اور صحابیؓ بیان فرمائیں گے۔ اس حوالہ سے اپنی گفتگو کا خلاصہ پھر عرض کر دیتا ہوں کہ قرآن فہمی اور قرآن کریم کی کسی آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے جہاں عربی زبان کا اس کے معیار کے مطابق جاننا ضروری ہے وہاں دو باتیں اور بھی لازمی ہیں ایک یہ کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت و حدیث کا علم حاصل کیا جائے کیونکہ قرآن کریم کے متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کی منشا اور مراد کا علم ہمیں جناب نبی اکرم ﷺ سے ہی حاصل ہوگا اور دوسرے یہ کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی تفسیر و تشریح میں جو کچھ فرمایا ہے اس پر ہماری نظر ہو کیونکہ کسی بھی آیت کریمہ کا پس منظر اور شان نزول معلوم کرنے کے لیے ہمیں صحابہ کرامؓ سے رجوع کرنا ہوگا اور وہی کسی آیت کا بیک گراؤنڈ بیان کریں گے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے نزول کے عینی گواہ وہ ہیں اور ان ہی کے سامنے قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کا صحیح فہم نصیب کریں اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

قرآن فہمی میں

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہمیت

۴ مئی ۱۹۹۹ء کو دارالعلوم نعمانیہ ڈیرہ اسماعیل خان کی جامع مسجد میں درس قرآن۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ:

قرآن کریم کے درس کے حوالہ سے قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ غلط فہمی آج پھر عام ہو رہی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی ہے اور جو شخص عربی زبان پر، گرائمر اور لٹریچر پر عبور رکھتا ہے، وہ براہ راست قرآن کریم کی جس آیت کا مفہوم سمجھ لے، وہی درست ہے۔ یہ گمراہی ہے اور قرآن فہمی کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سنت نبوی، قرآن فہمی کی بنیاد

اس سلسلہ میں بنیادی گزارش یہ ہے کہ قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کی آیات کا مصداق و مفہوم معلوم کرنے کے لیے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بڑی بنیاد ہے کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وساطت سے ہمیں قرآن کریم ملا ہے اور انہوں نے قرآن کریم کے صرف الفاظ ہم تک نہیں پہنچائے بلکہ اس کی تعلیم بھی دی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصبی فرائض میں دو باتوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ ایک یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو قرآن کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور دوسرا يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ کہ لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ یَتْلُوْا کا تعلق الفاظ سے ہے اور یُعَلِّمُ کا تعلق

ان الفاظ کے معنی ومفہوم سے ہے اور یہ دونوں باتیں جناب نبی اکرم ﷺ کے فرائض منصبی میں سے ہیں۔ اس لیے ایسا نہیں ہوا کہ رسول اکرم ﷺ نے (نعوذ باللہ) ایک چٹھی رساں کے طور پر قرآن کریم امت کے حوالہ کر دیا ہو اور خود فارغ ہو گئے ہوں بلکہ انہوں نے قرآن کریم کے الفاظ وآیات پڑھ کر سنانے اور انہیں امت کے حوالہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل ۲۳ برس تک ان کی تعلیم بھی دی ہے اور وہی تعلیم سنت نبوی ہے جو قرآن کریم کی صرف تشریح و بیان ہی نہیں بلکہ اس پر ایمان کی بنیاد بھی ہے کیونکہ سنت وحدیث پر ایمان لائے بغیر قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔

حضرت امام شافعیؒ سے ایک جملہ منسوب ہے کہ "اَلْقُرْآنُ اَحْوَجُ اِلَی السُّنَّةِ مِنَ السُّنَّةِ اِلَی الْقُرْآن" سنت قرآن کریم کی اتنی محتاج نہیں ہے جتنا قرآن کریم سنت کا محتاج ہے۔ اس جملہ کا مطلب عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم متن ہے اور سنت رسول ﷺ اس کی شرح ہے اس لیے شرح کے بغیر متن کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے جبکہ شرح میں متن خود بخود موجود ہوتا ہے مگر میں اس جملہ کو اور مفہوم میں لیتا ہوں اور اس کی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

ایک جگہ گفتگو ہو رہی تھی کہ قرآن کریم کے بعد اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور حدیث وسنت چونکہ اختلافات کا ذریعہ بنتی ہیں اس لیے انہیں قرآن کریم کے ساتھ لازم قرار دینا درست نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حدیث کے بغیر تو خود قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورت "الکوثر" ہے جو تین چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی شخص انکار کر دیتا ہے کہ میں سارے قرآن کریم کو مانتا ہوں مگر اس سورت کو قرآن کریم کا حصہ نہیں مانتا تو ہمیں اس کے سامنے اس سورت کو قرآن کریم کا حصہ ثابت کرنے کے لیے کوئی اتھارٹی پیش کرنا ہوگی کہ ہم کس کے کہنے پر سورۃ الکوثر کو قرآن کریم کا حصہ مان رہے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو براہ راست ہمیں کچھ نہیں فرمایا اور نہ ہی جبریل علیہ السلام سے ہمارا کوئی رابطہ ہے، ہمارے سامنے تو اس بارے میں ایک ہی اتھارٹی ہے اور وہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے جنہوں نے جس جملہ اور آیت کو قرآن کریم کا حصہ قرار دیا، اسے ہم نے قرآن کریم کا جزو تسلیم کر لیا۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس

قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور الفاظ کے تعین کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لیے سورۃ الکوثر کے حوالہ سے بھی اتھارٹی جناب نبی اکرم ﷺ ہی کی ذات اقدس ہے کہ چونکہ انہوں نے سورۃ الکوثر کو قرآن کریم میں شامل کیا ہے اس لیے یہ سورت کتاب اللہ کا حصہ ہے ورنہ اس سلسلہ میں اور کوئی ذریعہ اور اتھارٹی ہمیں میسر نہیں ہے تو جب یہ طے ہو گیا کہ ہم نے سورۃ الکوثر کو قرآن کریم کا حصہ اس لیے تسلیم کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو پھر ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے'' کے جملہ کو آپ کیا کہیں گے؟ یہ حدیث ہے اور آپ خود غور فرما لیں کہ ہم پہلے حدیث پر ایمان لائے ہیں یا قرآن کریم پر؟ اسی لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ رتبہ اور مقام میں قرآن کریم حدیث سے مقدم ہے مگر ایمان کی ترتیب میں حدیث قرآن کریم سے پہلے ہے کیونکہ جب تک رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ ہو، قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن بھی نہیں ہے اور امام شافعیؒ کے مذکورہ جملہ کو میں اسی مفہوم میں لیتا ہوں۔

لہٰذا سنت و حدیث نہ صرف قرآن کریم کی تشریح اور اس کا بیان ہے بلکہ اس پر ایمان کی بنیاد بھی ہے اور قرآن کریم کے ساتھ سنت کا تعلق قول اور عمل کا تعلق ہے اور یہ بات ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن'' رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و عادات قرآن کریم تھے یعنی وہ قرآن کریم جو الفاظ میں تلاوت کیا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے، اسے اگر عمل و کردار اور اخلاق و عادات کی شکل میں دیکھنا چاہو تو وہ جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور سیرت و سنت ہے۔ اسے یوں سمجھ لیجیے جیسے سکول اور کالج میں ایک استاد کلاس روم میں سائنس کا ایک فارمولا پڑھاتا ہے اور پھر لیبارٹری میں اسے عملی مرحلہ سے گزار کر دکھاتا ہے۔ جو کچھ اس نے کلاس روم میں پڑھایا ہے، اسے تھیوری کہتے ہیں اور جس عملی تجربہ کا مظاہرہ لیبارٹری میں کیا ہے، وہ پریکٹیکل کہلاتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم تھیوری ہے اور سنت نبویؐ پریکٹیکل ہے جو اسی تھیوری کی عملی شکل ہے۔

اس سے ہٹ کر ایک اور انداز میں بھی بات کو دیکھ لیں۔ وہ یہ کہ کسی عام شخص سے یہ سوال کریں کہ اس قرآن کریم پر پوری نسل انسانی میں کس شخصیت نے سب سے زیادہ اور مکمل عمل کیا ہے؟ اس کے جواب میں کوئی شخص بھی جناب نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی اور نام نہیں لے گا اور نہ ہی لے سکتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ جس کا عمل کتاب اللہ پر سب سے زیادہ مکمل ہوگا، وہی

اس پر عمل میں دوسروں کے لیے نمونہ اور معیار بنے گا اور اس لیے خود قرآن کریم نے جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کو پوری امت کے لیے ''اسوہ حسنہ'' قرار دیا ہے۔

قرآن فہمی میں سنت نبوی ﷺ کی اہمیت

اس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سنت نبوی ﷺ کے بغیر قرآن کریم کو براہ راست سمجھنا ممکن نہیں ہے اور یہ دعویٰ کرنا گمراہی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے صرف عربی گرائمر اور لٹریچر پر عبور کافی ہے۔ اس پر چند واقعات عرض کروں گا کہ حضرات صحابہ کرامؓ عرب تھے اور عربی ان کی مادری زبان تھی مگر بعض مواقع ایسے آئے کہ انہیں قرآن کریم کے الفاظ و احکام کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی اور جب نبی اکرم ﷺ نے وضاحت فرمائی تو وہ قرآن کریم کی مراد سمجھ سکے۔ حاتم طائی عرب کے مشہور سخی ہیں جن کی سخاوت کے قصے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ انہوں نے جناب نبی اکرم ﷺ کا زمانہ نہیں پایا البتہ چونکہ وہ تاریخی روایات کے مطابق بت پرستی ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے دنیا میں رائج الوقت حق مذہب عیسائیت ہی تھا اس لیے حاتم طائی کو اہل حق میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا بیٹا عدیؓ اور بیٹی سفانہؓ دونوں صحابی ہیں، انہی عدی بن حاتمؓ کا قصہ ہے کہ جب رمضان المبارک میں سحری کا حکم نازل ہوا کہ اس وقت تک سحری میں کھا پی سکتے ہو جب تک سفید اور سیاہ دھاریاں الگ الگ ظاہر نہ ہو جائیں۔ یہاں قرآن کریم کی مراد طلوع فجر کے وقت مشرق کی جانب آسمان پر نظر آنے والی سفید روشنی اور سیاہ اندھیرے کی دھاریاں ہیں جن کا الگ الگ نظر آنا طلوع فجر کی علامت ہے اور اسی کے ساتھ سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے مگر عدی بن حاتمؓ نے یہ کیا کہ دھاگے کی سفید اور سیاہ ڈوریاں اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیں اور سحری کے وقت انہیں دیکھ کر کھاتے پیتے رہے اور جب وہ الگ الگ دکھائی دینے لگیں تو کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک روز جناب رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ "اذا لو سادتك عريضة يا عدى" پھر تو اے عدیؓ تیرا تکیہ بہت چوڑا ہے یعنی سفید اور سیاہ دھاریاں سے قرآن کریم نے جو مراد لیا ہے وہ اگر تیرے تکیے کے نیچے آ جاتا ہے تو پھر تو تکیہ بہت چوڑا ہوگا۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم کی مراد واضح کی تو عدی بن حاتمؓ بات کو سمجھے اور تکیے

کے نیچے سے دھاگے کی ڈوریاں نکال لیں۔

اب غور فرمائیے کہ عدی بن حاتم ؓ عرب ہیں، عرب کے بیٹے ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں مگر قرآن کریم کا بیان کردہ محاورہ سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے اور اس وقت قرآن کریم کا مطلب نہیں سمجھ پائے جب تک خود حضور ﷺ نے اس کی وضاحت نہیں فرمادی، اس لیے اگر آج کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ محض عربی دانی کے زور پر قرآن کریم کے مفہوم و مراد کو پاسکتا ہے تو یہ بات کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک شخصی واقعہ ہے اور کسی بھی شخص کو ذاتی طور پر اس قسم کا مغالطہ ہوسکتا ہے اس لیے اجتماعی واقعہ بھی عرض کردیتا ہوں۔

لفظ ظلم کے معانی اور مفہوم: یہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جب اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الانعام ۶:۸۲) نازل ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس نہ ہونے دیا، وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور ان ہی کے لیے امن ہوگا'' تو صحابہ کرام ؓ میں بے چینی پھیل گئی۔ انہوں نے ظلم کا عام مفہوم سمجھا کہ لوگوں میں باہمی معاملات و حقوق اور لین دین میں جو کمی بیشی اور حق تلفی ہوجاتی ہے، وہ ظلم ہے اور بلاشبہ ظلم کا عمومی مفہوم یہی ہے مگر پریشانی اس بات پر ہوئی کہ یہ کمی بیشی تو انسانی معاشرت کا حصہ ہے اور روزمرہ معاملات میں کہیں نہ کہیں ہوہی جاتی ہے، اس سے مکمل گریز کو اگر ایمان و ہدایت کے لیے شرط قرار دیا جائے تو بہت کم لوگوں کا ایمان قبولیت کے معیار پر پورا اترے گا، صحابہ کرام ؓ کی پریشانی اس حد تک بڑھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ حضرات پیش ہوئے اور اپنے اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ وَاَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ''ہم میں سے کون ہے جس سے تھوڑی بہت زیادتی نہیں ہوجاتی، معصوم تو صرف پیغمبر ہیں، باقی لوگ تو نہیں ہیں اور آپ کے معاملات میں تھوڑی بہت کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لیے ایمان و ہدایت کا یہ معیار بہت سخت ہے کہ ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس بھی نہ ہو۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ بات سن کر صحابہ کرام ؓ کو تسلی دی کہ یہ پریشانی بجا ہے مگر یہاں ظلم سے مراد وہ نہیں جو سمجھا جارہا ہے بلکہ اس آیت کریمہ میں ظلم سے مراد وہ ہے جو حضرت لقمان علیہ

السلام نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا شرک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اس پر صحابہ کرامؓ کی پریشانی دور ہوئی کہ ایمان کی قبولیت کے لیے جس ظلم سے مکمل گریز کو شرط کے طور پر پیش کیا گیا، وہ عام ظلم نہیں بلکہ شرک ہے۔

اب قرآن کریم میں عام طور پر بولا جانے والا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مخاطب صحابہ کرامؓ سب کے سب عرب ہیں مگر انہیں لفظ کی مراد سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور وہ اس وقت آیت کریمہ کا مقصد پا سکے ہیں جب جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے جو حافظ ابن کثیرؒ نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲۳ کے ضمن میں بیان کیا ہے اس آیت میں جملہ ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ''جس نے برائی کا کوئی کام کیا اسے ضرور بدلہ دیا جائے گا'' یہاں ''سُوْٓءً'' نکرہ ہے جس میں برائی کا معمولی سا کام بھی شامل ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت صحابہ کرامؓ کو سنائی تو مجلس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی موجود تھے، یہ جملہ سنتے ہی ان کی حالت متغیر ہوگئی اور چہرے کا رنگ بدل گیا حتیٰ کہ خود نبی اکرم ﷺ نے ان کی کیفیت کو محسوس کر کے پوچھا کہ "مَالَكَ يَا اَبَا بَكْرٍ" آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! یہ آیت سن کر میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے کیونکہ جب ہر چھوٹے بڑے کام پر قیامت کے روز گرفت ہوگی تو کون شخص وہاں کے عذاب سے بچ سکے گا؟ جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ نہیں آپ نے "يُجْزَ بِهٖ" کا معنی یہ سمجھا ہے کہ ہر عمل کا بدلہ قیامت کے روز ہی ملے گا۔ یہ درست نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اہل ایمان کو جو تکالیف اور پریشانیاں پیش آتی ہیں، وہ ان کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے حتیٰ کہ کسی مومن کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہے تو وہ بھی کسی گناہ کا کفارہ بن گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کی جان میں جان آئی کہ جو بات وہ سمجھتے تھے وہ صحیح نہیں تھی۔

تفسیر قرآن میں اقوال صحابہؓ کی اہمیت

اب حضرت ابوبکرؓ نسلی عرب ہیں، ان کی مادری زبان عربی ہے بلکہ انہیں "اَعْلَمُ الصَّحَابَةِ" کہا جاتا ہے مگر قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ کا مفہوم نہیں سمجھ پائے اور نبی اکرم ﷺ نے وضاحت کی ہے تو بات ان کی سمجھ میں آئی ہے بلکہ میں تو اس سے اگلی بات کرتا

ہوں کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت تو قرآن فہمی کی بنیاد ہے، حضرات صحابہ کرامؓ کے ارشادات کے بغیر بھی بسا اوقات قرآن کریم کی کسی آیت کا مصداق متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ میں بھی دو واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۱۰۵) کے ضمن میں حافظ ابن کثیرؒ نے روایت نقل کی ہے، اس آیت میں اہل ایمان سے خطاب کر کے فرمایا ہے'' کہ اے ایمان والو! تم پر اپنا فکر لازم ہے۔ کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو تمہیں کوئی ضرر نہیں دے سکتا اگر تم خود ہدایت پر ہو''۔

ابن کثیرؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے دور خلافت میں اس آیت کریمہ کا مفہوم و مصداق بیان کرنا پڑا جس کی وجہ سے یہی ہو سکتی ہے کہ کسی نے اس دور کے حالات پر یہ آیت پڑھ دی ہوگی اور آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو منکرین ختم نبوت، زکوٰۃ اور دیگر مرتدین کے خلاف جس طرح محاذ آرا ہونا پڑا تھا اس پس منظر میں کسی نے یہ آیت پڑھ دی ہو تو عام حلقوں میں اس کا کیا مطلب سمجھا جاتا ہے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے برسر عام اس کا اعلان فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں خطاب ہم لوگوں سے نہیں ہے بلکہ اس دور کے مسلمانوں سے ہے جب فتنے عام ہو جائیں گے اور عقائد و ایمان کے فتنوں کی اس قدر کثرت ہو جائے گی کہ ایمان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اسی زمانے کے لوگوں کے لیے یہ حکم ہے کہ جب اپنا ایمان بچانا بھی مشکل ہو جائے تو دوسروں کی فکر کرنے کی بجائے اپنا فکر کرو اور اپنے ایمان کو بچانے کی کوشش کرو۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے دور خلافت کے حالات، ان کی جنگوں اور اس آیت کریمہ کے حوالہ سے ان کی وضاحت کو سامنے رکھتے ہوئے ذرا غور کر لیں کہ اگر حضرت ابوبکرؓ آیت کریمہ کا یہ مصداق واضح نہیں کرتے تو منکرین ختم نبوت، منکرین زکوٰۃ اور دیگر مرتدین کے خلاف ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کی حیثیت محل نظر ہو جاتی ہے بلکہ جس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے حضرت صدیق اکبرؓ نے وضاحت فرمائی ہے، وہ باقی رہ جاتی تو '' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر '' کا پورا دینی شعبہ ہی کالعدم ہو کر رہ جاتا اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم طے کرتے ہوئے اس دور کا پس منظر اور حضرات صحابہ کرامؓ کی تشریحات کو بھی

سامنے رکھا جائے ورنہ قرآن کریم کی مراد تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح امام ترمذیؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ رومیوں کے خلاف معرکوں کے دوران ایک جنگ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی شریک تھے، مسلمانوں اور رومیوں کے لشکر آمنے سامنے تھے اور لڑائی کی تیاری ہو رہی تھی کہ مسلمانوں کے لشکر میں سے ایک پرجوش نوجوان نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا اور اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ اس پر لوگوں نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اپنے انداز میں باتیں کیں کہ اس نے جلد بازی کی، جذباتی کام کیا ہے اور غلطی کی ہے اسی دوران کسی صاحب نے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۵ کا ایک جملہ پڑھ دیا وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ اس کا مفہوم یہ ہے ”خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت پڑو“ یہ سن کر حضرت ابوایوب انصاریؓ چونکے اور موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے جس مفہوم میں ان صاحب نے اسے پڑھا ہے۔ یہ آیت ہم انصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے اس کا مفہوم اور مصداق ہم بہتر جانتے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصار مدینہ نے دل کھول کر ساتھ دیا اور مہاجرین کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ قریش کے ساتھ معرکہ آرائی میں بھی پوری قوت کے ساتھ شریک رہے۔ بدر، احد، احزاب اور دیگر جنگوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس دوران اپنی کھیتی باڑی کی طرف ان کی توجہ کم ہوگئی، باغات کی حالت بگڑنے لگی اور معاشی حالت خاصی متاثر ہوئی۔ ترمذیؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوایوب انصاریؓ نے کہا کہ جب غزوہ خیبر کے بعد مسلمانوں کی حالت کچھ سنبھلی اور صورت حال بہتر ہونے لگی تو انصار مدینہ میں سے کچھ حضرات نے باہم مشورہ کیا کہ اب رسول اللہ ﷺ کو ہماری اس طرح کی امداد کی ضرورت نہیں جیسی ہم اب تک کرتے آرہے ہیں اور حالات خاصے بہتر ہو گئے ہیں اس لیے ہم اب اپنے باغات اور کھیتی باڑی کی طرف توجہ دیں اور خرچ کرنے کے معاملہ میں کچھ کمی کر لیں تاکہ اس دوران معاشی طور پر جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس پر قرآن کریم کی مذکورہ آیت نازل ہوئی کہ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت پڑو“۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ اس آیت کا شان نزول ہے اور اس کا مطلب

یہ ہے کہ جہاد اور دفاع پر بدستور پہلے کی طرح خرچ کرتے رہو کیونکہ اگر اس میں کمی کرو گے تو کمزور ہو جاؤ گے اور جہادی قوت کمزور کرنے کا مطلب خود اپنے ہاتھ ہلاکت میں پڑنا ہوگا اور اس آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔

اب ان دونوں واقعات کو سامنے رکھ کر دیکھ لیجیے کہ قرآن کریم کی آیات کریمہ کا مطلب اور پس منظر حضرات صحابہ کرامؓ نے بیان کیا تو واضح ہوا ورنہ ان کا ظاہری مفہوم کچھ اور ہے۔ ان گزارشات کے بعد میں آپ حضرات کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و تعلیمات بھی قرآن پاک ہی کا حصہ ہیں اور اس پر ایک دو واقعات عرض کروں گا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک بار کوفہ کی جامع مسجد میں درس دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ ''جسم پر نام گدوانے والی، بال اکھاڑنے والی اور ریتی سے رگڑ کر دانت چھوٹے کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے''۔

یہ اس زمانے کا فیشن تھا جیسا کہ ہر دور میں عورتوں میں رواج ہوتا ہے کہ وہ خود کو سنوارتی ہیں، آرائش و زیبائش اختیار کرتی ہیں اور پھر ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ انہیں دیکھا جائے، اس زمانے کا فیشن یہ تھا۔ یہ سن کر کوفہ کی ایک خاتون ام یعقوبؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئیں اور پوچھا کہ آپ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے؟ آپؓ نے جواب دیا کہ ہاں میں نے یہ کہا ہے۔ اس عورت نے پوچھا کہ کیا یہ قرآن کریم میں ہے؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے تو اس کا ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہیے، ہمارا زمانہ ہوتا اور ہمارے جیسا کوئی ڈھیلا ڈھالا مولوی ہوتا تو گھبرا جاتا کہ قرآن کریم میں تو نہیں ہے مگر وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے، پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں یہ قرآن کریم میں ہے۔ ام یعقوبؒ نے کہا کہ قرآن کریم تو میں نے بھی سارا پڑھا ہے، اس میں کہیں یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر ۵۹:۷) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ تمہیں جو دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں،

اس سے رک جاؤ" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا فیشن کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی قرآنی تعلیمات ہی کا حصہ ہے۔

پیغمبر ﷺ کا منصب

اس سے قطع نظر بھی یہ بات سوچ لیں کہ نمائندہ کسے کہتے ہیں؟ نمائندگی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نمائندہ جو بات بھی کہتا ہے، وہ اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اس کی طرف سے ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے، ہم خود بھی اگر کسی کو نمائندہ بنا کر بھیجتے ہیں اور اس کی بات توجہ سے نہیں سنی جاتی تو شکایت ہمیں ہوتی ہے کہ فلاں صاحب نے ہمارے نمائندے کی بات پر توجہ نہیں دی اور اس کو ہم نمائندہ کی بجائے اپنی توہین سمجھتے ہیں اور رسول کا معنی ہی قاصد اور نمائندہ کے ہیں اس لیے جب اللہ تعالیٰ اصولی طور پر یہ بات فرما رہے ہیں کہ محمد ﷺ میرے نمائندہ ہیں، یہ جس کام کا کہیں وہ کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ تو اس اصول کے تحت جناب نبی اکرم ﷺ کے تمام تر ارشادات و فرمودات اللہ تعالیٰ ہی کے ارشادات قرار پاتے ہیں۔ میں آپ حضرات کے سامنے ایک اور مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ آپ کے ضلع کا حاکم ڈپٹی کمشنر ہے جو صوبائی حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جو حکم بھی دیتا ہے، وہ صوبائی حکومت کی طرف سے تصور ہوتا ہے، آج تک کسی شخص نے کسی ڈپٹی کمشنر کے پاس جا کر یہ سوال نہیں کیا کہ آپ نے جو حکم جاری کیا ہے، اس پر صوبائی حکومت کی تصدیق دکھائیں اور اگر کسی کو شوق ہو تو وہ ڈپٹی کمشنر کے کسی حکم پر اس سے یہ سوال کر کے دیکھ لیں، جواب خود معلوم ہو جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کا ایک اور ارشاد اسی آیت کے ضمن میں تفسیر قرطبی میں بھی مذکور ہے کہ ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرد کو دیکھا کہ وہ احرام کی دو چادروں کے ساتھ کوئی سلا ہوا کپڑا بھی پہنے ہوئے تھا۔ آپ نے اسے روک کر بتایا کہ مرد کے لیے احرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا پہننا منع ہے۔ اس نے جھٹ سے سوال کر دیا کہ کیا یہ قرآن کریم میں ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہاں قرآن کریم میں ہے اور پھر مذکورہ آیت پڑھ کر یہی استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا نبی ﷺ جس کام کا حکم دے وہ کرو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور جناب نبی اکرم ﷺ نے

فرمایا ہے کہ مرد کے لیے حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا پہننا درست نہیں ہے۔

اور حضرت امام شافعیؒ تو اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں، تفسیر قرطبی میں اسی آیت کے ضمن میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد بن ادریس شافعیؒ نے جو اہل سنت کے چار بڑے اماموں میں سے ایک ہیں، کسی روز اپنی محفل میں یہ فرمادیا کہ آج جو مسئلہ پوچھو گے، قرآن کریم کی روشنی میں بیان کروں گا، ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا حالت احرام میں بھڑیں مارنا درست ہے؟ جواب دیا کہ ہاں درست ہے! کسی نے سوال کیا کہ قرآن کریم میں کہاں ہے؟ حضرت امام شافعیؒ نے سورۃ الحشر کی مذکورہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میرا رسول جس کام کے کرنے کا حکم دے وہ کرو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ جبکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے بعد میرے خلفائے راشدینؓ کی اتباع بھی تم پر لازم ہے اور حالت احرام میں بھڑ کو مارنے کا یہ سوال خلیفہ راشد حضرت عمر بن الخطابؓ سے کیا گیا تھا اور انہوں نے فرمایا تھا کہ جائز ہے۔ تو حضرت عمرؓ کا یہ حکم سنت نبویؐ کا حصہ ہے اور ارشاد نبویؐ قرآنی تعلیمات کا حصہ ہے اس لیے یہ مسئلہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس استدلال پر ایک بار پھر غور فرمالیجیے۔ یہ میرا استدلال نہیں ہے بلکہ امام اہل سنت حضرت امام شافعیؒ استدلال کر رہے ہیں اس لیے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن فہمی کے لیے سنت نبوی ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے تعامل کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر قرآن کریم کی کئی آیات کے صحیح مصداق تک پہنچنا مشکل ہے، وہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات وفرمودات اور خلفاء راشدینؓ کے فیصلے بھی قرآنی تعلیمات کا حصہ ہیں اور انہیں قرآن کریم سے الگ کرنا درست نہیں ہے۔

حضرات محترم! میں نے آپ کے سامنے قرآن وسنت کے باہمی تعلق اور قرآن فہمی کے چند بنیادی اصولوں پر کچھ گزارشات پیش کی ہیں، دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنت کا صحیح فہم نصیب فرمائیں اور ان پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہی
مسلمانوں کی زندگی کا محور ہے

> ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی لاہور کی دعوت پر فیز تھری کی مسجد میں ربیع الاول کی بارہویں شب کو "سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نکتۂ اتحاد بین المسلمین" کے عنوان پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا، ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

مجھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو پر کچھ عرض کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم امت مسلمہ کے اتحاد کا مرکزی نکتہ ہیں۔ ان کی ذات اقدس ہمیشہ مسلمانوں کی وحدت کا مرکز رہی ہے۔ آج بھی امت ان کی ذات پر مجتمع ہے اور قیامت تک وہ تمام مسلمانوں کی یکساں عقیدت واطاعت کا مرکز رہیں گے۔ اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے میں وقت کے اختصار کے باعث صرف تین حوالوں سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

۱۔ اتحاد کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟

۲۔ مسلمانوں کو آپس میں متحد رہنے کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں ارشادات گرامی میں تلقین فرمائی ہے۔ ان میں سے چند ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کروں گا اور

۳۔ توہین رسالت کے اخباری خاکوں کی اشاعت کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اجتماعی طور پر جس شدت سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے، اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ایک بار پھر مسلمانوں کی وحدت واجتماعیت کے مرکزی نکتے کے طور پر دنیا کے سامنے آئی ہے۔ اس کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

پہلی بات یہ کہ اتحاد کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی قوم کے درمیان اختلاف پیدا نہ ہونے کو اتحاد کہا جاتا ہے اور اتحاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اول تو اختلاف پیدا نہ ہو اور اگر کسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جائے تو وہ ختم ہو جائے۔ میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ اختلاف ایک فطری امر ہے، جہاں بھی کچھ انسان باہم اکٹھے ہوں گے، ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوگا۔ یہ عقل اور فطرت کا تقاضہ ہے، اسلام اس کی نفی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل اور فہم کے مختلف درجات سے نوازا ہے۔ مزاج الگ الگ ہیں اور نفسیات میں بے پناہ تفاوت ہے۔ اس لیے اختلاف پیدا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیے اس لیے کہ اختلاف اگر پیدا ہوگا تو وہ باقی بھی رہے گا۔ ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اختلاف اور چیز ہے اور تفرقہ اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے اختلاف سے کسی جگہ بھی منع نہیں کیا البتہ تفرقے سے منع کیا ہے۔ اتحاد بین المسلمین پر گفتگو کرتے ہوئے میں اس نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

اس سلسلے میں جناب نبی اکرم ﷺ کے بیسیوں ارشادات میں سے دو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسجد نبویؐ میں ایک صاحب نماز پڑھ رہے تھے اور اس میں قرآن کریم کی بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی جو اس طرح نہیں تھی، جس طرح حضرت عمرؓ نے جناب نبی اکرم ﷺ سے پڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ چونکہ وہ میرے حساب سے قرآن کریم کی آیت غلط پڑھ رہا تھا، اس لیے مجھے سخت غصہ آیا۔ قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے جا دبوچتا، مگر میں نے صبر کیا اور اس کے نماز مکمل کرنے کا انتظار کیا، جونہی اس نے نماز مکمل کی میں نے اس کے گلے میں چادر ڈالی اور کھینچتا ہوا جناب نبی اکرم ﷺ کے پاس لے گیا کہ یا رسول اللہ! یہ شخص نماز میں قرآن کریم غلط پڑھ رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے مجھے فرمایا کہ پہلے اس کی گردن تو چھوڑو۔ میں نے اسے چھوڑ دیا تو نبی اکرم ﷺ نے اسے فرمایا کہ وہ آیت جس طرح تم پڑھ رہے تھے، اب پڑھ کر سناؤ۔ اس نے سنا دی۔ نبی اکرم ﷺ نے پھر مجھے فرمایا کہ اب تم پڑھ کر سناؤ میں نے بھی سنا دی نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس نے بھی ٹھیک

پڑھا ہے اور تم نے بھی درست پڑھا ہے۔ یہ دراصل دو قراءتوں کا اختلاف ہے۔ کسی بھی زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا تلفظ اور لہجہ علاقوں اور قوموں کے فرق سے بدل جاتا ہے، معنی ایک ہی رہتا ہے۔ لفظ بھی بنیادی طور پر وہی ہوتا ہے، لیکن لہجہ بدل جاتا ہے تلفظ بدل جاتا ہے اور بعض اوقات سپیلنگ بھی بدل جاتے ہیں۔

میں مثال کے طور پر پنجابی کے ایک لفظ کا حوالہ دوں گا کہ ہمارے ہاں کسی کام کی کیفیت پوچھنے کے لیے ''کیویں'' کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن اس لفظ کے مختلف تلفظ ہیں کسی جگہ یہ لفظ کیویں ہے کہیں کداں ہے، کہیں کیکن ہے، کہیں کنجو ہے اور کسی علاقے میں اسے کِیاں کے تلفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ لفظ ایک ہے، معنی بھی ایک ہے، لیکن تلفظ اور ادائیگی مختلف ہے۔ یہ زبان پر علاقائی اثرات ہوتے ہیں، جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اسے قریش کے لہجے اور تلفظ میں پڑھنے کی پابندی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے بارگاہ ایزدی میں خود درخواست کی کہ ایک ہی لہجے اور تلفظ کا سب عربوں کو پابند بنانے سے بہت سے عرب قبائل کو قرآن کریم پڑھنے میں دقت پیش آ سکتی ہے، اس لیے اس معاملے میں سہولت پیدا کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میری استدعا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سات مختلف لہجوں اور قراءتوں میں پڑھنے کی اجازت دے دی تاکہ تمام لہجوں اور قراءتوں کے لوگ آسانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر سکیں۔ اب یہ اختلاف ایسا ہے جو نبی اکرم ﷺ نے خود مانگ کر لیا ہے، اس لیے کہ یہ فطری ضرورت تھا۔

دوسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے مستقل وضو کرتے تھے اور ہر نماز الگ وضو کے ساتھ پڑھتے تھے، لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے ایک ہی وضو کے ساتھ پورے دن کی نمازیں پڑھ ڈالیں۔ حضرت عمرؓ نے اس پر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے آج ایسا کام کیا جو اس سے پہلے آپ نہیں کیا کرتے تھے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے'' مطلب یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے الگ وضو کرنا اگرچہ بہت اجر و ثواب کی بات ہے لیکن اس کی پابندی سے بہت سے لوگوں کو دقت ہوگی، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک وضو کے ساتھ

کئی نمازیں ادا کر کے اسے بھی سنت میں شامل فرمالیا تاکہ کسی کو ایسا کرتے ہوئے کوئی الجھن نہ ہو۔ یہ صرف ایک مثال ہے، اس طرح کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک کام کو جناب نبی اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے انجام دیا تاکہ طریقوں میں تنوع ہو اور لوگوں کو اپنی سہولت کے مطابق ان میں سے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے میں یہ پریشانی نہ ہو کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔

اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اسلام نے اختلاف کی نفی نہیں کی، بلکہ اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے، اس کا احترام کیا ہے اور اسے برقرار رکھا ہے۔ البتہ اس کی حدود کا تعین کیا ہے اور ہر اختلاف کو اس کے دائرے اور حدود میں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اختلاف کی حدود میں پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ جہاں اختلاف کی گنجائش ہو، وہاں اختلاف کیا جائے اور جہاں اختلاف کی گنجائش نہ ہو، وہاں اختلاف نہ ہو، وہاں اختلاف سے گریز کیا جائے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے حضرت بریرہؓ کے واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی باندی بریرہؓ کو آزاد کر دیا تو وہ ایک صحابی حضرت مغیثؓ کے نکاح میں تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر بریرہؓ کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ اگر وہ مغیثؓ کے نکاح میں نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے، اس نے ایسا ہی کیا۔ اس پر مغیث کو پریشانی ہوئی اور اس نے مختلف اطراف سے بریرہؓ کو واپسی پر آمادہ کرنے لیے کوششیں شروع کر دیں، حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت مغیثؓ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھومتے رہتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا لائے؟

جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ صورت حال دیکھ کر خود بریرہؓ سے بات کی اور اس سے اس حوالے سے پوچھا بریرہؓ نے جواباً کہا کہ میرا شرعی حق تھا جو میں نے استعمال کر لیا ہے اور میں مغیثؓ کے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ”کیا تم اپنا یہ فیصلہ واپس نہیں لے سکتی؟“

اس نے بڑے ادب سے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے، سمجھدار خاتون تھی اور کیسے نہ ہوتی حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھی۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اس

نے ایک حد فاصل قائم کر دی کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے کسی حکم کو نہ ماننے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ مشورے کی صورت میں اختیار باقی رہتا ہے، چنانچہ اس نے اس کی وضاحت مانگ لی۔ جب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں حکم نہیں دے رہا، بلکہ مشورہ دے رہا ہوں تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں اور مجھے مغیثؓ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر جگہ اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی اور اختلاف وہیں کیا جا سکتا ہے، جہاں اس کی گنجائش ہو۔ مثلاً قرآن کریم کے کسی حکم کو سمجھنے اور اس کا مصداق طے کرنے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن نفس حکم سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ کے کسی ارشاد اور عمل کا مفہوم اور منشا متعین کرنے میں تو اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ارشاد اور عمل سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا اختلاف کی حدود میں پہلی بات یہ ضروری ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ کہاں اختلاف کی گنجائش ہے اور کہاں نہیں ہے۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ضروری ہے کہ ہر اختلاف کو اپنی سطح پر اور اپنے درجے میں رکھا جائے۔ ہمارے ہاں ہر اختلاف پر ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ بازی کا جو رجحان زور پکڑ گیا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ ہر اختلاف کفر و اسلام کا نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ اختلاف حلال و حرام کا ہوتا ہے۔ بعض جگہ صرف ترجیحات اور اولیٰ غیر اولیٰ کا اختلاف ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں فتویٰ بازی ہر اختلاف کے حوالے سے یکساں ہوتی ہے۔ اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اس رجحان پر کنٹرول کرنا وحدت امت کا آج کے دور میں سب سے بڑا تقاضہ ہے۔ اس سلسلے میں جناب نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد گرامی کا حوالہ دوں گا، جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کو کافر کہا اور وہ کافر نہیں ہے تو کفر کا فتویٰ کافر کہنے والے پر واپس لوٹ آئے گا۔ جس کسی نے کسی مسلمان پر لعنت بھیجی ہے اور وہ لعنت کا مستحق نہیں ہے تو یہ لعنت بھیجنے والے پر واپس آ کر چپک جائے گی۔ یہی فتوے ہمارے ہاں سب سے بڑے فتوے شمار ہوتے ہیں، جن کی اہمیت اور نزاکت جناب نبی اکرم ﷺ نے ان ارشادات گرامی میں بیان فرمائی ہے۔

اگر اختلافات کی حدود کو قائم رکھا جائے اور بلا وجہ فتوے بازی سے گریز کر کے ہر اختلاف کو اُس کی سطح پر اور اس کے دائرے میں محدود رکھا جائے تو یہ اختلاف امت کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں، بلکہ فطرت کا تقاضہ اور رحمت ہے، بلکہ ہماری معاشرتی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنے بہت سے ارشادات میں ہمیں باہمی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں جناب رسالتمآب ﷺ نے دورِ جاہلیت کے خاتمے کا اعلان کر کے اسلام اور روشنی کے دور کا آغاز کیا اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ

''جاہلیت کی تمام اقدار آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں''

ان اقدار میں شرک و بدعت، نسل پرستی، زبان و رنگ کا امتیاز، بدکاری، شراب، جوا، سود، کہانت و نجوم، ناچ گانا، عریانی اور باہمی قتل و قتال کی جاہلی اقدار شامل تھیں، جنہیں جناب نبی اکرم ﷺ نے تئیس سالہ محنت کے ساتھ ختم کیا اور ان اقدار سے پاک اسلامی معاشرے کا آغاز فرمایا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تمام اقدار ایک ایک کر کے آج پھر ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی ہیں، صرف اس فرق کے ساتھ کہ ان میں سے کچھ کی روایت کا ابوجہل، ابولہب، نضر بن حارث اور دیگر کافر سرداروں کے حوالہ سے ذکر کیا جاتا ہے تو وہ جاہلی قدر کہلاتی ہے اور وہی قدر جب ہماری سوسائٹی کا حصہ بنتی ہے تو تمدن، سویلائزیشن، ترقی یا آرٹ کا عنوان اختیار کر لیتی ہے۔

اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنے خطبے میں ہمیں اس بات کی تلقین بھی فرمائی تھی کہ ''میرے بعد کفر و جاہلیت کے دور کی طرف واپس نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو''۔ باہمی قتل و قتال اور مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا کسی بھی عنوان سے ہو، اسے جناب نبی اکرم ﷺ نے کفر و جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اور ایک حدیث میں اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ایک صورت قرار دیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے چار باتوں کا سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے تین عطاء فرما دیں ایک چیز نہیں دی۔ میں نے سوال کیا کہ

میری امت پر مجموعی طور پر پہلی امتوں جیسا عذاب نازل نہ ہو۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت یکبارگی گمراہی کا شکار نہ ہو، یہ بات بھی قبول کر لی گئی۔ میں نے گزارش کی کہ میری امت ساری کی ساری یکبارگی تباہ نہ ہو، یہ بات بھی قبول ہو گئی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت آپس میں نہ لڑے تو یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت پر جب اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا تو اس کی عملی صورتیں تین ہوں گی۔

۱۔ میری امت کے لوگ آپس میں لڑیں گے اور ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔
۲۔ اللہ تعالیٰ امت کے شریر لوگوں کو امت پر مسلط کر دیں گے اور
۳۔ امت کے نیک لوگوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں۔ اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ آنکھ کو تکلیف ہو تو سارا جسم اسے محسوس کرتا ہے اور پاؤں کو تکلیف ہو تو جسم کے سارے اعضاء اسے محسوس کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس لیے کوئی مسلمان نہ اپنے دوسرے بھائی پر خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے ظلم کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کرتا ہے۔ ان ارشادات نبویؐ کی روشنی میں دیکھا جائے تو امت کے موجودہ افتراق کے اسباب کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ آج کے دور کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم امت کے افتراق کے اصل اسباب کو تلاش کریں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ہمیں اسی کی تلقین فرمائی ہے اور اس حوالے سے ہماری دینی و ملی ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد گفتگو کے آخری نکتے کی طرف آتا ہوں کہ ہماری تمام تر خرابیوں، کمزوریوں اور بداعمالیوں کے باوجود توہین رسالت کے خلاف عالم اسلام کے حالیہ اجتماعی احتجاج سے ایک بار پھر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان وحدت و اتحاد کا مرکزی نکتہ آج بھی جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ دنیا نے پھر یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ مسلمان دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتا ہو، اس کا مرکز عقیدت آج

بھی جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

یہ بات جہاں نبی اکرم ﷺ کا اعجاز اور اسلام کی صداقت کا اظہار ہے، وہاں اس بات کی بھی علامت ہے کہ مسلمانوں کے ایمان کا کنکشن آج بھی قائم ہے۔ یہ ڈیڈ کنکشن نہیں ہے اور کنکشن میں کوئی کمزوری نہیں ہے، کمزوریاں ساری کی ساری ہمارے سیٹوں میں ہیں، اگر ہم اپنے اپنے سیٹ ٹھیک کر لیں اور ان کی خرابیاں دور کر لیں تو جناب نبی اکرم ﷺ کی عقیدت کا کنکشن آج بھی ''اسٹینڈ'' کرتا ہے اور اس کی برکتیں اور بہاریں بدستور تازہ ہیں۔

یورپ کے بعض اخبارات نے تو یقیناً یہ کارروائی شر کے خیال سے کی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں سے خیر کا یہ پہلو نکال دیا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مسلمانانِ عالم کی بے لچک کمٹمنٹ کا ایک بار پھر اظہار ہو گیا ہے اور مغرب کو اس تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ اس نے گذشتہ دو تین صدیوں کے درمیان مسلمانوں کی کمٹمنٹ کے مراکز تبدیل کرنے کی جو محنت کی تھی، وہ رائیگاں جا رہی ہے، کیونکہ مسلمانوں کی کمٹمنٹس کی ترجیحات میں آج بھی سرفہرست اسلام اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے، باقی تمام کمٹمنٹس کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی، سیرت مبارکہ اور تعلیمات کا وہ اعجاز ہے، جس کا مشاہدہ ہم جیسے گئے گزرے مسلمان بھی کر رہے ہیں اور ساری دنیا اس منظر کو دیکھ رہی ہے، اس لیے ہمارے آقا ﷺ کا آج کے دور میں ہمارے لیے یہی پیغام ہے کہ اپنی اصل کی طرف واپس لوٹیں اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت و اسوۂ حسنہ سے روشنی حاصل کر کے اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگیوں کا جزو بنا لیں۔

کیا فہم قرآن کی کلاسیں ایک نیا فتنہ ہے؟

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و علی الہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ اجمعین

امابعد! قابل صد احترام، بہنوں اور بیٹیو

فہم قرآن کے حوالے سے عالمی فہم قرآن ٹرسٹ دارالعلوم لاہور، مولانا احمد یار لاہوری اوران کے رفقاء کی ٹیم کو سب سے پہلے اس پیشرفت پر مبارکباد پیش کرنا چاہوں گا۔ ابھی ہمارے عزیز ساتھی اور مولانا کے رفیق کار ذکر کر رہے تھے کہ فہم قرآن کے اس سفر کا آغاز سکول کی ایک چٹائی پر تین یا چار آدمیوں سے ہوا تھا۔

لاہور میں درس قرآن کا آغاز

یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ صرف لاہور میں نہیں بلکہ پورے پنجاب میں قرآن کے عوامی درس کا آغاز لاہور سے ہوا تھا آغاز کرنے والے بزرگ کا نام مولانا احمد علی لاہوری ہے وہ یہاں لاہور میں اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں آئے تھے بلکہ ان کو شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک میں گرفتار کیا گیا تھا نیک چال چلن کی ضمانت طلب کر کے ایک سال لاہور میں نظر بند کر دیا گیا چال چلن کی ضمانت ملک لال خان مرحوم نے دی کہ میں ضمانت دیتا ہوں کہ یہ بڑے شریف اور سادہ مولوی صاحب ہیں اور حکومت کیلیے کوئی مشکلات پیدا نہیں کریں گے۔ آپ اس طرح نظر بند کر کے لائے گئے کہ لاہور کی حدود سے ایک سال تک باہر نہیں نکل سکتے مولانا نے نظر بندی کے دوران خود کو مصروف کرنے کیلیے لائن سبحان خاں کی مسجد کے چبوترے سے درس قرآن مجید کا آغاز کیا۔

انہوں نے لوگوں سے کہا کہ مجھ سے قرآن پاک کا ترجمہ اور اس کا درس سن لیا کرو۔ اس

طرح لاہور میں فہم قرآن کا آغاز ہوا لیکن آج آپ ان کا اور ہمارے دیگر اکابر کا فیضان دیکھ رہے ہیں اللہ پاک مزید ترقی اور پیشرفت نصیب فرمائے۔

فہم قرآن کے حوالے سے چند اصولی باتیں

کوئی دس پندرہ سال پہلے ایک مجلس میں کسی دوست نے مجھ سے بڑی پریشانی کے ساتھ سوال کیا کہ مولانا! ہم بہت پریشان ہیں ہماری مسجد میں کوئی مولوی صاحب آتے ہیں وہ قرآن کی آیات پڑھ کر کوئی مسئلہ بتاتے ہیں۔ دو چار دن بعد دوسرے مولوی صاحب قرآن کی آیات پڑھتے ہیں لیکن مسئلہ اس کے خلاف بتاتے ہیں جو پہلے مولوی صاحب نے بتایا تھا ہم بہت پریشان ہیں کہ دونوں نے قرآن پڑھا ہے۔ لیکن مسئلہ ایک دوسرے سے مختلف بتا رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل کام ہے کہ کون سا مسئلہ درست اور صحیح ہے۔

دس پندرہ سال پہلے کیا ہوا سوال آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ میں نے کہا میرے بھائی آپ کا کوئی بچہ ہے کہنے لگا ہاں میرا ایک بیٹا ہے جو چھٹی جماعت میں پڑھتا ہے میں نے کہا میں آپ کے گھر آیا ہوں اور آپ نے میرے احترام اور اکرام میں اپنے دوست بھی بلوائے ہوئے ہیں میں آپ کے بیٹے سے اچھی اچھی باتیں کرتا ہوں اور پھر اس سے کہتا ہوں کیٹ کے معنی ہے چوہا۔ میرا لب ولہجہ بڑا سلجھا ہوا اور فلسفیانہ ہے میری گفتگو اشعار سے مزین ہے کیا کوئی بچہ میرے حلیے اور داڑھی سے متاثر ہو کر مان لے گا کہ کیٹ کا معنی چوہا ہے کیا کوئی آدمی میرے لب ولہجے، فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز بیان سے متاثر ہو کر کیٹ کو چوہا کے معنی میں تسلیم کر لے گا۔ اس بات کا جواب یقیناً نفی میں ہے وہ کبھی بھی کیٹ کا معنی چوہا نہیں مانے گا۔

ہم بھی مولوی ہیں دنیا میں رہتے ہیں اور دنیا ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ ہم کبھی ایک آیت پڑھتے ہیں اور مسئلہ بیان کر دیتے ہیں۔ دوسرے وقت دوسری آیت پڑھتے ہیں اور دوسرا مسئلہ بیان کرتے ہیں میں نے کہا میں اپنی کمی کوتاہی اور قصور کا اعتراف کرتا ہوں لیکن میرا اس دوست سے بھی یہی سوال تھا اور آپ سے بھی یہی سوال ہے

کہ اس میں پہلا قصور کس کا ہے؟ اگر مجھے معلوم ہو کہ یہاں بیٹھنے والے 80 فیصد لوگ قرآن کا مطلب اور مفہوم جانتے ہیں تو کیا میں غلط مطلب بیان کرنے کی جرأت کروں گا؟

آپ لوگ اگر یہ جانتے ہیں کہ اس آیت کا معنی اور مفہوم کیا ہے تو کیا میں اس کے مطلب کو غلط انداز میں پیش کر سکوں گا۔ فرقہ واریت میں اصل مجرم کون ہے اور اس کا حل کیا ہے اس کا صرف ایک حل ہے اور وہ ہے فہم قرآن۔

فہم قرآن اک نیا فتنہ؟

میں واشنگٹن آتا جاتا رہتا ہوں۔ دو سال پہلے کی بات ہے وہاں ایک عالم دوست کہنے لگے مولانا یہاں ایک بہت بڑا فتنہ کھڑا ہو رہا ہے۔ قرآن پاک کے ترجمہ کی کلاسیں بہت بڑھ رہی ہیں آپ اس کا کوئی حل تلاش کریں۔ میں نے کہا بندہ خدا کچھ سوچ کر کہو کیا یہ فتنہ ہے یہ تو آج کی ضرورت ہے۔ امت کو اس کی بہت ضرورت ہے کہنے لگے یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے میں نے کہا مولوی صاحب قصور ہم پڑھانے والوں کا ہے اصل ہمارے ذہنوں میں قرآن فہمی کا درجہ متعین نہیں ہے۔ ہم دو انتہاؤں میں کام کر رہے ہیں ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ قرآن فہمی کی کسی بھی کوشش کو فتنہ قرار دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف کچھ لوگ نہ صرف قرآن کو سمجھنے کے دعویدار ہیں بلکہ اس بات پر بھی مصر ہیں کہ اس آیت کے صرف وہی معنی درست ہیں جو میں نے سمجھے ہیں۔ میں مفتی بھی ہوں، میں امام بھی ہوں اور اتھارٹی بھی میں ہی ہوں۔

فہم قرآن کے درجات

میں آج کی محفل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ فہم قرآن کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن پاک پڑھتے ہوئے نفس مفہوم سمجھ میں آ جائے اس آیت کے یہ معنی ہیں اس میں حج کا ذکر ہے اور اس میں نماز روزہ اور زکوٰۃ کا بیان ہے اس آیت میں مجھے فلاں کام سے روکا گیا ہے اور اس آیت میں مجھے فلاں کام کا حکم دیا گیا ہے خلاصہ یہ کہ قرآن کو پڑھتے ہوئے ہر آیت کا مفہوم سمجھنا یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ آپ میری بات کو مبالغہ پر محمول نہ کریں میں یہ بات بالکل شرح صدر کے ساتھ کہہ رہا ہوں قرآن کے مفہوم کو سمجھنا ہر مسلمان

مرد اور ہر مسلمان عورت کی ذمہ داری ہے۔ دلیل کے لیے ایک حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ نماز کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء ۴: ۴۳) "اے ایمان والو نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ" آگے ارشاد ہے حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ میں نے کہا تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ دو لفظ ہیں۔ علم کا تعلق معنی اور دل سے ہے اور قول کا تعلق زبان سے ہے۔ یعنی مطلب یہ کہ جو تم کہو اس کو سمجھو بھی۔ خیر میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا میں یہ عرض کر رہا تھا کہ فہم قرآن کے دو درجے ہیں آپ یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھیں یہیں سے ہم مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں ادھر چلے جاتے ہیں یا ادھر چلے جاتے ہیں۔

ایک ہے نفس مفہوم کو سمجھنا اور یہ ہر مسلمان مرد و عورت کی ذمہ داری ہے بالکل ایسے ہی جیسے ملک کے قانون سے واقفیت ہر شخص کی ذمہ داری ہے ایک شخص نے قانون کی خلاف ورزی کی اس کے خلاف عدالت میں کیس درج ہو گیا عدالت میں پیش ہونے پر وہ یہ عذر پیش کر دے کہ مجھے قانون کا علم نہیں تھا تو دنیا کی کوئی عدالت اس کا یہ عذر مانے گی؟ کسی ملک کی کوئی عدالت قانون کی اس خلاف ورزی کو یہ کہہ کر معاف کر دے گی کہ اس شخص کو قانون کا علم نہیں تھا اس کا یہ عذر کہیں بھی قبول نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ ملک کے شہری کی حیثیت سے تمہاری ذمہ داری ہے کہ قانون سے واقفیت حاصل کرو۔

دوسری طرف وہ آدمی ہے کہ جس کے پاس معلومات کا انبار ہے اور وہ بہت وسیع المطالعہ ہے وہ عدالت میں کھڑے ہو کر کہے میں بہت صاحب علم ہوں لہٰذا قانون کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کیا کوئی عدالت اس کی بات مان لے گی؟ بالکل نہیں۔

قانون سے واقف ہونا ہر شہری کی ذمہ داری ہے لیکن قانون کی تشریح کرنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ اس کیلیے ڈگری چاہیے ڈگری کے بعد پریکٹس چاہیے اس کے بعد دس پندرہ سال کا تجربہ ہو ان مراحل سے گزرے بغیر کوئی آدمی یہ کہے کہ میں قانون کا بڑا مطالعہ رکھتا ہوں اس لیے ہائی کورٹ میں کھڑے ہو کر سپریم کورٹ میں کھڑے ہو کر قانون کی تشریح کرنا چاہتا ہوں دنیا کی کوئی عدالت اس کو یہ حق نہیں دے گی اس کا دائرہ الگ ہے۔

اسی طرح قرآن پاک کا نفس مفہوم سمجھنا ہر شخص کی ذمہ داری ہے لیکن قرآن پاک کی

تعبیر کرنا، قرآن پاک کی تشریح کرنا اس کی وضاحت کرنا اس سے استدلال کرنا اس سے استنباط کرنا اس کا الگ پراسیس ہے اس کی الگ شرائط ہیں اس کی الگ حدود ہیں۔ اس پراسیس کے بغیر کسی کو قرآن پاک کی کسی آیت کی تعبیر اور تشریح کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کو نقل ہی کرنا ہوگا اگر کوئی اس مقام پر ہے تو بات کرے اگر نہیں تو بات نہ کرے۔ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ فہم قرآن کے حوالے سے ہم افراط وتفریط کا شکار ہیں اس کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

یہ بھی افراط وتفریط کی بات ہے کہ ہم کہیں کسی کو قرآن پاک کا ترجمہ نہیں پڑھنا چاہیے اور یہ بھی افراط وتفریط کی بات ہے کہ جو آدمی قرآن کے چار پارے پڑھ لے وہ یہ کہے کہ میں اتھارٹی ہوں بلکہ حق ان دونوں کے درمیان ہے۔

فہم قرآن میں عورت کا کردار

چونکہ اس کورس میں میری بہنیں، بیٹیاں بھی شریک ہیں اس پر ایک بات کہنا چاہوں گا اور وہ آخری بات ہوگی کہ فہم قرآن میں عورت کا حصہ کیا ہے؟ فہم قرآن کے ساتھ عورت کا کیا تعلق ہے اور ایک مرد و عورت کے فہم قرآن میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

قرون اولیٰ میں جنہیں ہم خیر القرون کہتے ہیں یعنی ہمارے آئیڈیل دور ہمارے آئیڈیل زمانے کون سے ہیں یعنی صحابہ کا زمانہ، تابعین کا زمانہ، اتباعِ تابعین کا زمانہ، ان کو ہم اپنی اصطلاح میں خیر القرون کہتے ہیں اور میں ان کا ترجمہ کرتا ہوں آئیڈیل دور۔ یہ قیامت تک کے لیے ہمارے آئیڈیل دور ہیں۔ ان زمانوں میں عورت کا فہم قرآن کتنا بلند تھا اس پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر ابن کثیر میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانہ کی بات ہے کہ خلیفہ راشد تھے۔ امیر المومنین تھے سربراہ مملکت تھے اور ان سب سے ہٹ کر حضرت عمرؓ تھے، حضرت عمرؓ خود ایک ٹائٹل ہے۔ امیر المومنین ہونا الگ ٹائٹل ہے۔ اور بذات خود حضرت عمرؓ نے جمعہ کے روز مسجد میں خطبہ میں اعلان کر دیا۔ آرڈیننس جاری کر دیا کہ لوگ شادی میں مہر کی رقم مقرر کرتے وقت جوش وخروش میں مہر کی رقم زیادہ مقرر کر لیتے ہیں لیکن بعد میں جب ادائیگی کی باری آتی ہے تو ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ ہم سے آ کر پوچھتے ہیں مولوی

صاحب دس لاکھ مہر مقرر کیا تھا سارا ہی دینا ہے ہم کہتے ہیں جی ہاں سارا ہی دینا ہے کیونکہ عورت کا حق ہے۔ خیر پھر جھگڑے ہوتے ہیں اور بڑے مسئلے کھڑے ہوتے ہیں اور اگر میں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کروں تو شاید آپ بھی میری تائید کریں گے، عورت آج بھی ہمارے معاشرے میں مظلوم ہے 80 فیصد عورتوں کو مہر نہیں ملتا اور 95 فیصد عورتوں کو وراثت نہیں ملتی۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

حضرت عمرؓ نے کہا مہر میں لوگ بڑی بڑی رقمیں مقرر کر لیتے ہیں اور پھر جھگڑا ہوتا ہے میں یہ قصہ ہی ختم کرتا ہوں۔ میں یہ پابندی لگا رہا ہوں کہ چار سو درہم سے زیادہ کسی نکاح میں مہر مقرر نہ کیا جائے یہ حکم جاری کر دیا آپ موٹا حساب سمجھ لیں کہ چار سو درہم موجودہ کرنسی میں تقریباً 10 ہزار روپے بنتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حکم جاری کر دیا کہ دس ہزار روپے سے زیادہ کسی شادی میں مہر مقرر نہ کیا جائے۔ حکم کس نے جاری کیا؟ امیر المومنین خلیفہ راشد حضرت عمرؓ نے، خطبہ سے فارغ ہو کر باہر نکلے۔ ایک قریشی عورت (جس کا نام نہیں لکھا) نے راستے میں روک کر کہا امیر المومنین آپ نے مہر کی رقم پر پابندی لگا دی ہے فرمایا جی ہاں آپ کو کس نے اختیار دیا ہے آپ نے قرآن نہیں پڑھا کون کہہ رہی ہے، کس کو کہہ رہی ہے۔ آپ تصور کیجیے راہ جاتے ایک عورت کہہ رہی ہے اور کس کو کہہ رہی ہے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو آپ نے قرآن نہیں پڑھا حضرت عمرؓ کے بارے میں امام بخاری کہتے "کان وقافا عند کتاب اللہ" قرآن پاک کا حوالہ آنے پر رک جایا کرتے تھے۔ قرآن پاک کا حوالہ آنے پر حضرت عمرؓ کے پاؤں بریک پر خود بخود پہنچ جایا کرتے تھے۔ جب تک اگلی بات نہیں آتی اس وقت تک قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھی سمجھ دار ڈرائیور کے پاؤں سرخ بتی دیکھ کر خود بخود بریک پر چلے جاتے ہیں۔ بریک لگ جاتی ہے سٹاپ ہو جاتے ہیں اس پر امام بخاری نے واقعات نقل کئے ہیں ان کو چھوڑ رہا ہوں کھڑے ہو گئے اور پوچھا قرآن میں یہ مسئلہ کہاں ہے عورت نے کہا میں بتاتی ہوں اور یہ آیت پڑھی "وان اتیتم احدھن قنطارا فلا تاخذ وامنہ شیئا" اگر تم اپنی بیویوں کو ڈھیر ساری دولت بھی دے دو تو واپس نہ مانگنا شروع کر دو۔ جو دے دی ہے وہ دے دی ہے ان کی ملکیت ہو گئی ہے۔ مہر ہے یا ہبہ جو بھی کہو واپس نہ مانگنا شروع کر دو۔ قرآن پاک

نے اس پس منظر میں بات کی لیکن اصطلاح یہ استعمال کی اگر تم عورتوں کو ڈھیر ساری دولت بھی دے دو تو واپس مت مانگو۔ اپنی مرضی سے دے دیں تو دے دیں خاتون کہنے لگی امیر المومنین قرآن تو ہمیں خاوندوں سے جب دلواتا ہے تو ڈھیروں کے پیمانے میں دلواتا ہے اور آپ کہتے ہیں چار سو درہم سے زیادہ مت دو۔ دلیل سمجھ نہیں آئی؟

حضرت عمرؓ وہیں کھڑے ہو گئے واپس مسجد میں جا کے اعلان فرمایا کہ لوگو میں نے اعلان کر کے مہر کی رقم پر پابندی لگائی تھی ایک عورت نے مجھے قرآن کا حوالہ دے کر روک لیا ہے۔ بخدا قرآن کی اس آیت کی طرف میرا دھیان نہ تھا اس عورت نے توجہ دلائی ہے تو دھیان ہوا وہ عورت ٹھیک کہتی ہے میرا فیصلہ غلط تھا اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ جب اپنا فیصلہ واپس لے رہے تھے تو انہوں نے ہنستے ہنستے دل لگی میں ایک بات کہی تھی کہ اب تو مدینہ کی عورتیں عمرؓ سے بھی زیادہ قرآن جاننے لگی ہیں۔ اچھے زمانوں میں عورت کے فہم قرآن کا معیار یہ تھا۔

ایک واقعہ بیان کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں امام تاج الدین سبکیؒ نے ''الطبقات الشافعیہ الکبریٰ'' میں امام شافعی کی والدہ محترمہ کا قصہ بیان کیا ہے۔ امام شافعیؒ ہمارے امام ہیں اہلسنت کے چار بڑے اماموں میں سے ہیں ان کی والدہ محترمہ کا قصہ ہے کہ عدالت میں کسی مقدمے کے گواہ کے طور پر پیش ہو گئیں۔

معاملات کا کوئی مقدمہ تھا مقدمے میں گواہوں میں ایک مرد تھا دو عورتیں تھیں ان میں سے ایک امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ تھیں عدالت نے مقدمہ سنا قاضی صاحب نے گواہیاں سنیں۔ جج تھے ان کا خیال تھا کہ عورتیں اکٹھی بیٹھی گواہی دے رہی ہیں تو میں الگ الگ بھی ان سے گواہی سن لوں اگر کوئی فرق ہوا تو پتہ چل جائے گا اس سے الگ اور دوسری سے الگ ان سے کہا بی بی آپ ذرا الگ بیٹھیں میں ان سے الگ پوچھوں گا پھر آپ کو بلا کر آپ سے پوچھوں گا۔ میں ذرا گواہی کے بارے میں تسلی کرنا چاہتا ہوں۔ امام شافعیؒ کی والدہ نے کہا جج صاحب قرآن آپ کو یہ حق نہیں دیتا۔ بھئی قرآن میں یہ گواہی کے آداب کہاں ہیں امام شافعیؒ کی والدہ نے کہا قرآن میں الفاظ ہیں: ''اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى'' قرآن کریم نے جہاں دو عورتوں کی گواہی کا مسئلہ بیان کیا وہاں اس کی فلاسفی بھی بیان کر دی ہے اس

کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ دو عورتیں کیوں؟ ایک نفسیاتی فرق ہے۔ میری بہنیں، بیٹیاں، اگر محسوس نہ کریں تو ایک بات کہوں۔ عورت مرد کی نسبت جلدی یاد کرتی ہے اور جلدی بھولتی ہے اللہ نے فرق رکھا ہے ہم اس فرق کو مٹا نہیں سکتے اللہ اس فرق پر راضی ہیں تو قرآن نے فلسفہ بیان کر دیا کہ عورتیں اکٹھی گواہی دیں گی تا کہ اگر کوئی بات ایک کو بھول جاتی ہے تو دوسری یاد کرا دے۔ ''اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى'' ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے بہن یہ بات بھی تھی۔ قرآن پاک نے فلسفہ بھی بیان کر دیا کہ دونوں ایک دوسری کو یاد کرا دیں تا کہ گواہی مکمل ہو جائے کیونکہ جلدی بھول جاتی ہے قاضی صاحب ہم اکٹھی گواہی دیں گی ایک دوسری سے پوچھیں گی بھی ایک دوسری کو یاد بھی کرائیں گی ایک دوسری کو لقمہ بھی دیں گی آپ ہم سے الگ الگ گواہی نہیں لے سکتے۔ قاضی صاحب کو ہتھیار ڈالنے پڑے بی بی ٹھیک کہتی ہو۔ قرآن پاک کی منشاء تم سمجھتی ہو میرے ذہن میں نہیں تھا۔ تو میں نے عرض کیا اچھے زمانوں میں عورت کے فہم قرآن کا یہ معیار تھا۔ خدا کرے وہ دور واپس آ جائے۔ (آمین)

مشکلات و مصائب

میں

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مدیر ''الشریعہ'' مولانا زاہد الراشدی نے ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء تک متحدہ عرب امارات کا تبلیغی دورہ کیا اور مختلف اجتماعات سے خطاب کرنے کے علاوہ سرکردہ شخصیات سے ملاقاتیں کیں اور متعدد علمی و دینی مراکز میں گئے۔ انہوں نے یہ دورہ جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان کے سابق راہ نما جناب محمد فاروق شیخ اور جمعیۃ اہل السنۃ والجماعۃ متحدہ عرب امارات کے سیکرٹری اطلاعات حافظ بشیر احمد چیمہ کی دعوت پر کیا اور دبی، شارجہ، عجمان، ام القوین، راس الخیمۃ اور الفجیرۃ کی ریاستوں میں احباب سے ملاقاتیں کیں۔ اتفاق سے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن صاحب بھی ان دنوں متحدہ عرب امارات کے دورے پر تھے چنانچہ دونوں راہ نماؤں نے دبی کی مسجد الغریر، مسجد الرفاعہ اور بلال بن رباح میں عام اجتماعات سے خطاب کیا اور حافظ بشیر احمد چیمہ کی طرف سے دیے گئے عصرانہ میں شرکت کی۔ مسجد بلال بن رباح میں عام اجتماع سے مولانا زاہد الراشدی کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ:

آج کے اس اجتماع سے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمن تفصیلی خطاب کریں گے۔ ان سے قبل مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کو کہا گیا ہے، اس لیے بطور تمہید چند باتیں آپ سے عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے ہمارے فاضل دوست مولانا مفتی

عبدالرحمٰن نے اپنے خطاب میں افغانستان کی طالبان حکومت کا ذکر کیا ہے اور اسے درپیش مشکلات کا حوالہ دیا ہے۔ بلاشبہ ''طالبان'' آج کے دور کا مظلوم ترین طبقہ ہے جس کے خلاف کفر ونفاق کی پوری دنیا متحد ہوگئی ہے اور انہیں عالمی استعمار کے سامنے جھکانے یا مٹا دینے کے لیے منصوبے بن چکے ہیں۔

طالبان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا صرف نام نہیں لیتے بلکہ اپنے ملک میں اسلامی احکام وقوانین کو عملی طور پر نافذ بھی کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کے بین الاقوامی دباؤ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا اصل جرم یہی ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف پابندیوں اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے، اس سے قبل بھی اہل حق اس قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے آرہے ہیں۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرم ﷺ کو بھی مکہ مکرمہ کے کفار کی طرف سے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا جب قریش کے باقی خاندانوں نے بنو ہاشم سے مطالبہ کیا تھا کہ محمد ﷺ کو قتل کے لیے ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن بنو ہاشم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں قریش کے تمام قبائل نے مل کر بنو ہاشم کا سوشل بائیکاٹ کر دیا اور جناب نبی اکرم ﷺ اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔

کفار کی طرف سے ان کے خلاف یہ پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ ان کے ساتھ لین دین نہیں ہوگا، ان سے رشتہ داری قائم نہیں کی جائے گی، ان کے پاس خوراک وغیرہ کی کوئی چیز نہیں جانے دی جائے گی اور ان کی معاشی ناکہ بندی ہوگی۔ اس دوران نبی اکرم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اس ارشاد سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہم درختوں کے پتے کھا کر گزارا کیا کرتے تھے اور راستے میں پڑا ہوا خشک چمڑا اٹھا لیتے تھے اور اسے گرم پانی سے نرم کر کے چبا کر نگل لیا کرتے تھے۔

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وادی میں بھوکے بچے جب روتے چلاتے تو ارد گرد گھومنے والے مشرکین یہ آوازیں سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس کیفیت کے ساتھ نبی

اکرم ﷺ اور ان کے خاندان کو محصور رہنا پڑا لیکن مشرکین کی عائد کردہ یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہ روک سکیں اور بہت سارے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور مشرکین کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی پابندیاں اور ناکہ بندی تین سال گزرنے کے باوجود کارگر نہیں ہو رہی تو کچھ سمجھ دار مشرکین نے آگے بڑھ کر وہ معاہدہ ختم کرا دیا۔ اس لیے آج بھی یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہیں روک سکیں گی اور اگر طالبان حکومت اپنے مشن اور پروگرام پر استقامت کے ساتھ گامزن رہی تو پابندیاں لگانے والوں کو بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا فیصلہ کس قدر غلط تھا۔

میں اس موقع پر اس صورت حال کے حوالہ سے آپ حضرات کی خدمت میں ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشکلات ومصائب کے بارے میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اس پر سیرت نبوی سے دو واقعات پیش کروں گا تا کہ یہ بات ہمارے سامنے رہے کہ مشکلات ومصائب کے دور میں سنت نبوی کیا ہے۔

ایک واقعہ تو اس وقت کا ہے جب نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت ظاہری کیفیت یہ تھی کہ خود اپنی جان کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا، رات کی تاریکی میں چھپ کر مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، سفر کے لیے عام راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ خفیہ راستے سے سفر کر رہے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے ہمراہ تین دن تک غار ثور میں روپوش رہے اور راستہ میں چلتے ہوئے کسی کو اپنے نام بتانے میں بھی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ تو ظاہری کیفیت تھی کہ بظاہر جان کا بچانا مشکل ہو رہا تھا لیکن اسی دوران سراقہ بن مالکؓ جناب نبی اکرم ﷺ کو راستہ میں ملے اور پکڑنے میں ناکام ہو کر امان چاہی تو نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ”سراقہ، میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں“

یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت کا بھی اظہار تھا جس میں ہمارے لیے دو سبق ہیں۔ ایک یہ کہ خدائی فیصلے ظاہری حالات پر نہیں ہوتے۔ ظاہری حالات جس قدر بھی ناموافق ہوں، اگر مسلمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہے اور اس کا ایمان ویقین پختہ ہے تو ظاہری حالات کی ناسازگاری اس کا کچھ بھی نہیں

بگاڑ سکتی۔ اور دوسرا سبق یہ ہے کہ مسلمان کو ظاہری حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اب دیکھیے کہ جناب نبی اکرم ﷺ ظاہری طور پر کس حال میں ہیں کہ چھپ کر اور جان بچا کر مدینہ منورہ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نظر کہاں ہے؟ کسریٰ کے کنگنوں پر جو اس وقت کی ایک بڑی سلطنت کا حکمران تھا اور سراقہ بن مالکؓ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اسے کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے اور پھر یہ صرف ایک وقتی بات نہیں تھی بلکہ پیش گوئی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں فارس فتح ہوا، کسریٰ کے شاہی خزانے غنیمت کے مال میں مدینہ منورہ آئے، ان میں وہ کنگن بھی تھے جو کسریٰ بادشاہ دربار میں پہنا کرتا تھا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے سراقہ بن مالکؓ کو بلایا اور یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے کسریٰ کے کنگن انہیں پہنائے کہ اگرچہ سونے کے کنگن پہننا مرد کے لیے جائز نہیں ہے لیکن حضور اکرم ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پورے ہو جائیں اور دنیا کو پتہ چل جائے کہ جناب نبی کرم ﷺ نے ہمیں سبق دیا کہ مشکلات و مصائب اور حالات کی ناسازگاری سے گھبرا کر مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور اپنے ہدف اور ٹارگٹ میں کوئی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔

دوسرا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بدر و اُحد کی جنگ میں ناکام و نامراد ہو کر قریش مکہ نے یہ بات سمجھ لی کہ وہ اکیلے جناب نبی اکرم ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے عرب قبائل سے گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کا متحدہ محاذ بنوایا اور ایک بہت بڑا لشکر لے کر مدینہ منورہ کی طرف یلغار کر دی۔ یہ غزوۂ احزاب کی بات ہے جسے غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف عرب قبائل کا بہت بڑا متحدہ محاذ تھا اور دوسری طرف جناب نبی اکرم ﷺ اور ان کے ساتھی تھے جن کی تعداد چھوٹے بڑے سب ملا کر ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کھودنے کا پروگرام بنایا اور خود صحابہ کرام کے ساتھ مل کر دن رات خندق کھودنے میں مصروف رہے۔ قرآن کریم نے سورۃ الاحزاب میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اہل ایمان کو یاد دلایا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب تم پر چاروں طرف سے لشکر چڑھ دوڑے تھے، جب تمہاری آنکھیں خوف کے مارے پتھرا گئی تھیں، جب خوف کی

شدت سے تمہارے دل سینوں سے اچھل کر حلق میں پھنس گئے تھے، جب تم اللہ تعالیٰ کی مدد کے بارے میں گمانوں کا شکار ہونے لگے تھے، جب مومنوں کو آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا اور جب ان پر شدید زلزلے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ یہ اس وقت کی ظاہری کیفیت تھی جس کا نقشہ قرآن کریم ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ بہت سے خندق کھودنے والوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا اور بعض لوگوں نے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے حتیٰ کہ ایک صاحب نے جناب نبی اکرم ﷺ کو اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ اس نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے تو نبی اکرم ﷺ نے اپنے پیٹ مبارک سے کپڑا اٹھا کر دکھایا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اس صورت حال میں جب ظاہری طور پر سخت مایوسی اور شدید خوف کی کیفیت مدینہ منورہ کی آبادی کا احاطہ کیے ہوئے تھی، جناب نبی اکرم ﷺ سے خندق میں ایک چٹان کے سخت ضربوں کے باوجود نہ ٹوٹنے کی شکایت کی گئی، چنانچہ نبی اکرم ﷺ خود تشریف لے گئے اور کدال کی ایک ہی ضرب سے چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ جب آپ نے کدال سے چٹان پر ضرب لگائی تو وہاں سے چمک اٹھی اور جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "مجھے اس چمک میں قیصر و کسریٰ کے محلات دکھائی دیے ہیں"۔

ظاہری کیفیت دیکھیے کہ خوف اور مایوسی کا کیا عالم ہے؟ اور اس حالت میں نظر کی بلندی ملاحظہ کیجیے کہ اس وقت کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے شاہی محلات دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری تھی اور یہ سبق تھا کہ ظاہری حالات سے مایوس نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھو، اس پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مشن پر گامزن رہو اور اپنے ٹارگٹ اور ہدف میں کوئی کمزوری نہ آنے دو۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر ساز و سامان اور لشکر کی کثرت کے باوجود قبائل عرب کی یہ یلغار ناکام ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم ﷺ کو نہ صرف فتح عطا فرمائی بلکہ اس پیش گوئی کے مطابق قیصر و کسریٰ کے شاہی محلات بھی اپنے اپنے وقت میں مسلمانو ں کو عطا فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے کہ آزمائش اور ابتلاء کے اس سخت ترین دور کے بعد غزوۂ احزاب

میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد اس طرح کی کہ ہوا کو تیز کر دیا اور غیبی لشکر آسمان سے اتارے جنہوں نے محاصرہ کرنے والے کافروں کے لشکر کو تتر بتر کر دیا اور وہ کوئی مقصد حاصل کیے بغیر ناکام واپس لوٹ گئے۔

اس لیے ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ طالبان کی اسلامی حکومت اگر اسلام کے مکمل اور عملی نفاذ کے مشن پر قائم رہتی ہے اور ظاہری حالات کی ناسازگاری سے خوفزدہ نہیں ہوتی تو اس کے لیے بھی غیب کی قدرتیں حرکت میں آئیں گی اور امریکہ کی قیادت میں عالمی استعمار کا ان کے خلاف متحدہ محاذ اسی طرح ناکام ہوگا جس طرح جناب نبی اکرم ﷺ کے خلاف قبائل عرب کا اتحاد ناکام ہو گیا تھا البتہ ہمیں اس حوالہ سے اپنی ذمہ داریوں پر ضرور نگاہ رکھنی چاہیئے کہ اپنے مظلوم طالبان بھائیوں کی اس مشکل وقت میں ہم کیا مدد کر سکتے ہیں اور ان کا ہاتھ کس طرح بٹا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقہ سے نباہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین یارب العالمین۔

نعمتوں کی ناشکری پر عذاب الٰہی کا ضابطہ

عیدالفطر کے موقع پر مرکزی عیدگاہ اہل سنت گوجرانوالہ میں مدیر ''الشریعۃ'' کا خطاب

بعد الحمد والصلوۃ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١١٢﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ أَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿١١٣﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّأَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿١١٤﴾ قَالَ اللّٰهُ إِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّيْٓ أُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ أُعَذِّبُهٗٓ أَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١١٥﴾ (المائدہ ۵: ۱۱۲-۱۱۵)

''(وہ قصہ بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (طعام کا) خوان نازل کرے؟ انہوں نے کہا کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو (۱۱۲) وہ بولے کہ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل تسلی پائیں اور ہم جان لیں کہ تم نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس (خوان کے نزول) پر گواہ رہیں (۱۱۳) (تب) عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ ہمارے لیے (وہ دن) عید قرار پائے یعنی ہمارے اگلوں اور پچھلوں (سب) کے لیے۔ اور وہ تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں رزق دے تو بہتر رزق دینے والا ہے (۱۱۴) خدا نے فرمایا میں تم پر ضرور خوان نازل فرماؤں گا لیکن جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا اسے ایسا

عذاب دوں گا کہ اہل عالم میں کسی کو ایسا عذاب نہ دوں گا (۱۱۵)''۔

آج عید کا دن ہے، عید خوشی کو کہتے ہیں اور آج دنیا بھر کے مسلمان اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خوشی اور تشکر کا اظہار کر رہے ہیں کہ رمضان المبارک کا رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ نصیب ہوا اور اس میں ہر مسلمان کو اپنے ذوق اور توفیق کے مطابق اللہ تعالیٰ کی بندگی اور نیک اعمال کا موقع ملا۔ روزہ، قرآن کریم کا سننا سنانا، صدقہ خیرات اور نوافل کی توفیق ہوئی، اس خوشی میں مسلمان بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہیں اور تشکر و امتنان کا اظہار کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ شکر گزاری پر نعمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

(ابراہیم ۱۴:۷)

''اگر تم میری نعمتوں پر شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔''

یعنی جس طرح شکر گزاری پر نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح ناشکری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب اور سزا بھی دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اور ضابطہ بھی بیان فرمایا ہے کہ جو نعمتیں خود انسانوں کی فرمائش پر انہیں دی جاتی ہیں، ان کی ناشکری پر عذاب بھی سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ میں نے آج خطبہ کے بعد سورۃ المائدۃ کی جو آیات کریمہ (۱۱۲ تا ۱۱۵) آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں ان میں اللہ رب العزت نے اسی ضابطہ اور قانون کی وضاحت کی ہے اور ایک تاریخی واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، سورۃ المائدہ اسی واقعہ سے منسوب ہے۔ مائدۃ دستر خوان کو کہتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے تیار کھانوں کا خوان اترنے کا واقعہ اس سورۃ میں بیان ہوا ہے جس کی وجہ سے اس سورۃ کو ''المائدۃ'' کہا جاتا ہے، وہ واقعہ انہی آیات میں ہے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہیں اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ

''اور جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپ کا رب اس کی طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے خوان اتارے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ

تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

حواریوں نے کہا کہ ہم یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں گے جس سے ہمارے دلوں کو اطمینان نصیب ہوگا اور ہم یہ جان لیں گے کہ آپ نے ہم سے سچ کہا اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ہم پر خوان اتار دے۔ وہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہوگی اور آپ کی قدرت کی نشانی ہوگی، آپ ہمیں رزق عطا فرمادیں کیونکہ آپ بہترین رزق دینے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر خوان اتار دوں گا مگر اس کے بعد تم میں سے جس نے ناشکری کی تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ وہ عذاب اس کائنات میں اور کسی کو نہیں دوں گا۔"

یعنی جس نعمت کی فرمائش کی جارہی ہے اس کے ملنے کے بعد بھی اگر ناشکری کی گئی تو اس پر خدا کا عذاب بہت زیادہ سخت اور بے مثال ہوگا اور اس کی سنگینی اور شدت دوسرے عذابوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔

ان آیات کے ضمن میں امام ابن جریر طبریؒ نے "تفسیر طبری" میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے "تفسیر مظہری" میں حکیم ترمذیؒ کی "نوادر الاصول" کے حوالہ سے حضرت سلمان فارسیؓ کی تفصیلی روایات نقل کی ہیں، ان دونوں کو سامنے رکھ کر واقعہ کی تھوڑی سی تفصیل آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ان روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو جب روزہ رکھنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ اگر تم ایک ماہ کے روزے رکھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول کریں گے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے ایک ماہ مسلسل روزے رکھے اور جب تیس روزے مکمل ہوگئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے حواریوں نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب ہم ایک ماہ تک کسی کے ہاں مزدوری اور کام کرتے ہیں تو وہ ہمیں اپنی طرف سے کھانا کھلاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ وہ ہمارے لیے آسمان سے تیار کھانوں کا خوان اتارے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو انہیں تنبیہ کی کہ خدا سے ڈرو، اس قسم کے سوالات مناسب نہیں لیکن جب وہ اپنے سوال پر قائم رہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے

خوان اتارنے کی درخواست کر دی جس پر اللہ رب العزت نے خوان اتارنے کا وعدہ کر لیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر اس کے بعد بھی ناشکری کی تو پھر میرا عذاب ایسا ہوگا کہ اس کی مثال پوری کائنات میں نہیں ہوگی۔ چنانچہ آسمان سے تیار کھانوں کا دستر خوان اترا بلکہ مسلسل چالیس دن تک اترتا رہا اور بنی اسرائیل سب کے سب روزانہ اس سے کھاتے رہے۔ چالیس دن کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش شروع ہوئی اور حکم ہوا کہ آج کے بعد یہ خوان غریب اور مستحق لوگوں کے لیے ہوگا اور امیر اور صاحب استطاعت افراد کو اس سے کھانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس سے قبل یہ شرط بھی لگائی گئی تھی کہ دستر خوان پر بیٹھ کر جتنا کھا سکتے ہو کھاؤ مگر ساتھ لے جانے اور ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں ہے اور دستر خوان سے کوئی چیز اٹھا کر لے جانے کو خیانت شمار کیا جائے گا۔ مگر امیر لوگ اور صاحب استطاعت افراد ان شرائط کی پابندی نہ کر سکے اور طرح طرح کے حیلے نکال کر خلاف ورزی شروع کر دی جس کی وجہ سے یہ خوان اترنا بند ہو گیا اور خلاف ورزی کرنے والے سینکڑوں افراد کو یہ عذاب ہوا کہ رات کو بے فکری کے ساتھ اپنے بستروں پر محو خواب تھے کہ ان کی شکلیں بدل گئیں اور انہیں خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔ صبح اٹھے تو عجیب صورت حال تھی۔ دھڑ اور جسم انسانوں کے تھے مگر چہرے اور شکلیں خنزیروں کی بن چکی تھیں۔ بنی اسرائیل میں کہرام مچ گیا، سب لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرد جمع ہو کر آہ وزاری کرنے لگے۔ وہ سینکڑوں خنزیر نما انسان بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرد گھومتے اور روتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کسی کا نام لے کر پکارتے تو وہ سر ہلا کر ہاں کرتا مگر گفتگو کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ ان کا رونا دھونا بعد از وقت تھا اس لیے کسی کام نہ آیا اور وہ خنزیر نما سینکڑوں انسان تین دن اس حال میں رہنے کے بعد موت کا شکار ہو گئے۔ ان میں سے کوئی زندہ نہ رہا اور نہ ہی کسی کی نسل آگے چلی۔

گویا اس واقعہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون کا عملی اظہار فرما دیا کہ وہ عام نعمتوں کی ناشکری پر بھی سزا دیتے ہیں لیکن جو نعمت فرمائش اور درخواست کر کے لی جائے اس کی ناشکری پر ان کا عذاب بہت زیادہ سخت ہوتا ہے۔

اس حوالہ سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد گرامی بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے یہ واقعہ بیان کر کے عربوں سے مخاطب ہو فرمایا تھا۔ ”تفسیر

ابن کثیرؒ‘‘ میں انہی آیات کریمہ کے ضمن میں منقول ہے کہ حضرت عمار بن یاسر نے ایک مجلس میں ’’مائدہ‘‘ والا یہ واقعہ بیان فرمایا اور پھر کہا کہ اے اہل عرب! تم پر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا کہ حضرت محمد ﷺ جیسے عظیم پیغمبر تمہیں عطا فرمائے۔ حالانکہ ان سے پہلے تم صرف اونٹ اور بکریاں چرانے والے چرواہے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی برکت سے تمہیں عرب و عجم کی بادشاہت مل گئی اور نبی اکرم ﷺ نے تمہیں ہدایت کی کہ سونا چاندی ذخیرہ نہ کرنا یعنی دولت کو جمع کرنے کی بجائے اسے مستحقین پر خرچ کرتے رہنا مگر تم نے دولت کو ذخیرہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ تم بھی اسی طرح خدا کے عذاب کا شکار ہو گے جس طرح مائدہ والے بنی اسرائیل خدا کے عذاب میں مبتلا ہوئے تھے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ نے یہ بات اپنے دور کے پس منظر اور حالات میں کہی تھی لیکن آج کے حالات اور تناظر میں ان کے اس ارشاد گرامی کو دیکھیے کہ کس طرح حرف بہ حرف صادق آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ پون صدی میں عربوں کو تیل اور سونے کی صورت میں جس دولت سے مالا مال کیا، اس کی مثال نہیں ملتی لیکن یہ دولت کہاں خرچ ہوئی؟ یہ دولت ملت اسلامیہ کے اجتماعی اور ملی مفاد میں خرچ ہوتی تو اس کا میدان سائنس، ٹیکنالوجی، دفاع اور معیشت تھا مگر عربوں کی دولت ان معاملات میں مسلمانوں کے کسی کام نہ آئی اور نہ ہی غریب مسلمانوں اور نادار لوگوں کی ضروریات پر یہ دولت صرف کی گئی البتہ عیاشی پر، اللوں تللوں پر، بیکار بلڈنگوں پر اور شاہانہ اخراجات پر تیل کی دولت برباد ہو گئی اور جو دولت ان کاموں پر صرف نہ ہو سکی وہ مغربی ملکوں کے بینکوں میں ذخیرہ کر دی گئی ہے جو مسلمانوں کے بجائے ان کے دشمنوں کے تصرف میں ہے اور ان کے کام آ رہی ہے۔

اللہ نے چھپر پھاڑ کر عربوں کو دولت دی تھی، زمین کا سینہ ان کے لیے چاک کر دیا تھا مگر انہوں نے اس عظیم نعمت کی جو ناشکری کی، اس کی سزا آج ہم سب بھگت رہے ہیں اور اسرائیل جیسے چھوٹے سے ملک کے سامنے تمام عرب ممالک بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کا عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ نعمتیں بھی بے حساب دیتا ہے مگر ان کی ناشکری پر اس کی گرفت بھی بڑی سخت اور عبرتناک ہوتی ہے۔ عربوں کو ایک طرف رکھیے خود ہمارا حال کیا ہے؟ ہم نے یعنی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے ’’پاکستان‘‘ جیسی عظیم نعمت اللہ

تعالیٰ سے مانگ کر لی تھی اور یہ کہا تھا کہ یا اللہ! اس خطہ کے مسلمانوں کو الگ ملک عطا فرما دے ہم اس میں تیرے احکام کی پابندی کا اہتمام کریں گے، ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن شریف اور دوسرے ہاتھ میں بخاری شریف تھی اور ہم نے لاکھوں کے اجتماع میں عہد کیا تھا کہ پاکستان بن گیا تو ان دو کتابوں کی حکمرانی قائم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں الگ ملک دے دیا اور پاکستان بن گیا مگر ہم نے کیا کیا؟ اور نصف صدی سے مسلسل کیا کر رہے ہیں؟ ہم نے مملکت خداداد پاکستان کو لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کا مرکز بنا لیا۔ ہم میں سے جس کا جتنا داؤ چلا اس نے ملک کو لوٹنے اور اس کے وسائل کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم نے خدا کے قانون کو، اسلام کے نظام کو اور قرآن وسنت کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا اور خواہشات کی غلامی میں لگ گئے۔ آج غریب آدمی کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ہے، بجلی کا بل دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں، کھانے کو روٹی نہیں ہے اور سر چھپانے کو مکان نہیں ہے مگر چند افراد نے اپنی تجوریوں اور بیرون ملکوں بینکوں میں دولت کے انبار لگا رکھے ہیں۔ آج مجھے اور آپ سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے اور اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم نے تو عید کے روز نئے کپڑے پہنے، خوشبو لگا کر اور بن سنور کر بیٹھے ہیں مگر ہمارے اردگرد کتنے لوگ ہیں جو آج کے دن بھی اپنے بچوں کے لیے ایک دن کی عارضی خوشیوں کا اہتمام نہیں کر سکے۔ ان کی تعداد تھوڑی نہیں بہت زیادہ ہے اور دن بدن بڑھتی جا رہی ہی، ان لوگوں کا بھی وہی خدا ہے جو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کے دلوں سے بھی آہیں نکلتی ہیں جو سیدھی عرش پر جاتی ہیں۔ اس لیے ہمیں بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، سبق لینا چاہیے اور نصیحت پکڑنی چاہیے۔ ابھی وقت ہے اگر ہم ندامت اور توبہ کے ساتھ اپنی اصلاح کا راستہ اختیار کر لیں تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے لیکن اگر ہم نے اب بھی سبق نہ سیکھا تو عذاب کا قانون سب کے لیے یکساں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاح اور توبہ کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین یارب العالمین

حضرات صحابہ کرامؓ
اور
ان کا اسوۂ حسنہ

> محرم الحرام کے آخری عشرہ کے دوران چوک فاروق اعظمؓ کھیالی دروازہ گوجرانوالہ کی جامع مسجد خلافت راشدہؓ میں تحفظ ناموس صحابہؓ واہل بیتؓ کے عنوان سے ہر سال دو روزہ کانفرس منعقد ہوتی ہے۔اس کانفرنس کا آغاز اٹھارہ سال قبل خطیب شہر مولانا زاہد الراشدی، علاقہ کے ممتاز سماجی راہ نما خلیفہ محمد اسلم (مرحوم) کونسلر میونسپل کارپوریشن اور ان کے رفقاء نے کیا تھا، اس سے ہر سال تینوں مکاتب فکر دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث کے سرکردہ علماء کرام خطاب کرتے ہیں اور عوام کی بڑی تعداد شریک ہوتی ہے، یہ کانفرنس پابندی کے ساتھ منعقد ہو رہی ہے اور اس سال اس کانفرنس سے سپاہ صحابہ پاکستان کے سربراہ علامہ علی شیر حیدری کے علاوہ مولانا زاہد الراشدی، مولانا سید چراغ الدین شاہ، علامہ عبدالوحید ربانی، مولانا محمد اعظم، مولانا عبدالوکیل خانپوری، قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی، قاری جاوید اختر فیصل آبادی، مولانا محمد نعیم بٹ، مولانا محمد ریاض خان سواتی اور دیگر علماء کرام نے خطاب کیا۔ ۱۵ مئی ۱۹۹۹ء کو کانفرنس کی پہلی نشست سے مولانا زاہد الراشدی کے خطاب کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ:

سب سے پہلے خلیفہ محمد اسلم صاحب اور ان کے رفقاء کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اٹھارہ سال قبل جس نیک کام کا انہوں نے آغاز کیا تھا اسے وہ تسلسل کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے خدا کرے کہ یہ عمل تادیر جاری رہے اور جن مقاصد کے لیے یہ

شروع کیا گیا تھا ان کی تکمیل کے لیے ہم عملاً آگے بڑھ سکیں آمین۔

یہ اجتماع حضرات صحابہ کرام اور اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل و مناقب اور خدمات کے تذکرہ کے لیے منعقد ہوتا ہے اور آج بھی ہم اسی مقصد کے لیے جمع ہیں صحابہ کرامؓ ہوں، اہل بیتؓ ہوں، یا دیگر بزرگان دین ان کے تذکرہ اور یاد کے بہت سے فوائد ہیں، اس سے ہم اجر و ثواب حاصل کرتے ہیں، ان بزرگوں کے ساتھ اپنی نسبت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے نقش پا سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں اور میرے خیال میں سب سے بڑا مقصد اور فائدہ یہی ہے کہ ہم ان سے راہ نمائی حاصل کریں اور ان صاف اور شفاف آئینوں میں اپنے چہرے کو دیکھ کر اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہی حاصل کریں تا کہ اپنی اصلاح کر سکیں۔

اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے آج ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس وقت عالمی اور ملکی سطح پر ہم جن گھمبیر مسائل سے دو چار ہیں اور جن مشکلات و مصائب نے ہمیں گھیر رکھا ہے ان میں ان بزرگوں سے ہمیں کیا راہ نمائی ملتی ہے اور اسی حوالہ سے آج کی محفل میں کچھ مختصر گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آج ہمیں ملکی اور قومی سطح پر جس سنگین مسئلہ کا سامنا ہے وہ احتساب کا مسئلہ ہے لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری ہے اور ہم ایک دوسرے کا احتساب نہیں کر پا رہے، آیئے احتساب کے حوالہ سے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اسوہ سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد اپنے عمال، گورنروں اور افسران کو یہ ہدایت جاری کر دی تھی کہ (۱) کوئی حاکم یا افسر ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا۔ (۲) باریک لباس نہیں پہنے گا۔ (۳) چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائے گا اور (۴) اپنے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنائے گا یہ اس دور میں معاشرتی امتیاز کی علامتیں تھیں جنہیں حضرت عمرؓ نے اپنے حکام اور افسروں کے لیے ممنوع قرار دے دیا اور میں اس کی تعبیر یوں کیا کرتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے وی آئی پی کلچر کی نفی کر دی اور ملک کے حاکموں اور افسروں کو پابند کر دیا کہ وہ خوراک، لباس، رہائش اور سواری میں عام شہریوں سے الگ کوئی امتیازی حیثیت اختیار نہیں کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ حکم نافذ کیا اور اس پر عمل بھی کر کے دکھایا حتیٰ کہ کہیں سے خلاف ورزی کی اطلاع ملی تو سخت تادیبی کاروائی کی، انہیں شکایت ملی کہ کوفہ کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے

اپنے گھر کے دروازے پر ایک چھتا سا بنا رکھا ہے حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ سے اپنا نمائندہ بھیجا اس دور میں اس قسم کی ڈیوٹی عام طور پر حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ سرانجام دیا کرتے تھے۔ جن کے بارے میں میں کہا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے سب سے پہلے آئی جی پولیس تھے، وہ کوفہ گئے اور گورنر ہاؤس کا معائنہ کیا۔ شکایت درست تھی کہ گورنر ہاؤس کے دروازے پر ایک چھتا سا بنا ہوا تھا جو امیر المومنین کی ہدایت کے منافی تھا چنانچہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق ان کے نمائندے نے اس چھتے کو آگ لگا دی اور گورنر کوفہ کو آگ کے دھوئیں سے پتہ چلا کہ ان کے دروازے کا چھتہ نذر آتش کیا جا چکا ہے اس طرح ایک اور گورنر حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کے بارے میں شکایت ملی کہ انہوں نے باریک لباس پہننا شروع کر دیا ہے وہ جزیرہ کے گورنر تھے، حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ سے نمائندہ بھیجا اور اسے ہدایت کی کہ اگر گورنر جزیرہ نے عام لوگوں سے مختلف لباس پہن رکھا ہو تو اسی حالت میں انہیں مدینہ منورہ لے آؤ۔ تفتیشی افسر جزیرہ پہنچا اور گورنر صاحب کو دیکھا کہ واقعی انہوں نے امیر المومنین کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے باریک لباس پہن رکھا ہے۔ چنانچہ انہیں اسی کیفیت میں مدینہ منورہ لے جایا گیا، امیر المومنین حضرت عمرؓ نے انہیں سرزنش کی اور بطور سزا بکری کے بالوں سے بنا ہوا چغا ننگے بدن پہنا کر چھ ماہ تک بیت المال کی بکریاں چرانے کا حکم دیا، گورنر جزیرہ حضرت عیاض بن غنمؓ نے یہ سزا بھگتی اور اس کے بعد پھر اپنے عہدہ پر بحال ہو کر جزیرہ واپس چلے گئے۔

احتساب اس کا نام ہے اور حضرت عمر رضی اللہ علیہ نے اس کی واضح مثال پیش کی لیکن وہ یہ احتساب اس لیے کر پائے تھے کہ قواعد و ضوابط کی خود بھی پابندی کرتے تھے اور انہوں نے خود کو اس سے مستثنیٰ نہیں کر رکھا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک بار بیمار ہو گئے انتڑیوں میں سوزش تھی، معالجوں نے دیکھا تو کہا کہ خشک روٹی کھاتے کھاتے انتڑیوں میں خشکی ہو گئی ہے چند روز زیتون کا تیل استعمال کریں تو شکایت دور ہو جائے گی، فرمایا کہ میرے پاس تو زیتون کا تیل استعمال کرنے کی گنجائش نہیں ہے، کسی نے کہہ دیا کہ حضرت! بیت المال میں زیتون کا تیل موجود ہے وہاں سے لیں، بیت المال کے انچارج کو بلایا اور پوچھا کہ سرکاری خزانے میں زیتون کا تیل موجود ہے؟ اس نے کہا کہ خاصی مقدار میں ہے امیر المومنینؓ نے دریافت کیا کہ مدینہ منورہ کے سب لوگوں میں تقسیم کیا جائے تو میرے حصے میں کتنا آئے گا۔

بیت المال کے انچارج نے جواب دیا کہ وہ تو بہت تھوڑا ہوگا اس پر حضرت عمرؓ نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ "جتنا مرضی گڑ گڑا تا رہ! ملے گا وہی جو تیرا حصہ بنتا ہے"

یہی وہ قوت ہے جس نے حضرت عمرؓ کے کوڑے سے وسیع و عریض ملک کے ہر افسر اور ہر شہری کو لرزہ براندام کر رکھا تھا آج بھی اگر ہم احتساب کرنا چاہتے ہیں تو اسی راستے پر چلنا ہوگا اور اسی اسوہ کو اپنانا ہوگا یہ تو میں نے ملکی مسائل کے حوالہ سے ذکر کیا ہے ایک بات عالمی حال کے پس منظر میں بھی گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ مسلم ممالک نے باہمی تنازعات میں کیا طرز اختیار کر رکھا ہے؟ حضرات صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ تنازعہ اور محاذ آرائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان رہی ہے دونوں آمنے سامنے تھے۔ ان میں جنگ بھی ہوئی ہے اور ایک دوسرے سے مخاصمت اور محاذ آرائی بھی رہی ہے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ جب ان کی باہمی جنگ سے ایک تیسری قوت نے فائدہ اٹھانا چاہا تو اسے کامیابی نہیں ہوئی، روم اس وقت کا امریکہ تھا اور سپر پاور شمار ہوتا تھا، روم کے قیصر نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی باہمی جنگ کو دیکھتے ہوئے حضرت معاویہؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں حضرت معاویہؓ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے، آج کا زمانہ ہوتا تو خدا جانے کیا کچھ ہو جاتا مگر حضرت معاویہؓ نے روم کے حکمران کو جواب دیا وہ ہماری ملی تاریخ کا ایک روشن عنوان ہے اور آج ہمارے لیے اسوہ اور نمونہ ہے انہوں نے روم کے قیصر کو جواب دیا کہ ان کی اور حضرت علیؓ کی لڑائی بھائیوں کی لڑائی ہے اور اس سے کسی اور کو فائدہ اٹھانے کا نہیں سوچنا چاہیے روایات کے مطابق حضرت معاویہؓ کے جواب میں یہ جملہ بھی شامل تھا کہ:

اگر رومی لشکر نے حضرت علیؓ کے خلاف کوئی کاروائی کی تو حضرت علیؓ کے پرچم تلے رومی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے جو پہلا سپاہی شہید ہوگا وہ معاویہؓ ہوگا حضرت معاویہؓ کے اس تاریخی جواب نے بادشاہ روم کے حوصلے پست کر دیے اور وہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا ان گذارشات کے بعد ایک بار پھر یہ عرض کرتے ہوئے آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ اور بزرگان دین کے تذکرہ کا اصل مقصد ان سے راہ نمائی حاصل کرنا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

اسلام میں سوشل ورک کی اہمیت

اس سال ۲۹ رمضان المبارک کو ضلع سیالکوٹ کے قصبہ کنڈن سیان میں نوجوانوں کی ایک رفاہی تنظیم ''سوشل ویلفیئر سوسائٹی'' نے افطار پارٹی کے عنوان سے تقریب منعقد کی جس میں علاقہ بھر سے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کے مہمان خصوصی پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی تھے اور انہوں نے اس موقع پر ''اسلام میں سوشل ورک کی اہمیت'' کے موضوع پر خطاب کیا۔ ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

سب سے پہلے سوشل ویلفیئر سوسائٹی کنڈن سیان کے نوجوانوں کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس تقریب کا اہتمام کیا اور آپ حضرات سے ملاقات اور گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں اور کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

سوشل ورک یا انسانی خدمت اور معاشرہ کے غریب و نادار لوگوں کے کام آنا ایک بہت بڑی نیکی ہے اور اسلام نے اس کی تعلیم دی ہے، یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ ہے اور آپ ﷺ نے دکھی انسانیت کی خدمت اور نادار لوگوں کا ہاتھ بٹانے کا بڑا اجر و ثواب بیان فرمایا ہے حتیٰ کہ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ آقائے نامدار ﷺ پر وحی نازل ہونے کے بعد آپ کا پہلا تعارف ہمارے سامنے اسی حوالہ سے آیا ہے کہ آپ ﷺ نادار اور مستحق لوگوں کی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر غار حرا میں جب پہلی دفعہ وحی نازل ہوئی، آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ

چند دن کی خوراک اور پانی لے کر غار حرا میں چلے جاتے تھے اور سب لوگوں سے الگ تھلگ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مصروف رہتے تھے۔ ایک دن وہیں غار میں وحی کے آغاز کا واقعہ پیش آ گیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو قرآن کریم کی سورۃ اقرأ کی پہلی آیات سنائیں۔ اس واقعہ کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا کیونکہ آپ نے کئی بار سن رکھا ہوگا اور آپ کے ذہن میں ہوگا، اچانک واقعہ ہوا، اس سے قبل اس قسم کی بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جناب نبی اکرم ﷺ پر گھبراہٹ کا طاری ہونا ایک فطری بات تھی۔ آپ ﷺ گھر تشریف لائے، چادر اوڑھی اور لیٹ گئے۔ اہلیہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا دانا و بینا خاتون تھیں۔ پریشانی بھانپ گئیں، پوچھا تو جناب نبی اکرم ﷺ نے سارا واقعہ بیان کر دیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ خشیت علی نفسی "مجھے اپنے بارے میں خوف لگ رہا ہے" اس پر ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسلی دی اور کہا کہ "خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو غمزدہ نہیں کرے گا۔" اور اپنے دعویٰ پر جو دلیل دی وہ یہ تھی کہ "آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، لوگوں کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور بے سہارا لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔" گویا ام المومنین نے رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ جو لوگ انسانی سوسائٹی میں دوسروں کے کام آنے والے ہوں اللہ تعالیٰ انہیں غمزدہ نہیں کیا کرتا۔ اور اس طرح پہلی وحی نازل ہونے کے بعد احادیث کے ذخیرہ میں رسول اللہ ﷺ کا جو سب سے پہلا تعارف ہمارے سامنے آتا ہے وہ ایک "سوشل ورکر" کی حیثیت سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بہت بڑے ساتھی اور خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ کا تعارف بھی احادیث میں انہی الفاظ کے ساتھ ملتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف قریش کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے اور اب انہیں مزید برداشت کرنے کی تاب نہ رہی تو بہت سے صحابہ کرامؓ جناب نبی اکرم ﷺ سے اجازت لے کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے جن میں حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت جعفر طیار ؓ بھی تھے۔ انہی دنوں حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ بھی اس قسم کی صورت حال پیش آئی کہ آپ اپنے گھر کے صحن میں قرآن کریم پڑھا

کرتے تھے اور اردگرد کے بچے اور عورتیں اسے سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ اس پر محلہ کے بڑے لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو منع کر دیا کہ اگر قرآن کریم پڑھنا ہو تو کمرے میں بند ہو کر پڑھیں، صحن میں نہ پڑھا کریں کیونکہ اس سے ہماری عورتیں اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ اس سے دلبرداشتہ ہو کر جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہجرت کی اجازت چاہی کہ جہاں اپنے گھر کے صحن میں بھی قرآن کریم پڑھنے کی اجازت نہ ہو وہاں رہنے کا کیا فائدہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر سے ضروری سامان اٹھا کر ہجرت کے ارادے سے مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوئے، راستے میں قریش کے قبیلہ بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ ملا۔ اس نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ اب ظلم و صبر کی انتہا ہو گئی ہے اور میں ہجرت کے ارادے سے شہر چھوڑ کر کہیں اور جا رہا ہوں، اس کافر سردار نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہو گا اور میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ اس موقع پر اس نے کہا کہ آپ جیسے شخص کا شہر سے چلے جانا شہر کے لوگوں کے لیے اچھی علامت نہیں ہے اور پھر حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں وہی بات کہی جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے غار حرا سے واپسی پر جناب نبی اکرم ﷺ سے کہی تھی کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، معذوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور لوگوں کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ چنانچہ کافروں کے قبیلہ بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ واپس مکہ لے آیا اور خانہ کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ ابوبکرؓ آج کے بعد میری امان میں ہیں، کوئی ان کو تنگ نہ کرے، گویا جناب نبی اکرم ﷺ اور ان کے ساتھی و خلیفہ حضرت ابوبکرؓ دونوں کا مزاج و طبیعت ایک تھے اور دونوں کی عادات و اخلاق یکساں تھے۔ اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اسلام میں تو نبوت اور خلافت دونوں کا مزاج ''سوشل ورک'' کا مزاج ہے اور دونوں کی بنیاد سماجی خدمت پر ہے۔ اس حوالہ سے میں نوجوانوں سے بطور خاص عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسابقت، معاصرت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ فطری جذبہ ہے اور اسلام نے انسان کے کسی فطری جذبے کی نفی نہیں کی اور کسی طبعی ضرورت سے انکار نہیں کیا۔ البتہ ہر جذبے اور ضرورت کا رخ متعین کر دیا ہے اور اسے منفی کی بجائے مثبت میدان میں

آگے بڑھانے کی ترغیب دی ہے۔آج کل ہمارے ہاں بھی مسابقت کا جذبہ کارفرما ہے لیکن اس کا میدان اور ہے، اس کا اظہار دولت کے جمع کرنے میں ہوتا ہے، بلڈنگوں کی تعمیر میں ہوتا ہے، اقتدار کے حصول میں ہوتا ہے اور جماعتوں، گروہوں اور جتھوں کے قیام میں ہوتا ہے لیکن یہی مسابقت کا جذبہ حضرات صحابہ کرامؓ میں تھا تو اس کا میدان اور تھا۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جس سے کوئی انسان خالی نہیں ہے مگر اس کا صحیح میدان وہ ہے جو صحابہ اکرمؓ نے پیش کیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، ایک رات آسمان صاف تھا، چاند نہیں تھا، ستارے ہر طرف جگمگا رہے تھے، ان گنت ستاروں کا ہجوم دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ جناب نبی اکرم ﷺ سے پوچھوں کہ کیا کوئی خوش نصیب انسان ایسا بھی ہے جس کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کی طرح ان گنت ہوں، فرماتی ہیں کہ جی میں یہ تھا کہ اس سوال کے جواب میں میرے والد محترم (حضرت ابوبکرؓ) کا نام ہی آسکتا ہے لیکن جناب رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں ایسا خوش نصیب شخص ہے اور وہ عمر بن الخطابؓ ہے۔ حضرت عائشہؓ توقع کے خلاف جواب سن کر چونک اٹھیں اور بے ساختہ دوسرا سوال کر دیا کہ وابی یا رسول اللہ؟" یا رسول اللہ، میرے والد محترم کہاں گئے۔" اس پر جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عائشہؓ! تم ابوبکرؓ کی نیکیوں کی بات کرتی ہو، بخدا عمرؓ کی ساری زندگی کی نیکیاں ایک طرف مگر ابوبکرؓ کی ایک غار کی نیکی ان سب پر بھاری ہے جو انہوں نے ہجرت میں میرے ساتھ وقت گزارا ہے تو حضرات صحابہ کرامؓ میں مقابلہ اور مسابقت کا میدان نیکیوں کا تھا اور وہ اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ساری زندگی یہ حسرت رہی کہ نیکیوں میں حضرت ابوبکرؓ سے آگے بڑھوں مگر دو واقعات نے مجھے اس حسرت کے پورا ہونے سے مایوس کر دیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ اس شیخ سے آگے بڑھنا میرے بس میں نہیں ہے، ایک واقعہ غزوہ تبوک کے موقع کا بیان کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ نے غزوہ تبوک کے لیے صحابہ کرامؓ سے زیادہ سے زیادہ چندہ لانے کے لیے کہا تو حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ان دنوں میری حالت حضرت ابوبکرؓ سے اچھی تھی اور

میں خوش ہوا کہ آج میں سبقت حاصل کرلوں گا۔ چنانچہ خوشی خوشی گھر گیا اور جو کچھ بھی گھر میں موجود تھا، نقدی، سامان، غلہ، کھجوریں وغیرہ سب کو نصف نصف کیا۔ نصف سامان گھر میں چھوڑا۔ اور نصف سامان باندھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ادھر سے حضرت ابوبکرؓ بھی ایک گٹھڑی اٹھائے آگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ آپ کیالائے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے بتایا کہ جو کچھ گھر میں تھا نصف نصف کر کے آدھا گھر میں چھوڑ آیا ہوں اور آدھا آپ ﷺ کی خدمت میں لے آیا ہوں اور حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ جو کچھ گھر میں تھا اٹھا کر لے آیا ہوں اور گھر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے نام کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرے دل میں چوٹ سی لگی اور دل نے گواہی دی کہ عمرؓ! اس شیخ سے نیکی میں آگے بڑھنا مشکل ہے۔

دوسرا واقعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے دور کا بیان کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا کہنا ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک ضعیف اور بے سہارا خاتون تھی۔ ایک کٹیا میں رہتی تھی اور انتہائی ضعیف اور نابینا تھی۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ اس خاتون کی تھوڑی بہت خدمت کرنی چاہیے۔ ایک روز صبح نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر اس خیال سے کٹیا کی طرف گیا کہ اس بڑھیا کے گھر کی صفائی کر دوں گا۔ پانی کا برتن بھر کر رکھ دوں گا اور کچھ کھانے پینے کی چیز دے آؤں گا۔ وہاں پہنچا، بڑھیا سے سلام عرض کیا اور کہا میں مدینہ منورہ کا باشندہ ہوں اور اس خیال سے آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ بیٹا تم سے پہلے ایک شخص آیا تھا، وہ روزانہ آتا ہے۔

اور یہ سارے کام کر جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ دوسرے روز میں ذرا جلدی آگیا تا کہ یہ دیکھوں کہ وہ شخص کون ہے؟ تو دیکھا کہ ایک شخص منہ لپیٹے ہوئے پانی کا گڑھا بڑھیا کی کٹیا میں رکھ کر باہر آرہا ہے۔ قریب ہو کر معلوم کیا تو وہ خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو صبح سویرے مدینہ منورہ کی ایک بے سہارا، معذور اور ضعیف بڑھیا کی خدمت گزاری کے فرض سے عہدہ برآ ہو رہے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس روز تو میرے دل نے یہ فیصلہ دے دیا کہ یہ مقابلہ میرے بس کی بات نہیں اور اس شیخ سے نیکیوں میں آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

میں سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے نوجوانوں سے یہ عرض کروں گا کہ باہم مقابلہ اور مسابقت

کا اصل میدان یہ ہے اس لیے نیکیوں میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور معاشرہ کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی بڑھ چڑھ کر خدمت کریں۔ یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کا حصہ ہے۔

ابھی مجھ سے پہلے ایک نوجوان نے خطاب کرتے ہوئے یہ ذکر کیا ہے کہ سوشل ورک کا سب سے بڑا کام لوگوں کو گمراہی سے نکالنا ہے اور ہدایت کے راستے پر لانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کا سب سے بڑا مشن یہی تھا کہ نسل انسانی کو راہ راست پر لایا جائے اور جہنم سے انسانوں کو بچانے کی کوشش کی جائے حتیٰ کہ قرآن کریم میں جناب نبی اکرم ﷺ کی اس خواہش کو ''حرص'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو کسی خواہش کا آخری اور انتہائی درجہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ ''جناب نبی اکرم ﷺ تمہارے ایمان لانے اور ہدایت پانے پر حریص ہیں'' اور خود جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنی مثال یوں دی ہے جیسے اندھوں کا کوئی بڑا گروہ ایک طرف کو جا رہا ہو اور ادھر بہت بڑا گڑھا ہو جس میں آگ جل رہی ہو اور ایک آنکھوں والا شخص اس منظر کو دیکھ رہا ہو، اب اس سے برداشت نہیں ہوگا، وہ آوازیں دے گا، شور مچائے گا اور قریب آ کر ان اندھوں کو آگ کے گڑھے کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہی ہے۔ تم لوگوں کو جہنم کا گڑھا نظر نہیں آ رہا اور تم سب اس کی طرف بھاگے جا رہے ہو۔ مجھے وہ گڑھا دکھائی دے رہا ہے اور تمہارا اس کی طرف دوڑے چلے جانا بھی نظر آ رہا ہے اس لیے میں تمہیں آوازیں دے رہا ہوں اور میری ہر ممکن کوشش ہے کہ کوئی شخص بھی اس گڑھے میں نہ گرنے پائے۔

اب یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اس کا تکوینی فیصلہ ہے کہ ہدایت دینے کا اختیار اس نے اپنے پاس رکھا ہے کہ جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اگر ہدایت کا یہ اختیار اللہ تعالیٰ جناب نبی اکرم ﷺ کو دے دیتا تو حضور علیہ السلام کے زمانے کا تو کوئی ایک انسان بھی جہنم میں نہ جاتا اور نبی اکرم ﷺ کم از کم اپنے دور کے ہر انسان کو ہدایت کے دائرے میں ضرور لے آتے۔ اس لیے نوجوانوں سے عرض کرتا ہوں کہ لوگوں کی راہ نمائی کرنا، انہیں ایمان کے راستے پر لانا، کفر اور گمراہی سے بچانا اور

نیک اعمال کی ترغیب دے کر اچھے مسلمان بنانا بھی جناب نبی اکرم ﷺ کا مشن ہے اور دکھی انسانیت کی خدمات کرنا، نادار لوگوں کے کام آنا لوگوں کی مشکلات اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا اور بے سہارا لوگوں کا سہارا بننا بھی سنت نبوی ﷺ ہے۔ یہ سب سوشل ویلفیئر کے کام ہیں اور ان میں سے جس شعبہ میں بھی موقع مل جائے اس میں کام کرنا ہم سب کے لیے سعادت کی بات ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں۔

آمین یارب العالمین۔

قرآن وسنت کی تعلیمات
اور
ہمارا اجتماعی طرز عمل

۴ جون ۱۹۹۹ء کو شمالی لندن کی مرکزی جامع مسجد (فنس بری پارک) میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب۔

بعد الحمد والصلوۃ:

وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (عنکبوت ۲۹: ۵۰-۵۱)

''اور (کافر) کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں کہہ دو کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔ اور میں تو کھلم کھلا ہدایت کرنے والا ہوں (۵۰) کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ مومن لوگوں کے لیے اس میں رحمت اور نصیحت ہے (۵۱)''

میں نے سورۃ العنکبوت کی دو آیات تلاوت کی ہیں جو اکیسویں پارے کے پہلے رکوع کی آخری آیتیں ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے ایک سوال کا جواب دیا ہے۔ مشرکین مکہ جناب رسول اللہ ﷺ سے اکثر و بیشتر نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو سینکڑوں معجزات دیے ہیں، مکہ مکرمہ میں بھی دیے ہیں اور مدینہ

منورہ میں بھی عطا فرمائے ہیں، ان میں سے بعض معجزات ایسے ہیں جو مشرکین کی فرمائش پر دیے گئے اور ایسے معجزات بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی فرمائش کے بغیر اپنی حکمت سے عطا فرمائے۔ سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ ایک کافر نے بند مٹھی نبی اکرم ﷺ کے آگے کر کے کہا کہ اگر آپ یہ بتا دیں کہ اس بند مٹھی میں کیا ہے تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ اگر یہ خود بتا دیں تو؟ اس نے کہا کہ یہ تو اور اچھا ہے۔ اس کی مٹھی میں کنکریاں تھیں جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ نے وسلم کے ارشاد پر خود بول اٹھیں اور بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھا۔ یہ جناب نبی اکرم ﷺ کا معجزہ تھا جو ایک کافر کی فرمائش پر ظاہر ہوا۔

اسی طرح شق قمر کا معجزہ ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک رات مطلع صاف تھا، چاند مکمل تھا اور جناب نبی اکرم ﷺ چاند کی روشنی میں کھلے آسمان تلے تشریف فرما تھے، مکہ کے چند سرکردہ حضرات آئے اور کہا کہ ہم آپ پر ایمان لانے کے لیے تیار ہیں مگر شرط یہ ہے کہ یہ چاند آپ کی سچائی کی گواہی دے اور اس کے لیے دو ٹکڑے ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے انگشت شہادت سے اشارہ کیا تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ اب وہ کافر سردار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، آنکھیں مل رہے ہیں اور بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا رہے ہیں مگر ایمان مقدر میں نہیں تھا اس لیے جب یہ یقین ہو گیا کہ چاند واقعی دو ٹکڑے ہے جو صاف نظر آ رہا ہے تو کہنے لگے کہ بڑے بڑے جادوگر دیکھے ہیں مگر کسی کا جادو آسمان پر نہیں چلتا اور یہ تو اتنا بڑا جادوگر (معاذ اللہ) ہے کہ اس کا جادو آسمان پر بھی چلتا ہے۔ تو اللہ رب العزت نے رسول اللہ ﷺ کو کفار مکہ کی فرمائش پر بھی متعدد معجزات عطا فرمائے مگر اس کے باوجود ان کے مطالبات کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور طرح طرح کے معجزات کی فرمائش کرتے رہتے تھے جن میں سے بعض فرمائشوں کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ہے۔

مثلاً ایک بار انہوں نے تقاضا کیا کہ اللہ تعالیٰ خود ہمارے سامنے آ کر آپ کی نبوت کی شہادت دے یا کم از کم اللہ تعالیٰ کے فرشتے آ کر ہمیں بتائیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ ایک موقع پر یہ تقاضا کیا کہ اگر آپ رسول خدا ہیں تو آپ کے آگے آگے فرشتوں کو ہونا چاہیے جو پروٹوکول ڈیوٹی دیں اور لوگوں کو خبردار کریں کہ اللہ کے نبی آ رہے ہیں۔ ایک تقاضا یہ تھا کہ اگر آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو مکہ مکرمہ میں آپ کا سونے کا محل ہونا چاہیے، انگور اور کھجور

کا باغ ہونا چاہیے، نہریں اور چشمے ہونے چاہییں تاکہ لوگوں کو دور سے پتہ چلے کہ یہ پیغمبر کا ڈیرہ ہے۔ اسی طرح کفار مکہ کی ایک یہ فرمائش بھی قرآن پاک نے بیان کی ہے کہ آپ یہ کتاب جو تھوڑی تھوڑی کر کے ہمیں سناتے ہیں، اسے ہم نہیں مانتے۔ ہم تو اس کتاب کو مانیں گے کہ آپ ﷺ ہمارے سامنے خالی ہاتھ آسمان کی طرف چڑھ جائیں اور پھر وہاں سے واپس آئیں تو آپ کے ہاتھ میں کتاب ہو، اس کتاب پر ہم ایمان لائیں گے۔

الغرض اس طرح کے بے تکے سوالات اور تقاضے مشرکین مکہ جناب نبی اکرم ﷺ سے کرتے رہتے تھے۔ سورۃ العنکبوت کی جو دو آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے انہی سوالات کا جواب دیا ہے اور جواب میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ پہلے مشرکین کا سوال نقل کیا ہے کہ ''وہ لوگ کہتے ہیں'' کہ حضرت محمد ﷺ پر ان کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اترتیں؟'' نشانیاں تو بہت سی نازل ہوئی ہیں جو مشرکین نے بھی دیکھی ہیں مگر ان کا مطلب تھا کہ جو نشانیاں ہم کہتے ہیں وہ کیوں پوری نہیں ہوتیں؟''
اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلی بات یہ فرمائی کہ قل انما الآیات عند اللہ اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں یعنی نشانیاں اور معجزات دینا اس کے اختیار میں ہے اور اس کی حکمت بھی وہی جانتا ہے کہ کون سی نشانیاں دینی ہیں اور کونسی نہیں؟ میرا کام نشانیاں پیش کرنا نہیں اور نہ ہی یہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے۔ انما انا نذیر مبین۔

میری ذمہ داری تو صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤں اور اس کے احکام کو کھول کر بیان کر دوں۔ باقی نشانیاں اور معجزات دینا اس کا کام ہے، چاہے دے اور چاہے نہ دے اور اس کی حکمت بھی وہی جانتا ہے۔

اب آپ خود غور کر لیجئے کہ چاند کا دو ٹکڑے کرنا بھی کفار مکہ کا مطالبہ تھا اور مکہ مکرمہ میں سونے کا ایک محل بھی انہی کا تقاضا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کا چاند دو ٹکڑے کر دیا مگر مکہ مکرمہ میں سونے کا ایک محل نہیں دیا حالانکہ بظاہر ہمارے حساب سے اس سے وہ زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے لیے نہ وہ مشکل ہے نہ یہ مشکل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ میں سونے کا ایک محل بنا دیتے تو کون سی مشکل بات تھی مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اسی میں حکمت تھی۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں۔ کوئی حکمت ہماری سمجھ میں بھی آجاتی ہے لیکن

ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ کی ہر حکمت ہم سمجھ جائیں۔ البتہ یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم یا کام حکمتوں سے خالی نہیں ہوتا۔

حوالہ اس وقت ذہن میں نہیں ہے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حوالہ کسی جگہ پڑھا تھا کہ مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرم ﷺ کو سونے کا محل نہ دینے کی ایک حکمت ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے کہ اگر یہ سونے کا محل بن جاتا تو قیامت تک کے لیے مخالفین کو ایک ہتھیار مل جاتا کہ جتنے لوگ بھی جناب نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائے، وہ ان کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ سونے کا محل دیکھ کر ایمان لائے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان کا چاند تو مشرکین مکہ کے فرمائش پر دو ٹکڑے کر دیا مگر مکہ مکرمہ میں سونے کا ایک محل بنا کر نہیں دیا۔

مکہ مکرمہ کے کفار کے اس سوال کے جواب میں دوسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ "کیا ان کو یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں رحمت اور نصیحت ہے ایمان لانے والوں کے لیے"

گویا اللہ رب العزت نے یہ فرمایا کہ قرآن کریم جیسے عظیم معجزے اور نشانی کے بعد یہ اور کس معجزہ کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ایک بہت بڑی بات سامنے آجانے کے بعد چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے پڑنا عجیب سا لگتا ہے اور بے وقوفی معلوم ہوتی ہے اور قرآن کریم میں سوال کے انداز میں مشرکین مکہ کی اسی بے وقوفی کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم جناب نبی اکرم ﷺ کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے اور قیامت تک زندہ رہنے والا معجزہ ہے۔ باقی معجزے وقتی تھے جن پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم نے چاند کو دو ٹکڑے نہیں دیکھا مگر ہمارا ایمان ہے، ہم نے رسول اللہ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے پانی کا چشمہ پھوٹتے نہیں دیکھا مگر ہمارا ایمان ہے، ہم نے آنحضرت ﷺ کی برکت سے چند افراد کا کھانا سینکڑوں حضرات کو سیر ہو کر کھاتے نہیں دیکھا مگر ہمارا ایمان ہے، اسی طرح اور معجزات ہیں جو ہم نے دیکھے نہیں مگر ان میں سے جو بھی صحیح روایات کے ساتھ ثابت ہیں، ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں البتہ قرآن کریم ایک ایسا معجزہ ہے جو ہم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ قرآن کریم کو بھی دیکھ رہے ہیں اور اس کے اعجاز کا بھی مشاہدہ کر رہے ہیں اور قیامت تک لوگ اس زندہ معجزہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہیں گے۔ قرآن کریم کا اعجاز ہے

کہ یہ سینوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور پھر محفوظ رہتا بھی ہے، دنیا میں صرف یہی ایک کتاب ہے جس کے حافظ لاکھوں کروڑوں (ایک کروڑ تیس لاکھ) کی تعداد میں دنیا میں ہر وقت موجود رہتے ہیں، یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے جس کا ذکر خود قرآن کریم میں سورۃ العنکبوت کی انہی آیات سے کچھ پہلے کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کی آیات اہل علم کے سینوں میں محفوظ رہتی ہے۔ فی صدور الذین اوتو العلم۔ اس پر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے اور کتابت امر زائد ہے یعنی قرآن کریم کا اصل مقام یہ ہے کہ اسے سینے میں محفوظ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو بے نیاز ذات ہے اس لیے اس کا کلام بھی بے نیاز ہے، ظاہری اسباب کا محتاج نہیں۔ آج دنیا میں کاغذ، قلم، سیاہی، ڈسک، کیسٹ، سی ڈی، اور اس طرح کے اسباب ختم ہو جائیں اور ان کا وجود باقی نہ رہے تو دنیا کی ہر کتاب ختم ہو جائے گی۔ ہر تحریر اور کلام فنا ہو جائے گا مگر قرآن کریم پھر بھی موجود رہے گا جو ان اسباب سے بے نیاز ہے اور لاکھوں اہل ایمان کے سینوں میں محفوظ ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کے اعجاز کا ایک اور پہلو بھی دیکھ لیں۔ دنیا میں لاکھوں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں مگر ایک کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا ہے تو وہ پہلے سے مختلف ہوتا ہے، تیسرے ایڈیشن میں اور زیادہ فرق ہو جاتا ہے مگر قرآن کریم کے جو چند نسخے سب سے پہلے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں تحریر کیے گئے، ان میں سے تین نسخے اصلی حالت میں آج بھی موجود ہیں، ایک ترکی میں ہے جو استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں ہے، دوسرا تاشقند میں ہے اور تیسرا یہاں لندن کے انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ اس لندن والے نسخہ کی میں نے بھی زیارت کی ہے جس کے آخر میں لکھا ہے کتبہ عثمان بن عفان کہ اس قرآن کریم کو حضرت عثمان بن عفانؓ نے لکھا ہے۔ اس پر بعض عثمانی، صفوی اور مغل حکمرانوں کی مہریں بھی ہیں جن کے پاس باری باری یہ قرآن کریم رہا ہے اور پھر مغل دور کے آخر میں انگریزوں نے وہاں سے لندن منتقل کر دیا تھا۔

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ چودہ سو سال قبل لکھے جانے والے اصل نسخے موجود ہیں اور آج مراکش سے انڈونیشیا تک کسی مسلم مطبع کا چھپا ہوا قرآن کریم لے کر تقابل کر لیں، آپ کو

کوئی فرق دکھائی نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے اسی اعجاز کا ذکر کر رہے ہیں اور مشرکین مکہ سے پوچھ رہے ہیں کہ اتنے بڑے معجزہ کے بعد اور کون سی نشانی مانگتے ہو؟ ان آیات کریمہ کے بارے میں ایک روایت بھی آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں جو امام سیوطیؒ نے مسند دارمی کے حوالے سے لباب النقول فی اسباب النزول میں نقل کی ہے کہ مدینہ منورہ میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ یہودی اور بت پرست بھی رہتے تھے اور مخلوط معاشرہ تھا، شہرداری تھی اس لیے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے، خوشی غمی کی محفلوں میں اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے کی باتیں بھی سنتے تھے، کئی بار ایسا ہوتا کہ صحابہ کرامؓ یہودیوں سے پرانے دور کی اور انبیاء سابقین علیہم السلام کی کوئی بات سنتے تو آپس میں بھی اس پر بحث و گفتگو کرتے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بعض صحابہ کرامؓ کو اونٹ کے کولہے کی ایک ہڈی ملی جس پر تورات کے کچھ احکام درج تھے۔ اس زمانہ میں کاغذ عام نہیں ہوتا تھا اور زیادہ تر ہڈیاں، چوڑے پتھر، بڑے پتے اور درخت کی چھال ہی لکھنے پڑھنے کے کام آتے تھے، اونٹ کے کولہے کی ہڈی کو اس دور کا تختہ سیاہ سمجھ لیں، وہ حضرات اسے اٹھا کر جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ خیال ہوگا کہ رسول اکرمؐ خوش ہوں گے مگر نبی اکرم ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور مسند دارمی کے مطابق ارشاد فرمایا کہ:

"كفى بقوم ضلالة ان يرغبوا عما جاء به نبيهم الى ما جاء به غيره الى غيرهم او كما قال صلى الله عليه وسلم"

یہ روایت امام ابن جریرؒ نے تفسیر طبری میں بھی نقل کی ہے اور اس ارشاد نبویؐ کا معنی یہ ہے کہ کسی قوم کے گمراہ ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی ہدایات و تعلیمات کی بجائے دوسروں کی تعلیمات کی طرف توجہ دینا شروع کر دے۔ اس محاورہ کا ترجمہ میں یوں کرتا ہوں کہ جب کوئی امت اپنے پیغمبر کی تعلیمات کے ہوتے ہوئے دوسروں کی طرف دیکھنا شروع کر دے تو اس کی گمراہی کا آغاز ہو جاتا ہے، یہ فرما کر جناب نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی ہے

"کیا ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ ﷺ پر ہم نے کتاب اتاری ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔ بے شک اس میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور

نصیحت ہے۔"

گویا اس آیت کریمہ میں جہاں کافروں کے لیے یہ پیغام ہے کہ قرآن کریم کے آجانے کے بعد اور کسی نشانی اور معجزہ کا مطالبہ معقولیت نہیں ہے، وہاں ہم مسلمانوں کے لیے بھی اس میں یہ پیغام ہے کہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت کے ہوتے ہوئے راہنمائی کے لیے کسی اور طرف دیکھنا گمراہی ہے اور آج ہم دنیا بھر کے مسلمان اپنی حالت پر غور کریں تو یہی گمراہی ہم پر مسلط ہے کہ قرآن کریم ہمارے گھروں میں ہے، زبانوں پر ہے اور سینوں میں ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت وسیرت سے ہماری الماریاں بھری ہوئی ہیں مگر ہم اپنے اجتماعی معاملات میں راہ نمائی کے لیے ادھر ادھر جھک مارتے پھر رہے ہیں۔ کبھی ماسکو کی طرف دیکھتے ہیں، کبھی واشنگٹن کی طرف دیکھتے ہیں، کبھی لندن کا رخ کر لیتے ہیں، کبھی بیجنگ کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، اور کبھی پیرس سے راہ نمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ گمراہی ہے اور جب تک اس گمراہی سے نجات حاصل کر کے ہم قرآن وسنت کی تعلیمات پر قناعت نہیں کریں گے اور انہیں سینے سے نہیں لگائیں گے، ہدایت اور کامیابی کی منزل کی طرف گامزن نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین یارب العالمین

وحی کی ضرورت اور اس کی حقیقت وماہیت

۱۰ مارچ ۱۹۹۹ء کو جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ راولپنڈی صدر میں بخاری شریف کے سبق کے آغاز پر ایک باوقار تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں راولپنڈی اور اسلام آباد کے علماء کرام اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ بہت سے دیگر شہریوں نے بھی شرکت کی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا حسن جان مدظلہ نے بخاری شریف کی پہلی حدیث کا درس دے کر سبق کا آغاز فرمایا جبکہ ان کے علاوہ شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالسلام، حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب اور مدیر الشریعہ مولانا زاہد الراشدی نے بھی شرکاء سے خطاب کیا۔ مولانا راشدی کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ:

حضرات علماء کرام، محترم بزرگو! دوستو اور عزیز طلبہ!

حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب نے مجھے اور آپ دونوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا حسن جان مدظلہ کے خطاب کے بعد اور شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدظلہ کے خطاب سے پہلے مجھے حکم دیا ہے کہ بخاری شریف کے سبق کے افتتاح کی اس تقریب میں آپ حضرات کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کروں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان دو بزرگوں کے درمیان مجھ جیسا طالب علم کیا بات کرے گا؟ البتہ ایک بات ذہن میں آئی ہے جس سے کچھ حوصلہ ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے نصاب کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر وہ سال کے آغاز اور اختتام پر مکمل ہے تو درمیان میں کسی وقت اس میں کمی بھی ہو جائے تو اس کی کمی کا اعتبار نہیں ہے اس لیے یہ سوچ کر آپ کے

سامنے کھڑا ہو گیا ہوں کہ گفتگو کا آغاز حضرت مولانا حسن جان صاحب نے کیا ہے اور اختتام اور دعاء حضرت مولانا شیر علی شاہ صاحب فرمائیں گے اگر درمیان میں مجھ جیسے طالب علم کی کمزور باتیں بھی ہو جائیں تو تقریب کا نصاب بہر حال متاثر نہیں ہو گا۔

حضرات محترم! امام بخاریؒ نے اپنی عظیم المرتبت کتاب کا آغاز ''بدء الوحی'' سے کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا تھا؟ اسی مناسبت سے حضرت مولانا حسن جان صاحب نے وحی کے حوالہ سے گفتگو فرمائی ہے اور میں بھی ''وحی'' کے بارے میں ہی کچھ طالب علمانہ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

اول یہ کہ وحی کی ضرورت کیا ہے؟ دوسری یہ کہ وحی کی ماہیت کیا ہے؟ اور تیسری یہ کہ بخاری شریف جس علم کی کتاب ہے یعنی حدیث نبویؐ اس علم کا وحی کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ جہاں تک وحی کی ضرورت کا تعلق ہے اس کے بارے میں اتنی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء رضی اللہ عنہا یعنی نسل انسانی کے ماں اور باپ کو زمین پر اتارا تھا تو اترنے کے حکم کے ساتھ ہی ایک ہدایت کی تھی کہ

> قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ ۲: ۳۸-۳۹)
>
> ''زمین پر اتر جاؤ! وہاں میری طرف سے ہدایات آتی رہیں گی جس نے ان ہدایات کی پیروی کی وہ غم اور خوف سے نجات پائے گا اور جس نے انہیں جھٹلا دیا وہ جہنم میں جائے گا۔''

یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زمین ہمارا آبائی وطن نہیں ہے ہمارا آبائی وطن جنت ہے جہاں ہمارے ماں اور باپ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو پیدا کیا گیا۔ زمین میں ہم عارضی طور پر امتحان کے لیے آئے ہیں اور وہ امتحانی عرصہ گزارنے کے بعد ہم نے اس زمین سے واپس چلے جانا ہے۔ البتہ واپس اصلی گھر یعنی جنت میں ان لوگوں کو جانا نصیب ہو گا جو زمین میں اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے امتحان میں کامیاب ہوں گے اور جو لوگ ان ہدایات سے انکار کر دیں گے اور امتحان میں ناکام

ثابت ہوں گے وہ واپس اصلی گھر میں نہیں جائیں گے بلکہ انہیں دوسرے گھر یعنی عذاب کے گھر دوزخ میں جانا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے پہلے دو افراد کو زمین پر اتارتے ہی کہہ دیا تھا کہ انسانی آبادی زمین پر اپنی مرضی میں آزاد نہیں ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایات کی پابند ہوگی۔ یہ ہدایات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہیں اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوئیں۔ ان ہدایات کا نام وحی ہے اور یہ زمین پر نسل انسانی کے لیے خدائی دستور ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے وحی سے کتاب کا آغاز کیا اور اس کے بعد ایمان، علم اور اعمال کے ابواب لائے ہیں اسطرح انہوں نے بتا دیا ہے کہ ہمارے ہاں ایمان و یقین اور علم و عمل سمیت ہر چیز کی بنیاد وحی الٰہی ہے اور ہم ہر معاملہ میں وحی الٰہی کی راہ نمائی حاصل کرنے کے پابند ہیں اور اگر آپ غور فرمائیں تو یہ آج کی انسانی سوسائٹی کا سب سے بڑا مسئلہ بھی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی سے بغاوت کے بعد انسانی سوسائٹی نے جو کئی صدیاں گزاری ہیں اور اپنے مسائل خود حل کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ناکامی کے بعد نسل انسانی کو آج پھر وحی الٰہی کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انسانی سوسائٹی اپنی حکمران خود ہے اور اسے اپنے معاملات طے کرنے کے لیے باہر سے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ آج دنیا بھر میں یہی گمراہی مسلط ہے مگر امام بخاریؒ نے ''بدء الوحی'' سے کتاب کا آغاز کر کے اس تصور کو رد کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر معاملہ میں وحی الٰہی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے اور آسمانی تعلیمات کی پیروی کے بغیر انسانی معاشرہ دنیا یا آخرت کسی جگہ میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ وحی کی ماہیت کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وحی انسان کی اپنی کسی تخلیقی صلاحیت کا ثمرہ ہے یا واقعتاً باہر سے اسے ہدایات ملتی ہیں؟ آج کل عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وحی کا کوئی خارجی وجود نہیں بلکہ بعض انسانوں میں مخصوص قسم کی تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے اور اس صلاحیت کی بنیاد پر وہ جو سوچتے اور کہتے ہیں اس کا نام وحی ہے یہ بات سر سید احمد خان نے لکھی ہے اور آج کی فکری گمراہیوں کا سب سے بڑا سرچشمہ یہی

ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وحی کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے بلکہ شعر و شاعری طرز کی تخلیقی صلاحیت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو ودیعت ہوئی تھی۔ اس حوالہ سے ان پر خاص کیفیت وارد ہوتی تھی۔ اس کیفیت کا نام جبرئیلؑ ہے اور اس کیفیت میں ان کی زبان سے صادر ہونے والے کلام کا نام وحی ہے اس طرح نہ حضرت جبریل علیہ السلام کا کوئی خارجی وجود ہے اور نہ ہی وحی کوئی باہر سے آنے والی ہدایت ہے۔ آج جب کوئی دانش ور جناب نبی اکرم ﷺ کو خراج عقیدت پیش کرنے اور محبت کے اظہار کے ساتھ ان کی ہدایات کی تعریف کرتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات بہت اچھی تھیں مگر آج کے زمانہ کے لیے نہیں تھیں اب زمانہ بدل گیا ہے اس لیے بہت سی اصلاحات کی ضرورت ہے تو اس کے پس منظر میں یہی فکری کجی کارفرما ہوتی ہے کہ وحی خود جناب نبی اکرم ﷺ کی سوچ اور تخلیقی صلاحیت کا ثمرہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اصل واقعہ یہ ہے کہ وحی باہر سے آنے والی ہدایات کا نام ہے جس کو بھیجنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ لانے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام اور وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل ہوئی ہے اس لیے وحی داخلی کیفیات کا نام نہیں بلکہ خارجی ہدایات ہیں۔ کم وبیش یہی بات قادیانی بھی کہتے ہیں مگر اور انداز سے۔ ان کا کہنا ہے کہ نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی چیز ہے۔ یعنی کوئی شخص خود بھی ترقی اور محنت کر کے نبوت کے منصب تک پہنچ سکتا ہے مگر یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ نبوت خالصتاً وہبی منصب ہے جسے خود اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے عطا فرماتے ہیں اور وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی ہدایات کا نام ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہو چکی ہیں اور ان کے بعد نبوت اور وحی کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند ہو چکا ہے۔ تیسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث وسنت کا وحی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس پر بہت کچھ عرض کیا جا سکتا ہے مگر اس موقع پر مختصراً صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث وسنت بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے اور یہ قرآن کریم کا بیان اور اس کی شرح ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے رسول اور نمائندہ کی حیثیت سے فرمائی ہے اس لیے قرآن کریم کی مستند اور سرکاری تشریح یہی ہے۔ اس پر تفصیلات میں جانے کی بجائے ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو خود امام بخاریؒ نے اس کتاب میں نقل کیا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے جلیل

القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ کی جامع مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ ایک درس میں انہوں نے عورتوں کے بارے میں مسائل بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کر دیا کہ

لعن اللہ الواشمات والموتشمات والمتنمصات والمتفلجات، للحسن، المغیرات خلق اللہ

"جسم پر نام گدوانے والی بال اکھاڑنے والی اور ریتی سے دانت رگڑ کر ان کو چھوٹا کرنے والی عورتوں پر خدا کی لعنت ہے۔"

بخاری شریف کی روایت کے مطابق کوفہ کی ایک خاتون ام یعقوبؒ نے یہ بات سنی تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئی اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ بات بیان فرمائی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے اس خاتون نے سوال کیا کہ کیا یہ قرآن میں ہے؟ اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ جب لعنت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو اس کا ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہیے۔ اس لیے اس نے یہ سوال کر دیا۔ ہمارا زمانہ ہوتا اور ہمارے جیسا کوئی ڈھیلا ڈھالا مولوی ہوتا تو گھبرا جاتا کہ قرآن کریم میں تو یہ موجود نہیں ہے۔ مگر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں قرآن کریم میں یہ مسئلہ موجود ہے۔ اس پر اس خاتون نے تعجب اور حیرت کے ساتھ پوچھا کہ قرآن کریم تو میں نے بھی سارا پڑھا ہے اس میں کہیں یہ مسئلہ موجود نہیں ہے حضرت عبداللہ مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر میں فرمایا کہ

وَ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَ مَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (الحشر ۵۹:۷)

"اللہ کے رسول تمہیں جس کام کے کرنے کا حکم دیں وہ کرو اور جس کام سے روکیں اس سے رک جاؤ"

اور جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ نام گدوانے والی، بال اکھاڑنے والی اور دانت رگڑ کر چھوٹے کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ جب اللہ تعالیٰ کے رسول اور نمائندہ ہیں تو اصول یہ ہے کہ نمائندہ کی کوئی بات اپنی نہیں ہوتی بلکہ وہ نمائندہ کی حیثیت سے جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اسی کی طرف سے ہوتی ہے

جس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرما دیا کہ میرا رسول جس کام کے کرنے کا حکم دے وہ کرو اور جس کام سے روکے اس سے رک جاؤ تو اس اصول کے تحت جناب نبی اکرم ﷺ نے جو کچھ بھی فرمایا ہے اور جو کچھ بھی کہا ہے وہ قرآنی تعلیمات کا ہی حصہ ہے اور اسے قرآن پاک سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کم ہے اس لیے انہی گزارشات پر اکتفاء کرتا ہوں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِیْنَ۔

امام بخاریؒ اور بخاری شریف

۱۲ نومبر ۹۸ء کو جامعہ مدینۃ العلم بکر منڈی فیصل آباد میں بخاری شریف کے اختتام کی سالانہ تقریب ہوئی۔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدظلہ نے آخری حدیث پڑھا کر دورہ حدیث کے طلبہ کو بخاری شریف مکمل کرائی جبکہ مولانا محمد ضیاء القاسمی، مولانا محمد رفیق جامی، مولانا محمد الیاس، الحاج سید امین گیلانی اور دیگر حضرات کے علاوہ مدیر ''الشریعہ'' مولانا زاہد الراشدی نے بھی اس تقریب سے خطاب کیا۔ ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

حضرات علماء کرام اور عزیز طلبہ! ختم بخاری شریف کی اس تقریب میں شرکت اور کچھ عرض کرنے کا موقع میرے لیے سعادت کی بات ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

بخاری شریف کی آخری حدیث کے حوالہ سے علمی مباحث تو حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ آپ کے سامنے رکھیں گے البتہ کتاب کے موضوع اور صاحب کتاب کے بارے میں چند معروضات ضروری سمجھتا ہوں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں۔

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز ''بدء الوحی'' سے کیا ہے اور اس کے بعد کتاب الایمان اور کتاب العلم اور پھر اعمال کے ابواب شروع کیے ہیں جس سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایمان، علم اور عمل تینوں کی بنیاد وحی پر ہے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے اور آج کے دور میں بھی انسانی معاشرے کو سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش ہے کہ اسے اپنے تمام معاملات

خود طے کرنے ہیں یا آسمانی ہدایات کی پابندی قبول کرنی ہے۔اس لیے امام بخاریؒ نے ابتداء میں ہی بات واضح کر دی ہے کہ اسلام میں تمام امور کی بنیاد وحی پر ہے اور آسمانی تعلیمات کے دائرے سے ہٹ کر کوئی یقین، کوئی علم اور کوئی عمل قابل قبول نہیں ہے۔

اسی طرح امام بخاریؒ نے "الجامع الصحیح" کا اختتام جس کتاب پر کیا ہے اس کا عنوان ہے "باب الرد علی لجهمية" جهميه قرن اول کے گمراہ فرقوں میں سے ایک ہے جنہوں نے فلسفیانہ موشگافیوں میں پڑ کر اسلامی عقائد کی گمراہ کن تعبیرات شروع کر دی تھیں۔ یہ گمراہ فرقے یونانی فلسفہ کے مسلمانوں میں پھیلنے کے بعد رونما ہوئے تھے اور علماء امت نے ہر دور میں ان کے عقائد اور تعبیرات کو مسترد کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی ان گروہوں کے عقائد و تعبیرات کے خلاف مختلف ابواب میں روایات پیش کی ہیں اور اسی عنوان پر کتاب کا اختتام کر کے یہ بتایا ہے کہ جہاں اپنے ایمان، علم اور عمل کی بنیاد وحی پر رکھنا ضروری ہے وہاں انہیں غلط تعبیرات سے محفوظ رکھنا اور گمراہ فرقوں پر نظر رکھنا اور ان کا تعاقب کرنا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ امام بخاریؒ نے جن فتنوں اور گمراہ گروہوں کا رد کیا ہے ان میں سے بیشتر یونانی فلسفہ کی پیداوار تھے۔ اب ان گروہوں کا بحیثیت گروہ دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے البتہ جراثیم باقی ہیں جو مختلف ذہنوں میں جگہ بنائے ہوئے ہیں اور ان کا کبھی کبھار اظہار ہوتا رہتا ہے۔ آج کے دور کے فتنے اس سے مختلف ہیں۔ آج دنیا پر مغرب کے سیکولر فلسفے کی یلغار ہے اور اس نے ایمان، علم اور اعمال کے حوالہ سے ہمارے لیے نئے نئے فتنے کھڑے کر دیے ہیں۔ آج علماءؒ کو ان کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، اور جس طرح یونانی فلسفہ کی کارفرمائی کے دور میں اس وقت کے علماء نے یونانی فلسفہ پر عبور حاصل کر کے اس کے پیدا کردہ فتنوں کا مقابلہ کیا تھا، آج کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغرب کے سیکولر فلسفے کو سمجھیں اور اس کی پیدا کردہ علمی اور فکری گمراہیوں کا تعاقب کریں۔

یہ دو باتیں تو کتاب کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا تھا۔ اب دو باتیں صاحب کتاب کے حوالہ سے گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ "الجامع الصحیح" کے مصنف امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ جلیل القدر محدث ہیں اور امت کے بڑے ائمہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے

حالات زندگی کا آپ حضرات نے مطالعہ کیا ہوگا۔ میں ان کے ایک واقعہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ انہیں ایک موقع پر بعض علماء کی مخالفت کی وجہ سے نیشاپور چھوڑنا پڑا تھا۔ اصل وجہ خواہ کچھ لوگوں کا حسد ہو مگر ظاہری وجہ یہ بنی تھی کہ ''خلق قرآن'' کے مسئلہ پر امام بخاریؒ نے جو تعبیر اختیار کی تھی اسے ان کی مخالفت کا بہانہ بنا لیا گیا تھا۔ اس مسئلہ پر امت کے دو بڑے اماموں امام احمد بن حنبلؒ اور امام محمد ابن اسماعیل بخاریؒ کی تعبیرات کو سامنے رکھیں تو اصل مسئلہ واضح ہوگا۔ امام احمدؒ کے سامنے وہ لوگ تھے جو قرآن کریم کو کلام الٰہی کی صورت میں صفت خداوندی نہیں مانتے تھے اور مخلوق شمار کرتے تھے اس لیے انہیں مصائب و مشکلات کی پروا کیے بغیر یہ اعلان کرنا پڑا کہ القرآن کلام الله غیر مخلوق اس کے لیے انہوں نے کوڑے بھی کھائے مگر عزیمت و استقامت کی ایک داستان رقم کردی۔ دوسری طرف امام بخاریؒ کے سامنے وہ حضرات تھے جو ''غیر مخلوق'' کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اس میں انسانی تلفظ اور اس کے دیگر متعلقات کو بھی شامل کرنے لگے تھے اس لیے انہوں نے لفظی بالقرآن مخلوق اور افعال العباد کلها مخلوقة کا نعرہ لگایا اور اس پر قائم رہتے ہوئے نیشاپور سے جلاوطنی قبول کرلی۔

دونوں امام بظاہر ایک دوسرے کے خلاف بات کر رہے ہیں۔ دونوں امت کے جلیل القدر امام ہیں اور دونوں نے اپنے اپنے موقف کی خاطر صعوبتیں برداشت کی ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ دونوں کا موقف ایک ہے اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نہ امام بخاریؒ کلام الٰہی کو مخلوق کہہ رہے ہیں اور نہ امام احمدؒ کے نزدیک انسانی تلفظ غیر مخلوق ہے۔ دونوں نے اس عقیدہ کی انتہا پسندانہ تعبیرات کو رد کیا ہے اور اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک اعتدال کی ترجمانی کی ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ عقائد کی تعبیر میں انتہائی احتیاط اور توازن کی ضرورت ہے۔ کسی بھی اسلامی عقیدہ کی کوئی انتہا پسندانہ تعبیر کی جائے گی تو فتنہ پھیلے گا، خرابی پیدا ہوگی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اسلامی عقائد کو تعبیر کا جامہ پہناتے ہوئے اعتدال اور توازن کو ملحوظ رکھا جائے اور کسی بھی عقیدہ کی کسی انتہا پسندانہ تعبیر سے گریز کیا جائے۔

امام بخاریؒ کے حوالہ سے دوسری بات یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہیں زندگی کے

آخری لمحات میں اپنے آبائی شہر ’’بخارا‘‘ کو بھی چھوڑنا پڑا تھا اور ان کی وفات سمرقند کے قریب ایک بستی ’’خرتنگ‘‘ میں ہوئی ہے جہاں ان کی قبر کی زیارت بحمد اللہ تعالیٰ میں نے بھی کی ہے۔ انہیں بخارا سے نکلنا پڑا تھا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بخارا کے امیر خالد بن احمد نے ان سے تقاضہ کیا کہ وہ اس کے گھر آ کر اس کے بچوں کو حدیث اور تاریخ پڑھائیں۔ امام بخاریؒ نے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا جسے پڑھنا ہو ان کی مجلس میں آ کر پڑھے۔ اس کے بعد امیر بخارا نے فرمائش کی کہ اپنی مجلس میں اس کے بچوں کی تعلیم کے لیے الگ وقت مخصوص کر دیں۔ امام بخاریؒ نے اس کو بھی گوارا نہیں کیا اور فرمایا کہ انہیں اگر پڑھنا ہے تو عام مجلس میں دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھیں۔ یہ بات امیر بخارا کی ناراضگی کا باعث بنی اور امام بخاریؒ کے خلاف سازشوں کا آغاز ہو گیا جس کے نتیجے میں امام بخاریؒ کو بخارا چھوڑنا پڑا اور ’’خرتنگ‘‘ میں مسافرت اور کسمپرسی کے عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس واقعہ میں ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ علم کا وقار قائم رکھنا اور اسے امراء کے دروازوں پر رسوا ہونے سے بچانا بھی اہل علم کی ذمہ داری ہے خواہ اس کے لیے ذاتی طور پر کتنی ہی تکلیف اور پریشانی اٹھانا پڑے اور امام بخاریؒ کی زندگی کا آخری سبق ہمارے لیے یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

نیکی اور اس کی حفاظت

"مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ میں ششماہی امتحان کے بعد دو ہفتے کی تعطیلات کے موقع پر شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی نے امریکہ اور برطانیہ کا تبلیغی اور مطالعاتی دورہ کیا۔ وہ ۱۰ مئی ۲۰۰۳ء کی شام واشنگٹن پہنچے اور امریکہ میں دو ہفتے قیام کے دوران انہوں نے دارالہدیٰ سپرنگ فیلڈ واشنگٹن، دارالعلوم کوئینز نیو یارک، مکی مسجد بروک لین نیو یارک، دارالعلوم مدنیہ بفیلو و دیگر مقامات میں دینی اجتماعات سے خطاب کیا اور مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلم رہنماؤں سے عالم اسلام کی تازہ ترین صورت حال اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے مسائل پر تبادلہ خیالات کیا۔ واپسی پر وہ ۲۵ مئی کو لندن پہنچے اور چار روزہ قیام کے دوران لندن، برمنگھم، نوٹنگھم، مانچسٹر اور برنلی میں سرکردہ مسلم رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں جبکہ ۲۹ مئی کو وہ گوجرانوالہ واپس پہنچ گئے۔ ۲۳ مئی کو جامع مسجد دارالہدیٰ سپرنگ فیلڈ ورجینیا واشنگٹن میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے مولانا زاہد الراشدیؔ کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے"۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا الَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا (کہف ۱۸: ۱۰۳-۱۰۴)

"اے پیغمبرؐ! کہہ دیجیے کہ کیا ہم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نہ بتائیں جو اعمال کے لحاظ سے زیادہ خسارے میں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی اس دنیا کی زندگی میں رائیگاں چلی گئی حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں"۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے سورۃ الکہف کے آخری رکوع کی ایک

آیت کریمہ تلاوت کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک اہم مسئلہ کی طرف ہمیں توجہ دلائی ہے، وہ یہ کہ دنیا میں ہر مسلمان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائے اور ثواب والے کام کرے تا کہ یہ ثواب اور نیکیاں آخرت میں اس کے کام آئیں لیکن جس طرح نیکیاں کمانا ضروری ہے اسی طرح ان کی حفاظت بھی ضروری ہے کیونکہ بسا اوقات کمائی ہوئی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں اور کیے ہوئے نیک اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو نیکی کے بارے میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ بعض دوست پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب یہ جو روزانہ ہم سنتے اور پڑھتے ہیں کہ فلاں کام کرنے سے اتنی نیکیاں ملتی ہیں تو یہ نیکیاں کیا چیز ہیں اور کس شکل میں ملتی ہیں؟ میں اس سوال کے جواب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ نیکیاں آخرت کی کرنسی ہیں جس طرح اس دنیا کے معاملات روپے پیسے سے طے ہوتے ہیں اسی طرح آنے والی زندگی میں اور آخرت میں باہمی معاملات نیکیوں اور بدیوں کے ذریعہ طے ہوں گے، آج جس طرح ہم ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں اور بارڈر کراس کرتے ہیں تو ہمیں وہاں لین دین اور معاملات کے لیے اس ملک کی کرنسی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم بارڈر کراس کرنے سے قبل اس کا انتظام کر کے اس ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح موت بھی دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے، وہاں جانے سے قبل نیکیوں کا اتنا ذخیرہ جمع کر لینا چاہیے کہ وہاں کی زندگی آسانی کے ساتھ گزاری جا سکے، موت کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ موت فنا ہو جانے کا نام ہے یہ غلط بات ہے، یہ مشرکین کا عقیدہ تھا مشرکین کہتے تھے:

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ﴿۸۲﴾ (المومنون ۲۳:۸۲)

"کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے کیا ہم دوبارہ اٹھائیں جائیں گے"۔

جس کی قرآن کریم نے جابجا صراحت کے ساتھ تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ موت فنا ہو جانے کا نام نہیں بلکہ دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہونے اور اس جہان کا بارڈر کراس کر کے دوسرے جہان میں داخل ہو جانے کا نام ہے۔ اس اگلے جہان کے معاملات نیکی اور بدی کی کرنسی میں طے ہوں گے اور بہت سے مقامات پر باہمی حقوق کا فیصلہ کرتے وقت نیکیوں اور گناہوں کا تبالہ کر کے حساب برابر کرنا ہوگا۔ اس لیے قرآن کریم نے ترغیب دی ہے اور

جناب رسالت مآب ﷺ نے تلقین فرمائی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ثواب کماؤ اور جتنی زیادہ ہو سکے نیکیاں حاصل کرو تا کہ آخرت کی زندگی اور قیامت کے دن کے حساب کتاب میں تم سرخرو ہوسکو لیکن جو آیت کریمہ میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس میں اللہ رب العزت نے اس کے دوسرے پہلو کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ نیکیاں کمانے کے ساتھ ان کی حفاظت کرنا اور آخرت کے حساب کتاب کے وقت تک انہیں بچا کر رکھنا بھی ضروری ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (کہف ۱۸: ۱۰۳-۱۰۴)

"اے پیغمبرؐ! کہہ دیجیے کہ کیا ہم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نہ بتائیں جو اعمال کے لحاظ سے زیادہ خسارے میں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی اس دنیا کی زندگی میں رائیگاں چلی گئی حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں"۔

ایک خسارہ یہ ہے کہ کوئی شخص سرے سے کماتا ہی نہیں ہے، یہ شخص بھی خسارے میں ہے لیکن دوسرا خسارہ یہ ہے کہ ایک شخص محنت مزدوری کرتا ہے اور سارا دن مشقت کر کے کمائی کرتا ہے لیکن اپنی کمائی ہوئی رقم کی حفاظت نہیں کر پاتا اور وہ گھر پہنچنے سے قبل راستہ میں ہی کہیں ضائع ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ دوسرا شخص پہلے سے زیادہ خسارے میں ہے اور اس نے زیادہ نقصان اٹھایا ہے کہ محنت و مشقت بھی کی لیکن اپنی محنت کی کمائی سے ضرورت کے وقت فائدہ نہ اٹھا سکا۔ یہی بات قرآن کریم نے نیکیوں کے بارے میں فرمائی ہے کہ جو شخص سرے سے نیکی نہیں کماتا وہ بھی خسارے میں ہے لیکن جو نیکیاں کما کر برباد کر دیتا ہے وہ اس سے زیادہ خسارے میں ہے، نیکی! "وہ کام کی ہے" جو آخرت کے حساب کتاب تک انسان کے ساتھ جائے اور جو راستے میں ہی کہیں برباد ہو جائے وہ کسی کام کی نہیں ہے بلکہ بسا اوقات الٹا وبال کا باعث بن سکتی ہے۔ قرآن کریم نے ایسے متعدد افعال و اعمال کی نشاندہی کی ہے جو نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں جس طرح بعض وائرس کمپیوٹر کے پروگراموں کو صاف کر دیتے ہیں اور انسان کا کیا ہوا کام ضائع ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح بعض اعمال ایسے ہیں جن کے ارتکاب سے ایک انسان کی نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں اور حاصل کیا ہوا ثواب برباد ہو جاتا ہے۔

نیکیاں برباد کرنے والا پہلا کام شرک: مثلاً شرک کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس سے اعمال حبط (برباد) ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اللہ رب العزت نے خود جناب نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر ۳۹:۶۵) اگر خدانخواستہ آپ ﷺ سے شرک سرزد ہو جائے تو آپ کی نیکیاں بھی برباد ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدانخواستہ جناب نبی اکرم ﷺ سے شرک کا صدور ممکن ہے ایسا نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے شرک کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس آیت کریمہ کے ذریعہ ہمیں سمجھانا مقصود ہے کہ شرک اتنا سنگین جرم ہے کہ اگر خوانخواستہ سرور کائنات ﷺ سے سرزد ہو جائے تو ان کے اعمال بھی حبط ہو جائیں گے تو شرک ایسا عمل ہے جو نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے، ثواب کو کھا جاتا ہے اور انسان کے کیے ہوئے اعمال اس کی نحوست سے غارت ہو جاتے ہیں۔

نیکیاں برباد کرنے والا دوسرا کام: اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات میں جناب نبی اکرم ﷺ کی مجلس ومحفل کے آداب بیان کرتے ہوئے ذکر فرمایا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٢﴾ (الحجرات ۴۹:۱-۲) "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور اے ایمان والو! تمہاری آواز جناب نبی اکرم ﷺ کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور بھی نہ ہو۔" یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے بعد دوسرا سنگین جرم جس سے نیکیاں برباد ہوتی ہیں وہ جناب نبی اکرم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی اور دربار رسالت کی بے ادبی ہے جس سے خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبردار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میرے رسول کی شان میں تمہارا کوئی گستاخانہ طرز عمل تمہاری بے خبری میں بھی زندگی بھر کی نیکیاں برباد کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔

نیکیاں برباد کرنے والا تیسرا کام: اس کے علاوہ سورۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کریم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (محمد ۴۷:۹) انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے احکام و آیات کے بارے میں ناپسندیدگی اور کراہت کا

اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال برباد کر دیے یعنی قرآن کریم کی آیات، احکام اور ارشادات کے بارے میں خدانخواستہ کراہت یا ناپسندیدگی کا کسی بھی درجہ میں اظہار ایسا سنگین جرم ہے جس سے حاصل کیا ہوا ثواب ضائع ہو جاتا ہے اور انسان کی کی ہوئی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

نیکیاں برباد کرنے والا چوتھا کام: قرآن کریم نے ایک اور عمل کا بھی ذکر کیا ہے جو نیکیوں کو ضائع کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور وہ ہے کسی پر احسان کر کے اسے جتلانا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (البقرہ ۲:۲۶) ”اے ایمان والو! اپنے صدقات کو منّ اور أذی کے ساتھ باطل نہ کرو“ منّ کی تشریح مفسرین کرامؒ یہ کرتے ہیں کہ کسی پر صدقہ کیا ہے یا کسی کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے اور اس کے بعد اسے منہ پر جتلایا ہے کہ میں نے تم پر یہ خرچ کیا تھا اور تمہارے ساتھ یہ نیکی کی تھی جبکہ أذی کی تشریح بعض مفسرینؒ کے نزدیک یہ ہے کہ جس پر صدقہ یا احسان کیا ہے اسے براہ راست منہ پر تو نہیں جتلایا لیکن اس کی غیر حاضری میں کسی کے سامنے اس نیکی کا اس انداز سے ذکر کر دیا ہے جس سے اس شخص کو اذیت پہنچتی ہو تو ایسا کرنا بھی ممنوع ہے اور ایسا کرنے سے بھی صدقے کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب صدقہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہے اور اس کا ثواب بھی اسی سے لینا ہے تو پھر بندے کو جتلانے کا کوئی معنیٰ نہیں اور اگر براہ راست بندے کو جتلا کر یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے تجھے ہی دیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ سے اس کے ثواب کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

احادیث میں نیکیاں برباد کرنے والے کاموں کا ذکر: جناب نبی اکرم ﷺ نے بھی بعض اعمال کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان سے ایک مسلمان کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں مثلاً حسد کے بارے میں فرمایا کہ اِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ ”حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے“۔

حسد ایک منفی جذبہ ہے جس کا شمار اخلاق رذیلہ میں ہوتا ہے۔ حسد اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے کسی بھائی، دوست یا رشتہ دار کو اچھی حالت میں دیکھ کر دل میں کڑھن محسوس کرے کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھے تو اس کی طبیعت تنگ پڑے اور اس کے دل میں یہ خیال آئے کہ یہ نعمت مجھے نہیں ملی تو اسے کیوں ملی ہے؟ اور اگر میرے پاس یہ نعمت نہیں ہے تو خدا کرے اس

کے پاس بھی نہ رہے، یہ منفی جذبہ ہے، بد اخلاقی ہے اور اتنا برا عمل ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق انسان کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو لمحوں میں جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

اس کے برعکس ایک اور جذبہ جو مثبت ہے اور اچھا جذبہ ہے جسے عربی میں غبطہ کہتے ہیں اور اردو میں اسے رشک کہا جاتا ہے، یہ جذبہ یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے شخص کو اچھی حالت میں دیکھے یا اس کے پاس کوئی نعمت اسے نظر آئے تو خوش ہو اور دل میں یہ تمنا کرے کہ یا اللہ جس طرح آپ نے میرے اس بھائی پر مہربانی فرمائی ہے مجھ پر بھی اسی طرح مہربانی فرما دیں، یہ محمود جذبہ ہے، اخلاق حسنہ میں سے ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اور بھی بہت برے اعمال مذکور ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اعمال انسان کی نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں اور اس کے نیک اعمال کو غارت کر دیتے ہیں۔ اختصار کی وجہ سے ان میں سے چند کا میں نے ذکر کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ ہم جس طرح نیکیاں کمانے کی محنت کرتے ہیں، ثواب کے حصول کے لیے مشقت کرتے ہیں اسی طرح ان نیکیوں کو بچانے اور بچا کر آخرت کے گھر تک لے جانے کی فکر بھی کرنی چاہیے ورنہ اگر قیامت کے روز نیکیوں کا خانہ خالی نکلا اور اس وقت پتہ چلا جو تھوڑی بہت نیکیاں کمائی تھیں وہ بھی دوسرے اعمال کی وجہ سے برباد ہو چکی ہیں تو یہ بہت بڑے خسارے کی بات ہوگی اور اس سے بڑے خسارے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں، ان کی حفاظت کریں اور ایسے اعمال سے بچنے کی کوشش کریں جو نیکیوں کو برباد کرتے ہیں تا کہ جو تھوڑی بہت نیکی اور ثواب ہم کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں وہ آخرت میں ہمارے کام آ جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین یارب العالمین۔

جناب رسول کریم ﷺ
کی
دس نصیحتیں

گزشتہ روز ایک دینی محفل میں جناب سرور کائنات ﷺ کے ان دس نصائح کا قدرے تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہوا جو نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو فرمائی تھیں تو محفل میں شریک ایک دوست نے خواہش کا اظہار کیا کہ ان نصائح اور ان کے حوالہ سے کی گئی گزارشات کو ضبط تحریر میں بھی آنا چاہیے چنانچہ اسی خیال سے انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے بھی اسے نقل کیا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے مجھے دس باتوں کی بطور خاص نصیحت فرمائی جو یہ ہیں

۱۔ ”اے معاذ! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تجھے جلا دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔“

شرک سب گناہوں سے بڑا گناہ اور سب نافرمانیوں سے بڑی نافرمانی ہے جو اللہ تعالیٰ کو کسی حالت میں گوارا نہیں ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ اور دوسرے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کا اولین نکتہ یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے اور اس کی ذات صفات، اختیارات، اور افعال میں کسی اور کو شریک نہ مانا جائے حتیٰ کہ اگر کسی موقع پر ایک مسلمان کو شرک اور قتل میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑے تو اس کے لیے عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ وہ قتل ہونا قبول کر لے مگر اپنے ایمان کے دامن کو شرک سے آلودہ نہ کرے۔

۲۔ ”ماں باپ کی نافرمانی ہرگز نہ کرنا اگرچہ وہ تجھے گھربار چھوڑ دینے کا حکم دیں۔“

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے متعدد مقامات پر اپنی توحید اور بندگی کے ساتھ ماں باپ کی فرمانبرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے جس کی وجہ مفسرین کرامؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس سب سے بڑی دولت اور نعمت اس کی زندگی ہے اور زندگی دینے والا خدا ہے مگر انسان کے وجود اور زندگی کا ظاہری ذریعہ ماں باپ ہیں۔ اس لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہنا ضروری ہے اسی طرح ماں باپ کی شکر گزاری بھی واجب ہے اور ماں باپ کا حق یہ ہے کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے کسی واضح حکم کی خلاف ورزی کی بات نہ کریں ان کے حکم کو ماننا شرعاً ضروری ہے۔

۳۔ ''فرض نماز عملاً ہرگز ترک نہ کرنا کیونکہ جس نے فرض نماز جان بوجھ کو چھوڑ دی اللہ تعالیٰ کا ذمہ اس سے اٹھ گیا۔''

ہر مسلمان مرد اور عورت پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں جن کو بلا عذر ترک کرنا کبیرہ گناہ ہے اور اگر کوئی فرض نماز رہ گئی ہے تو جب تک اس کی قضا نہیں کرے گا اور توبہ استغفار نہیں کرے گا یہ گناہ معاف نہیں ہوگا اس لیے ہر مسلمان کو نماز کی پابندی کرنی چاہیے۔ جو مسلمان نمازوں کی پابندی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کی نگرانی اور حفاظت میں آجاتا ہے اور جب کوئی شخص جان بوجھ کر فرض نماز ترک کرتا ہے تو یہ حفاظت اس سے اٹھ جاتی ہے۔

۴۔ ''شراب ہرگز نہ پینا اس لیے کہ یہ ہر برائی کی جڑ ہے۔''

شراب کو قرآن کریم نے ''گندگی'' کہا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے ''ام الخبائث'' قرار دیا ہے۔ شراب اسلام میں حرام ہے اور شراب کی طرح ہر وہ چیز حرام ہے جو نشہ دیتی ہے جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ نشہ دینے والی ہر چیز حرام ہے اور اس کا استعمال کبیرہ گناہ ہے اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ایسی گندگی سے خود کو دور رکھے اور شراب سمیت نشہ والی کوئی چیز استعمال نہ کرے۔

۵۔ ''نافرمانی سے بچ کر رہنا اس لیے کہ نافرمانی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنتی ہے۔''

یہاں نافرمانی سے مراد کسی انسان کا وہ عمومی رویہ ہے جو وہ احکام الٰہی کے بارے میں اختیار کرتا ہے کسی فریضہ میں اچانک کوتاہی ہوگئی ہے یا کسی شرعی حکم پر عمل نہیں ہوسکا تو یہ بھی گناہ کی بات ہے اور اس کی تلافی اور معافی کی کوشش کرنی چاہیے لیکن شرعی احکام کے بارے

میں کسی کا عمومی طرزِ عمل یہ ہو گیا ہے کہ نہ ماننے اور عمل نہ کرنے کا مزاج بن گیا تو ایسا شخص ''نافرمان'' کہلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستوجب قرار پاتا ہے اس لیے ہم سب کو اپنے عمومی طرزِ عمل کا جائزہ لینا چاہیے کہ قرآن وسنت کے احکام اور ہدایات کے حوالہ سے ہمارا رویہ کیا ہے اور ایسے طرزِ عمل سے گریز کرنا چاہیے جس پر نافرمانی کا اطلاق ہو سکے۔

۶۔ ''میدان جہاد سے فرار اختیار نہ کرنا اگرچہ لوگ ہلاک ہو رہے ہوں۔''

جہاد اور اس میں ثابت قدمی دینی تقاضوں اور فرائض میں سے ہے اور میدان جہاد میں دشمن کے ساتھ لڑتے ہوئے موت کے خوف سے بھاگنا کبیرہ گناہ ہے جس کی قرآن کریم نے بھی مذمت کی ہے۔ اس لیے کہ موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو اپنے وقت پر ہر حالت میں آ کر رہے گی اور جہاد سے بھاگنا دراصل اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھاگنا ہے جو شدید ترین نافرمانی ہے البتہ جنگی حکمت کے تحت جگہ بدلنا اور عسکری ضرورت کے تحت پیچھے ہٹنا اس میں شامل نہیں۔

۷۔ ''جب کسی جگہ موت کی وباء ہو اور تم وہاں ہو تو ثابت قدم رہو۔''

شرعی مسئلہ یہ ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ہدایت ہے کہ اگر کسی جگہ ایسی وبا پھیل جائے کہ عام موتیں ہو رہی ہوں مثلاً ہیضہ اور طاعون وغیرہ تو وہاں رہنے والوں میں سے کوئی باہر نہ جائے اور نہ ہی باہر سے کوئی وہاں جائے اس پس منظر میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر ایسی صورتحال پیش آ جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقدیر پر صابر و شاکر رہتے ہوئے وہاں سے فرار اختیار نہ کیا جائے۔

۸۔ ''اپنے اہل وعیال پر اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرتے رہو۔''

گھر کے سربراہ پر اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری ہے اور بیوی، بچوں اور زیر کفالت افراد کے اخراجات اس کا ذمہ ہیں لیکن اس کے لیے ہدایت یہ ہے کہ اس کی مالی حیثیت کے مطابق ہوں اگر وہ اپنی حیثیت اور وسعت سے کم خرچ کرتا ہے اور ضروریات فراہم نہیں کرتا تو وہ بیوی بچوں کی حق تلفی کر رہا ہے اور اگر بیوی بچے اس کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ کا اس سے مطالبہ کرتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ اسلام نے اس بارے میں حقیقت پسندی اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس سلسلہ میں کوتاہی ہوتی ہے جس سے خاندان اور معاشرت کے نظام میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں

اگر ہم سب اپنے اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے مطابق میانہ روی اور توازن اختیار کریں تو بے شمار مسائل سے خود بخود جان چھوٹ جائے۔

۹۔ ''ان پر سے اپنے ادب کا ڈنڈا نہ اٹھاؤ۔''

یہ محاورہ کی زبان میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ گھر کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا رعب گھر کے ماحول میں قائم رہنا چاہیے تاکہ گھر کا نظام صحیح طریقہ سے چلتا رہے اور کوئی خرابی نظر آئے تو وہ اس کی اصلاح کر سکے۔ ضروری نہیں کہ ڈنڈا ہاتھ میں لیکر گھر والوں پر برساتا ہی رہے اصل مقصد گھر کے نظام کا کنٹرول اور اس کا ذریعہ خرابیوں کی اصلاح اور نظام کو صحیح طور پر چلانا ہے جو حکمت و دانش اور محبت و اعتماد کی فضا میں زیادہ موثر طریقہ سے قائم ہوتا ہے اس سلسلہ میں خود جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی بیوی، بچے حتیٰ کہ خادم پر بھی کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا اور محبت و اعتماد کے ساتھ گھر کے نظام کو کنٹرول میں رکھا ہے البتہ کبھی اشد مجبوری ہو اور اصلاح کے دیگر ذرائع ناکام ہو جائیں تو بقدرِ ضرورت ڈنڈے کے استعمال کی بھی گنجائش موجود ہے۔

۱۰۔ ''اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات میں ڈراتے رہو۔''

یعنی بیوی بچوں اور زیرِ کفالت افراد کے بارے میں گھر کے سربراہ کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ان کو کھلائے پلائے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کرے بلکہ یہ بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ ان کی دینی تعلیم و تربیت اخلاق و عادات کی اصلاح اور ایمان و عقیدہ کی درستگی و پختگی کا خیال رکھے کیونکہ اگر گھر کے سربراہ کی غفلت اور بے پرواہی کی وجہ سے گھر کے افراد دین سے دور رہیں گے ان کے عقائد خراب ہونگے اعمال و عبادات میں کوتاہی ہوگی اور اخلاق و عادات میں بگاڑ ہوگا اس لیے اس طرف بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو جناب نبی اکرم ﷺ کی ان ہدایات پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین، یا رب العالمین۔

زلزلہ کے تناظر میں گردش کرتے تین سوال!

مختصر تعارف جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم

جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم ہمارے ملک کے پرانے دینی مدارس میں سے ہے اور حضرت مولانا عبداللطیف جہلمی رحمہ اللہ کی یادگار اور صدقہ جاریہ ہے حضرت مولانا عبداللطیف جہلمی دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے خلیفہ مجاز تھے اور وکیلِ صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ کے رفیق کار اور دست راست تھے ساری زندگی اہل سنت کے عقائد وحقوق کے تحفظ اور علماء دیوبند کے مسلک وخدمات کی اشاعت وفروغ کی جدوجہد میں گزری۔ 26/نومبر 2005ء کو مجھے جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام کے سالانہ جلسہ دستار بندی میں رات کی نشست سے خطاب کا موقع ملا۔ گفتگو کا عنوان ''حالات حاضرہ'' تھا اس گفتگو کا خلاصہ تھوڑے سے حذف و اضافہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم کے سالانہ جلسہ میں گفتگو کرتے ہوئے میری نظروں کے سامنے اس اسٹیج کا وہ پرانا منظر گھوم گیا جب اس اسٹیج پر حضرت مولانا عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ حضرت مولانا حکیم سید علی شاہ رحمہ اللہ آف ڈومیلی اور حضرت مولانا عبداللطیف جہلمی رحمہ اللہ جیسے بزرگ تشریف فرما ہوتے تھے اور ہم ان کی زیارت اور ارشادات سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ مجھ سے پہلے قاری سید انوار الحسن شاہ نے قرآن کریم کی تلاوت کی تو ایک اور بزرگ کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا، ان کے والد محترم حضرت مولانا قاری سید محمد حسن شاہ صاحب رحمہ اللہ ہمارے بزرگوں میں سے تھے میرے تو دادا استاد

تھے ہمارے پاس گکھڑ میں تشریف لایا کرتے تھے اور میں نے جن چند بزرگوں کو حفظ قرآن کریم کا آخری سبق سنایا ان میں وہ بھی شامل تھے اب یہ بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی یادگاریں اور صدقات جاریہ موجود ہیں ان کی نسبت باقی ہے اور یہی نسبت ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس نسبت پر قائم رہنے اور اس کا حق ادا کرنے کی توفیق دیں۔ (آمین یارب العالمین)۔

مجھے گفتگو کے لیے ''حالات حاضرہ'' کا عنوان دیا گیا اور اس حوالے سے آج کا اہم موضوع زلزلہ اور اس کے اثرات ہیں اس پر ملک بھر میں گفتگو ہو رہی ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے مختلف قسم کے شکوک وشبہات پھیلائے جا رہے ہیں اور ہر سطح پر میڈیا اور لابیاں اس کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

میں اس کے ایک دوسرے پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس وقت اس کے بارے میں مختلف حلقوں میں جو بحث ہو رہی ہے اس میں دو تین سوالات بطور خاص زیر بحث ہیں ایک یہ کہ زلزلہ کون لایا ہے؟ دوسرا یہ کہ یہ زلزلے اور دیگر آفتیں کیوں آتی ہیں؟ اور تیسرا یہ کہ زلزلے سے ہونے والی خوفناک تباہی کے بعد اس کے نقصانات کو کم کرنے اور اس کے اثرات کو سمیٹنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اور میں انہی سوالات پر کچھ نگارشات پیش کروں گا۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتا ہے اس لیے یہ سوال کہ زلزلہ کون لایا ہے؟ بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے اس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بعض دانش وروں کی طرف سے کھلے بندوں یہ کہا جا رہا ہے کہ اس زلزلہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ یا سزا سمجھنے کی بجائے فطری قوانین اور نیچرل سورسز کی کاروائی سمجھا جائے کہ ایسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے اور نیچرل سورسز کے حوالے سے یہ معمول کی کارروائی ہے ایک ممتاز دانش ور نے ایک بڑے قومی اخبار میں یہ بات تحریر کی تو میں نے انہیں خط لکھا کہ اگر فطری قوانین خود مختار اور خود کار ہیں تو اسے کسی حد تک قبول کیا جا سکتا ہے لیکن اگر فطری قوانین اور نیچرل سورسز کے پیچھے کوئی کنٹرولر اور نگران موجود ہے تو یہ بات درست قرار نہیں پاتی۔ میرا

مطلب یہ تھا کہ مغرب کے بہت سے حلقوں کے نزدیک یہ سادہ اور فطری قوانین ہی کائنات کی اصل قوت محرکہ ہیں اور ان کے پیچھے کسی ذات کے وجود کو وہ تسلیم نہیں کرتے مگر ہم اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ کائنات میں کوئی پتہ بھی اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کرتا اس لیے ہم اس سب کچھ کو نیچرل سورسز کے کھاتے میں ڈال کر مطمئن نہیں بیٹھ سکتے ان محترم دانش ور نے اپنے کالم میں میرے اس خط کا ذکر کر کے اس کا جواب دیا کہ نیچرل سورسز ''فیڈ'' کیے ہوئے پروگرام پر چلتے ہیں میں نے گزارش کی کہ اس جواب سے بھی بات نہیں بن رہی اس لیے کہ ''فیڈ'' کرنے والا پروگرام کو فیڈ کرنے کے بعد نہ تو بے اختیار ہو گیا ہے اور نہ ہی نیچرل سورسز کی کارروائی سے بے خبر بلکہ سب کچھ اس کے علم اور مرضی کے مطابق ہو رہا ہے اس لیے یہ بات تو عقیدہ کے طور پر بہرحال تسلیم کرنا ہوگی کہ جو کچھ ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے اور اس کے علم اور حکم کے مطابق ہوا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ زلزلے، سیلاب، طوفان اور دیگر آفتیں کیوں آتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان کے کچھ ظاہری اسباب بھی ہوں گے ہمارے سائنس دان اور ماہرین ان اسباب کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی نشاندہی بھی کرتے ہیں، ہمیں ان میں سے کسی بھی بات سے انکار نہیں ہے اور اسباب کے درجے میں ہم معقول بات کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے گزشتہ اقوام پر آنے والی ان آفتوں زلزلوں آندھیوں طوفانوں وباؤں اور سیلابوں کا ذکر ان اقوام پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے اظہار کے طور پر کیا ہے اور ان قدرتی آفتوں کو ان قوموں کے لیے خدا کا عذاب قرار دیا ہے اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جناب سرور کائنات ﷺ نے قیامت سے پہلے اپنی امت میں آنے والی قدرتی آفتوں کا پیش گوئی کے طور پر تذکرہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا یا تنبیہ کے طور پر ان کا ذکر کیا ہے میں ان میں سے دو چار احادیث کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

☆ ترمذی شریف میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم نیکی کا حکم ضرور دیتے رہنا لوگوں کو برائی سے ضرور منع کرتے رہنا اور ظلم کرنے والے کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے ضرور روکنا ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے پر مار دے گا اور تم پر اسی طرح لعنت کرے گا جیسا کہ پہلی امتوں پر کی تھی۔

☆ ترمذی شریف میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ضرور سرانجام دیتے رہنا ورنہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب نازل ہوگا پھر تم دعائیں کروگے تو تمہاری دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

☆ ابوداؤد شریف میں سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا! جب لوگ معاشرہ میں منکرات یعنی نافرمانی کے اعمال کو دیکھیں اور انہیں تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں اور جب کسی ظالم کو ظلم کرتا دیکھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے نہ روکیں تو قریب ہے کہ سب پر خدا کا عذاب آجائے۔"

☆ ابن ماجہ شریف میں حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "میری امت میں بعض لوگ شراب پی رہے ہوں گے اور اس کا نام انہوں نے کچھ اور رکھا ہوا ہوگا، مردوں کے سروں پر گانے کے آلات بج رہے ہوں گے اور گانے والیاں گا رہی ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے کچھ کو بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دے گا۔"

☆ ترمذی شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب "غنیمت کے مال کو ہاتھوں ہاتھ لوٹا جانے لگے، امانت کو غنیمت کا مال سمجھ لیا جائے، زکوٰۃ کو تاوان اور بوجھ سمجھا جانے لگے، تعلیم حاصل کرنے میں دین کے مقصد کو پس پشت ڈال دیا جائے خاوند اپنی بیوی کا فرمانبردار ہو جائے، بیٹا اپنی ماں کا نافرمان ہو جائے، بیٹا اپنے دوست کو قریب کرے اور باپ کو خود سے دور رکھے، مسجدوں میں شور وغل ہونے لگے، قبیلہ کا سردار اس کا فاسق شخص ہو، قوم کا لیڈر اس کا رذیل ترین شخص ہو، کسی شخص کی عزت صرف اس کے شر سے بچنے کیلیے کی جانے لگے، ناچنے والیاں اور گانے بجانے کے آلات عام ہو جائیں، شرابیں پی جانے لگیں اور امت کے آخر والے لوگ پہلے لوگوں پر لعن طعن کرنے لگیں تو پھر خدا کے عذاب کا انتظار کرو، جو سرخ آندھی، زلزلوں، زمین میں دھنسائے جانے، شکلوں کے مسخ ہونے، پتھر برسنے اور ایسی دیگر نشانیوں کی صورت میں اس طرح لگاتار ظاہر ہوگا جیسے کسی ہار کی ڈوری

ٹوٹ جائے اور موتی لگا تار گرنے لگیں۔'' اسی طرح آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ قدرتی آفتیں پہلی امتوں کی طرح اس امت میں بھی آئیں گی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا اظہار ہوں گی۔ اس لیے زلزلہ کے ظاہری اسباب پر ضرور نظر کی جائے اور ان کے حوالے سے بچاؤ اور تحفظ کی ضرور کوشش کی جائے لیکن اس کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ اس کے باطنی اسباب اور روحانی عوامل کی طرف بھی توجہ دی جائے اور ان کو دور کرنے کے لیے بھی محنت کی جائے۔ لیکن جب ہم یہ بات کہتے ہیں تو ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سزا اور تنبیہ تو مجرموں کی ہوتی ہے جو لوگ جرائم میں شریک نہیں ہیں ان کا کیا قصور ہے اور معصوم بچوں اور عورتوں کا کیا جرم ہے کہ وہ بھی بہت بڑی تعداد میں زلزلہ کی زد میں آگئے ہیں؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ یہ بات بھی جناب نبی اکرم ﷺ نے متعدد ارشادات میں واضح فرمائی ہے اور جب نبی اکرم ﷺ نے آنے والی ان آفتوں کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ عمومی عذاب مین نیک اور بدسب ایک ساتھ شریک ہوں گے تو یہ سوال خود جناب نبی اکرم ﷺ سے بھی کیا گیا تھا کہ کیا نیک لوگوں پر بھی یہ عذاب آئے گا؟ تو نبی اکرم ﷺ نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''جب کسی قوم پر خدا کا عمومی عذاب آتا ہے تو نیک و بدسب اس کا شکار ہوتے ہیں البتہ قیامت کے دن سب لوگ اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔''

مسلم شریف میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے خواب میں دکھایا گیا ہے کہ میری امت کا ایک شخص حرم مکہ میں پناہ لیے ہوگا اور میری امت ہی کا ایک لشکر اس کے تعاقب میں مکہ مکرمہ کی طرف یلغار کرے گا لیکن ابھی وہ بیداء کے مقام پر ہوں گے کہ سب لوگ زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ''میں نے دریافت کیا کہ ان میں بہت سے لوگ غیر متعلق بھی ہوں گے۔'' اس پر جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''ان میں مستبصر بھی ہوں گے یعنی وہ لوگ جو اپنی مرضی کے ساتھ شریک ہوں گے کچھ مجبور بھی ہوں گے جو کسی مجبوری کی

وجہ سے ساتھ ہوں گے اور ابن السبیل یعنی راہ گیر بھی ہوں گے جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہو گا لیکن جب زمین پھٹے گی تو سب لوگ اس میں سما جائیں گے البتہ قیامت کے دن سب لوگ اپنی اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے۔

بخاری شریف میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک موقع پر جناب نبی اکرم ﷺ نے امت کے کسی حصے پر آنے والے عمومی عذاب کا ذکر فرمایا تو ام المومنین نے سوال کیا کہ کیا نیک لوگوں کی موجودگی میں ایسا ہوگا؟ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ہاں! جب خباثتوں کی کثرت ہو جائے گی تو ایسا ہی ہوگا۔''

مسلم شریف میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی نوعیت کی روایت ہے کہ انہوں نے جناب نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ جو شخص نافرمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہوگا کیا اس پر بھی عذاب آئے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں! دنیا کے عذاب میں سب ایک ساتھ ہوں گے پھر قیامت کے دن ہر شخص اپنی نیت پر اٹھایا جائے گا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کا قانون اور ضابطہ ہے جس کی جناب نبی اکرم ﷺ وضاحت فرما رہے ہیں۔ اس کے مطابق ہمیں جہاں یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے وہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہے، سزا ہے تنبیہ ہے اور عبرت کے لیے ہے جس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے۔

اب آخری سوال کی طرف آیئے کہ اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمارا اس سلسلہ میں سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم توبہ استغفار کریں، اپنے جرائم اور بداعمالیوں کا احساس اجاگر کریں، اپنی زندگیوں کو بدلنے کی کوشش کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کریں، معاشرے میں برائیوں کو روکنے اور نیکیوں کو پھیلانے کی محنت کریں اور دین کی طرف عمومی رجوع کا ماحول پیدا کریں۔ اس کے بعد ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کریں ان کی بحالی کے لیے ہر ممکن تعاون کریں، امدادی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیں، زخمیوں کے علاج معذروں کی خدمت اور بے گھروں کی بحالی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں کہ یہ ہماری دینی اور قومی ذمہ داری ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ میں زلزلہ کے متعدد علاقوں سے ہو کر آیا ہوں اور

تباہی کے خوفناک مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ہزاروں خاندان اور لاکھوں افراد ہماری مدد اور توجہ کے مستحق ہیں اور اگرچہ امدادی سرگرمیاں وسیع پیمانے پر جاری ہیں لیکن اصل ضرورت سے بہت کم ہیں۔ ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے یہ وقتی مسئلہ نہیں اس پر کئی سال لگ سکتے ہیں اور اسکے لیے خاصی محنت اور قربانی کی ضرورت ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی اس زلزلہ میں جاں بحق ہونے والے بھائیوں اور بہنوں کے لیے دعائے مغفرت کا اہتمام ضروری ہے وہ لوگ اچانک اور حادثاتی موت کا شکار ہوئے ہیں اس لیے جناب نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد کے مطابق وہ شہداء میں شامل ہیں ان کے لیے مغفرت اور بلندئ درجات کی دعا بھی ہم پر ان کا حق ہے اور ہمیں اپنی دعاؤں میں انہیں یاد رکھنا چاہئے۔

اسلام کی مقرر کردہ سزائیں
اور
مغرب کے شکوک وشبہات

بریڈفورڈ (برطانیہ) کے "ریڈیو رمضان" کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ ان کے سامعین سے ٹیلی فون کے ذریعے "اسلام کی مقرر کردہ سزائیں اور ان پر شکوک واعتراضات" کے حوالے سے گفتگو کروں۔ یہ گفتگو سوالات وجوابات سمیت ایک گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی جو براہ راست نشر کی گئی۔ اس کے اہم حصوں کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

اسلام میں معاشرتی جرائم کی سزائیں دو حصوں پر مشتمل ہیں ایک حصے کو تعزیرات کہا جاتا ہے جن کے تعین کا اختیار اسلامی حکومت پارلیمنٹ یا عدلیہ کو حاصل ہے کہ وہ حالات اور ضروریات کی روشنی میں کسی جرم پر کوئی سزا مقرر کر دیں ان میں ردوبدل بھی ہوسکتا ہے اور حالات میں تغیر وتبدل کے ساتھ ساتھ ان سزاؤں میں تغیر وتبدل کی گنجائش بھی موجود رہتی ہے جبکہ دوسرا حصہ حدود کہلاتا ہے یہ وہ سزائیں ہیں جو کسی متعین جرم کے حوالے سے قرآن کریم یا سنت نبوی کے ذریعے طے کر دی گئی ہیں اور ان کے بارے میں امت کا شروع سے یہ اجماع ہے کہ ان میں ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے اور جرم ثابت ہونے کی صورت میں اسلامی عدالت اس کی پابند ہے کہ اس جرم پر مجرم کو وہی سزا دے جو قرآن وسنت میں طے کر دی گئی ہے یہ حدود صرف چند جرائم کے بارے میں ہیں جن کی تعداد پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہے مثلاً چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے زنا کی سزا ایک صورت میں سنگسار کرنا اور دوسری صورت میں سو

کوڑے مارنا ہے کسی پر بدکاری کا غلط الزام لگانے کی سزا اسی کوڑے ہے، شراب نوشی کی سزا اسی کوڑے ہے ڈکیتی کی سزا بعض صورتوں میں ہاتھ پاؤں کاٹ دینا اور بعض صورتوں میں اس سے مختلف ہے اور ارتداد کی سزا قتل ہے وغیر ذالک ان چند جرائم اور ان کی سزاؤں کے علاوہ باقی تمام سزائیں تعزیرات کے دائرے میں آتی ہیں اور ان کا تعین، اور بوقت ضرورت تغیر و تبدل حکومت وقت یا اس کی مقنّنہ اور عدلیہ کے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے۔

ان میں سے حدود ایک عرصے سے بین الاقوامی اعتراضات کی زد میں ہیں اور ان کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا ہے زیادہ تر اعتراضات اور شکوک و شبہات کی بنیاد مغرب کا وہ فکر و فلسفہ ہے جسے ٹیکنالوجی معاشی بالادستی اور عسکری قوت کی وجہ سے اس وقت عالمی اور بین الاقوامی فلسفے کی حیثیت حاصل ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جاتا ہے کہ سنگسار کرنے، قتل کرنے، کوڑے مارنے، جسم کے اعضاء کاٹنے اور اس قسم کی سزائیں تشدد پر مبنی ہیں اسلام اور مغرب کے درمیان ایک اصولی اور بنیادی اختلاف موجود ہے جسے سزاؤں کا جائزہ لینے سے پہلے سمجھنا ضروری ہے۔

مغرب کے نزدیک کسی عمل کو جرم قرار دینے کی بنیاد صرف انسانی سوسائٹی کی اس دنیا کی ضروریات ہیں اور اس کا تعین ان کی سوسائٹی کی خواہشات اور قبولیت کے حوالے سے ہوتا ہے مگر اسلام اس دنیا کی معاشرتی ضروریات کے ساتھ ساتھ انسان کی اخروی زندگی کے حوالے سے بھی ''جرم'' کا تعین کرتا ہے۔ اسی طرح جو عمل اس دنیا میں انسانی سوسائٹی کے لیے ضرر رساں ہے، وہ بھی جرم ہے اور جو عمل انسانوں کی اخروی زندگی میں ان کی ناکامی اور ان کے لیے عذاب الٰہی کا باعث بن سکتا ہے وہ بھی اسلام کے نزدیک جرائم کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے پھر اس دنیا کی زندگی کے حوالے سے بھی فرد اور سوسائٹی کی ضروریات اور تقاضوں کا دائرہ مغرب کے ہاں بہت محدود ہے جبکہ اسلام اس سے زیادہ وسیع تناظر میں اس کا جائزہ لیتا ہے مغرب کے نزدیک کسی فرد کا وہ عمل جرم ہوگا جس سے دوسرے فرد کی آزادی اور اس کے حقوق متاثر ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اس کا ماحول اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے مثلاً سود مغرب کے نزدیک صرف اس لیے جائز قرار پا گیا ہے کہ سود لینے والے کے ساتھ وقتی طور پر سود دینے والے کا مفاد بھی وابستہ ہو جاتا ہے اور وہ اسے قبول کر لیتا ہے۔ اسی طرح

ماحول کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لہٰذا اسے جرم قرار دینا درست نہیں ہے مگر اسلام صرف فرد اور ماحول کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کے ساتھ انسانی سوسائٹی کے اجتماعی تناظر اور کسی عمل کے حتمی نتیجے کو بھی پیش نظر رکھتا ہے اور چونکہ سود ایک محدود دائرے میں چند افراد یا ماحول کے لیے قابل قبول ہونے کے باوجود انسانی سوسائٹی کے اجتماعی ماحول اور حتمی نتیجے کے حوالے سے دولت کی غیر مساویانہ تقسیم اور اس کے ارتکاز کا باعث بنتا ہے اس لیے اسلام اسے جواز کی سند دینے کے لیے تیار نہیں ہے جبکہ اس بات پر جدید ماہرین معیشت بھی متفق ہیں کہ دولت کے چند ملکوں میں ارتکاز، وسائل دولت کی غیر مساویانہ اور غیر منصفانہ تقسیم اور ہوشربا معاشی تفاوت کی ایک بڑی وجہ سود ہے اسی طرح اپنے حتمی نتیجے کے حوالے سے سود ان کی سوسائٹی کے لیے نقصان دہ ہے اور اسی لیے اسلام کے نزدیک وہ جائز نہیں ہے۔

اسی طرح زنا کے مسئلہ کو لے لیجئے مغرب کہتا ہے کہ جب زنا کرنے والے دو افراد آپس میں رضامند ہیں اور کسی تیسرے فرد کا حق اس سے متاثر نہیں ہو رہا تو اس پر اعتراض کا جواز نہیں ہے اور باہمی رضامندی کے ساتھ قائم کئے جانے والے جنسی تعلق کو جرم قرار نہیں دیا جا سکتا مگر اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ زنا کے اثرات صرف دو افراد تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس سے انسانی سوسائٹی کا اجتماعی ماحول متاثر ہوتا ہے کہ نسب کا سلسلہ مشکوک ہو جاتا ہے جو نوع انسانی کا امتیازی وصف ہے خاندانی نظام خطرے میں پڑ جاتا ہے جو انسانی تمدن کا بنیادی یونٹ ہے اور پیدا ہونے والے بچے کی پرورش کی ذمہ داری کا تعین ممکن نہیں رہتا اس لیے زنا خواہ رضامندی کا ہو وہ بھی نسل انسانی کے لیے مجموعی طور پر نقصان دہ اور ضرر رساں ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے اور سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح ایک فرق یہ بھی ہے کہ اسلام کے نزدیک جرم اور اس کی سزا کے تعین کی بنیاد آسمانی تعلیمات ہیں جبکہ مغرب کے نزدیک اس کا تعین سوسائٹی کی خواہشات کی بنیاد پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آسمانی تعلیمات میں سنگین جرائم کی فہرست ہمیشہ سے مشترک چلی آ رہی ہے اور مغرب میں جرائم کی فہرست میں رد و بدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے ایک چیز نصف صدی قبل جرم شمار ہوتی تھی مگر سوسائٹی میں اس کا رواج عام ہو جانے کے بعد اب وہ جرم نہیں رہی اور ایک چیز مغربی دنیا کے ایک حصے میں جرم شمار ہوتی ہے مگر دوسرے حصے میں اسے جرم کا درجہ حاصل نہیں ہے اس طرح جرم کا تعین کسی اخلاقی اصول

پر نہیں بلکہ سوسائٹی کی ہر لحہ بدلتی ہوئی خواہشات کے حوالے سے ہوتا ہے اور جرائم کی فہرست ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔

اس پس منظر میں اسلامی حدود کے حوالے سے کئے جانے والے شکوک و اعتراضات کے بارے میں اصولی طور پر تین گزارشات کرنا چاہوں گا ایک یہ کہ اسلام کے نظام قانون میں بیان کردہ جرائم اور ان کی سزاؤں کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے اور اس میں انسانی خواہشات کا کوئی دخل نہیں ہے دوسری بات یہ کہ یہ سزائیں کسی انسان کی مقرر کردہ نہیں بلکہ آسمانی تعلیمات کی صورت میں پہلے سے چلی آرہی ہیں اور اسلام نے یہ سزائیں از خود طے کرنے کی بجائے ان کے بارے میں پہلے اپنی تعلیمات کے تسلسل کو قائم رکھا ہے سابقہ آسمانی کتابوں کا مجموعہ بائبل کی صورت میں تمام تر تغیرات اور تحریفات کے باوجود آج بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ قصاص میں قتل کرنے، زنا کے جرم میں سنگسار کرنے سزا کے طور پر انسانی جسم کے اعضاء کاٹنے اور کوڑے مارنے کی سزائیں اسلام نے بائبل سے لی ہیں جبکہ خود قرآن کریم کا اپنا دعوٰی یہ ہے کہ وہ تورات، زبور اور انجیل کی تعلیمات کا محافظ ہے اس لیے اگر ان سزاؤں میں تشدد ہے تو اس کی ذمہ داری قرآن کریم پر نہیں بلکہ بائبل پر عائد ہوتی ہے قرآن کریم اور سنت نبویؐ نے صرف یہ کیا ہے کہ وحی الٰہی کے مطابق تورات کی بیان کردہ سزاؤں کو بعض جزوی اصلاحات و ترامیم کے ساتھ قائم رکھا ہے اور ایک تسلسل کے طور پر انہیں اپنے نظام کا حصہ بنالیا ہے۔

تیسری گزارش یہ ہے کہ آج کے دور میں بھی یہ بات تجربے سے ثابت ہو چکی ہے کہ جرم پر قابو وہیں پایا جاسکا ہے جہاں سزاؤں کی نوعیت سخت رہی ہے بلکہ اسلام کی مقرر کردہ سزائیں جس معاشرے میں عملاً نافذ ہوئی ہیں وہاں آج بھی وہ جرائم پر کنٹرول میں موثر ثابت ہوئی ہیں اس میں مثال کے طور پر سعودی عرب کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ وہاں باشاہت کا نظام ہے جو اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا لیکن جرائم کی شرعی سزائیں نافذ ہیں جن پر عمل بھی ہوتا ہے اس لیے سعودی عرب میں جرائم کی شرح دوسرے ممالک سے بہت کم ہے دوسری مثال افغانستان میں طالبان کی حکومت کے پانچ سالہ دور کی صورت میں ریکارڈ پر موجود ہے کہ ان کے دور حکومت میں نہ صرف یہ کہ جرائم کی شرح کا گراف حیرت انگیز طور پر رک گیا تھا بلکہ ان کی حدود کار میں امن قائم ہونے کے ساتھ ساتھ قبائلی سرداروں کی جنگیں بھی غائب ہو

گئی تھیں اور پوست کی کاشت کی شرح بھی صفر تک جا پہنچی تھی جو کہ طالبان کی حکومت ختم ہونے کے ساتھ ہی دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن پر واپس چلی گئی ہے اور اب اس قبائلی خانہ جنگی اور پوست کی کاشت کا مسئلہ عالمی سطح پر پھر پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر قانون کا مقصد جرم پر قابو پانا اور معاشرے میں امن قائم کرنا ہے تو اس کا ذریعہ آج کے دور میں بھی صرف آسمانی تعلیمات ہیں۔ اور آسمانی تعلیمات کی نمائندگی صرف اور صرف اسلام کرتا ہے کہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کا محفوظ ذخیرہ اسی کے پاس موجود ہے اور وہی اس حوالے سے نسل انسانی کی راہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فکری و مسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو

۵ دسمبر ۲۰۰۳ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں اساتذہ کے دوروزہ مشاورتی اجتماع کی چوتھی نشست سے خطاب
کل سے مختلف مسائل پر گفتگو چل رہی ہے۔ ہم نے صبح کی نشست میں نصاب اور اساتذہ کی تدریسی اور تربیتی مشکلات کے حوالے سے بات کی جس کے نتیجے میں تفصیلی تجاویز سامنے آئی ہیں۔

بعدالحمد و الصلوۃ:

محترم دوستو! آج کی اس نشست میں میری گفتگو کا عنوان ہے ''فکری و مسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو'' فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ جب ایک خاص نصاب کی تعلیم پا کر سوسائٹی میں جاتے ہیں اور انہیں آج کے مسائل اور حالات سے سابقہ پیش آتا ہے تو ان کی فکر اور سوچ کیا ہو؟ ان کا نصب العین اور زندگی کا مقصد کیا ہو؟ ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی فکری نصب العین بن جاتا ہے جس کے اردگرد اس کی زندگی کی ساری تگ ودو گھومتی ہے۔ طالب علمی کے دوران میں اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی ترجیح قائم ہو جاتی ہے کہ میں نے تو یہ کام کرنا ہے، اور پھر وہ ساری زندگی اسی میں لگا رہتا ہے۔ یہ مرحلہ یعنی کسی طالب علم کی فکری تربیت کے رخ کا تعین ہم نے اسے آزاد چھوڑا ہوا ہے اور طالب علم اپنی مرضی سے اس کا تعین کر رہے ہیں۔ اس کا تعلق بھی اس بات سے ہے جو اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے ہماری مشاورت میں زیر غور آئی یعنی چونکہ ہمارے ہاں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نظم موجود نہیں، اس لیے ہوتا یہ ہے کہ مدارس میں اساتذہ میں سے جس استاد کے ساتھ طالب علم زیادہ مانوس ہو جاتا ہے تو جو ذہنی سوچ اس کی ہوتی ہے وہی طالب علم کی بھی بن

جاتی ہے۔ایک مدرسے میں اساتذہ کے ذہنی رجحانات مختلف ہیں تو دو دو، چار چار طالب علم ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں۔اس طرح فکری تربیت تو ہوتی ہے لیکن یہ فکر کوئی اجتماعی فکر نہیں ہوتی۔ ہر طالب علم اپنے ذوق کے مطابق کسی استاد کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی ذہنی وفکری تربیت ہوتی ہے اور وہ اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ میں اس کو خون کے گروپ سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں خون کے مختلف گروپ کام کر رہے ہیں۔سپاہ صحابہ کا خون گروپ ہے، جہادی خون گروپ ہے، جمعیت علماء اسلام کا خون گروپ ہے۔اسی طرح تبلیغی جماعت، اشاعت التوحید اور خدام اہل سنت کے خون گروپ موجود ہیں۔ان میں سے کچھ گروپ آپس میں ملتے ہیں اور کچھ نہیں ملتے۔اور لطیفے کی بات یہ ہے کہ اتفاق سے میرا خون کا گروپ سب سے مل جاتا ہے۔میرا خون سب کو لگ جاتا ہے اور سارے خون اس کو لگ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طالب علم کو مجموعی فکر ہم نے کیا دی ہے؟ میں وفاق والوں سے اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ آپ اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کریں تا کہ وہ طلبہ کا کوئی اجتماعی ذہن تو بنائیں اور انہیں کوئی بنیادی سوچ تو دیں۔ یہ تو انہیں بتائیں کہ ملک وملت کے تقاضے کیا ہیں، عالمی صورت حال کے تقاضے کیا ہیں، اور آپ کے مسلک کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔انہیں کوئی اجتماعی سوچ دیں، اس کے ساتھ ساتھ ضمنی ترجیحات کا دائرہ بھی موجود رہے۔

آپ تقریباً اتفاق کریں گے کہ صورت حال ایسی ہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ ہے کہ اساتذہ، جنہوں نے سوچ دینی ہے اور فکری تربیت کرنی ہے، خود ان کی اپنی اجتماعی فکر کا کوئی اہتمام نہیں۔عصری تعلیم میں ہر سطح کے استاذ کے لیے اس سطح کا تربیتی کورس کرنا ضروری ہے لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی نظم نہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ فکری طور پر ہم خلفشار کا شکار ہیں۔ہم پر مغرب کی فکری اور تہذیبی یلغار ہے۔اس کی صحیح تعبیر وہ ہے جو ہمارے شیخ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے کی ہے کہ یہ فکری ارتداد کا زمانہ ہے۔آپ ذرا محدود حلقے میں ہیں، اللہ آپ کے ایمان کو سلامت رکھے، لیکن اگر آپ جدید حلقے میں چلے جائیں کسی کے ذہن کو ٹٹولیں تو احتراماً اور عقیدتاً یا

فتوے کے ڈر سے تو وہ شاید کوئی بات نہ کہے لیکن جب آپ اس کی فکر کا تجزیہ کریں گے تو کہیں نہ کہیں ارتداد، ارتیاب اور شک کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہوگا۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ آج کی فکری ارتداد کی لہر سے متاثر ہوگا۔

ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کشمکش کو سرے سے سمجھ ہی نہیں رہے۔ ہم پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے، ہمارے گرد حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے اور ہم بالکل ایک دائرے میں محصور ہوتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں نکاح وطلاق یا دوسرے مسائل کے بارے میں شریعت کے احکام کے بارے میں شک ہے اس نے جدید لٹریچر پڑھا ہوا ہے۔ ہم اس کے شک اور اس کی وجہ کو سمجھ کر شک کا کانٹا نکالنے کے بجائے اس کے ساتھ طعنے اور فتوے کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے تو احتراماً خاموش ہو جاتا ہے لیکن اس کا شک پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے، اس لیے یہ جواب نہیں دے سکے اور مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ ہم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کو شک کیا ہوا ہے، اس لیے کہ خود ہمیں معلوم نہیں ہے اس کے پس منظر میں کون سا فکری الجھاؤ کارفرما ہے۔

بات سمجھانے کے لیے حوالہ دوں گا۔ میں ایک عرصے سے مدارس کے منتظمین سے گزارش کر رہا ہوں کہ آج کا بین الاقوامی قانون جو رائج الوقت ہے، جس کی بنیاد پر ہم پر اعتراضات ہوتے ہیں اور الزام لگایا جاتا ہے وہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ اس کی تیس دفعات ہیں۔ ہم نے اس کو تسلیم کر رکھا ہے اور اس پر دستخط کر رکھے ہیں۔ اس وقت عالمی کشمکش میں ایک جھگڑا یہ ہے کہ مغربی اقوام کا موقف یہ ہے کہ جب آپ نے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں، اس کے نظام میں شریک ہیں اس سے فائدے اٹھاتے ہیں یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ ہے جس کے آپ رکن ہیں، آپ نے عہد کیا ہے کہ اس میں لکھی ہوئی باتوں کی اپنے دستور میں پابندی کریں گے، تو آپ اس کے خلاف اقدامات کیوں کر رہے ہیں؟ یہ موقف اس حوالے سے درست ہے کہ جب ہم نے باقاعدہ معاہدہ کر رکھا ہے تو یا تو اس پر عمل کریں اور یا اس سے پیچھے ہٹ جائیں۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے کہ اگر اس چارٹر کو اور اس کی ان تشریحات کو قبول کر لیا جائے جو اقوام متحدہ کے باضابطہ ادارے مثلاً جنیوا انسانی حقوق کنونشن، یونیسکو اور یونیسف وغیرہ کرتے ہیں، تو ہمیں احکام شرعیہ میں سے کم از کم ۸۰ فیصد سے دستبردار ہونا ہوگا۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو یقینی بنایا جائے اور جنس کی بنیاد پر کوئی امتیازی قانون نہ بنایا جائے۔ مرد اور عورت کے مابین تمام معاملات میں مساوات ضروری ہے۔ اب آپ اپنے قوانین کو دیکھ لیں۔ آپ مرد کو طلاق کا حق دیتے ہیں، عورت کو نہیں دیتے، یہ امتیازی قانون ہے۔ وراثت میں آپ مرد کو حصہ زیادہ دیتے ہیں، عورت کو کم دیتے ہیں۔ یہ امتیازی قانون ہے۔ شہادت میں آپ بعض معاملات میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کرتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ عورت کو آپ صدر اور وزیر اعظم بننے کا حق نہیں دیتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ اس طرح آپ کی فقہ میں بہت سے ایسے احکام نکلیں گے جہاں آپ امتیاز کے قانون پر عمل کر رہے ہیں جو کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے اور اس پر فوراً کہا جائے گا کہ آپ اس کو منسوخ کریں۔

ایک دوسری مثال لیں۔ عالمی قانون میں آزادی رائے اور تبدیلی مذہب کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ ہر شخص کو کوئی بھی مذہب چھوڑنے یا اختیار کرنے کا اور کسی بھی قسم کی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ لیکن ہم نے توہین رسالت پر موت کی سزا کا قانون نافذ کر رکھا ہے جو رائے کی آزادی کے خلاف ہے۔ ہم نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے، ان کو مسجدیں نہیں بنانے دیتے، ان کو اسلامی اصطلاحات استعمال نہیں کرنے دیتے جو مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔

یا مثلاً بین الاقوامی قانون میں غلامی کی تمام صورتیں ممنوع ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ غلامی اسلام کی مطلوبہ چیزوں میں سے نہیں، اس لیے بین الاقوامی معاہدے کے تحت یہ ممنوع سہی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب ممنوع ہے اور آپ مانتے ہیں کہ غلامی درست نہیں تو پھر پڑھاتے کیوں ہیں؟ تعلیمی نصاب سے خارج کیوں نہیں کرتے؟ قرآن پاک سے وہ آیات اور حدیث وفقہ سے وہ ابواب خارج کیوں نہیں کرتے؟

اسی طرح اس میں ایک دفعہ یہ ہے کہ کوئی سزا ایسی نافذ نہیں کی جائے گی جس میں جسمانی تشدد یا ذہنی اذیت ہو یا جس میں توہین وتذلیل ہو۔ یعنی سزا کو تین چیزوں، جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین وتذلیل سے خالی ہونا چاہیے۔ اب آپ کی کون سی سزا اس سے خالی ہے؟ آپ کی ساری حدود میں تشدد ہے، ہاتھ پاؤں کاٹنا، سنگسار کرنا، کوڑے مارنا، کھلے بندوں سزا دینا ہے جس میں توہین اور تذلیل ہے۔

گویا حدود کا نظام لے لیں، خاندانی نظام لے لیں، وراثت کا نظام لے لیں، نکاح وطلاق کا مسئلہ لے لیں، ہمارا کوئی بھی مسئلہ نہیں بچتا جس پر اعتراض نہ ہو۔

تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی ان تیس دفعات کو ہمارے ہاں نصاب میں پڑھایا جانا چاہیے، اس حوالے سے کہ آج کا مروجہ بین الاقوامی قانون کیا ہے، ہمارے قوانین کیا ہیں، ٹکراؤ کہاں ہے، ان کا موقف کیا ہے اور ہمارا موقف کیا ہے؟ ہمارے عالم دین کو پتہ تو ہونا چاہیے۔ جب کوئی اعتراض سامنے آئے تو وہ سمجھ تو سکے کہ اعتراض کیوں ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہم نے ان کی کون سی بات قبول کرنی ہے اور کون سی نہیں، لیکن کم از کم ہمارے علما کو اس جھگڑے سے واقف تو ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں سرے سے اس کا کوئی پتہ نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بحث کو اپنے دائرے میں محدود رکھتے ہیں تو اپنے لوگوں کو مطمئن کر لیں گے لیکن جب بات جدید تعلیم یافتہ ماحول میں کریں گے تو ہماری بات سنی نہیں جائے گی کیونکہ ہماری بات ادھوری اور بے علمی پر مبنی ہوگی۔

تو فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ ہمارے علما کو یہ پتہ ہو کہ آج کا عالمی ماحول کیا ہے، ہماری کشمکش کس سے ہے، لڑائی کس سے ہے، اس کے مقابلے میں ہم نے کیا تیاری کی ہے؟ اس انداز سے ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں، احادیث کا مطالعہ کریں۔ سارا ذخیرہ موجود ہے۔ قرآن پاک میں ہر چیز موجود ہے، احادیث کے ذخیرے میں ہر بات کا جواب موجود ہے، البتہ فقہی کتابوں میں اس کی نئی تعبیرات کرنے کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ ہماری اپنی اس انداز سے مطالعہ کرنے کی تربیت نہیں ہے، اس لیے آج کی اس فکری کشمکش میں ہم موثر طور پر حصہ لینے اور کوئی عملی کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس

میں بھی پہلے بات اساتذہ کی آئے گی۔ استاد کو پتہ ہوگا تو وہ شاگرد کو بتائے گا۔ اگر اسے خود پتہ نہیں ہوگا تو شاگردوں کو کیا بتائے گا؟ میں نے وفاق والوں سے گزارش کی تھی کہ آج کے مغربی فلسفہ، عالمی کشمکش اور تہذیبی جنگ پر اساتذہ کے لیے بریفنگ کورس کا اہتمام کریں اور نصاب میں بھی ایسی چیزیں شامل کریں، خواہ وہ محاضرات کی شکل میں ہوں یا کسی کتاب کی صورت میں۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر کام نہیں ہو رہا لیکن عرب دنیا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ اس میں سے اچھا مواد مل جائے گا۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ ہے مسلکی تربیت کا۔ ہمارا مسلک کیا ہے اور دیوبندیت کیا ہے؟ یہاں میں تھوڑی سی گستاخی کروں گا جس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میری عادت یہ ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے، کہہ دیا کرتا ہوں۔ اگر ناراض نہ ہوں تو ایک کہاوت عرض کرتا ہوں۔ کہتے کہ چار پانچ نابینا کہیں اکٹھے ہو گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ طے یہ ہوا کہ اس کا فیصلہ 'مشاہدہ' کرنے کے بعد کیا جائے۔ اب وہ گئے اور جا کر ہاتھی کو ٹٹولنے لگے۔ دیکھا تو تھا نہیں، تو کسی کے ہاتھ کان پر آ گئے، کسی کے سونڈ پر اور کسی کے سینگ پر۔ اب وہ تبصرہ کر رہے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ ایک نے کہا کہ ہاتھی لمبا سا ہڈی کا سینگ ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں وہ تو چھاج کی طرح لمبا اور چوڑا سا ہوتا ہے۔ تیسرے نے کہا کہ پانی کا ایک نل ہے جس کو ہاتھی کہتے ہیں۔ چوتھے نے کہا کہ چمڑے کے ایک بڑے سے ستون کو ہاتھی کہا جاتا ہے۔

ہمارا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہم میں سے جس شخص کو جس ماحول میں جس سے واسطہ پڑ جاتا ہے، ہماری دیوبندیت اسی تک محدود ہو جاتی ہے۔ ایک ماحول میں شیعہ سے واسطہ ہے تو دیوبندیت یہی ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔ ہماری دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ کہیں اہل حدیث سے سابقہ پیش آ جائے تو وہاں دیوبندیت صرف حنفیت کے دفاع میں محصور ہو جاتی ہے، باقی سارے تقاضے ختم ہو جاتے ہیں۔ کہیں بریلویوں سے لڑائی آ گئی ہے تو دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ میں ان مسائل سے انکار نہیں کر رہا۔ یہ تمام شعبے ہیں۔ مجھے نہ حنفیت کے دفاع کی اہمیت سے انکار ہے، نہ بریلویت کے مقابلے سے اور نہ انکار حدیث اور شیعہ کا جواب دینے سے، لیکن یہ تمام جزوی شعبے ہیں۔ ہم ان الگ الگ شعبوں کی

بات تو کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اہل السنّت والجماعت کا جو اجتماعی دھارا چلا آ رہا ہے، اس کی بات ہم میں سے کوئی نہیں کرتا۔

قیام دیوبند کا اصل مقصد کیا تھا؟ جب انگریز یہاں آیا تھا اور اس کے ہاتھوں دین مٹ رہا تھا تو کچھ اللہ والوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی کہ دین کو جس حد تک ممکن ہو، بچا لیا جائے۔ مجموعی دین کو، اس کے اجتماعی حصے کو اور سب شعبوں کو بھی۔ میرے نزدیک دیوبندیت تین چیزوں کا نام ہے۔ اگر دیوبندیت میں کسی کو معیار سمجھا جائے تو میرے نزدیک سب سے بڑا معیار شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں جن کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں وہ تینوں باتیں تھیں علم بھی بدرجہ اتم روحانیت بھی بدرجہ اتم اور جہاد بھی بدرجہ اتم۔ گویا دیوبندیت یہ ہے کہ علم میں بھی کمال ہو، روحانیت میں بھی کمال ہو اور ملی غیرت اور جہاد کے جذبے میں بھی کمال ہو۔

دیوبندی مسلک کوئی نیا مسلک نہیں ہے۔ ہم عقائد کے لحاظ سے اہل سنت ہیں اور فقہی اعتبار سے حنفی ہیں۔ کوئی نیا تشخص ہم نے قائم نہیں کیا۔ ایک مدرسے کے ساتھ ہماری نسبت ہے، جس کے اجتماعی مقاصد کے حوالے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے ضمنی طور پر سارے کام کیے۔ حضرت شیخ الہند کو لے لیں۔ کیا انہوں نے حنفیت کا دفاع نہیں کیا؟ ان کے اس پر رسالے موجود ہیں، لیکن اس حد تک جتنی ضرورت پڑی۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے ''الشہاب الثاقب'' لکھی، لیکن یہ کام ضرورت کی حد تک محدود رہا۔ ان کا اصل مقصد ملی وجود اور ملی مقاصد تھے۔ جہاں ضرورت پڑی، ضمنی اور فرعی مسائل سے بھی تعرض کیا، لیکن اس کے لیے اپنے آپ کو وقف نہیں کر دیا۔ میں بھی یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دیوبندیت سے مراد اگر ہم نے الگ الگ شعبے لے رکھے ہیں تو میں اس کو دیوبندیت نہیں سمجھتا۔ دیوبندیت نام ہے ملت کے اجتماعی دینی کام کا۔ جہاں کسی ضمنی کام کی ضرورت پڑتی ہے وہاں وہ ضرور کیا جائے لیکن ہمارا اجتماعی اور مین دھارا یہ ہے کہ اس ملک میں اس معاشرے میں دین کی اجتماعی حفاظت کی جائے اور نئی نسل تک دین صحیح حالت میں منتقل ہو۔ اجتماعی مقاصد اور ملی مقاصد کے حوالے سے ہم طلبہ کی تربیت کریں۔

ہمیں اس پہلو کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ فکری تربیت، ملکی مقاصد اور مسلک کے اصل اہداف کے حوالے سے ہم تھوڑا سا ماضی کی طرف پلٹ کر اپنے بزرگوں کو دیکھیں اور اس کے مطابق علمی کمال، روحانیت اور ملی غیرت وحمیت کی خصوصیات اپنے طلبہ میں پیدا کر کے اجتماعی مقاصد اور ضروریات کے لیے ان کو تیار کریں۔

باتیں تو میں اور بھی بہت سی کہنا چاہتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ ان پر تفصیل سے بات ہوگی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اسلامی نظام اور ہمارا اجتماعی عمل

مولانا زاہد الراشدی کا گزشتہ کم و بیش تیس برس سے معمول ہے کہ عید کی نماز شہر کی قدیمی عیدگاہ نزد قبرستان کلاں مبارک شاہ روڈ میں پڑھاتے ہیں اور اس موقع پر حالات حاضرہ کی مناسبت سے دس پندرہ منٹ کا مختصر خطاب کرتے ہیں۔ اس سال عید الاضحیٰ کے موقع پر ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

(الکوثر ۱۰۸:۱-۳)

''(اے محمد) ہم نے تم کو کوثر عطا فرمائی ہے (۱) تو اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو (۲) کچھ شک نہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے اولاد رہے گا (۳)''

آج عید کا دن ہے اور دنیا بھر میں مسلمان عید کی خوشی کے ساتھ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانی کی یاد تازہ کر رہے ہیں، صاحب استطاعت حضرات جانور ذبح کریں گے اور اس عزم کا اظہار کریں گے کہ مولائے کریم! آج ہم آپ کی رضا اور خوشی کے لیے جانوروں کی قربانی دے رہے ہیں، کل اگر ضرورت پڑی اور آپ کا حکم ہوا تو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ قربانی دراصل اسی عزم کو تازہ کرنے کا نام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری رکھ دی اور اپنی طرف سے انہیں قربان کر دیا۔

آج اسی جذبہ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور عالم اسلام کو اس جذبہ کی ضرورت ہے کیونکہ ہم مسلمان دنیا میں سوا ارب سے زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود کوئی عزت و وقار کی

زندگی بسر نہیں کر رہے اور آج کی دنیا میں ہماری حالت قابل رشک نہیں ہے۔ آج پھر اسلام اور دیندار مسلمان دنیا بھر کے طعنوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور اہل دین ایک بار پھر آزمائشوں اور مصیبتوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے سورۃ الکوثر کی تلاوت کی ہے جو قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورت ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے بالکل اسی طرح کی کیفیت کا حوالہ دیا ہے، رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کا مکی دور آزمائشوں اور تکلیفوں کا دور تھا، طعنوں اور کردار کشی کا دور تھا جس کے منہ میں جو بات آتی تھی کہہ دیتا تھا، کوئی مجنون کہہ رہا ہے کوئی کاہن کہہ رہا ہے اور کوئی شاعر کے لقب سے پکار رہا ہے، یہ کردار کشی تھی اور طعن و تشنیع کے تیر تھے جو مسلسل برسائے جا رہے تھے، اسی دوران کہنے والوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ محمد ﷺ تو "ابتر" ہیں یعنی ان کی نرینہ اولاد نہیں ہے، کوئی بیٹا جوان نہیں ہوا جو ان کے بعد اس مشن کو سنبھال سکے، اس لیے ان کے دین کا معاملہ ان کی زندگی تک ہے اور ان کے بعد اس دین کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس بات نے خود جناب نبی اکرم ﷺ کو پریشان کر دیا جس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکوثر نازل کر کے آنحضرت ﷺ کو تسلی دی۔ آج کے عالمی منظر پر ایک نظر ڈال لیں۔ آج بھی اسلام اور اس کے حاملین کو اسی طرح کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آج بھی اہل دین کے لیے مجنون کا خطاب ہے اور آج بھی اسلام کے بارے میں یہی کہا جا رہا ہے کہ آج کی دنیا میں اس دین کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اس دین کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس لیے سورۃ الکوثر میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ آج کے حالات میں ہمارے لیے بھی راہ عمل ہے اور ہمیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

مکہ کے مشرکوں کے طعنوں کے جواب میں جناب نبی اکرم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ گھبرائیں نہیں پریشان نہ ہوں، ہم نے آپ کو ''کوثر'' عطا کی ہے کوثر کا معنی جمہور مفسرین نے ''خیر کثیر'' کیا ہے جس کی تعبیر میں یوں کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جو کچھ ہم نے آپ کو دیا ہے سب کچھ اسی میں ہے اور دونوں جہانوں کی خیر اسی میں ہے اس لیے اس کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی معاملہ میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ساری خیر اسی میں ہے اور اس کے علاوہ کہیں کچھ نہیں ہے۔

اس لیے آپ قطعاً پریشان نہ ہوں اور دو باتوں کا اہتمام کرتے رہیں۔ ان دو باتوں کا اہتمام آپ کے ذمہ ہے اور دشمن کو بے نام و نشان کر دینا ہمارا کام ہے۔ آپ دیکھ لیں گے کہ آپ کو ابتر ہونے کا طعنہ دینے والے خود ابتر ہیں اور دنیا کے نظام میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ آپ کے کرنے کے کام دو ہیں۔ ایک یہ کہ نماز کی پابندی کرتے رہیں اور دوسرا یہ کہ قربانی دیتے رہیں۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ صلوٰۃ سے یہاں مراد پانچ وقت کی نماز بھی ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر لازمی ہے اور اس سے مراد عمومی معنی کے لحاظ سے ''بندگی'' بھی لیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی پر قائم رہیں اور خود کو اس کے حوالہ کر دیں اسی طرح ''نحر'' سے مراد یہ قربانی بھی ہے کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے جانور ذبح کریں اور عمومی مفہوم لیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر جس چیز کو بھی قربان کرنے کی ضرورت پڑے اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ یہ قربانی جذبات وخواہشات کی بھی ہے اور مفادات اور تقاضوں کی بھی کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جس طرح جانوروں کی گردنوں پر چھری رکھتے ہیں اسی طرح خواہشات اور جذبات کو بھی ذبح کر دیں اور اللہ تعالیٰ کے سچے دین کی سربلندی کی راہ میں جو چیز بھی رکاوٹ بنے اسے قربان کر دیں۔ اللہ تعالیٰ وعدہ کر رہے ہیں کہ ان دو باتوں کا اہتمام تم کرلو تو طعنے دینے والے اور کردار کشی کرنے والے دشمن کو شکست دے کر بے نام ونشان میں کر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ سے اللہ پاک نے فرمایا تھا کہ آپ اس ''خیر کثیر'' پر قائم رہیں، نماز پڑھتے رہیں اور قربانی دیتے رہیں، آپ کا دشمن بے نام و نشان ہو جائے گا، یہ وعدہ ہمارے ساتھ بھی ہے اور یہ سبق ہمارے لیے بھی ہے کہ دنیا کے پراپیگنڈہ کی پروا نہ کریں۔ دنیا والے دین اسلام اور دیندار لوگوں کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں، جو طعنے دے رہے ہیں اس سے نہ گھبرائیں، پریشان نہ ہوں بلکہ دین اسلام پر قائم رہیں، نماز اور بندگی جاری رکھیں اور قربانی دیتے رہیں۔ طعنے دینے والوں اور کردار کشی کرنے والوں کا نام ونشان تک مٹ جائے گا، ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے اور ان کے پاس کوئی مشن نہیں ہے سب سے بہتر پروگرام تمہارے پاس ہے سب سے بہتر مشن تمہارا ہے اور اس کے ساتھ مخلص رہو گے تو

مستقبل بھی صرف تمہارا ہے۔ اس حوالہ سے آج ہم اپنے آپ کو دیکھیں اپنا جائزہ لیں اور اپنا احتساب کریں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں، اس جسارت پر مجھے معاف کریں کہ آج ہم سب اسلام کا نام لیتے ہیں اسلامی نظام کی باتیں کرتے ہیں اور اسلام کی سربلندی کے لیے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اسلام کے ساتھ ہمارا طرز عمل کیا ہے؟ ہماری اسلام کی وابستگی بالکل اسی طرح مشروط ہو چکی ہے جس طرح طائف والوں نے فتح مکہ کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے شرطیں پیش کی تھیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبیؐ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ فتح مکہ کے بعد طائف والوں کا وفد مدینہ منورہ آیا اور جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش ہو کر عرض کیا کہ ہم اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں مگر ہماری چند شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ ہم شراب نہیں چھوڑ سکیں گے۔ دوسری یہ کہ زنا کے بغیر ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ تیسری یہ کہ ہمارے تمام تر کاروبار کی بنیاد سود پر ہے، اس سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ چوتھی یہ کہ نماز کی پابندی ہم سے نہیں ہوگی پانچویں شرط یہ کہ زکوٰۃ ادا کرنا ہمارے لیے مشکل ہوگا اور چھٹی شرط یہ کہ ہم جہاد میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ یہ شرطیں اگر منظور ہیں تو ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔

ان شرائط پر ایک بار پھر غور کیجیے اور یہ بھی دیکھئے کہ کیا آج اسلام کو قبول کرنے اور اسلامی نظام کو نافذ کرنے کے لیے کیا ہماری عملی شرائط بھی یہی نہیں ہیں؟ ہم زبان سے بے شک نہ کہیں مگر ہمارا قومی طرز عمل گواہ ہے اور ہماری اجتماعی زندگی شہادت دے رہی ہے کہ ہم اسلام اور اسلامی نظام کے حوالے سے انہی رعایتوں کے طلب گار ہیں جن کا مطالبہ طائف والوں نے کیا تھا۔ سود کے بغیر ہمارا گزارا نہیں رہا۔ شراب اور زنا ہمارے کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔ نماز کی پابندی کے لیے سختی کے سرکاری اقدامات ہمیں قبول نہیں ہیں۔ زکوٰۃ و جہاد کے احکام بوجھ محسوس ہو رہے ہیں اور عمل اور کردار کے حوالہ سے ہم بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں طائف والے کھڑے تھے اور پورے کا پورا اسلام ہمیں ہضم نہیں ہو رہا۔ اس لیے آج پھر اس سبق کو دہرانے کی ضرورت ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے راہ نمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو انہوں نے طائف والوں کی شرطوں کے جواب میں فرمایا تھا اور

شرائط مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسلام میں داخل ہونا ہے تو سب شرطیں چھوڑ کر آؤ اور پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ طائف والوں کو اپنی شرطوں سے دست بردار ہونا پڑا تھا اور انہوں نے شرطیں واپس کر کے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تھا۔

آج ہمارے لیے بھی راہ عمل یہی ہے کہ اسلام کو مکمل طور پر اپنائیں، تمام تر شرائط اور ذہنی تحفظات کو جھٹک دیں۔ اسلام کے ساتھ بے لچک وابستگی قائم کریں۔ نماز کی پابندی کریں اور قربانی دیتے رہیں۔ قربانی جانوروں کی بھی اور اسلام کی راہ میں رکاوٹ بننے والی خواہشات جذبات اور تقاضوں کی بھی اور مخالفانہ پراپیگنڈہ، کردار کشی اور طعن و تشنیع کی پروا نہ کرتے ہوئے اسلام کی سربلندی کے لیے کام کریں۔ آج کی عید کا ہمارے لیے یہی پیغام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی میں ہمارے لیے یہی سبق ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قربانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی مہمانی بھی ہے اس لیے کوشش کریں کہ آپ کے اردگرد کوئی اللہ کا بندہ اس مہمانی سے محروم نہ رہ جائے۔ ان لوگوں کا خاص خیال رکھیں جنہیں عام دنوں میں گوشت میسر نہیں آتا، ان کا بھی آپ کی قربانی میں حق ہے بلکہ ان کا حق زیادہ ہے۔ اپنے اردگرد گلی محلّہ میں اور کنبہ برادری میں ایسے لوگوں کو تلاش کریں اور قربانی کے گوشت سے اپنے فریز ربھرنے کی بجائے غرباء اور مستحقین کو کھلائیں اور ان کی مہمانی کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات

۲۱ جنوری ۲۰۰۳ء کو ہمدرد سنٹر لٹن روڈ لاہور میں "مجلس فکر ونظر" کے زیر اہتمام "پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت "الشریعہ" کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی نے کی۔ سیمینار میں جسٹس (ر) عبدالحفیظ چیمہ، حکیم محمود احمد سرور سہارنپوری، ڈاکٹر محمد امین نے مختلف متعلقہ عنوانات پر مقالات پیش کیے اور متحدہ مجلس عمل کے مرکزی راہ نما حافظ حسین احمد ایم این اے اور صوبہ سرحد کے راہ نما پروفیسر محمد ابراہیم نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے نفاذ اسلام کے لیے متحدہ مجلس عمل کی پالیسی اور پروگرام نیز اس حوالہ سے صوبہ سرحد اور بلوچستان کی تازہ ترین صورت حال پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

اس موقع پر مولانا زاہد الراشدی کے خطاب کا متن پیش خدمت ہے:

نحمدہ تبارک و تعالیٰ و نصلی ونسلم علیٰ رسوله الکریم و علی آله واصحابه واتباعه اجمعین

نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک نظریاتی کارکن کی حیثیت سے مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس سے متعلق اساتذہ نے اگست ۲۰۰۰ء سے "مجلس فکر ونظر" کے نام سے ایک علمی فورم قائم کر رکھا ہے جس میں عصری مسائل پر اسلامی تناظر میں غور کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد سے اب تک نفاذ اسلام کے علمی وفکری تقاضوں اور عصری مسائل کے اسلامی تناظر میں تجزیہ وحل کے لیے غیر سرکاری سطح پر کوئی اجتماعی کام منظم نہیں ہوسکا اور اگرچہ اس حوالہ سے شخصی حوالوں سے اچھا خاصا کام سامنے آیا ہے مگر کسی شخصی فکر اور عقیدت کے دائروں میں محدود ہونے کی وجہ سے قوم کی

اجتماعی زندگی میں اس کے خاطر خواہ ثمرات مرتب نہیں ہو سکے اور نفاذ اسلام کے محاذ پر علمی و فکری ہوم ورک کا خلا بدستور ارباب علم و دانش کو کھٹک رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جس طرح قیام پاکستان کے فوراً بعد تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات مرتب کر کے نفاذ اسلام کے حوالہ سے اجتماعی علمی سوچ اور فکر کا عملی مظاہرہ کیا تھا، اس کا تسلسل قائم رہتا اور اسی جذبہ اور شعور کے ساتھ عصری مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ نفاذ اسلام کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور مشکلات سے نمٹنے کی علمی جدوجہد کی جاتی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور ہماری نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط قومی زندگی میں علماء کرام کے مذکورہ ۲۲ دستوری نکات کے بعد اگر کوئی اجتماعی علمی کاوش نظر آئی ہے تو وہ ۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے، صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی شرعی عدالت کے قیام، حدود آرڈیننس کے نفاذ اور اس نوعیت کے دیگر چند اقدامات تک محدود ہے یا اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور وفاقی شرعی عدالت کے متعدد فیصلوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے مگر جب ہم نفاذ اسلام کے سلسلہ میں عالمی سطح پر پائے جانے والے شکوک و شبہات اور مختلف عالمی حلقوں کی تشویش و اضطرب کے تناظر میں نفاذ اسلام کی اصل علمی و فکری ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ کام قطعی طور پر ناکافی دکھائی دیتا ہے۔ بالخصوص جدید علمی و فکری چیلنجز کے پس منظر میں اجتماعی علمی و فکری جدوجہد کا خلا پوری شدت کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

میری ایک عرصہ سے یہ کوشش اور خواہش رہی ہے کہ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و تدریس کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والے علما اور جدید علوم و فنون بالخصوص قانونی نظام سے تعلق رکھنے والے ارباب دانش کے مشترکہ علمی فورم تشکیل پائیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے طرز اجتہاد کا احیا کرتے ہوئے مسائل کے تجزیہ و تحلیل اور حل کے لیے مشاورتی طریق کار کا راستہ اختیار کیا جائے لیکن متعدد مواقع پر اس کے لیے آواز اٹھانے اور متعلقہ حضرات کو توجہ کے باوجود پیش رفت کی کوئی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس پس منظر میں ''مجلس فکر و نظر'' کے قیام پر مجھے جس قدر خوشی ہو سکتی ہے، اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل محسوس ہو رہا ہے تاہم اس میں یہ کمی میرے خیال میں ابھی تک موجود ہے کہ دینی مدارس کے سینئر اساتذہ اور قانونی شعبہ سے تعلق

رکھنے والے ماہرین سے استفادہ کی شاید ضرورت محسوس نہیں کی گئی یا ان سے رابطہ کا کوئی قابل عمل طریقہ طے نہیں پا سکا۔ لیکن اس حوالہ سے اپنے احساسات و تاثرات کے اظہار پر خود کو مجبور پا رہا ہوں اور اس پر ''مجلس فکر و نظر'' سے معذرت خواہ ہوں۔

جہاں تک پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات پر گفتگو کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اب تک ہونے والے کام پر ایک نظر ڈال لی جائے تو آئندہ ترجیحات پر غور ہمارے لیے آسان ہو جائے گا۔

☆ ملک کے دستور کی بنیاد ''قرار داد مقاصد'' پر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر کے قرآن و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ ملک کا نظام چلانے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسی حوالہ سے یہ ملک ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کہلاتا ہے اور اسی بنیاد پر پاکستان کو ایک نظریاتی اسلامی ریاست کا مقام حاصل ہے۔

☆ دستور میں اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔

☆ قرآن و سنت کے منافی قوانین نافذ نہ کیے جانے اور تمام قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کا دستوری وعدہ کیا گیا ہے۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے جامع رپوٹ پیش کر چکی ہے۔

☆ وفاقی شرعی عدالت نے متعدد قوانین کے بارے میں واضح فیصلے صادر کر رکھے ہیں۔

☆ قومی اسمبلی اور سینٹ آف پاکستان مختلف مواقع پر قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینے کا بل الگ الگ طور پر منظور کر چکی ہیں۔

مگر اس سب کچھ کے باوجود نفاذ اسلام کی دلّی ابھی بہت دور ہے اور اس کے قریب آنے کا سر دست کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کا موجودہ نظام جن طبقات کی گرفت میں ہے اور جو گروہ پاکستان کے مروجہ سسٹم کا کنٹرول پوری قوت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں ان میں سے

کوئی طبقہ بھی نفاذ اسلام کے لیے سنجیدہ نہیں ہے اور وہ اسے قوم کو بہلانے کے لیے کھلونے سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس طبقہ میں سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ جاگیردار اور اعلیٰ مراعات یافتہ گروہ بھی شامل ہیں اور انہیں پاکستان میں نفاذ اسلام کا ہر قیمت پر راستہ روکنے کے لیے عالمی استعمار اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کی بھرپور حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔ اس لیے میرے نزدیک نفاذ اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعتوں اور طبقات کی ترجیحات میں سب سے پہلے اس بات کو اہمیت حاصل ہونی چاہیے کہ مروجہ نظام کی حفاظت کے لیے لوکل اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے قائم کردہ حصار اور ریڈ لائن کو کیسے توڑا جائے؟ کیونکہ اس حصار کو توڑے بغیر اور مروجہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کیے بغیر نفاذ اسلام کا کوئی سنجیدہ قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی نظام میں تبدیلی کی کوئی کوشش کامیاب ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد تاریخ اسلام سے دو تین مواقع کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جب چند نیک دل حکمرانوں کو بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کا موقع ملا اور انہوں نے اس بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کے لیے پوری دیانت داری کے ساتھ پیش رفت کی۔ ہوسکتا ہے ان کے اقدامات اور طرز عمل سے ہمارے لیے راہ نمائی کا کوئی راستہ نکل آئے۔

پہلے نمبر پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں جنہوں نے پہلی صدی ہجری کے اختتام پر خلافت کی ذمہ داری قبول کی جبکہ ملکی نظام میں خاصا بگاڑ آچکا تھا۔ عوامی حاکمیت کی بجائے حکمران طبقہ وجود میں آگیا تھا۔ وی آئی پی کلچر نے مسلمان سوسائٹی میں اپنی جگہ بنالی تھی اور قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ کا یہ عالم تھا کہ بعض مؤرخین کے بقول بیت المال یعنی قومی خزانے کے اسی فی صد اموال اور اثاثے شاہی خاندان اور مراعات یافتہ طبقوں کی تحویل میں تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے برسر اقتدار آنے کے بعد اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جو اقدامات کیے ان کی فہرست طویل ہے لیکن ان میں چند اہم اقدامات یہ ہیں

☆ قومی خزانے کی رقوم اور اثاثوں کی واپسی کا آغاز اپنی ذات اور گھر سے کیا اور

پھر کسی رعایت کے بغیر تمام متعلقہ لوگوں سے قومی خزانے کی رقوم اور اثاثے سختی کے ساتھ واپس لے لیے۔

☆ سابق حکمرانوں نے رعایا پر جو ناجائز ٹیکس عائد کر رکھے تھے، وہ ختم کر دیے اور عام لوگوں کو سرکاری عمال کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلائی۔

☆ وی آئی پی کلچر کا خاتمہ کیا اور پروٹوکول اور پرسٹیج کے ضابطے ختم کر دیے۔

☆ خود بھی عام لوگوں جیسی سادہ زندگی اور رہن سہن اختیار کیا اور دوسرے سرکاری حکام کو بھی عام لوگوں جیسے معیار زندگی کی طرف واپس آنے پر مجبور کیا۔

☆ قانون کی عملداری بحال کی اور سرکاری عمال کو پابند کیا کہ وہ کسی شخصیت، طبقہ یا خاندان کی پروا کیے بغیر قرآن وسنت کے مطابق تمام امور کے فیصلے کریں۔

☆ چھٹی صدی ہجری میں ایک نیک دل حکمران سلطان نورالدین زنگی نے شام کی حکومت کا کنٹرول حاصل کیا تو اسے بھی ایک بگڑے ہوئے نظام کا سامنا تھا اور اس نے اصلاح احوال کے لیے جو طریقے اختیار کیے، ان میں سے چند ایک کا مؤرخین اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

☆ جزیہ اور خراج کے سوا تمام ٹیکس منسوخ کر دیے۔

☆ عام ضرورت کی تمام اشیا کو چونگی اور ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

☆ منکرات وفواحش اور بدکاری و بے حیائی کے خاتمہ کے لیے سخت گیر پالیسی اختیار کی۔

☆ سرکاری خرچ پر مفت شفاخانہ قائم کیا۔

☆ دمشق میں علم حدیث کی تعلیم کے لیے مستقل مدرسہ قائم کیا جو عالم اسلام کا پہلا ''سرکاری دار الحدیث'' کہلاتا ہے اور جس کے شیخ الحدیث معروف محدث حافظ ابن عساکرؒ تھے۔

☆ خراسان کے معروف ریاضی دان قطب الدین نیشاپوریؒ کو دمشق میں بلوا کر بڑی درسگاہ قائم کی۔

بارہویں صدی ہجری کے دوران جب ہندوستان میں مغل بادشاہت کا چراغ بتدریج

گل ہو رہا تھا، جنوبی ہند کی ریاست میسور میں سلطان ٹیپوؒ نے اقتدار سنبھالا تو اسے ایک زوال پذیر معاشرے سے سابقہ درپیش تھا اور وہ جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے میسور کی سلطنت خداداد کو ایک خوشحال اور مستحکم اسلامی ریاست بنانے کی ہر ممکن کوشش کی، تجارت و زراعت کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ دفاع اور اسلحہ سازی کی طرف خصوصی توجہ دی اور جہاز سازی کے میدان میں پیش رفت کر کے عسکری قوت میں فرنگی استعمار کے بالمقابل آنے کا عزم کیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ گر ٹیپو شہیدؒ کو اس کی خواہش کے مطابق ترکی کی خلافِ عثمانیہ کی سرپرستی حاصل ہو جاتی اور میسور کی پڑوسی مسلم ریاستیں اس کے مقابلہ میں فرنگی حکمرانوں کا ساتھ نہ دیتیں تو سلطان ٹیپوؒ کی حکمت عملی اور عزم میں اتنی قوت تھی کہ وہ جنوبی ایشیا کے ایک بڑے حصے کو برطانوی استعمار کے آبادیاتی تسلط سے آزاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر خلافت عثمانیہ اور ریاست حیدر آباد دونوں نے اس مردِ غیور کا ساتھ دینے اور اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دینے کو ترجیح دی جس کی وجہ سے نہ صرف سلطان ٹیپوؒ کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا بلکہ جنوبی ایشیا کی یہ اسلامی ریاست بھی تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو گئی۔

ہمیں پاکستان میں اس سے کہیں زیادہ سنگین صورت حال درپیش ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور سلطان نور الدین زنگیؒ کے سامنے ایک بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کا مشن تھا جو انہوں نے اپنے خلوص، دیانت اور کردار کی بدولت پورا کر دکھایا جبکہ سلطان ٹیپوؒ کے سامنے اپنی سلطنت کی آزادی کو بچانے اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مستقبل کا سوال تھا جسے وہ حل نہ کر سکا مگر اپنی جان کا نذرانہ دے کر اس نے مسلمانوں کو اپنی آزادی، خودمختاری اور اسلامی تشخص کے تحفظ کی جدوجہد کا راستہ بتا دیا۔ ہمارے سامنے یہ دونوں چیلنج ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ سنگین اور خوفناک شکل میں ہیں۔ اس لیے پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سلطان نور الدین زنگیؒ اور سلطان ٹیپو شہیدؒ کے کردار، عزم اور حوصلہ واستقامت سے راہ نمائی حاصل کرنا ہو گی اور محض ''روایتی سیاسی عمل'' پر قناعت کرنے کی بجائے ایک ملی و دینی مشن کے طور پر اس کے طریق کار اور ترجیحات کا تعین کرنا ہو گا۔

آخر میں صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے حوالہ سے بھی کچھ عرض کرنا ضروری

سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ نہ صرف پاکستان کے عوام بلکہ دنیا بھر کی دینی تحریکات اور دینی کارکنوں کی نظریں ان پر لگی ہوئی ہیں اور افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے جبری خاتمہ نے دنیا بھر کے دینی کارکنوں کے دلوں پر جو زخم لگائے ہیں، وہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اپنے زخموں پر مرہم کی طرح محسوس کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے موقع پر میں لندن میں تھا۔ انتخابات کے نتائج سامنے آنے پر کم از کم چھ مختلف ملکوں کے مسلم دانش وروں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور مبارک باد دیتے ہوئے اپنے جذبہ اور خلوص کے مطابق صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی متوقع حکومت کو کامیاب بنانے کے لیے بہت سے مشورے دیے۔ انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ شاید متحدہ مجلس عمل میں مجھے بھی ایسی حیثیت حاصل ہے کہ میں اس کی قیادت کو پالیسی اور ترجیحات کے معاملہ میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں اور اسی وجہ سے مجھے مفید مشوروں سے نواز رہے تھے جبکہ میں اس بات پر خوش تھا کہ متحدہ مجلس عمل کو صرف پاکستان کے دین دار عوام ہی نہیں بلکہ مختلف ملکوں کے مسلمان دانشور بھی اپنی جماعت سمجھ رہے ہیں اور اس سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان سب دوستوں کے مشوروں کا خلاصہ یہ تھا کہ:

☆ متحدہ مجلس عمل کو صوبہ سرحد میں ایک مثالی عوامی اور اسلامی حکومت کا عملی نقشہ پیش کرنا چاہیے۔

☆ عوامی مسائل کے حل اور مشکلات کے خاتمہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

☆ سماجی انصاف اور معاشرتی عدل کی فراہمی کو اولیت دینی چاہیے۔

☆ پروٹوکول، پرسٹیج اور وی آئی پی کلچر کے عذاب سے لوگوں کو نجات دلانا چاہیے۔

☆ صوبائی وزراء کو قناعت، سادگی اور قانون کی یکساں عملداری کا اپنی ذاتی زندگی میں نمونہ بننا چاہیے۔

☆ ناانصافی، رشوت، بدعنوانی اور سرخ فیتہ کی لعنت کے خاتمہ کے لیے سنجیدہ اقدامات کرنے چاہئیں۔

☆ عام لوگوں میں اپنی مدد آپ کے تحت سماجی کاموں کا شعور بیدار کرنا چاہیے اور ہر لحاظ سے دوسرے صوبوں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے وزرا سے متحدہ مجلس

عمل کے وزرا کو الگ اور ممتاز نظر آنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف اپنے صوبہ میں عوام کو عدل وانصاف کا صحیح ماحول فراہم کر سکیں بلکہ ان کا کردار اور حکومتی طرز عمل ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام کے لیے بھی باعث کشش ہو اور پورے پاکستان کے عوام عملاً یہ محسوس کریں کہ ان کی فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل اسلامی نظام اور دینی قیادت ہی سے وابستہ ہے۔

ان مشوروں کے ساتھ میں اپنی طرف سے سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے لیے ایک مشورہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامائزیشن کا بہت سا کام اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی شکل میں موجود ہے۔ صرف آئین کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر صوبائی اختیارات کی حدود واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے بعد صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو چھانٹ لیجیے اور متعلقہ ماہرین کی مشاورت سے ترجیحات طے کر کے صوبائی اسمبلی کے ذریعہ ان کے بارے میں قانون سازی کا آغاز کر دیجیے کہ اس وقت آپ کے بس میں عملاً صرف یہی ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب اپنے بس اور اختیار کا کام آپ کر گزریں گے تو اگلی پیش رفت کی راہیں بھی اللہ تعالیٰ ضرور کھول دیں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اسلامی احکام وقوانین
کا
مزاج واسلوب

جامعہ فتاح العلوم نوشہرہ سانسی گوجرانوالہ کے ایک اجتماع سے خطاب:

آج کی محفل میں دور نبوی ﷺ کے ایک ایسے واقعہ کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے اسلام کے معاشرتی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلامی احکام وہدایات کے اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ یہ واقعہ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا ہے جو حدیث نبویؐ کے بڑے راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ صوفی منش بزرگ تھے، نماز، روزہ اور تعلیم وتعلم کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ان کا معمول بن گیا تھا کہ روزانہ پابندی کے ساتھ روزہ رکھتے تھے اور رات کا بیشتر حصہ اہتمام کے ساتھ نماز وقیام میں گزارتے تھے حتیٰ کہ حافظ ابن عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں ذکر کیا ہے کہ ان کے والد حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں باقاعدہ شکایت کرنا پڑی۔ اس شکایت کا پس منظر بھی بعض روایات میں بڑا دلچسپ بیان ہوا ہے۔ ان کی شادی ہوئی اور اپنی اہلیہ کے ساتھ الگ گھر میں آباد ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ بیٹے اور بہو کا حال احوال دریافت کرنے کے لیے ان کے گھر گئے، بہو گھر میں موجود تھیں ان سے حال پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہر طرح خیریت ہے پھر اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے طرز عمل اور سلوک کے بارے میں استفسار کیا تو اس نیک دل خاتون نے معنی خیز انداز میں کہا کہ

"آپ کا بیٹا بہت نیک ہے۔ ساری رات مصلے پر ہوتا ہے اور سارا دن روزے سے رہتا ہے۔"

عمرو بن العاصؓ جہاندیدہ شخص تھے فوراً سمجھ گئے کہ بہو دراصل شکایت کر رہی ہے۔ چنانچہ

خود کچھ کہنے کی بجائے جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں شکایت پیش کردی۔ اس سے آگے کا واقعہ بخاری شریف میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو بلایا اور اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے تصدیق کردی کہ وہ روزانہ بلا ناغہ روزہ رکھتے ہیں اور رات کا اکثر حصہ نماز و قیام میں گزارتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا کہ

''تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے''

یعنی نبی اکرم ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے جسے جتنا زیادہ ادا کیا جائے کم ہے لیکن اس سے انسان کے اپنے جسم، گھر والوں اور ملنے والوں کے حقوق متاثر نہیں ہونے چاہئیں اور انسان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان توازن قائم رکھنا چاہیے جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ وہ ہر چاند ماہ کے درمیانے تین روزے رکھ لیا کریں انہیں ہمیشہ کے روزوں (صوم الدھر) کا ثواب مل جائے گا۔ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ بہت کم ہیں اور میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اچھا یہ معمول بنالو کہ ایک دن روزہ رکھو اور دو دن نہ رکھو اس طرح مہینے میں دس روزے ہو جایا کریں گے۔ حضرت عبداللہؓ اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی ہمت رکھتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی سنت اپنا لو کہ وہ زندگی بھر ایک دن چھوڑ کر ایک روزہ رکھا کرتے تھے اور مہینے میں پندرہ روزے بن جاتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا اس پر بھی قناعت کرنے کو جی نہ چاہا اور یہ کہہ کر مزید تقاضا کیا کہ میں اس سے افضل روزوں کی طاقت رکھتا ہوں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے حد بندی کر دی اور فرمایا کہ اس سے افضل کوئی روزہ نہیں ہے۔ بعض روایات کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کے بارے میں بھی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے جناب نبی اکرم ﷺ کی اسی نوعیت کی گفتگو ہوئی اور ان کے اصرار کے باوجود انہیں رسول اکرم ﷺ نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ سات دن سے کم مدت میں قرآن کریم مکمل کیا کریں اور اس طرح رسول اکرم ﷺ نے حکماً عبداللہ بن عمروؓ کے اوقات کے ایک حصے کو نماز اور قرآن سے فارغ کر کے انہیں اپنے جسم، بیوی، مہمانوں اور دیگر

لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ زندگی بھر اس معمول پر قائم رہے جو جوانی اور ہمت کے دور میں تو انہیں اپنی طاقت سے کم نظر آتا تھا لیکن جب بڑھاپے اور ضعف نے غلبہ پایا تو مشکل محسوس ہوئی۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق وہ خود بڑھاپے میں کہا کرتے تھے کہ ”اے کاش! میں نے نبی اکرم ﷺ کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا“ مگر اب ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ جس معمول کا وعدہ وہ خود اپنے اصرار پر جناب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کر چکے تھے اسے چھوڑنے کے لیے خود کو تیار نہیں کر پاتے تھے اور بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے اس معمول کو نباہنا ان کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔

اس واقعہ سے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن برقرار رکھنے کا حکم دیتا ہے اور حقوق اللہ کی ادائیگی کی کوئی صورت قبول نہیں کرتا جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہوں وہاں ایک اور بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ انسان جب بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے سامنے وقتی حالات ہوتے ہیں اور وہ انہی کی روشنی میں معاملات انجام دیتا ہے۔ لیکن اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت اسلام میں اس کے تمام احوال و ظروف کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جو بسا اوقات انسان کو عجیب محسوس ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے اول و آخر تمام احوال سے واقف ہیں اس لیے قاعدہ اور ضابطہ وہی دیرپا اور موثر ثابت ہوتا ہے جو انسان کا خود اپنا طے کردہ نہ ہو بلکہ اس کے ماضی اور مستقبل سے مکمل آگاہی رکھنے والے مالک و خالق کی طرف سے بیان کیا گیا ہو۔ یہی صورت انسانی اجتماعیت کے قوانین و احکام کی ہے کہ انسان جب اپنی سوسائٹی کے لیے خود قوانین وضع کرتے ہیں تو قوانین وضع کرنے والا خواہ فرد ہو یا جماعت، نمائندہ ہو یا ڈکٹیٹر اس کے سامنے احوال و ظروف اور اسباب و محرکات سب وقتی ہوتے ہیں اور وہ انہی کے دائرے میں قاعدے اور ضابطے ترتیب دیتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ بے کار ہو جاتے ہیں اور اسی لیے انسانی معاشرے کے لیے وہی قوانین و احکام فطری اور دیرپا ہیں جو کائنات کے خالق و مالک نے وحی کے ذریعے بھیجے ہیں کیونکہ وہ ساری نوع انسانی کی ضروریات کو خود ان سے بھی بہتر طور پر جانتا ہے اور سب کے ماضی حال اور مستقبل سے کما حقہ آگاہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے آج تک کبھی قانون کے بارے میں نہ معذرت کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے اور نہ کسی دور میں اس کے غیر موثر ہونے کی کوئی شکایت سنی گئی۔

جدید مغربی معاشرے کے لیے دینی مدارس کا پیغام

۱۷۔اکتوبر ۲۰۰۲ء کو شیفیلڈ (برطانیہ) میں مدنی ٹرسٹ نوٹنگھم کے زیر اہتمام جامعہ الہدیٰ کی افتتاحی تقریب سے خطاب۔

برادر محترم مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور ان کے رفقا کا شکر گزار ہوں کہ جامعہ الہدیٰ شیفیلڈ کے افتتاح کے موقع پر اس تقریب میں آپ حضرات کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا موقع فراہم کیا اور اس نئے تعلیمی ادارے کے آغاز پر مدنی ٹرسٹ کے تمام دوستوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس ادارہ کو پورے خطے میں دین کی سربلندی اور علم کے فروغ کا ذریعہ بنائیں۔آمین یارب العالمین

ہم ایک دینی درس گاہ کے افتتاح کی تقریب میں جمع ہیں اور دینی مدارس کے حوالے سے اس وقت یہ صورت حال ہمارے سامنے ہے کہ ایک طرف دینی مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور نئی دینی درس گاہیں قائم ہو رہی ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس کی مخالفت عالمی سطح پر بڑھتی جا رہی ہے۔اس مدرسہ کو انسان کی تہذیبی پیش رفت میں رکاوٹ قرار دیا جا رہا ہے، سولائزیشن کا دشمن بتایا جا رہا ہے اور بلند آہنگی کے ساتھ یہ پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ یہ مدرسہ تہذیب و تمدن کے لیے خطرہ ہے سولائزیشن اور نسل انسانی کی ثقافتی پیش رفت کے لیے خطرہ ہے اور موجودہ عالمی سسٹم کے لیے خطرہ ہے، اس لیے اسے ختم کیا جائے یا کم از کم اس کے جداگانہ تشخص، کردار، آزادی اور خودمختاری کو محدود کر دیا جائے۔میں اس پس منظر میں آج کی اس محفل میں صرف ایک پہلو پر مختصراً کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔وہ یہ کہ وہ لوگ جو اس مدرسہ کی مخالفت میں پیش پیش ہیں اور اسے بند کرنے کے درپے ہیں، ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تم انصاف کی نظر سے دیکھو تو یہ مدرسہ خود تمہاری ضرورت بھی ہے اور

پوری نسل انسانی کو اس کی ضرورت ہے۔ میری اس گزارش کے مخاطب وہ تمام لوگ ہیں جو اس دینی مدرسہ کے مخالف ہیں اور خاص طور پر ویسٹرن سولائزیشن کے علم برداروں اور مغربی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرنے والے دانش وروں سے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ یہ دینی درس گاہ تمہاری ضرورت بھی ہے، جو کچھ یہ مدرسہ پڑھا رہا ہے اور جن علوم کو یہ تاریخ کی دست برد سے محفوظ رکھے ہوئے ہے، اس کی مستقبل میں تمہیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے بلکہ ضرورت پڑے گی اس لیے تم اس کی ضرورت سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

تم نے اب سے دو تین سو برس قبل یورپ میں اہل مذہب کے ظالمانہ کردار سے تنگ آ کر اس کے ردعمل میں مذہب کا طوق گردن سے اتار دیا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب سے تین صدیاں قبل یورپ میں اہل مذہب کا کردار کیا تھا اور کس طرح انہوں نے پورے معاشرے کو اپنے ظالمانہ کردار کے شکنجے میں کسا ہوا تھا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسی کے ردعمل میں تم نے مذہب سے پیچھا چھڑانے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ تم اہل مذہب کی مخالفت میں خود مذہب کے خلاف انتہا پر چلے گئے اور تم نے کہا کہ اب انسانی سوسائٹی بالغ ہوگئی ہے اور اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے، اس لیے انسان کو باہر سے ڈکٹیشن لینے کی ضرورت نہیں ہے اور آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی پابندی کا دور گزر گیا ہے اس لیے اب ہم اپنے معاملات خود طے کریں گے، انسانی سوسائٹی اپنے فیصلے خود کرے گی اور کسی بیرونی ہدایت کے بغیر اپنا نظام خود چلائے گی۔ تم نے اس فلسفے پر ایک نیا نظام تشکیل دیا، ایک نیا کلچر پیش کیا اور پھر اسے پوری دنیا پر مسلط کرنے کے لیے ہر طرف چڑھ دوڑے۔

لیکن تین صدیوں کے بعد آج تمہاری اس تگ و دو کے نتائج سامنے آرہے ہیں تو تم خود پریشانی کا شکار ہو گئے ہو، آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی راہ نمائی سے بے نیاز ہو کر آج انسانی سوسائٹی فکری انتشار، تہذیبی انارکی اور افراتفری کی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور تمہاری دانش گاہیں خود اس مقام سے واپسی کی راہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم جان میجر نے اس نعرہ پر باقاعدہ مہم چلائی کہ ”Back to Bases“ (بنیادوں کی طرف واپسی) کی ضرورت ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے بنیاد پرستی کو طعنہ بنا دیا گیا ہے اور اہل مغرب خود بنیادوں کی طرف واپسی کا راستہ تلاش کر رہے ہیں برطانوی ولی عہد شہزادہ

چارلس نے بی بی سی پر کئی لیکچر دیے اور کہا کہ ہم نے صرف عقل کو معیار قرار دے کر ٹھوکر کھائی ہے اور ہم نسل انسانی کو نقصان کی طرف لے جا رہے ہیں اس لیے ''وجدان'' کی طرف واپسی کی ضرورت ہے۔ برطانوی شہزادے نے ''وجدان'' کی اصطلاح استعمال کی ہے جو ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس کے بعد وحی اور الہام ہی کی بات آئے گی۔ جبکہ ممتاز روسی لیڈر اور دانش ور گورباچوف نے کھلے بندوں اعتراف کیا کہ ہم نے عالمی جنگ کے بعد دفتروں اور کارخانوں میں افرادی قوت کے خلا کو پر کرنے کے لیے عورت کو بہکا کر گھر سے نکالا جس سے ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا ہے اور اب ہمیں عورت کو دوبارہ گھر میں لے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔

ان باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کے دانش وروں کی سوچ کا رخ کیا ہے اور وہ موجودہ صورت حال سے کس قدر پریشان ہیں۔ اب یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی رہنمائی سے پیچھا چھڑا کر نسل انسانی نے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ نقصان سے دوچار ہوئی ہے اور انسانی سوسائٹی کو اس نئے فلسفے اور کلچر نے اخلاقی انارکی اور ذہنی خلفشار کے سوا کچھ نہیں دیا چنانچہ مغرب کی دانش گاہوں میں اس بات پر غور شروع ہو چکا ہے کہ یہاں سے واپسی کا راستہ کیا ہے اور انسانی سوسائٹی کو اس دلدل سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔

مغرب کے اہل دانش سے میرا سوال ہے کہ جس ''وجدان'' اور ''بنیادوں'' کی طرف واپسی کی تم بات کر رہے ہو، اگر تم نے اس کا فیصلہ کر لیا اور تمہارے پاس اب اس فیصلے کے سوا کوئی اور ''چوائس'' باقی بھی نہیں رہا تو یہ بنیادیں تمہیں ملیں گی کہاں سے؟ اور عقل انسانی کے لیے بیرونی راہ نمائی یا دوسرے لفظوں میں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کا یہ سودا تم آخر کس دکان سے حاصل کر سکو گے؟ یہ ''جنس'' آج مسلمانوں کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ کسی اور مذہب کے ماننے والوں کے پاس آسمانی تعلیمات کا کوئی قابل اعتماد ذخیرہ موجود ہے۔ یہ سعادت صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس نہ صرف قرآن کریم اصلی حالت میں محفوظ و موجود ہے بلکہ قرآن کریم کی تشریحات و تعبیرات میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات بھی تمام تر جزئیات و تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں اور نسل انسانی نے جب بھی آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا، اسے یہ چیز صرف اور صرف مسلمانوں کے ہاں سے ہی ملے گی اور دنیا کا کوئی مذہب انسانی سوسائٹی کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے آخری کتاب قرآن کریم اور آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات و تعلیمات کی حفاظت کا ایسا فول پروف انتظام کر رکھا ہے کہ ان میں کسی اور چیز کی دراندازی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت ہے کہ لاکھوں سینوں میں قرآن کریم کے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کے سب سے پہلے لکھوائے جانے والے نسخے بھی ابھی تک موجود و محفوظ ہیں جو امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اس لیے آج صرف اور صرف مسلمان اس دعویٰ کی پوزیشن میں ہیں کہ ان کے پاس آسمانی تعلیمات محفوظ حالت میں موجود ہیں اور نسل انسانی کو جب بھی آسمانی تعلیمات کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ اصلی حالت میں اسے مسلمانوں کے پاس مل جائیں گی۔

میں مغرب کے اہل دانش سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سمجھ دار لوگ ہیں اور سمجھ دار لوگوں کی ایک علامت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی متبادل ضرور ذہن میں رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی مغرب کے دانش وروں کو سوچنا چاہیے کہ جس راستے پر انہوں نے نسل انسانی کو تین سو برس قبل چلانا شروع کیا تھا، اس کی ناکامی کی صورت میں ان کے پاس اس کا متبادل کیا ہے؟ اور انہوں نے اس کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟

آج سچی بات یہ ہے کہ مغرب کا فلسفہ ناکام ہو چکا ہے، مغرب کے کلچر نے انسانی سوسائٹی کو اخلاقی انارکی اور ذہنی خلفشار سے دوچار کر دیا ہے، انسانی قدریں برباد ہو گئی ہیں، خاندانی نظام جو انسانی سوسائٹی کا بنیادی یونٹ ہے، بکھر کر رہ گیا ہے اور خود مغرب کے دانشوروں نے وجدان، بنیادوں اور ماضی کی طرف واپس جانے کے لیے سوچنا شروع کر دیا ہے اس لیے میں ان سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دینی مدرسہ جس کو وہ ختم کرنے کے درپے ہیں، انہی وجدانیات، بنیادوں اور ماضی کے اخلاقی اقدار کی تعلیم دے رہا ہے جن کی ضرورت کا احساس خود ان کے ذہنوں میں اجاگر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہ مدرسہ ان اقدار و تعلیمات کو نہ صرف محفوظ رکھے ہوئے ہے بلکہ اسے نئی نسل کے سپرد کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کے محاذ پر سرگرم عمل بھی ہے اور اس حوالے سے یہ مدرسہ ان لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور کل جب انہیں کہیں اور پناہ نہیں ملے گی، یہی مدرسہ ان کی راہ نمائی اور نجات

کے لیے کردار ادا کرے گا۔

باقی رہی بات اس مدرسہ کو ختم کرنے کی تو میں اس موقع پر اہل مغرب سے اختصار کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تم بار بار اس بات کا تجربہ کر چکے ہو کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں اس لیے اس کام میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم نے ۱۸۵۷ء کے بعد جنوبی ایشیا میں اس درس گاہ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا لیکن جبر و تشدد کے تمام تر مراحل کے باوجود جنوبی ایشیا میں یہ درس گاہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ پہلے سے زیادہ متحرک اور موثر کردار ادا کر رہی ہے۔ تم نے ترکی میں اس مدرسہ کو اپنی طرف سے مکمل طور پر ختم کر دیا تھا اور اس کو دوبارہ ابھرنے سے روکنے کے لیے پون صدی سے جبر کا ہر حربہ آزما رہے ہو لیکن یہ مدرسہ ترکی میں بھی زندہ ہے اور اگر تم اس کی زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہو تو ترکی میں فوج کے جبر سے ہٹ کر ایک الیکشن کرا کے دیکھ لو، تمہیں اس مدرسے کی کارکردگی کا گراف معلوم ہو جائے گا۔ تم نے وسطی ایشیاء میں اس مدرسہ کو بند کرنے کے لیے جبر اور تشدد کو انتہا تک پہنچا دیا اور اس درس گاہ کا کردار ختم کرنے کے لیے ریاستی جبر کی ہر شکل آزما کر دیکھ لی ہے لیکن پون صدی کے بعد دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ وسطی ایشیا میں بھی یہ مدرسہ زندہ ہے اور اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

اس لیے میں مغرب کے دانش وروں کو آج کی اس محفل کی وساطت سے یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ حقائق سے آنکھیں بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ مدرسہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ پوری نسل انسانی کی اور خود تمہاری بھی ضرورت ہے۔ اس چٹان سے سر ٹکرانے کے بجائے اس کے وجود کو تسلیم کرو اور اس کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کا پیغام نسل انسانی کے بہتر مستقبل کا پیغام ہے، انسانی سوسائٹی کو انارکی اور خلفشار کی دلدل سے نکالنے کا پیغام ہے اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کا پیغام ہے۔ اب نسل انسانی کو اسی پیغام کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے سوا نسل انسانی کی فلاح کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

دینی مدارس کو درپیش چیلنج!

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسلام اسلام آباد میں دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے تعاون سے دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے "دینی مدارس" شخصی اور اداراتی نشوونما کے عنوان سے دس روزہ تربیتی پروگرام چل رہا ہے اس کا آغاز 11 مارچ کو ہوا اور 20 مارچ تک جاری رہے گا۔ مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کے اساتذہ اس میں شریک ہیں اور ممتاز ارباب فکر ودانش انہیں اپنے تجربات اور افکار سے آگاہ کر رہے ہیں۔ مجھے بھی اس میں اساتذہ کے سامنے کچھ گزارشات پیش کرنے کی دعوت دی گئی اور میں نے 12 مارچ کو دو نشستوں میں
ا۔ دینی مدارس کو درپیش چیلنجوں اور موزوں حکمت عملی اور ۲۔ دینی مدارس، روایت، تحقیق اور فن تحقیق کے عنوانات پر معروضات پیش کیں، جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ:

دینی مدارس کو درپیش چیلنجوں پر گفتگو سے پہلے مدارس کے موجودہ معاشرتی کردار پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بعد ہم ان چیلنجوں کا صحیح طور پر ادراک کر سکیں گے جو دینی مدارس کے اس موجودہ نظام اور نیٹ ورک کو درپیش ہیں۔ جنوبی ایشیا کے تناظر میں یہ دینی مدارس جداگانہ تشخص اور مکمل خود مختاری کے ساتھ ایک وسیع نیٹ ورک کی صورت میں گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے جو کردار ادا کر رہے ہیں، اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) قرآن وسنت اور اس سے متعلقہ علم کی حفاظت، ان کی تعلم وتدریس کے تسلسل اور انہیں اگلی نسل تک صحیح حالت میں پہنچانے کے ساتھ ساتھ عام مسلمان کا وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات، یعنی قرآن کریم اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ان مدارس کا

بنیادی ہدف اور کردار ہے۔

(۲) مسلم معاشرے میں مسجد اور مکتب کا ادارہ قائم رکھنے کے لیے یہ مدارس رجال کار فراہم کر رہے ہیں۔ کسی جگہ بھی مسجد کا نظام بچانے اور دینی تعلیم کا مکتب قائم کرنے کے لیے امام، خطیب مدارس، قاری، موذن، اور مفتی حضرات کی درجہ بدرجہ ضرورت ہوتی ہے اور یہ افراد تعلیم یافتہ صورت میں ان مدارس سے ہی فراہم ہوتے ہیں۔ ان کے سوا ان افراد کی تیاری اور فراہمی کا کام کسی اور جگہ نہیں ہوتا۔

(۳) یہ مدارس مسلمانوں کا نظریاتی اور ثقافتی حصار ہیں۔ عقیدے اور ثقافت کے حوالے سے کہیں سے بھی حملہ ہو اور اسلامی عقائد اور ثقافت و روایات کے خلاف کسی جانب سے بھی آواز اٹھے، یہ مدارس اس کے مقابلے میں سد راہ بنتے اور دفاع میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

مدارس کا کردار آج کے عالمی استعمار کو کھٹکتا ہے، اس لیے کہ مسلم معاشرے میں مغربی ثقافت کے نفوذ اور استعماری تسلط کے استحکام میں مدارس کا یہ رول سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے ان مدارس کی کردار کشی اور ان کے کردار کو ختم کرنے، محدود کرنے یا دیگر قومی شعبوں میں ضم کر کے تحلیل کر دینے کی مسلسل کوشش ہوتی رہتی ہے۔

اس پس منظر میں دینی مدارس کو آج کے حالات میں درپیش چیلنجوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک چیلنج وہ ہے، جو انہیں خارج سے درپیش ہے اور وہ دو عملی صورتوں میں ہے۔ پہلے نمبر پر ان کے وجود کے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ عالمی اور ملکی سطح پر مقتدر طبقات ایک مدت سے اس تگ و دو میں ہیں کہ ان مدارس کا وجود اپنی موجودہ کیفیت کے ساتھ قائم نہ رہے۔ یا تو ریاستی انتظام کے دائرے میں لا کر اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے خوبصورت لیبل کے ساتھ انہیں ان کے جداگانہ دینی تعلیمی تشخص سے محروم کر دیا جائے اور یا جدید علوم بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی کو نصاب میں شامل کرنے کے بہانے خالص دینی تعلیم کے نصاب کو تحلیل کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ان کا یہ آزادانہ کردار بھی باقی نہ رہنے دیا جائے کہ وہ اپنے تعلیمی نظام و نصاب کے تعین کے ساتھ ساتھ مالیاتی اور انتظامی طور پر بھی مکمل حیثیت سے خود مختار ہیں اور کسی کی مداخلت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

مدارس کے اس جداگانہ تشخص اور مالیاتی و انتظامی خودمختاری کے کچھ نقصانات بھی ہوں گے جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلم معاشرے میں دینی مدارس کے کردار کے جن تین پہلوؤں کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا ہے اس کردار کے موثر اور نفع بخش ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار ہے، اس سے محروم ہو کر دینی مدارس اپنا وہ کردار باقی نہیں رکھ سکیں گے جو گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے ان کا امتیاز چلا آرہا ہے۔

خارجی طور پر دینی مدارس کو درپیش دوسرا بڑا چیلنج عالمی میڈیا اور ذرائع ابلاغ ہیں۔ ان کی کردار کشی کی مہم ہے جو منظم اور مربوط طور پر چلائی جارہی ہے اور مدارس کی ایسی مکروہ تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جارہی ہے، جو حقیقت کے منافی اور انتہائی نفرت انگیز ہے، انہیں قرون مظلمہ اور ظلم و تشدد کے اس تاریک دور کے پس منظر میں دنیا کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، جب یورپ میں بادشاہ اور جاگیردار کی حکمرانی تھی اور عام آدمی غلاموں سے بھی بدتر جانوروں جیسی زندگی بسر کررہا تھا۔ بادشاہ اور جاگیردار کے اس ظلم و جبر میں مذہبی ادارے اور شخصیات عام مظلوم لوگوں کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ کے طرفدار اور جاگیردار کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے۔

عالمی میڈیا دینی مدارس کی غلط تصویر پیش کر کے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کررہا ہے کہ یہ دینی مدارس وہی تاریک دور واپس لانا چاہتے ہیں اور اس دور کی نمائندگی کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات قطعی طور پر غلط اور تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ اس حوالے سے میں مغرب والوں سے عرض کیا کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اگر مذہب سے دست بردار ہونا پڑا تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ قرون مظلمہ میں بادشاہ اور جاگیردار کے وحشیانہ مظالم میں مذہب ان کا ساتھی تھا اور سرکردہ مذہبی شخصیات ان ظالموں کی پشت پناہ تھیں اسی طرح جب سائنس نے ارتقاء اور پیش رفت کا آغاز کیا تو مذہب اس کے خلاف فریق بن گیا، سائنس دانوں پر کفر و الحاد کے فتوے جاری کرنے شروع کر دیئے۔ اس پس منظر میں مغرب کی مذہب سے دست برداری سمجھ میں آتی ہے، لیکن ہمارا پس منظر یہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو مذہب اور مذہبی شخصیات نے جبر و ظلم کا ساتھ دینے کی بجائے ہمیشہ دلیل اور حق کا ساتھ دیا ہے اور اس حوالے سے علمائے کرام کی قربانیوں، شہادتوں اور قید و بند کی صعوبتوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمارے ہاں مذہب اور مذہبی اداروں نے سائنس کی راہ میں کبھی مزاحمت کی دیوار کھڑی نہیں کی بلکہ یورپ

کی موجودہ سائنسی ترقی اسی مسلم سپین کے تعلیمی اداروں کی رہینمنت ہے، جس نے یورپ کو آزادی اور سائنسی ترقی وارتقاء کا راستہ دکھایا، مگر خود میدان جنگ میں شکست کھا کر پیش رفت کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔

اس پس منظر میں یہ ایک سنجیدہ علمی وفکری سوال ہے کہ یورپ اپنا فیصلہ ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے اور اپنا تاریک ماضی دکھا کر ہمیں اپنے روشن ماضی سے دست بردار ہونے پر مجبور کیوں کر رہا ہے۔

بہر حال دینی مدارس کو ایک چیلنج عالمی سطح پر یہ بھی درپیش ہے کہ انہیں عالمی میڈیا اور لابنگ کے ادارے یورپ کے قرون مظلمہ کے پس منظر میں ظلم اور جہالت کے نمائندے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح دینی مدارس کو اپنے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے امیج کو صحیح کرنے اور اپنی تصویر کو عالمی سطح پر بہتر بنانے کے چیلنج کا بھی سامنا ہے۔

یہ دو چیلنج وہ ہیں، جو دینی مدارس کو خارج کی طرف سے درپیش ہیں۔ اب میں داخلی صورت حال کی طرف آنا چاہوں گا کہ اپنے داخلی نظام اور ترجیحات کے حوالے سے بھی دینی مدارس کے موجودہ نظام کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا ہے، لہٰذا ان کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں اس بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام اور نیٹ ورک کے اصل اہداف جن کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے، تحفظاتی ودفاعی ہیں اور مدارس ابھی تک اسی دائرے میں محصور رہنے میں عافیت محسوس کر رہے ہیں، جبکہ عام مسلمان ان مدارس سے بہت سے ایسے کاموں کی توقع بھی کر رہے ہیں، جن کا تعلق تحفظاتی اور دفاعی دائرے سے ہٹ کر اقدامی اور پیش رفت کے دائروں سے ہے اور اس پر کچھ عرض کرنے سے پہلے میں اس کی وجہ بتانا چاہوں گا کہ لوگ مدارس سے ان کے طے کردہ دائرے سے ہٹ کر مزید کاموں اور کارکردگی کا تقاضا آخر کیوں کر رہے ہیں؟

میرے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ دینی مدارس نے اپنے ذمے جو کام لیا تھا، اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں، مثلاً مسجد کے نظام کو باقی رکھنے کے لیے امام، خطیب، مدرس اور قاری وحفاظ حضرات کی تیاری اور فراہمی کی صورت حال دیکھ لیجئے پورے جنوبی ایشیا میں کہیں بھی ایسی صورت نظر نہیں آئے گی کہ مسجد بن گئی ہے اور امام وخطیب نہیں مل

رہے۔مکتب قائم ہے،مگر حافظ و قاری دستیاب نہیں۔ مدرسہ قائم ہوا ہے،مگر مدرس اور مفتی تلاش کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ایسا آپ کو کہیں بھی دکھائی نہیں دے گا، بلکہ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم تو اس معاملے میں بہت بڑے ایکسپورٹر ہیں اور دنیا بھر کو یہ مال سپلائی کر رہے ہیں۔آپ دنیا کے کسی بھی براعظم میں چلے جائیں۔آپ کو پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش کے دینی مدارس سے تعلیم یافتہ حافظ، قاری، امام، خطیب اور مدرس ضرور ملیں گے، حتیٰ کہ عالم اسلام کے مرکز حرمین شریفین میں بھی آپ کو قرآن کریم پڑھانے والے قاری حضرات زیادہ تر پاکستانی مدارس کے تعلیم یافتہ ہی ملیں گے، اس مارکیٹ میں عالمی سطح پر ان دینی مدارس کو اگر اجارہ داری نہیں تو برتری ضرور حاصل ہے۔

دینی مدارس اپنی فیلڈ میں چونکہ پوری طرح کامیاب نظر آ رہے ہیں، اس لیے زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ان سے ہی توقع کی جارہی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور جو کام انہوں نے اپنے اہداف میں شامل نہیں کر رکھے، انہیں بھی اپنے دائرہ کار میں لائیں۔یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی گھرانے کے دو چار نوجوانوں میں اگر ایک نوجوان کام کاج میں تیز ہو اور اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں مستعد ہو تو سارے کاموں کی توقع اسی سے وابستہ کر لی جاتی ہے اور گھر والوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سارے کام وہی کرے، اسے ''کاما پتر'' سمجھا جاتا ہے اور گھر کے سارے افراد اسی سے اپنے کاموں کی بجا آوری کی خواہش رکھتے ہیں۔

مجھ سے بسا اوقات دوست پوچھتے ہیں کہ ہم سے ان کاموں کی توقع آخر کیوں کی جاتی ہے، جو ہمارے پروگرام اور اہداف کا حصہ نہیں ہیں۔میں ان سے عرض کیا کرتا ہوں کہ ہر گھر میں کامے پتر کا یہی حال ہوتا ہے اور ہمیں اس بات پر ناراض ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہئے کہ یہ توقعات اور خواہشات دراصل دینی مدارس کی کارکردگی پر قوم کے اعتماد کا اظہار ہیں۔

مثلاً دینی مدارس سے بہت سے دوستوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کیوں نہیں دیتے، حالانکہ خود انہیں بھی معلوم ہے کہ یہ مضامین دینی مدارس کے اہداف کا حصہ نہیں ہیں، کیونکہ دینی مدارس کے اہداف متعین ہیں (۱) دینی علوم کی حفاظت ہو اور وہ اصلی حالت میں اگلی نسل تک منتقل ہوں۔(۲) عام مسلمان کا قرآن وسنت اور دینی تعلیمات کے ساتھ رابطہ قائم رہے۔(۳) مسلمانوں کے عقائد اور ثقافت کا تحفظ ہو اور (۴) مسجد و مکتب کا

ادارہ باقی رکھنے کے لیے انہیں ضرورت کے مطابق تربیت یافتہ حضرات فراہم ہوتے رہیں۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کے اہداف میں کوئی مقصد شامل نہیں ہے، جبکہ اپنے اہداف میں یہ مدارس بہرحال کامیاب ہیں، جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے الگ سے ادارے موجود ہیں، لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کے بارے میں ان ذمہ دار اداروں سے باز پرس کرنے کی بجائے سارا غصہ دینی مدارس پر نکالا جاتا ہے اور سارے مطالبات ان کی طرف رخ کر کے کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے قیام اور اسے ایک اسلامی جمہوری ریاست قرار دیئے جانے کے بعد عدلیہ، انتظامیہ اور دیگر شعبوں میں اسلامی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور رجال کار کی فراہمی اور تیاری اصولی طور پر ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہے اور یہ ان کے کرنے کا کام ہے، لیکن چونکہ وہ یہ کام نہیں کر رہے، اس لیے یہ توقعات بھی دینی مدارس سے وابستہ کر لی گئی ہیں اور ان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کام بھی وہی کریں۔

ان کاموں کی دینی مدارس سے توقع یا مطالبہ درست ہے یا نہیں، یہ ایک مستقل بحث ہے، لیکن ایک عوامی مطالبہ اور تقاضا اور بھی ہے، جسے میں بھی درست سمجھتا ہوں اور دینی مدارس سے اسے اپنے اہداف میں شامل کرنے کے لیے کہتا رہتا ہوں، وہ یہ کہ دینی مدارس اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں اور اپنی چار دیواری سے ہٹ کر ان لوگوں کی دینی تعلیم کی طرف بھی توجہ دیں جو ان کے چاروں طرف رہتے ہیں، مگر تعلیمی سہولتوں سے محروم ہیں۔ اب تو اس سلسلے میں صورت حالات خاصی بہتر ہو رہی ہے، لیکن اب سے ربع صدی قبل کی بات ہے کہ گوجرانوالہ میں ایک مخیّر دوست نے مجھ سے پوچھا کہ ہمارے دینی مدارس میں طلبہ زیادہ تر کس علاقے کے ہوتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ پنجاب کے مغربی اور جنوبی اضلاع، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقوں سے ان کا تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ انہوں نے سوال کیا، اساتذہ کن علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ اساتذہ بھی زیادہ انہی علاقوں کے ہوتے ہیں، وہ کہنے لگے کہ کیا ہمارا کام صرف چندہ دینا ہی ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ جس علاقے میں مدرسہ موجود ہے، وہاں کے طلبہ کیوں نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو دینی مدارس میں تعلیم کے لیے نہیں بھیجتے۔ انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنے بچوں کو دین نہیں پڑھانا چاہتے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا بھی پڑھانا چاہتے ہیں۔ آپ

دینی تعلیم کے ساتھ سکول کی تعلیم بھی شامل کر لیجئے پھر دیکھئے کہ یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے کیسے دینی مدارس میں نہیں بھیجتے۔ان کی یہ بات درست تھی۔یہی وجہ ہے کہ جوں جوں دینی مدارس نے اپنے نصاب میں عصری تعلیم کے ضروری حصے شامل کرنا شروع کئے ہیں، دینی مدارس میں مقامی طلبہ کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے اور اب کہیں بھی یہ صورت حال نہیں ہے کہ پڑھنے والے دوسرے علاقوں کے ہیں، پڑھانے والے بھی دوسرے علاقوں کے ہیں اور مقامی لوگوں کا کام صرف چندہ دے کر ثواب حاصل کرنا ہے۔

اس مثبت پیش رفت کے ساتھ ساتھ میں اس بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی مدارس کو منظّم طریقے سے اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ ان کے تعلیمی نظام کے ساتھ جو لوگ منسلک ہیں، ان کا باقی آبادی کے حوالہ سے کیا تناسب ہے، اور اس تناسب میں آبادی کا جو حصہ دینی مدارس کے ساتھ منسلک و متعلق نہیں ہے۔اسے اس دائرے میں لانے کے لیے دینی مدارس کیا کر سکتے ہیں؟ ہر شخص کو عالم بنانا ضروری نہیں ہے، لیکن عام آبادی کے لیے کسی نہ کسی درجے میں دینی تعلیم کا کوئی نہ کوئی نظام دینی مدارس کو ضرور بنانا چاہئے اور جو آبادی ان سے منسلک نہیں ہے، اسے نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے کہ یہ بات ان کی تعلیمی پیش رفت کے ساتھ ساتھ ان کی قوت کا ذریعہ بھی ہوگی۔

داخلی نصاب و نظام کے حوالے سے دینی مدارس کو ایک اور چیلنج بھی درپیش ہے، یعنی اسلامی ثقافت و اقدار کا تحفظ ان کے اہداف میں شامل ہے، لیکن جس مغربی ثقافت اور فلسفے سے اسلامی اقدار و ثقافت کو خطرہ درپیش ہے، اس سے واقفیت کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی۔ مغربی فکر و فلسفہ کیا ہے اور مغربی ثقافت و اقدار کا پس منظر کیا ہے؟ اس سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی غالب اکثریت ناواقف ہے یہ ایک افسوسناک صورت حال ہے کہ جس دشمن سے ہم لڑ رہے ہیں، اس کی ماہیت، طریق کار، ہتھیاروں اور دائرہ کار سے ہمیں شناسائی تک حاصل نہیں ہے۔مغربی فلسفہ و نظام اور ثقافت و اقدار کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔اس کی اعتقادی بنیادیں ہیں۔اس کا ایک عملی کردار ہے اور اس کا وسیع دائرہ اثر ہے، مگر دینی مدارس کے نصاب میں اس سے آگاہی کا کوئی حصہ شامل نہیں ہے، حالانکہ ہمارے سامنے اسلاف کی یہ عظیم روایت موجود ہے کہ جب ہمارے معاشرے میں یونانی فلسفے نے فروغ حاصل کیا تھا اور

ہمارے عقائد کے نظام کو متاثر کرنا شروع کیا تھا تو ہمارے اکابرین مثلاً امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابومنصور ماتریدی اور امام غزالیؒ، امام ابن رشدؒ اور امام ابن تیمیہؒ نے یونانی فلسفے پر عبور، بلکہ برتری حاصل کی تھی اور اسی زبان اور اصطلاحات میں یونانی فلسفے کے پیدا کردہ اعتراضات وشبہات کا جواب دے کر اسلامی عقائد کی حقانیت اور برتری ثابت کی تھی ورنہ ایک دور میں یونانی فلسفہ ہمارے عقائد کے نظام میں اتھل پتھل کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب دکھائی دے رہا تھا۔

اس حوالے سے دینی مدارس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ مغربی فکر و فلسفے کو بطور فن اپنے نصاب کا حصہ بنائیں، اس کے ماہرین پیدا کریں اور اسی کی زبان و اصطلاحات میں شکوک وشبہات کے ازالے اور اسلامی عقائد و ثقافت کے تحفظ و دفاع کا اہتمام کریں دینی مدارس کو درپیش ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ عالمی ماحول تو رہا ایک طرف ہم عام طور پر اپنے اردگرد کے ماحول سے بھی باخبر نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں اب اردگرد کے ماحول اور عالمی ماحول میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے اور مزید مشکل ہوتا جائے گا۔ یہ معلومات کی وسعت کا دور ہے ہر چیز سے باخبر رہنے اور حالات پر نظر رکھنے کا دور ہے۔ اس ماحول میں دینی مدارس کو اپنے اس طرز عمل اور ترجیحات پر نظر ثانی کرنا ہوگی جو اپنے اساتذہ اور طلبہ کو بہت سے معاملات میں بے خبر رکھنے کے لیے ان کی پالیسی کا حصہ ہے مثلاً۔

معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ انتہائی ضروری ہے، بالخصوص وہ چھ سات مذاہب، جن کے پیروکار اس وقت دنیا میں وسیع دائرے میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مستقل ممالک اور حکومتیں قائم ہیں مثلاً یہودی، عیسائی، ہندو، بدھ مت اور سکھ وغیرہ، ان کا تعارفی، بلکہ اسلام کے ساتھ تقابلی مطالعہ دینی مدارس کے فضلاء کے لیے ضروری ہے۔

مسلم امہ کا حصہ سمجھے جانے والے اعتقادی اور فقہی مذاہب مثلاً اہل سنت، اہل تشیع، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، سلفی، جعفری، زیدی وغیرہ کا تعارفی مطالعہ اور ان کے اصول اور تاریخ سے واقفیت ضروری ہے اس کے ساتھ ہی دوسری مسلم فکری تحریکات جو روایتی دائرے سے ہٹ کر ہیں ان کے بارے میں ضروری معلومات اور ان کے موقف و کردار سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ معلومات سطحی اور نامکمل نہ ہوں، بلکہ اصل مآخذ سے صحیح معلومات ہونی چاہئیں۔

طب، سائنس، ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ وغیرہ کی عملی کارفرمائی سے بہت سے مسائل کی نوعیت تبدیل ہوگئی ہے اور ہوتی رہتی ہے، ان سے آگاہ ہوئے بغیر فتویٰ دینا یا مسئلہ بیان کرنا شرعی اصولوں کے منافی ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ فن کو حاصل کرنا اور چیز ہے اور اس کے بارے میں ضروری معلومات رکھنا اس سے مختلف امر ہے۔

عالمی اور علاقائی زبانوں سے واقفیت اور ان پر عبور ایک مستقل مسئلہ ہے۔ دینی مدارس میں انگریزی کی تعلیم کا ایسا اہتمام کہ کوئی فاضل انگلش میں تقریر کر سکے یا معیاری مضمون لکھ سکے، سرے سے موجود نہیں ہے۔ ہماری عربی زبان میں اس سے زیادہ عبور حاصل نہیں کر پاتے کہ کتاب کو سمجھ لیں اور اس کو پڑھا سکیں۔ بول چال، فی البدیہہ تقریر اور مضمون نویسی کی صلاحیت حاصل کرنا ہمارے اہداف میں شامل ہی نہیں ہے، بلکہ اپنی قومی زبان اردو میں بھی ہماری حالت قابل رحم ہوتی ہے، ہمارے اکثر فضلاء اچھی اردو نہیں بول سکتے اور نہ اردو میں ڈھنگ کا کوئی مضمون تحریر کر سکتے ہیں، یہ ایک ایسا افسوسناک خلاء ہے، جس نے ہمیں ابلاغ کے شعبے میں بالکل ناکارہ بنا رکھا ہے۔

ابلاغ کے جدید ذرائع مثلاً کمپیوٹر، انٹرنیٹ، وڈیو وغیرہ تک ہماری رسائی بھی محل نظر ہے۔ نہ صرف یہ کہ زبان اور ذرائع عام طور پر ہماری دسترس سے باہر ہیں، بلکہ اسلوب کے حوالے سے بھی ہم آج کے دور سے بہت پیچھے ہیں۔ ہماری زبان ثقیل اور اسلوب فتویٰ اور مناظرہ کا ہوتا ہے، جبکہ یہ تینوں باتیں اب متروک ہو چکی ہیں۔ آج کی زبان سادہ اور اسلوب لابنگ اور بریفنگ کا ہے، مگر ہم ان دونوں سے ناآشنا ہیں، جس کی وجہ سے ہم خود اپنے معاشرے اور ماحول میں ہی بسا اوقات اجنبی ہو کر رہ جاتے ہیں اور ابلاغ کی ذمہ داری پوری نہیں کر پاتے۔

ہمارے ہاں عمرانی اور معاشرتی علوم کا ارتقاء مسلم اسپین کے دور تک رہا ہے، اس کے بعد ایسے بریک لگی ہے، جیسے ہمارے خیال میں معاشرت اور عمرانیات کا ارتقاء بھی رک گیا ہو، تب سے اس شعبے میں ایک جمود طاری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اجتہادی کام کے علاوہ اس دوران کوئی پیش رفت دکھائی نہیں دیتی اور شاہ صاحب کے بعد تین صدیوں سے سناٹا طاری ہے۔ انسانی معاشرت کا ارتقاء تو ظاہر ہے رک نہیں سکتا، مگر معاشرت وتہذیب کے حوالے سے ہماری سوئی ابھی تک مسلم اسپین پر اٹکی ہوئی ہے اور ہم اس سے آگے بڑھتے نظر

نہیں آ رہے۔ اس جمود کو توڑے بغیر ہم معاشرت وتمدن اور ثقافت وعمرانیات کے باب میں دنیا کی رہنمائی کا مقام آخر پھر سے کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ مگر دینی مدارس میں عمرانی علوم کے حوالے سے کوئی اختیاری کام اور عملی پیش رفت تو رہی ایک طرف، ان علوم تک ہمارے فضلاء اور اساتذہ کی رسائی بھی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔

دینی مدارس میں ہمارے باہمی اعتقادی اور فقہی مباحث اور اختلافات پر خوب کام ہوتا ہے اور یہی ایک شعبہ ہے جس میں ہماری توانائیوں اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ بسا اوقات اولیٰ وغیر اولیٰ کے مسائل اور فروعی اختلاف کفر واسلام کے معرکے کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی اصولی اور بنیادی مسائل بھی نظر انداز ہونے لگ جاتے ہیں۔ اعتقادی مباحث اور فقہی اختلافات پر ضرور بات ہونی چاہیے اور طلبہ کو ان سے متعارف کرانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ان اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات بھی ان کے سامنے واضح ہونی چاہئیں اور انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ کون سی بات کفر واسلام کی ہے اور کون سی بات اولیٰ وغیر اولیٰ کی ہے۔ کس اختلاف پر سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اور کون سے اختلاف کو کسی مصلحت کی خاطر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق کے حوالے سے ہمارے ہاں صرف تین شعبوں میں کام ہوتا ہے (۱) اعتقادی، فقہی اختلافات پر خوب زور آزمائی ہوتی ہے۔ (۲) افتاء میں ضرورت کے مطابق تحقیق ہوتی ہے اور (۳) دینی جرائد مین عام مسلمانوں تک اپنے اپنے ذوق کے مطابق دینی معلومات پہچانے کے لیے تھوڑی بہت محنت ہوتی ہے، ان کے علاوہ امت کی اجتماعی ضروریات اور ملت اسلامیہ کے عالمی ماحول کی مناسبت سے کسی تحقیقی کام کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ کچھ افراد اپنے ذوق اور محنت سے ایسا ضرور کر رہے ہیں، لیکن بحیثیت ایک ادارہ اور نیٹ ورک کے دینی مدارس کے پروگرام میں یہ شامل نہیں ہے۔

معلومات کی وسعت، تنوع اور ثقاہت کا مسئلہ بھی غور طلب ہے، کسی بھی مسئلے پر بات کرتے ہوئے ہم میں سے اکثر کی معلومات محدود، یک طرفہ اور سطحی ہوتی ہیں، حالانکہ کسی کا ذوق ذاتی محنت اور توجہ سے ترقی پا جائے اور اس سطح سے بالا ہو کر کوئی کام کر دکھائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تحقیق، مطالعہ اور استدلال و استنباط کے فن کو ایک فن اور علم کے طور پر دینی مدارس میں پڑھایا جائے اور طلبہ کو اس کام کے لیے باقاعدہ طور پر تیار کیا جائے۔

دینی مدارس کی لائبریریوں کا حال بھی ناگفتہ بہ ہے گنتی کے چند بڑے مدارس کے استثناء کے ساتھ عمومی طور پر دینی مدارس کی لائبریریوں میں درسی کتابوں سے ہٹ کر جو کتابیں موجود پائی جاتی ہیں وہ کیف ما اتفق کی منصوبہ بندی اور ہدف کے بغیر ہوتی ہیں، حوالے کی کتابیں میسر نہیں ہوتیں اور جو کتابیں موجود ہوتی ہیں، ان تک طلبہ کی رسائی اور استفادے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض مدارس میں تو روزانہ اخبارات کا داخلہ بھی بند ہوتا ہے اور طلبہ پر پابندی ہوتی ہے کہ وہ اخبارات و جرائد کا مطالعہ نہیں کریں گے۔ خدا جانے اپنے طلبہ کو دنیا اپنے ملک اور اردگرد کے ماحول سے بے خبر رکھ کر یہ مدارس انہیں کون سے ماحول میں کام کرنے کی تربیت دے رہے ہوتے ہیں۔

مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی ضرورت بھی روز بروز عالمی سطح پر بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی طرف بین الاقوامی حلقے متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مکالمے کے اصل فریق کون ہیں اور مکالمے کا ایجنڈا کیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، جس پر الگ سے گفتگو ہونی چاہیے لیکن مذاہب کے درمیان مکالمے جس انداز سے آگے بڑھ رہے ہیں، اس سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کا بے خبر اور لاتعلق رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس مکالمے کے پس منظر، ضرورت دائرہ کار اور مضرت و منفعت سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کا آگاہ ہونا ضروری ہے بلکہ اس مکالمے کے تو اصل فریق ہی دینی مدارس ہیں اور انہیں اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے۔

یہ تو وہ مختلف پہلو ہیں، جو دینی مدارس کے اس نظام کو خارجی اور داخلی طور پر چیلنج کے طور پر پیش ہیں، اب آخر میں موزوں حکمت عملی کے حوالے سے چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں ،جن پر دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔

۱۔ اپنے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے تحفظ کے لیے دینی مدارس کو باہمی اتحاد اور اشتراک وارتباط میں اضافہ کرنا ہوگا، کیونکہ دینی مدارس کے مختلف وفاق جس طرح اب اکٹھے ہیں، اسی طرح متحد رہے تو کسی کو ان کے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے خلاف کوئی

قدم اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔

۲۔ اپنے امیج کو صحیح بنانے کے لیے انہیں عالمی میڈیا تک رسائی حاصل کرنا ہوگی اور اپنے موقف، خدمات اور عزائم سے دنیا کو باخبر کرنے کے لیے میڈیا اور لابنگ کے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔

۳۔ لوگوں کی توقعات، تجاویز، شکایات اور تقاضوں سے پوری طرح آگاہی حاصل کر کے ان پر باہمی بحث ومباحثہ اور مختلف درجات ومراحل میں ان کے تجزیہ وتحلیل کی ضرورت ہے اور جن باتوں پر عمل ہوسکتا ہو انہیں دائرہ عمل میں لانے سے حت الوسع گریز نہ کیا جائے۔

۴۔ متعلقہ ارباب علم وفن سے رابطہ اور مشاورت کا اہتمام کیا جائے اور ان کے تجربات اور آراؤ افکار سے استفادہ کیا جائے۔

۵۔ رائے عامہ کو اعتماد میں لینا اور اعتماد میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے قومی اخبارات اور ممتاز اصحاب قلم سے رابطہ اور ان کی بریفنگ کا اہتمام ضروری ہے۔

مجھے امید ہے کہ اگر دینی مدارس موجودہ عالمی تناظر میں اپنے کردار کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں گے اور خود احتسابی کے جذبے سے اپنی ترجیحات، دائرہ عمل اور طریق کار پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کریں گے تو ان چیلنجوں سے بخوبی نمٹ سکیں گے جن کا ان کو اس وقت سامنا ہے اور حوصلے، اعتماد اور ولولے کے ساتھ مستقبل میں اپنے کردار کو زیادہ موثر اور نتیجہ خیز بنانے کی راہ بھی ہموار کر پائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دورِ حاضر کے فتنے

اور

مدارس کی ذمہ داری

۱۸ نومبر ۲۰۰۰ء کو اسلامک دعوۃ اکیڈمی لیسٹر (برطانیہ) کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا جس میں پاکستان کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مہمان خصوصی تھے جبکہ اکیڈمی کے سربراہ مولانا محمد سلیم دھورات کی خصوصی دعوت پر راقم الحروف نے بھی سالانہ اجتماع کی عمومی اور خصوصی دونوں نشستوں سے خطاب کیا خصوصی نشست علماء کرام کی تھی جس میں مختلف شہروں کے علماء کرام اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے موجودہ عالمی حالات میں اہل علم کی ذمہ داریوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور علماء کرام کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ کیا جبکہ راقم الحروف نے بھی اسی موضوع پر مختصر گفتگو کی جو قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

مولانا محمد سلیم دھورات کا شکر گزار ہوں کہ اہل علم کی اس محفل میں شرکت اور آپ حضرات سے گفتگو کا موقع فراہم کیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے درد دل کی کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارا طبقہ جسے علماء کا طبقہ سمجھا اور کہا جاتا ہے اور جس کی طرف پوری امت کی نظریں لگی ہوئی ہیں آج اپنی ذمہ داریوں کے حوالہ سے عجیب سی صورت حال سے دوچار ہے ایک طرف لوگوں کی توقعات اور احساسات ہیں جو دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف ہماری بے توجہی اور عدم احساس کی صورت حال جوں کی توں ہے اور امت کی توقعات مایوسی میں بدل رہی ہیں۔ اس لیے ہمیں گہری سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کا جائزہ لینا چاہیے اور اسی

احساس کو آج بیدار کرنا چاہتا ہوں۔

عام مسلمان معاشرہ کے ساتھ ہمارے تعلقات کار کو سامنے رکھتے ہوئے اہل علم کی ذمہ داریوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یا ان کی دو الگ الگ سطحیں اور دائرے متعین کیے جا سکتے ہیں ایک سطح تو یہ ہے کہ عام لوگوں تک دین پہنچے اور قرآن و سنت کے احکام سے عام مسلمانوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسری سطح یہ ہے کہ دینی علوم نئی نسل تک منتقل ہوں اور نوجوان علماء کی کھیپ تیار کی جائے جو لوگوں تک دین اور علم پہنچانے کی ذمہ داری کو سنبھالتے رہیں اور دینی تعلیم کا تسلسل قائم رہے۔

ان دونوں حوالوں سے اہل علم کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے ایک ایک تاریخی واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں ایک واقعہ دور نبوی ﷺ کا ہے اور امام طبرانیؒ نے حضرت عبدالرحمٰن بن اَبزیؓ سے روایت کیا ہے یہ واقعہ امام محمد کی کتاب ''کتاب الکسب'' میں بھی موجود ہے اور اس کی تخریج میں ہمارے شیخ محترم استاذ عبدالفتاح ابوغدۃؒ نے اسے ''حدیث حسن'' قرار دیا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک بار مسجد نبوی میں خطبہ جمعہ کے دوران ارشاد فرمایا کہ:

''ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے اردگرد کے لوگوں کو دین کی تعلیم نہیں دیتے'' انہیں دانش نہیں سکھاتے، انہیں علم کی باتیں نہیں سمجھاتے، انہیں نیکی کی تلقین نہیں کرتے اور انہیں برائی سے نہیں روکتے؟''

پھر اس کے بعد فرمایا کہ:

''ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے پڑوس میں رہنے والے اہل علم سے دین نہیں سیکھتے، علم حاصل نہیں کرتے اور ان کی دانش سے استفادہ نہیں کرتے؟''

اس کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ نے دونوں طبقات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں اور اپنے رویہ کو تبدیل کر لیں۔ ''ورنہ میں ان کے لیے دنیا میں سزا مقرر کروں گا''۔

جناب نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی پر مدینہ منورہ کے عام حلقوں میں یہ بات

کہی جانے لگی کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے یہ فرما کر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے خاندان کی طرف اشارہ کیا ہے جو قراء اور فقہاء کا خاندان کہلاتا ہے مگر ان کے اردگرد بدوؤں اور بے علم لوگوں کی کثرت ہے جن کا علم کے ساتھ زیادہ تعلق نہیں چنانچہ اشعری خاندان کے کچھ لوگ دربار رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور استفسار کیا جس کے جواب میں نبی اکرم ﷺ نے خطبہ جمعہ والی بات پوری کی پوری پھر دہرا دی جس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کا یہ تاثر درست تھا کہ یہ بات اشعریوں کے بارے میں ہی فرمائی گئی ہے اشعریوں کے وفد نے یہ جواب سن کر سوال کیا کہ:

"انعاقب بتقصیر غیرنا؟".

کیا دوسروں کی کوتاہی پر ہمیں سزا دی جائے گی۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے اثبات میں جواب دیا تو اشعری خاندان کے نمائندوں نے اپنی سابقہ کوتاہی کی تلافی کے لیے مہلت مانگی اور جناب نبی اکرم ﷺ نے انہیں ایک سال کی مہلت دی کہ وہ اس مدت کے اندر اردگرد کے لوگوں کو علم و دانش اور دین کی تعلیم دے کر اپنی ذمہ داری کو پورا کریں اس میں ہمارے لیے واضح سبق ہے کہ اپنے گردوپیش کے حالات پر نظر رکھنا اور عام لوگوں تک ہر ممکن ذریعہ سے علم اور دین کی روشنی پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اور اپنے اردگرد کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم میں سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو کس حد تک پورا کر رہا ہے۔

ہماری ذمہ داریوں کی دوسری سطح نوجوان علماء کی تیاری ہے اور دینی مدارس یہی کام کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان دینی مدارس کو مزید ترقیات سے نوازیں اور حاسدین و معاندین کے شر سے ان کی حفاظت فرمائیں لیکن اس حوالہ سے دکھی دل کے ساتھ گستاخی کی معافی مانگتے ہوئے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کو معاشرے میں جا کر جن مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور عقائد اخلاق معاشرت اور دیگر شعبوں میں انہیں جن فتنوں سے مقابلہ درپیش ہے ہم ان کے لیے انہیں تیار نہیں کرتے اور اسلام کی دعوت اور تحفظ و ترویج کے بارے میں کفر و الحاد کے جن مورچوں سے ان پر گولہ باری ہوتی ہے سرے سے انہیں ان کے بارے میں علم تک نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ سوسائٹی

میں اپنا کردار صحیح طریقہ سے ادا نہیں کر پاتے اور بہت سے معاملات میں انہیں پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے اس پر مجھے دیوان حماسہ کے دوشعر یاد آرہے ہیں جن کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک نوجوان کو اس کے خاندان نے خوب ناز و نعم میں پالا اور کھلا پلا کر جوان کیا مگر اسے لڑائی کی تربیت نہ دی اور دشمن سے مقابلہ کے لیے تیار نہ کیا چنانچہ جب وہ جوان ہوا اور دشمن قبیلہ کے نوجوانوں سے اس کا سامنا ہوا تو وہ مقابلہ نہ کر سکا اور اسے ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا جس پر وہ اپنے خاندان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حسرت کے ساتھ کہتا ہے کہ:

فهلا اعدوني لمثلي تفاقدوا اذا الخصم ابزى مائل الراس انكب وهلا
اعدوني لمثلي تفاقدوا وفي الارض مبثوث شجاع و عقرب

یہ ایک دوسرے کو گم پائیں انہوں نے مجھے اپنے جیسے نوجوانوں کے مقابلہ کے لیے تیار کیوں نہیں کیا جبکہ میرا دشمن ٹیڑھی گردن والا متکبر شخص تھا اور یہ ایک دوسرے کو گم پائیں انہوں نے مجھے میرے حریف کے مقابلہ کے لیے تیار کیوں نہیں کیا جبکہ زمین میں ہر طرف بچھو اور سانپ بکھرے ہوئے ہیں۔

کم و بیش اسی قسم کی صورت حال اس وقت دینی مدارس کے ان فضلاء کو درپیش ہے جو مسلم معاشرہ میں بکھرے ہوئے ہیں اور مختلف شعبوں میں اپنی بساط کی حد تک دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں لیکن جب انہیں اعتقادات نظریات، اخلاق اور معاشرت کے حوالہ سے اسلام دشمن لابیوں کے اعتراضات اور سرگرمیوں سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنی معلومات اور تربیت کی کمی کے باعث ان کا مقابلہ نہیں کر پاتے اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمیں اس صورت حال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور دینی مدارس اور علمی اداروں میں اس سنگین کوتاہی کے ازالہ کے لیے کوئی واضح رخ اختیار کرنا چاہیے جو آج کے دور کا سب سے اہم تقاضا ہے۔

(ہفت روزہ الہلال یکم تا ۷ دسمبر ۲۰۰۰ء)

بچیوں کے دینی تعلیم کے
مدارس اور نصاب تعلیم

جامعہ الہدیٰ نوٹنگھم (برطانیہ) میں تقسیم انعامات کی سالانہ تقریب تھی اور طالبات کی تین کلاسوں کے سالانہ امتحانات میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے والی بچیوں کو سرٹیفکیٹ اور میڈل وغیرہ دینے کا پروگرام تھا مدنی ٹرسٹ نوٹنگھم کے چیئرمین ڈاکٹر اختر الزمان غوری صدارت کر رہے تھے جب کہ مہمان خصوصی کی مسند پر دوستوں نے مجھے بٹھا دیا تھا دوسرے مہمانوں میں ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا عیسیٰ منصوری، بحرین سے دعوت اسلام کے پروگرام ''ڈسکور اسلام'' کے ڈائریکٹر الشیخ احمد خان، دینہ ضلع جہلم سے مسلم کانفرنس (س) کے راہنما مولانا فضل الٰہی تاج پوری، جامعہ اسلامیہ فلنتھم کے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق، ممتاز ماہر فلکیات مولانا ثمیر الدین قاسمی اور دیگر حضرات شامل تھے۔ طالبات کے والدین کے علاوہ علاقہ کے دیگر سرکردہ بزرگوں نے بھی شرکت کی۔ جامعہ الہدیٰ کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور اسلامک ہوم سٹڈی کورس کے ڈائریکٹر مولانا اورنگزیب خان نے انعامات کا اعلان کیا اور ہم اردو بولنے والوں کی انگلش میں ترجمانی کے فرائض سرانجام دیے۔

راقم الحروف نے اس موقع پر طالبات کی دینی تعلیم کے اداروں کے نصاب تعلیم اور اس کے ضروریات کے حوالہ سے مختصر گفتگو کی جسے بعض دوستوں نے بہت پسند کیا اور ان ہی کا اصرار ہے کہ اسے قلمبند بھی کیا جائے چنانچہ وہ گزارشات درج ذیل سطور میں پیش کی جا رہی ہیں۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

ہمارے ہاں دینی حلقوں میں عام طور پر یہ بحث رہتی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا نصاب کیا ہونا چاہیے اور بچیوں کے لیے مخصوص دینی مدارس میں طالبات کو کیا کچھ پڑھانا چاہیے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے بڑا اور روشن اسوہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے جو درس گاہ نبوی ﷺ کی سب سے کامیاب طالبہ اور امت کی سب سے بڑی معلمہ تھیں ان کے علمی فضل وکمال کا یہ عالم ہے کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''نصف دین ان سے حاصل کیا جائے'' یہ نصف اگر مقدار کے لحاظ سے نہ بھی ہو تو کیفیت کے لحاظ سے ضرور نصف دین ہے کہ چار دیواری کے اندر رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کا کم وبیش نوے فیصد حصہ انہی سے روایت ہے وہ حدیث نبوی کے پانچ بڑے راویوں میں سے ہیں بلکہ خواتین میں احادیث نبوی ﷺ کی سب سے بڑی راویہ ہیں۔ انہیں دور صحابہؓ کے ان سات بڑے مفتیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں فتوٰی دیا کرتے تھے۔ وہ فتوٰی بھی دیتی تھیں۔ دوسرے مفتیوں کے فتوٰی پر نقد کرتی تھیں اور اجتہاد کا حق پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کرتی تھیں۔ وہ قرآن کریم کی مفسرہ تھیں اور احکام اسلام کی حکمت اور فلسفہ بیان کرنے میں امتیازی شان رکھتی تھیں حتیٰ کہ بعض محققین نے انہیں ''علم اسرار دین'' کی بانیہ قرار دیا ہے یعنی احکام شریعت کی حکمت وفلسفہ بیان کرنے میں پہل انہوں نے کی جس پر آگے چل کر امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ دھلویؒ جیسے فضلاء نے عظیم الشان دینی فلسفہ کی بنیاد رکھ دی وہ عرب قبائل کی روایات تاریخ اور کلچر پر اس حد تک عبور رکھتی تھیں کہ لوگ اس سلسلہ میں ان سے رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے، انہیں عرب قبائل کے نسب ناموں سے بھی کما حقہ واقفیت حاصل تھی سخن فہم اور سخن شناس تھیں اور عرب شعراء کے اشعار ان کی نوک زبان پر ہوتے تھے خود بھی ادب وفصاحت سے بہرہ ور تھیں اور انہیں اپنے دور کے بڑے خطباء میں شمار کیا جاتا تھا علمی اور فقہی معاملات کے علاوہ عوامی مسائل پر بھی کھل کر رائے دیتی تھیں اور خلفاء راشدین تک بہت سے امور میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا ارشاد ہے کہ ''ہم اصحاب رسول کبھی کسی ایسی مشکل میں نہیں پھنسے جسکے بارے میں ہمیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس راہنمائی نہ ملی ہو'' اس کے علاوہ طب

اور علاج پر بھی دسترس رکھتی تھیں وران کے سب سے بڑے شاگرد اور بھانجے حضرت عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دور میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ طبی معلومات رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ ان کی مسند تدریس نصف صدی تک مدینہ منورہ میں آباد رہی اور سینکڑوں تشنگان علوم نے ان سے استفادہ کیا، صرف حدیث رسولؐ میں ان کے براہ راست شاگردوں کی تعداد دو سو سے زائد بیان کی جاتی ہے جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، یہ سب معلومات ان کے سیرت نگاروں نے مختلف کتابوں میں بیان کی ہیں اور اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ''سیرت عائشہؓ'' میں بیشتر معلومات کو جمع کر دیا ہے جس کا مطالعہ ہر دینی اور علمی ذوق رکھنے والی خاتون کو کرنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا تھا؟ وہ جب حرم نبویؐ میں داخل ہوئیں تو ان کی عمر صرف نو برس تھی جس پر بہت سے لوگوں کو اعتراض بھی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ عین حکمت و دانش کا تقاضا تھا رسول اللہ ﷺ کے حرم میں ایک خاتون اس عمر میں آئیں جو سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کی عمر ہو اور وہ بیوی کی حیثیت رکھتی ہوں تاکہ کسی بات کے پوچھنے سمجھنے اور سیکھنے میں حجاب نہ ہو اور امت تک دین کا وہ حصہ بلا کم و کاست پہنچ سکے جو میاں بیوی کے تعلقات اور گھر کی چار دیواری کے اندر کے حالات کے حوالہ سے ہے اور اس تعلیم و تربیت میں اور کسی قسم کی آمیزش نہ ہو اس مقصد کے لیے بالکل نیو اور صاف ''ہارڈ ڈسک'' چاہیے تھی جس کا اعزاز ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا اور انہوں نے امت کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی معلمہ کی حیثیت سے خود کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا وہ حرم نبوی ﷺ میں داخل ہوئیں تو نو برس کی تھیں اور رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو وہ اٹھارہ انیس برس کے پیٹے میں تھیں ظاہر بات ہے کہ انہوں نے ان علوم و کمالات کا بڑا حصہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ہی حاصل کیا کیونکہ ان کی درسگاہ وہی تھی اور اسی چشمۂ صافی سے انہوں نے سارا فیض پایا تھا ان کے علمی کمالات پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے وہ قرآن کریم کی بہت بڑی مفسرہ تھیں، حدیث رسول اللہ ﷺ کی ایک بڑی راویہ اور شارحہ تھیں، دینی مسائل و احکام کی حکمت و فلسفہ بیان کرنے والی دانشور تھیں، عرب قبائل کی روایات، کلچر، نسب، ناموں اور تاریخ پر عبور رکھتی تھیں انہیں ادب و شعر اور خطابت پر دسترس حاصل تھی وہ مجتہد درجے کی مفتیہ تھیں، عوامی مسائل پر رائے دینے والی

راہنما تھیں اور طب وعلاج کے بارے میں بھی ضروری معلومات سے بہرہ ور تھیں اور یہ سب کمالات انہوں نے درسگاہ نبوی ﷺ سے سیکھے تھے اس لیے میرے نزدیک تو عورتوں کے لیے درسگاہ نبوی ﷺ کا نصاب یہی ہے اور اس حوالہ سے امت مسلمہ میں بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سب سے بڑا اسوہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے جن کو راہنما اور معیار بنائے بغیر ہم اپنی نسل کی بچیوں کو دینی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے تقاضے پورے نہیں کر سکیں گے۔

اس موقع پر راقم الحروف نے طالبات اور ان کی معلمات سے بطور خاص عرض کیا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ حصول علم میں آگے بڑھیں وہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دیگر جلیل القدر صحابیات رضی اللہ عنہن کی زندگیوں اور علمی کارناموں کا مطالعہ کریں اور مغرب کے اس پراپیگنڈے سے قطعاً متاثر نہ ہوں کہ اسلام عورتوں کو علم حاصل کرنے سے روکتا ہے کیونکہ ہمارا شاندار ماضی اور تابناک تاریخ ہمارے سامنے ہے اور امت کی اولوالعزم خواتین کی خدمات اور کارنامے تاریخ کا روشن حصہ ہے جن کا دنیا کی کوئی اور قوم مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ سب کچھ دینی احکام کے دائرہ میں رہ کر ہو اور شرعی قواعد وضوابط کی پوری طرح پابندی کی جائے۔

تقریب کے شرکاء نے جامعہ الہدیٰ کی تعلیمی پیش رفت پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اس دینی ادارہ کا افتتاح دو سال قبل مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے ہاتھوں ہوا تھا اور آج یہ انہی کی سرپرستی میں دینی تعلیم، تربیت کے فروغ کے لیے خوب سے خوب تر کی منزل کی طرف گامزن ہے اور اس کے بعد شیخ الحدیث مولانا عبدالحق سواتی کی دعا پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

(روزنامہ اوصاف ہفتہ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۸ء)

حافظ قرآن کریم
کا
ایک بڑا اعزاز

اس سال برطانیہ سے واپسی سے ایک روز قبل لیسٹر کی اسلامک دعوۃ اکیڈمی کی سالانہ تقریب میں شرکت کا موقع ملا اور اکیڈمی کی تعلیمی پیش رفت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ اکیڈمی لیسٹر کے نوجوان عالم دین مولانا محمد سلیم دھورات نے قائم کی ہے اور نو سال قبل ایک گھر میں قائم ہونے والا یہ ادارہ اب ایک خوبصورت بلڈنگ میں منتقل ہو چکا ہے جو پہلے بوڑھوں کی دیکھ بھال کے کام آتی تھی مگر مولانا سلیم دھورات نے اسے خرید کر مسلم نوجوانوں کی دینی تعلیم وتربیت کے مرکز میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیسٹر برطانیہ کے ان شہروں میں سے ہے جہاں مسلمانوں کی دینی چہل پہل عام ہے، مسجدیں آباد ہیں۔ شام کے مکاتب میں مجموعی طور پر ہزاروں بچے اور بچیاں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بازاروں میں عام طور پر مسلمانوں کی دکانیں ہیں۔ لیسٹر کو وہاں کی میونسپلٹی نے کچھ عرصہ قبل گوجرانوالہ کے ساتھ جڑواں شہر قرار دیا تھا اور میری اس کے ساتھ مناسبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ مولانا محمد سلیم دھورات کے والد مرحوم انڈیا کے صوبہ گجرات سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ مولانا سلیم دھورات نے یہیں پرورش پائی ہے اور دار العلوم بری میں دینی تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں لندن کے ویمبلے کانفرنس ہال میں پہلی سالانہ ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں ایک سٹیج سیکرٹری کے طور پر مولانا محمد سلیم دھورات کا اس لیے انتخاب کیا گیا تھا کہ وہ بہت اچھی انگلش بولتے ہیں، اس زمانے میں وہ دار العلوم بری میں زیر تعلیم تھے مگر اب نہ صرف ایک معیاری تعلیمی ادارہ

کے سربراہ ہیں بلکہ تصوف وسلوک میں بھی وہ ایک روحانی پیشوا کے طور پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اسلامک دعوۃ اکیڈمی میں قرآن پاک حفظ و ناظرہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ درس نظامی کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کا سلسلہ بھی قائم ہے جس کے لیے شخصی رابطوں کے علاوہ اسلام کی دعوت اور دیگر ضروری معلومات پر مشتمل درجنوں کتابچے انگلش میں چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ سالانہ تقریب میں مولانا محمد سلیم دھورات کے بھائی مولانا محمد اسماعیل دھورات نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اس دعوت کے نتیجے میں اب تک ۱۶۳ افراد دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور قبول اسلام کے بعد ان کی دینی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

سالانہ تقریب میں پاکستان کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے تفصیلی خطاب فرمایا اور اکیڈمی کے شعبہ حفظ میں حفظ قرآن کریم مکمل کرنے والے ایک حافظ اور ایک فاضل عالم دین کی دستار بندی کی جس نے ابتدائی دینی تعلیم اس اکیڈمی میں حاصل کی تھی مگر اس کی تکمیل جنوبی افریقہ کے ایک دارالعلوم میں کر کے اس سال سند فراغت حاصل کی ہے۔ مولانا محمد سلیم دھورات کی دعوت پر راقم الحروف کو بھی اس اجتماع میں شرکت اور خطاب کا موقع ملا جس کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

اسلامک دعوۃ اکیڈمی لیسٹر کا یہ سالانہ اجتماع بہت سے حوالے سے اور مناسبتیں رکھتا ہے جن میں ایک یہ ہے کہ اکیڈمی میں قرآن کریم مکمل کرنے والے ایک حافظ کی دستار بندی ہونے والی ہے اور ویسے بھی رمضان المبارک کا برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ چند دنوں میں شروع ہو رہا ہے اس لیے میں اسی مناسبت سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ رمضان المبارک میں قرآن کریم کا نزول ہوا تھا اس لیے یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے اسی وجہ سے اس ماہ میں باقی سارے سال کی بہ نسبت قرآن کریم کی تلاوت زیادہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا پاک کلام کثرت کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ قرآن کریم کا پڑھنا اور سننا دونوں عبادت کا درجہ

رکھتے ہیں اور جناب رسول اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ یہ ہے آپؐ قرآن کریم کی تلاوت تو اہتمام سے کرتے ہی تھے مگر اس کے ساتھ اس کے سننے کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔ صحابہ کرامؓ میں حضرت ابی بن کعبؓ بہت بڑے قاری ہیں بلکہ ایک ارشاد گرامی میں جناب نبی اکرم ﷺ نے انہیں امت کا سب سے بڑا قاری ہونے کا خطاب دیا ہے اور یہ ان کے بڑے اعزازات اور امتیازات میں سے ہے ان کا دوسرا بڑا اعزاز یہ ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح کے دوران قرآن کریم مکمل پڑھنے اور سننے کی جو سنت چودہ سو برس سے جاری ہے اس کا آغاز ان سے ہوا تھا اور مسجد نبویؐ میں تراویح کے دوران سب سے پہلے انہوں نے قرآن کریم سنایا تھا۔ ان کا تیسرا بڑا اعزاز یہ ہے کہ ایک بار نبی اکرم ﷺ نے انہیں بلا کر ان سے فرمائش کی کہ وہ انہیں قرآن پاک سنائیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے تعجب سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا میں آپ کو قرآن کریم سناؤں؟ آپ پر تو خود قرآن کریم نازل ہوتا ہے جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں تم مجھے قرآن پاک سناؤ اس لیے کہ ابھی حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے اللہ تعالیٰ کا پیغام دیا ہے کہ ابی بن کعبؓ کو بلا کر اس سے قرآن کی سورۃ البینہ سنو۔ (عام روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ کو یہ سورت سنائی لیکن میں نے ایک روایت میں پڑھا ہے جس کا حوالہ ذہن میں نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے یہ سورت سنی) اس پر حضرت ابی بن کعبؓ کو اور زیادہ تعجب ہوا اور دریافت کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا ہے؟ جناب نبی اکرم ﷺ نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت ابی بن کعبؓ نے خوشی سے چھلکتے آنسوؤں کے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ کو قرآن کریم کی یہ سورت سنائی۔ اس لیے قرآن کریم سننے کے لیے اہتمام کرنا بھی جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت ہے اور رمضان المبارک میں تراویح میں سنت جاری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں قرآن کریم کم از کم ایک بار ضرور نماز کی حالت میں سن لیا جائے۔ قرآن کریم حفظ کرنا اور حافظ ہونا بہت بڑی سعادت کی بات ہے لیکن یہ بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے کیونکہ قرآن کریم پورا یاد کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اگر یاد کر لیا جائے تو اس کو ساری زندگی یاد رکھنا فرض ہے کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے قرآن کریم یاد کیا مگر اپنی غفلت اور بے پرواہی کی وجہ سے بھول گیا تو قیامت کے روز وہ کوڑھا کر کے اٹھایا جائے گا

لیکن اگر قرآن کریم یاد کرنے والا ساری زندگی اسے یاد رکھے اور اس کے احکام پر عمل بھی کرے تو اس کے اعزازات بہت ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قیامت کے روز بڑے بڑے انعامات سے نوازا جائے گا جن میں سے صرف ایک کا آج تذکرہ چاہتا ہوں۔

جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے قرآن کریم یاد کیا، یاد کرنے کے بعد اسے یاد رکھا اور اس کے احکام پر عمل بھی کیا۔ اس حافظ سے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ اپنے خاندان کے ایسے دس افراد کو اپنے ساتھ جنت میں لے جاؤ جن کے بارے میں دوزخ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ حافظ قرآن کا کوٹہ ہے کہ وہ دس جہنمیوں کو جہنم کے دروازے سے واپس لا کر جنت میں اپنے ساتھ لے جائے گا اور اسی لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جب قرآن کریم پر عمل کرنے والا حافظ قیامت کے دن دس افراد کی نجات کا کوٹہ لے کر کھڑا ہوگا ساری برادری اس کے گرد جمع ہو کر امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہوگی اور وہ ان میں دس افراد کا انتخاب کر کے انہیں اپنے ساتھ جنت میں لے جانے کے لیے بلا رہا ہوگا تو تب پتہ چلے گا کہ حافظ قرآن کریم کتنا بڑا وی آئی پی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے اور یہ وی آئی پی کا لفظ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ جناب نبی اکرم ﷺ نے اس ارشاد کا ترجمہ کر رہا ہوں کہ "اشراف امتی حملة القرآن" میری امت کے اشراف قرآن کریم کو اٹھانے والے ہیں۔

اس مناسبت سے میں ایک اور بات آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں اور آپ سب اس بات پر غور کر لیں کہ کل قیامت کے دن اگر ہمارے معاملات کا فیصلہ میرٹ اور فائل پر کرنے کا اعلان ہو گیا تو ہمارا حشر کیا ہوگا؟ جس طرح کی زندگی ہم گزار رہے ہیں اور ہمارے شب و روز کے جو معمولات ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم میں سے کون اپنی فائل اور میرٹ پر کسی بھی درجہ میں اعتماد کر سکتا ہے؟ ہمارے پاس کون سا میرٹ ہے؟ اور ہماری فائل میں آخر ہے ہی کیا؟ اس لیے ہماری نجات تو اسی طرح کے کسی کوٹے میں شامل ہو کر ہو گئی تو کچھ امید ہے ورنہ اور تو کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا لہٰذا میری گزارش ہے کہ ہر خاندان کو اپنے لیے چار پانچ ضمانتیوں کا انتظام تو بہر حال کر ہی لینا چاہیے۔ کسی خاندان میں پانچ حافظ ہوں گے تو پچاس کا اور دس ہوں گے تو سو افراد کی نجات کا بندوبست ہو جائے گا۔

ان گزارشات کے ساتھ قرآن کریم حفظ مکمل کرنے والے نوجوان، ان کے والدین، اساتذہ اور اسلامک دعوۃ اکیڈمی کے منتظمین ومعاونین کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس نوجوان کو قرآن کریم کو یاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کی تعلیم کو فروغ دینے کی توفیق سے نوازیں۔ (آمین)

(روزنامہ اوصاف جمعۃ المبارک یکم دسمبر ۲۰۰۰ء)

خواتین کی علمی برتری
کا
خیر القرون میں اعتراف

۲۴ جولائی ۹۹ء کو جامعۃ الہدیٰ نوٹنگھم (برطانیہ) میں تقسیم اسناد و انعامات کی سالانہ تقریب تھی اس تقریب میں جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کے والدین اور جامعہ کے منتظمین و معاونین شریک ہوتے ہیں۔ اس سال سولہ سال سے زائد عمر کی طالبات کی ایک کلاس "عالمہ" کا دو سالہ کورس مکمل کر کے فارغ ہو رہی تھی جو جامعہ سے فارغ ہونے والی پہلی کلاس ہے۔ اس لیے جامعہ الہدیٰ کے منتظمین اور کارکنوں کی خوشی قابل دید تھی۔ تین چار روز قبل جامعہ کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے لندن فون کر کے مجھ سے مشورہ کیا کہ اس سال تقریب میں مہمان خصوصی کی مسند پر کسے بٹھایا جائے؟ گزشتہ سال یہ اعزاز مجھے بخشا گیا تھا۔ میں نے گزارش کی کہ پاکستان یا بھارت سے آئے ہوئے کسی بزرگ عالم دین سے رابطہ کر کے انہیں زحمت دی جائے کیونکہ اس موسم میں علماء کرام کی ایک بڑی تعداد برطانیہ میں موجود ہوتی ہے۔ ایک دو ناموں پر مشورہ ہوا اور ان سے رابطہ کرنے کا فیصلہ ہو گیا مگر جب تقریب میں شرکت کیلیے نوٹنگھم پہنچا تو مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے بتایا کہ جن ناموں کا مشورہ ہوا تھا اس میں سے کوئی صاحب آج کیلیے فارغ نہیں ہیں اس لیے ہم نے آپ ہی کا نام مہمان خصوصی کے طور پر لکھ کر دعوت نامے تقسیم کر دیے ہیں۔

خیر یہ تو گھر کی بات تھی جس کیلیے نہ دل میں کوئی خواہش تھی اور نہ ہی انکار کے تکلف کا کوئی موقع تھا مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی خصوصی دعوت

پر پاکستان کے بزرگ عالم دین اور ماہنامہ الرشید لاہور کے مدیر مولانا حافظ عبدالرشید ارشد بھی تشریف لے آئے تھے۔ حافظ صاحب ہمارے پرانے بزرگوں میں سے ہیں۔ دینی صحافت سے قدیمی تعلق رکھتے ہیں اور اپنی معروف تصنیف ''بیس بڑے مسلمان'' کے حوالہ سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں اس لیے راقم الحروف نے مولانا رضاء الحق سیا کھوی سے عرض کیا کہ حافظ صاحب کی تشریف آوری کے بعد یہ حق انہی کا بنتا ہے وہ اس تقریب کے مہمان خصوصی ہوں۔

چنانچہ مدنی ٹرسٹ کے چیئرمین ڈاکٹر اختر زمان غوری کی صدارت میں یہ تقریب ہوئی، حافظ عبدالرشید ارشد صاحب مہمان خصوصی تھے ان کے ساتھ خاص مہمانوں کی صف میں گوجرانوالہ کے مفتی فخر الدین عثمانی، مولانا عیسیٰ منصوری اور راقم الحروف کے علاوہ دو بزرگ علماء مولانا کریم اللہ اور مولانا فضل رحیم بھی شامل تھے۔ اس تقریب میں زیادہ تقاریر کا اہتمام نہیں ہوتا۔ صدر محفل افتتاحی کلمات کہتے ہیں، پرنسپل کی طرف سے کارکردگی کی سالانہ رپورٹ پیش ہوتی ہے۔ انعامات اور اسناد تقسیم ہوتی ہیں۔ مہمان خصوصی کو مختصر اظہار خیال کی زحمت دی جاتی ہے اور پھر دعاء پر تقریب اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

مجھے جب ابتداء میں بتایا گیا کہ ''مہمان خصوصی'' کی حیثیت سے مجھے گفتگو کرنا ہوگی تو میں نے اپنے ذہن میں گفتگو کا تانا بانا بننا شروع کر دیا اور گزشتہ سال اسی تقریب میں کی جانے والی گفتگو کے تسلسل میں چند باتوں کی ترتیب قائم کر لی مگر جب خود میری ہی تجویز پر مولانا حافظ عبدالرشید ارشد کو یہ ذمہ داری منتقل ہوگئی تو گفتگو کا جو خاکہ ذہن میں ترتیب دے رکھا تھا وہ زبان پر نہ آسکا لیکن اسے اگلے سال تک ملتوی رکھنے کی بجائے ان کو ذہن کی معروضات کی صورت میں پیش کر دینے کو زیادہ مناسب خیال کر رہا ہے۔

گزشتہ سال اس تقریب میں مسلم خواتین کو دی جانے والی تعلیم کی حدود اور دائرے کے سوال پر عرض کیا تھا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سلسلہ میں کامل ترین اسوہ اور معیار ہیں کیونکہ وہ نو سال کی عمر میں حرم نبوی ﷺ میں آئیں، اٹھارہ برس کی عمر تک رسول اکرم ﷺ کے گھر میں اور پھر کم وبیش نصف صدی تک انہوں نے تعلیم و تدریس اور امت کی

رہنمائی میں ہی باقی زندگی گزار دی۔ ان کے معاصرین جن علوم میں ان کی خصوصی مہارت کا اعتراف کرتے ہیں ان کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ ہے۔ ان میں قرآن کریم کی تفسیر، حدیث وسنت، شعروادب اور طب وعلاج بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علوم انہوں نے جناب نبی اکرم ﷺ کے گھر میں ہی حاصل کیے اس لیے مسلمان طالبات کیلیے تعلیم کا دائرہ اور نصاب بھی اسی کی روشنی میں طے کیا جائے گا۔

اس کے بعد اسی تسلسل میں خیر القرون یعنی صحابہ کرامؓ تابعین اور اتباع تابعین رحمۃ اللہ تعالیٰ کے دور کے چند واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں جن سے علم وفضل میں مسلم خواتین کی پیش رفت بلکہ برتری کا اظہار ہوتا ہے اور اس زمانے میں اس کا پوری طرح اعتراف کیا گیا ہے۔

تفسیر ابن کثیرؒ میں مذکور ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ایک بار مسجد نبویؐ میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اعلان کیا کہ بعض لوگوں نے نکاح میں مہر کیلیے بڑی بڑی رقمیں مقرر کرنا شروع کردی ہیں جس سے مشکلات پیدا ہورہی ہیں۔ اس لیے وہ یہ پابندی عائد کررہے ہیں کہ کوئی شخص نکاح میں چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کرے۔ حضرت عمرؓ خطبہ ارشاد فرما کر باہر تشریف لائے تو ایک قریشی خاتون نے انہیں روک لیا کہ قرآن کریم میں عورتوں کو خاوندوں کی طرف سے دی جانے والی رقوم کو (سورۃ النساء آیت ۲۰) ''قنطار'' سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا معنیٰ ڈھیر ہے اور جب قرآن کریم ہمیں ڈھیروں دلواتا ہے تو آپ کو اس پر پابندی لگانے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ واپس منبر پر تشریف لے گئے اور دوبارہ اعلان کیا کہ میرے فیصلے پر ایک عورت نے اعتراض کیا ہے جو درست ہے اور وہ قرآن کریم کے مفہوم کو مجھ سے زیادہ بہتر سمجھی ہے اس لیے میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔

تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؒ معروف بزرگ ہیں جنہیں ''افقہ التابعین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق حضرت حسن بصریؒ جیسے بزرگ بھی مشکل مسائل میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے شاگردوں میں سے ایک ذہین شخص سے کردیا۔ شادی کے بعد شب عروسی گزار کر صبح جب وہ صاحب گھر سے نکلنے لگے تو نئی نویلی دلہن نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہیں؟ جواب دیا کہ استاد محترم حضرت سعید بن المسیبؒ کی مجلس میں حصول علم کا سلسلہ جاری رکھنے

کیلیے جارہا ہوں۔ اس خاتون نے جواب دیا کہ اس کیلیے وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے اباجان کا سارا علم میرے پاس ہے اور وہ میں ہی آپ کو سنادوں گی۔ امام مالک بن انسؒ اہل سنت کے چار بڑے اماموں میں سے ہیں اور اتباع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ قاضی عیاضؒ نے ترتیب المدارک میں لکھا ہے کہ حضرت امام مالکؒ جب حدیث پڑھانے بیٹھتے تو ان کی بیٹی بھی دروازے کے پیچھے بیٹھتی تھی، امام مالکؒ کا معمول تھا کہ شاگردوں کا ایک بڑا ہجوم ہوتا تھا ان میں سے کوئی صاحب احادیث سناتے تو حضرت امام مالکؒ سن کر تصدیق فرمادیتے یا ضرورت ہوتی تو اصلاح کر دیتے اور معنی اور مفہوم بیان فرما دیتے۔ ان کی دختر نیک اختر دروازے کے پیچھے بیٹھ کر یہ سب سنتی تھیں اور اگر حدیث پڑھنے والا کہیں غلطی کرتا تو وہ دروازہ کھٹکھٹا دیتیں جس پر امام مالکؒ پڑھنے والے کو ٹوک دیتے کہ تم نے کہیں غلطی کی ہے اسے دوبارہ چیک کیا جاتا تو کہیں نہ کہیں غلطی ضرور نکل آتی قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں کہ بیٹی کا حال یہ تھا جبکہ امام مالکؒ کا بیٹا جس کا نام محمد تھا ادھر ادھر گھومتا پھرتا اور لاپراوئی کے ساتھ سامنے سے گزر جاتا اس پر امام مالکؒ نے کئی بار شاگردوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

''خدا کی شان دیکھو وہ میری بیٹی ہے اور یہ میرا بیٹا ہے''۔

ایک موقع پر فرمایا کہ اس بیٹے کو دیکھ کر بات سمجھ میں آتی ہے کہ علم وراثت میں منتقل نہیں ہوتا امام شافعیؒ بھی اہل سنت کے بڑے اماموں میں سے ہیں اور ان کے پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد دنیا کے مختلف حصوں میں زیادہ ہے امام تاج الدین السبکیؒ نے ''طبقات الشافعیۃ الکبریٰ'' میں حضرت امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انہیں کسی مقدمہ میں گواہ کے طور پر قاضی کی عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ اصول کے مطابق ان کے ساتھ ایک اور خاتون بھی گواہ تھیں کیونکہ قرآن کریم نے بعض معاملات میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ قاضی نے دونوں کی گواہی سنی اور جرح کیلیے دونوں کو الگ الگ کرنا چاہا تاکہ وہ گواہی میں ایک دوسرے کی معاونت نہ کرسکیں۔ امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ نے اس موقع پر قاضی کو ٹوک دیا کہ وہ دو خاتون گواہوں کو ایک ہی معاملہ میں گواہی دیتے ہوئے الگ الگ نہیں کرسکتے کیونکہ قرآن کریم (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲) میں دو عورتوں کی گواہی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا سکے اس لیے

دونوں کو الگ الگ کر کے گواہی لینا قرآن کریم کی منشا کے خلاف ہے چنانچہ قاضی کو ان کا موقف تسلیم کرنا پڑا۔

یہ سب واقعات خیر القرون کے ہیں اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت مسلمہ کے خیر القرون یعنی مثالی اور آئیڈیل دور میں عورت کو علم و فضل میں کیا مقام حاصل تھا اور وہ نہ صرف علم میں مردوں سے آگے بڑھ کر اپنی برتری کا اظہار کر سکتی تھی بلکہ اس علم و فضل اور برتری کا کھلے بندوں اعتراف بھی کیا جاتا تھا۔

(روزنامہ اوصاف جمعۃ المبارک ۶ اگست ۱۹۹۹ء)

فلاحِ انسانیت
اور
مدارس دینیہ

(۱)

بعد الحمد والصلوٰۃ:

قبلہ حضرت مفتی صاحب، حضرات علماء کرام، محترم بزرگو اور دوستو، بھائیو، ساتھیو اور اگر سن رہی ہیں تو ماؤ، بہنو اور بیٹیو!

یہ جلسہ ایک دینی درسگاہ مدرسہ محمودیہ سرگودھا کا سالانہ جلسہ ہے۔ دینی درسگاہ کی چار دیواری میں ہو رہا ہے اور اس کا موضوع بھی ''عظمت مدارس اسلامیہ'' تجویز کیا گیا ہے۔

اصل خطاب تو ہمارے مخدوم و محترم بزرگ (حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی دامت برکاتہم) کا ہوگا۔ ان سے قبل برادرِ محترم مولانا محمد اشرف علی صاحب (مہتمم مدرسہ اسلامیہ محمودیہ) کے حکم پر آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں اور دینی مدارس کی عظمت اور ان کی ضرورت واہمیت کے حوالہ سے کچھ گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں۔ دین حق کی جو بات علم میں آئے سمجھ میں آئے اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں۔ آمین یارب العالمین

کسی تمہید کے بغیر دینی مدارس کے حوالہ سے عام طور پر ذہنوں میں پائے جانے والے تین سوالات کا جائزہ لینا چاہوں گا جو آج کی دنیا میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکے ہیں اور یقیناً آپ حضرات کے ذہنوں میں بھی یہ سوال کسی نہ کسی گوشے میں ضرور گھوم رہے ہوں گے۔

پہلا سوال

یہ ہے کہ دینی مدارس اپنے نصاب میں جدید علوم کیوں شامل نہیں کر رہے؟ انگریزی زبان، سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر جدید علوم کو اپنے نصاب کا حصہ کیوں نہیں بنا رہے؟ انہیں کیا شکایت ہے؟ کیا تکلیف ہے اور اس معاملہ میں کیا رکاوٹ ہے؟

دوسرا سوال

یہ ہے کہ اگر دینی مدارس سرکاری انتظامات کے تحت آ جائیں اور حکومت ان کو چلانے کی ذمہ داری قبول کر لے تو انہیں کیا اشکال ہے اور وہ اسے قبول کرنے کو کیوں تیار نہیں ہیں؟

تیسرا سوال

یہ ہے کہ جس طرح آج کا عالمی نظام اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اس بات پر تل گئی ہے کہ دینی مدارس کو کنٹرول کیا جائے۔ ان کے جداگانہ تشخص کو ختم کیا جائے اور معاشرہ میں ان کے آزادانہ کردار کو باقی نہ رہنے دیا جائے تو اگر خدانخواستہ یہ حملہ کامیاب ہو جاتا ہے اور یہ تو تیں دینی مدارس کو ختم کر دیتی ہیں تو دینی تعلیم کا مستقبل کیا ہوگا اور دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہوگا۔ یہ دینی مدارس کے بارے میں آج کی دنیا کے بڑے سوالات ہیں جو یقیناً اہم ہیں اور یقیناً آپ کے ذہنوں میں بھی ہوں گے اس لیے میں تھوڑے سے وقت میں ان کا جائزہ لینا چاہوں گا۔

پہلا سوال

یہ ہے کہ دینی مدارس اپنے نصاب میں جدید سائنس کو ٹیکنالوجی کو اور دیگر ضروریات کو کیوں شامل نہیں کرتے؟

اس کے جواب میں تین باتیں عرض کروں گا۔

پہلی بات

یہ کہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی تشریف فرما ہیں جو اس امر کے گواہ ہیں کہ دینی

مدارس کے تمام مکاتب فکر کے وفاقوں کے قائدین وفاقی وزراء کے ساتھ متعدد ملاقاتوں میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ انگریزی سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کو بنیادی تعلیم کی جائز حد تک دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے اور وہ میٹرک تک ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کے لیے نہ صرف تیار ہیں بلکہ اس سلسلہ میں بہت سے عملی اقدامات ہو چکے ہیں اور ان مضامین کو دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جا چکا ہے لیکن اس کی جائز حد میٹرک تک ہے۔

دوسری بات

یہ کہ میٹرک کے بعد اگلے مرحلہ کی تعلیم میں ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کو دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ غلط تصور کرتے ہیں اس کے لیے ہم تیار نہیں ہیں اس لیے کہ اس کے بعد تعلیم کے دائرے تقسیم ہو جاتے ہیں۔ میں آپ حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا میڈیکل کالج کے نصاب میں قانون پڑھایا جاتا ہے اور کسی لاء کالج میں میڈیکل کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ انجینئرنگ کالج میں طب کی تعلیم دی جاتی ہے؟

سرگودھا بڑا شہر ہے یہاں میڈیکل کالج بھی ہوگا اور لاء کالج بھی ہوگا اور ٹیکنیکل کالج بھی ہوگا۔ آپ خود معلوم کرلیں اور جا کر دیکھیں کہ ان کالجوں میں دوسرے مضامین پڑھائے جاتے ہیں؟ یقیناً نہیں پڑھائے جاتے اور نہ ہی پڑھائے جا سکتے ہیں بلکہ میں یہ عرض کروں گا کہ یہ مطالبہ کرنا کہ میڈیکل کالج میں لاء پڑھایا جائے اور لاء کالج میں انجینئرنگ پڑھائی جائے اور انجینئرنگ کالج میں میڈیسن کی تعلیم دی جائے۔ یہ فطرت کے خلاف بات ہوگی اور حماقت کی بات ہوگی۔ اسی طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کے نصاب میں میٹرک کے بعد اگلے درجات میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل کرنے کا مطالبہ بھی حماقت ہے اور کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

تیسری بات

تیسری بات ذرا تلخ سی ہے۔ لیکن عرض کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ ایک اور حوالہ سے اس مسئلہ کا جائزہ لے لیں کچھ عرصہ قبل پنجاب کی مقتدر ترین شخصیت لاہور کے ایک بڑے دینی مدرسہ میں تشریف لے گئی۔ گورنر پنجاب جامعہ اشرفیہ میں تشریف لے گئے۔ طلبہ اور اساتذہ کے سامنے وعظ فرمایا اور وہاں یہ کہا کہ دینی مدارس اپنے نصاب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو کیوں شامل نہیں کرتے؟ ہم اس میدان میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور دینی مدارس کو اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے۔

میں نے ایک مضمون میں اس کے جواب میں گورنر صاحب سے عرض کیا کہ مجھے آپ کی اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ ہم سائنس اور آج کی ٹیکنالوجی میں دنیا کی دوسری قوموں سے کم از کم سو برس پیچھے ہیں اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہم آج اسی کی مار کھا رہے ہیں۔

میں اس سے اگلی بات عرض کروں گا کہ اس محرومی کا احساس ہمیں زیادہ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے آج ہم دنیا مین اپنے جائز مقام سے محروم ہیں اور ہمارے مصائب و آلام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔

صرف ایک مثال سے بات سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے آج سے پون صدی یا ایک صدی قبل ہم مسلمانوں کو بہت بڑی دولت سے نوازا۔ خلیج میں تیل کی دولت دی۔ یہ ہمارا ادبار کا دور تھا۔ زوال کا دور تھا مگر اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے وقت کی سب سے بڑی دولت عطا فرمائی۔ لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم تیل زمین سے نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ چشمے کھودنے کی تکنیک سے بے بہرہ تھے۔ تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی صلاحیت سے ہم کورے تھے اور تیل کو ریفائن کرنے کے بعد دنیا کی مارکیٹ میں بیچنے کے لیے مارکیٹنگ کی صلاحیت بھی ہم میں موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے ہم مغربی ماہرین کو بلانے پر مجبور ہوئے۔ مغربی ماہرین آئے پھر مغربی کمپنیاں آئیں۔ ان کے بعد بینک آئے پھر سیاست کار آئے اور ان کے ساتھ مغرب کی فوجیں بھی آ گئیں۔ جو آج تیل کے چشموں کے

گرد گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔

قابل توجہ بات

ذرا خیال کیجیے کہ تیل ہمارا، چشمے ہمارے، کنویں ہمارے، زمین ہماری لیکن ان پر قبضہ کس کا ہے؟ اور کس وجہ سے ہے؟ یہ ہماری نااہلی تھی کہ ہم تیل نکالنے، صاف کرنے اور عالمی مارکیٹ میں اسے بیچنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ جس کی وجہ سے مغرب سے ماہرین آئے اور آج ماہرین، کمپنیاں، بینک اور پھر فوجیں خلیج میں تسلط قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تیل نکالنے، صاف کرنے اور مارکیٹ کی صلاحیت آج بھی ہم میں موجود نہیں ہے اور مغرب کے ارادے یہ ہیں کہ امریکی احکامات کی من وعن تابعداری نہ کی تو اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کرلیا جائے گا اور مغربی ملکوں میں اس کے اثاثے اور مغربی بینکوں میں اس کے اکاؤنٹس ضبط کرلیے جائیں گے۔ اس لیے ہمیں اس کی تکلیف زیادہ ہے اور ہم اس کا درد زیادہ محسوس کررہے ہیں۔

ذمہ دار کون؟

لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کرنا چاہیے اور میں ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے، دعوت دیتا ہوں کہ وہ سنجیدگی سے اس بات کا جائزہ لے کہ امت کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟

تاریخی حوالہ

میں تاریخ کے حوالہ سے بات کروں گا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ کردیا تھا۔ دینی مدارس ختم کردیے تھے۔ نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی۔

دو طبقے

تب دو طبقے سامنے آئے تھے اور انہوں نے ملت کو سہارا دیا تھا، دونوں نے الگ الگ شعبوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔

پہلا طبقہ

علماء کرام نے قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے عوام سے تعاون کے لیے رجوع کیا۔ چندے مانگے، گھر گھر دستک دے کر روٹیاں مانگیں، زکوٰۃ اور صدقہ کے لیے دست سوال دراز کیا اور سرکاری تعاون سے بے نیاز ہو کر عوامی تعاون کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیم کو باقی رکھنے اور اسلامی تہذیب وثقافت کے آثار کو بچانے کے لیے کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی۔ سر پر چنگیر رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگی ہیں۔ ہاں ہاں! میں نے خود روٹیاں مانگی ہیں اور مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اپنے طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے کئی محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم نے اپنی عزت نفس کی پرواہ نہیں کی۔ طعنے سنے ہیں، بے عزتی برداشت کی ہے لیکن قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھا ہے جس کی گواہی آج دشمن دے رہا ہے۔

دوسرا طبقہ

اس کے ساتھ ہی ایک اور طبقہ سامنے آیا، جس نے قوم کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کا وعدہ کیا۔ انگریزی اور جدید زبانوں کی تعلیم اپنے ذمہ لی۔ انہیں اس کام کے لیے ریاستی مشینری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے قوم کے کھربوں روپے خرچ کر ڈالے۔ انہیں سرکاری وسائل میسر تھے۔ ریاستی پشت پناہی حاصل تھی۔ لیکن وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے اور آج اپنی ناکامی کی ذمہ داری ''مولوی'' کے سر تھوپ کر اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دانشوروں سے سوال

میں آج کی اجتماعی دانش سے سوال کرتا ہوں کہ وہ انصاف سے کام لے اور یہ فیصلہ کرے کہ نااہل کون ثابت ہوا؟ اور اپنی ذمہ داری کس نے پوری نہیں کی؟ آج اگر ملک کے کسی گوشے میں دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، قرآن وسنت کی رہنمائی لوگوں کو میسر نہیں ہے اور اسلام کی آواز نہیں لگ رہی تو ہم مجرم ہیں۔ لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالیں، یہ ناانصافی ہے۔ اس کے بارے میں ان سے پوچھیے جنہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس کے لیے سرکاری خزانے کے کھربوں روپے اب تک انہوں نے خرچ کر ڈالے۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو مساجد میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر ہیں؟ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے قاری مل رہے ہیں؟ رمضان میں قرآن سنانے کے لیے حافظ مل جاتے ہیں؟ جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب موجود ہیں؟ مسئلہ بتانے والے مفتی صاحبان کی کمی تو نہیں؟ دینی رہنمائی دینے کے لیے علماء کرام سے ملک کا کوئی گوشہ خالی تو نہیں؟۔

اس سے اگلی بات کہ جنگ میں کفر کے خلاف صف آراء ہونے والے مجاہدین بھی مدارس سے مل رہے ہیں یا نہیں؟۔ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو دینی مدارس پر اعتراض کس بات کا ہے؟ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی آج بھی ایک محفل میں فرما رہے تھے کہ انہوں نے وفاقی وزراء سے کہا کہ سرکاری نصاب تعلیم اور انتظام کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ قومی کمیشن قائم کیجیے۔ ہمیں اور سرکاری تعلیم کے ذمہ داروں کو اس کے سامنے پیش کیجیے۔ ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔

اس لیے میں نے اپنے مضمون میں گورنر پنجاب سے عرض کیا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالہ سے مجھے آپ کے ارشادات سے سو فیصد اتفاق ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں باز پرس اور تلقین کی جگہ جامعہ اشرفیہ نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی ہے۔ وہاں یہ وعظ کیجیے اور ان سے پوچھیے کہ قوم سائنس اور ٹیکنالوجی میں دنیا کی دوسری قوموں سے پیچھے کیوں رہ گئی ہے؟۔

دوسرا سوال

یہ تھا کہ دینی مدارس کو سرکاری انتظام قبول کرنے اور حکومت کے کنٹرول میں آنے پر کیا اعتراض ہے؟ اور وہ دینی مدارس کو حکومتی کنٹرول کے تحت چلانے کے لیے کیوں تیار نہیں ہیں؟۔

جواب

اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ کسی فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف واقعات کے حوالہ سے یہ عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہم اس کا ایک تجربہ بہت پہلے کر چکے ہیں۔ جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ صدر محمد ایوب خان (مرحوم) کے دور میں ریاست بہاولپور پاکستان میں ضم ہوئی۔

پہلا تجربہ

بہاولپور کا سب سے بڑا دینی مدرسہ جامعہ عباسیہ تھا۔ جس کے بارے میں محکمہ تعلیم کے ذمہ داروں نے منصوبہ بنایا کہ اسے ماڈل اسلامی یونیورسٹی بنایا جائے گا۔ دینی علوم اور جدید تعلیم کے مضامین کو یکجا کر کے مشترکہ کورس تشکیل دیا گیا۔ جامعہ عباسیہ کو اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور اس کا نظام محکمہ تعلیم نے سنبھال لیا۔ اس کے لیے علامہ شمس الحق افغانیؒ، علامہ احمد سعید کاظمی مرحوم، مولانا عبدالرشید نعمانی اور دیگر سرکردہ علماء کرام کو ملک کے مختلف حصوں سے اٹھا کر بہاولپور میں بٹھایا گیا اور دنیا کو نوید دی گئی کہ ہم نے اسلامی اور جدید علوم کے امتزاج سے ایک آئیڈیل درسگاہ قائم کر دی ہے۔ ایک ماڈل دارالعلوم بنا دیا ہے۔

لیکن بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں اس کا حشر کیا ہوا؟ یہ ایک تلخ داستان ہے اور آج آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ آج بھی اس کا نام اسلامی یونیورسٹی ہے مگر دینی تعلیم اس کے نصاب سے خارج ہو چکی ہے۔ وہاں وہی سرکاری نصاب پڑھایا جاتا ہے جو ملک کی دیگر یونیورسٹیوں میں رائج ہے اور اس کے تعلیمی معیار کا حال یہ ہے کہ جس طالب علم کو ملک کے دوسرے کسی کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا، اس کے لیے بہاولپور اسلامی یونیورسٹی کے

دروازے کھلے رہتے ہیں۔

دوسرا تجربہ

دوسرا تجربہ محکمہ اوقاف نے کیا کہ اس نے ملک کے بیسیوں مدارس اپنی تحویل میں لیے اور کہا کہ ہم تم سے بہتر نظام چلائیں گے۔ تمہارے ہاں تعلیم کی درجہ بندی نہیں ہے۔ مدارس میں صفائی نہیں، رہائش اور خوراک کا نظام بہتر نہیں ہے اور نظم ونسق کی صورت حال ٹھیک نہیں ہے اس لیے محکمہ اوقاف ان مدارس کا تم سے بہتر انتظام کرے گا، ان میں سے صرف ایک مدرسہ کا حوالہ دینا چاہوں گا جسے آپ خود بھی کسی وقت جا کر دیکھ سکتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ اور محکمہ اوقاف

اوکاڑہ کے گول چوک میں جامعہ عثمانیہ محکمہ اوقاف کی تحویل میں آنے سے قبل ملک کے بڑے دینی مدارس میں شمار ہوتا تھا۔ سینکڑوں طلبہ ہاسٹل میں رہتے تھے اور معیاری تعلیم ہوتی تھی مگر آج اس مدرسہ کے کمرے محکمہ اوقاف نے تجارتی کمپنیوں اور وکلاء کو کرائے پر دے رکھے ہیں اور وقف کمروں کا کرایہ محکمہ اوقاف کھا رہا ہے۔

ایک مدرسہ کا حشر محکمہ تعلیم نے کیا، دوسرے کا محکمہ اوقاف نے اور آج یہ دونوں محکمے تقاضا کر رہے ہیں کہ ملک کے باقی مدارس بھی ان کے کنٹرول میں دے دیے جائیں میں عرض کرتا ہوں کہ جناب مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ اس لیے دوسرا تجربہ کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ میرا سوال وفاقی وزیر تعلیم سے ہے کہ وہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی فائل کا مطالعہ کریں اس فائل کی گرد جھاڑیں اور قوم کو بتائیں کہ اس اچھی خاصی دینی درسگاہ کا محکمہ تعلیم نے کیا حشر کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟ اس کے بعد باقی مدارس کے حوالہ سے بات کریں۔

تیسرا سوال

میں نے گفتگو کے آغاز میں اٹھایا تھا کہ آج کی اسٹیبلشمنٹ دینی مدارس کو کنٹرول میں لینے پر تلی بیٹھی ہے میں ملک کی اسٹیبلشمنٹ کی بات نہیں کر رہا کہ وہ تو ایک چھوٹا سا یونٹ ہے

بلکہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کی بات کر رہا ہوں جو آج عملاً دنیا کے نظام کو کنٹرول کر رہی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے اور دینی مدارس کے نظام کو تہ و بالا کر دیتی ہے تو دینی تعلیم کا مستقبل کیا ہوگا اور دینی مدارس والے پھر کیا کریں گے۔

تیسرے سوال کا جواب

اس کے جواب میں ایک تو سادہ سی بات یہ ہے کہ جناب ''منہ دھو رکھو'' یہ آپ کے بس کی بات نہیں آج کے ورلڈ سسٹم کا لیڈر امریکہ بم برسا سکتا ہے۔ ہزاروں انسانوں کو بے گناہ قتل کر سکتا ہے اور ''ڈیزی کٹر'' کی بارش کر سکتا ہے۔ لیکن دینی تعلیم کو ختم کرنا اس کے بس میں نہیں لیکن میں تاریخی حقائق کے حوالے سے بات کروں گا کہ اس سے پہلے بھی ایسے نہیں ہو سکا اور اب بھی ایسا ہونا ممکن نہیں۔ ان شاء اللہ

ابھی حال ہی میں امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول پاکستان آئے اور دورہ سے قبل وہیں سے یہ اعلان کر کے آئے کہ میں پاکستان کے معاشرے کو سیکولر بنانے کے ایجنڈے پر بات کرنے پاکستان جا رہا ہوں۔ میں نے ایک مضمون میں ان سے گزارش کی ہے کہ جناب اس پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ اب سے دو سو برس پہلے برطانیہ بھی اسی ایجنڈے پر جنوبی ایشیا میں آیا تھا۔ اس نے بھی مدارس کو بند کر دیا تھا۔ مدارس کی جائیدادیں ضبط کر لی تھیں۔ بلڈنگوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ علماء کرام کی بڑی تعداد کو شہید کر دیا تھا۔ ہزاروں کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ بہت سے علماء کو کالا پانی بھیج دیا تھا۔ توپ کے منہ پر باندھ کر علماء کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ زندہ انسانوں کو درختوں سے لٹکا کر زندہ حالت میں ان کی کھالیں کھینچ لی تھیں۔ وہ تم سے بڑا درندہ تھا۔ تم سے بڑا بھیڑیا تھا۔ اس نے دو صدیوں تک اپنا پورا زور صرف کیا کہ جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرے کو سیکولر بنا دے۔ ہاں دو صدیاں پوری دو صدیاں۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ شہیدؒ کی شکست کے بعد سے ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان تک ایک سو نوے سال بنتے ہیں۔ جن میں برطانوی حکومت نے پورا زور لگا دیا۔ جیلیں آباد کیں۔ پھانسی کے پھندوں پر لٹکایا اور ظلم و جبر کا ہر حربہ آزمایا۔

میرا سوال

مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ان کارروائیوں سے ہم ختم ہو گئے؟ نہیں ہم آج بھی موجود ہیں، زندہ ہیں اور نہ صرف زندہ ہیں بلکہ تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ مدارس کل بھی زندہ تھے آج بھی زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ ان شاء اللہ

تم جو چاہو کر لو۔ ان مدارس کے آزادانہ کردار کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ان مدارس میں قرآن و سنت کی تعلیم ہوتی ہے۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اٹھائی ہے۔ اس لیے ہمارا ایمان ہے اور تاریخ و تجربہ اس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی حفاظت بھی قیامت تک فرمائیں گے اور اس کی حفاظت کے ذرائع و اسباب کی بھی حفاظت فرمائیں گے۔ اس لیے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ آزمائش آئے گی۔ مشکل حالات پیدا ہوں گے اور جس طرح پہلے وقت گزر گیا ہے اب بھی گزر جائے گا۔ قرآن و سنت کی تعلیم کا یہ نظام کل بھی تمام تر جبر و تشدد کے باوجود زندہ رہا ہے اور اب بھی ظلم و جبر کا کوئی وار دینی تعلیم کے اس تسلسل کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ میں نے وقت زیادہ لے لیا ہے۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب صدر دارالعلوم کراچی نے ابھی خطاب کرنا ہے۔ اس لیے میں اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

فلاحِ انسانیت

اور

مدارس دینیہ

(۲)

۱۷ستمبر ۲۰۰۰ءکو جامعہ مفتاح العلوم سرگودھا کے سالانہ جلسہ سے خطاب۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ:

سرگودھا کے حضرات کو یاد ہوگا آج سے تقریباً سوا مہینہ پہلے یہاں سرگودھا میں ہی میں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ مدرسہ اسلامیہ محمودیہ میں لیکن وقت کے اختصار کی وجہ سے ساری بات نہ کر سکا تھا۔ مدارس کے حوالہ سے تین سوالوں کا جواب دیا تھا۔ دو سوال باقی ہیں تو میرا خیال ہے کہ کسی نئے موضوع پر گفتگو کرنے کی بجائے اسی گفتگو کو مکمل کر لیا جائے۔

آج دنیا کا سب سے اہم موضوع بھی یہی مدارس ہیں کہ یہ مدرسہ باقی رہنا چاہیے یا ختم ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک کام کر رہا ہے یا غلط کام کر رہا ہے دنیا کی خدمت کر رہا ہے یا دنیا کو خراب کر رہا ہے۔ یہ آج کی دنیا کا بڑا دل پسند موضوع ہے اور بڑا اہم موضوع ہے۔ اس لیے میں نے چار پانچ سوالات قائم کیے تھے۔ تین سوالات کے بارے میں گزارشات گزشتہ جلسہ میں عرض کر چکا ہوں۔

چوتھا سوال

چوتھا سوال یہ ہے کہ یہ مدارس جس چیز کی تعلیم دے رہے ہیں۔ یہ کلچر، تہذیب، تمدن اور ثقافت کے حوالہ سے چودہ سو سال پہلے کی تہذیب ہے۔ چودہ سو سال پہلے کے کلچر کی بات کر رہے ہیں۔ زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اور یہ مدارس لوگوں کو پیچھے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ یہ بات آپ سنتے ہیں پڑھتے ہیں یا نہیں پڑھتے کہ دنیا ترقی کی بات کر رہی ہے۔ چودہ سو سال میں ایک نیا کلچر ڈویلپ ہو گیا ہے۔ ایک نئی تہذیب اور عالم میں گلوبل سویلائزیشن منظم ہو رہی ہے اور یہ کھینچ کھینچ کے چودہ سو سال پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ گھڑی کی سوئی آگے چلتی ہے یہ الٹا چلانا چاہتے ہیں۔ یہ مدارس ماضی کی بات کرتے ہیں۔ ماضی بھی قریب کا نہیں بلکہ ماضی بعید کی بات کرتے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار سال پرانے کلچر کو آج دنیا میں دوبارہ مسلط کرنا چاہتے ہیں اور یہ گھڑی کی سوئیاں الٹا چلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ جناب ماضی کی طرف دھکیل رہے ہیں، آگے بڑھنے کے مخالف ہیں۔ پیش رفت کے مخالف ہیں اور پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ میں نے سوال اس لیے تفصیل سے کیا تاکہ آپ کے دلوں میں بات بیٹھے کہ کہنے والے کیا کہہ رہے ہیں اور ان کا سوال کیا ہے۔

پانچواں سوال

آج یہ سوال ان مدارس کے بارے میں بڑی اہمیت کے ساتھ اور بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ جب بھی کوئی مسلمان اپنے بیٹے کو مدرسہ میں بھیجتا ہے تو ساتھ والے کہتے ہیں یار کیا کر رہے ہو۔ مسیتڑ بنا رہے ہو۔ کھائے گا کدھر سے کرے گا کیا۔ یہ کیا کرے گا۔ چلو مولوی بھی بن جائے گا۔ زندگی کیسے گزارے گا۔ ارے بھائی اس کو بے کار بنا رہے ہو اس کو اگر دوسرے عنوان سے تعبیر کریں تو سوال یہ بنتا ہے۔ اس مدرسے کی تعلیم میں روزگار کا تحفظ نہیں ہے۔ روزگار کی گارنٹی نہیں ہے اور یہ مدارس لوگوں کو کسی کام میں لگانے کے بجائے معاشرے کے بہت بڑے حصے کو بے کار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مسیتڑ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ یعنی کام کاج سے نکال کر معطل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ مدارس کا کردار ہے۔ کوئی زیادہ اگلی بات کر دیتا ہے۔ کہتا ہے یار ٹھیک ہے۔ دین بھی پڑھاؤ اور کوئی ہنر بھی

سکھاؤ تا کہ یہ بے چارہ روٹی کھانے کے قابل بھی ہو جائے۔تو یہ سوال بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ چلو پڑھاؤ بھی لیکن اس کو کوئی ہنر بھی سکھا دو یار۔تا کہ کچھ روٹی بھی کما لے، بچوں کو کھلا دے۔ بھوکا نہ مرے غریب۔ان کو روٹی مل جائے مکان سر چھپانے کا مل جائے ہم سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ مدارس میں ہنر بھی سکھاؤ بھائی۔ کیوں قوم کو بے کار کر رہے ہو۔ ہنر سکھاؤ۔کوئی فن سکھاؤ تا کہ دین کی خدمت بھی کرتے رہیں لیکن ساتھ ہنر بھی ہوتا کہ یہ کمائے۔اپنی محنت مزدوری کریں۔قرآن ذریعہ روزگار نہ ہو۔ان کا دین ان کا ذریعہ روزگار نہ ہو اور یہ کوئی ہنر سیکھ لیں تو یہ کچھ کھانے کمانے کے قابل ہو جائیں کیا خیال ہے۔

چوتھے سوال کا جواب

پہلی بات کہتے ہیں جی یہ مدارس چودہ سو سال پرانے کلچر کی بات کرتے ہیں۔آج کلچر بہت آگے بڑھ گیا ہے۔گلوبل سویلائزیشن آ گئی ہے۔ جناب ورلڈ کلچر اسٹیبلش ہو گیا ہے۔ تہذیب تمدن ثقافت آسمان تک جا پہنچی ہے اور ابھی تک آپ چودہ سو سال پیچھے کی بات کر رہے ہیں۔اگر میرے بھائی آج کی ثقافت کو مان لیں آج کے کلچر کے علمبردار ٹھنڈے دل کے ساتھ میرے سوال کا جائزہ لیں کہ جس تہذیب کو تم جدید تہذیب کہتے ہو۔بات ذرا سخت سی ہے۔ذرا توجہ دینی ہوگی۔جس کلچر کو تم ترقی یافتہ کلچر کہتے ہو اس میں کونسی نئی بات ہے جو تم نے نئے سرے سے شروع کی ہے اور اس سے نسل انسانی جاہلیت کے دور میں بھگت نہیں چکی؟

آج کی تہذیب اور دور جاہلیت کی تہذیب میں کوئی فرق نہیں

میں تھوڑی سی تفصیل میں جانا چاہوں گا۔آپ کی تہذیب کی بنیاد یہ ہے۔تا کہ آپ کے ذہن میں یہ بات نہ رہے کہ کہنا کیا چاہ رہا ہے۔ہماری آج کی ترقی یافتہ معیشت کی بنیاد کس پر ہے۔سود پر، جوئے پر، سٹہ پر، لاٹری پر۔ان میں سے کونسی بات ہے جو ابو جہل کے دور میں نہیں تھی اور آج ہے۔کیوں جی؟ ابو جہل کے دور میں جس کو ہم دور جہالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس دور میں سود تھا یا نہیں تھا، جوا تھا یا نہیں تھا، لاٹری تھی یا نہیں تھی، سٹہ تھا یا نہیں تھا، جس کو تم کہتے ہو فری اکانومی۔فری اکانومی، ہر چیز فری، ہر چیز فری۔یہ فریڈم کے نام سے تم نے ہر

چیز فری کر دی ہے۔ تم نے یہ فری اکانومی کا تصور پیش کیا کہ حلال حرام سوسائٹی طے کرتی ہے۔ اوپر سے کوئی طے کرنے والا نہیں ہے۔ حلال حرام کرنے کا اختیار کس کو ہے؟ سوسائٹی کو، کہ حلال بھی خود طے کریں گے اور حرام بھی خود طے کریں گے۔ ہم کسی کی ڈکٹیشن نہیں مانتے۔ سوسائٹی خود طے کرے گی کہ حلال کیا ہے حرام کیا ہے۔ جس کو ہم حرام سمجھ لیں وہ حرام ہے اور جس کو ہم حلال سمجھ لیں وہ حلال ہے۔

آپ کی تہذیب آج کی نہیں ہزاروں سال پرانی ہے

میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا۔ یہ سوال حضرت شعیب علیہ السلام سے بھی ہوا تھا۔ بہت پہلے حضرت شعیب علیہ السلام سے قوم نے سوال کیا تھا کہ اے شعیب علیہ السلام تیری نماز ہمیں اس بات سے روکتی ہے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں اور اپنے مالوں میں اپنی مرضی سے تصرف نہ کریں؟۔

اور جس فری اکیڈمی کی تم بات کر رہے ہو یہ تو حضور ﷺ سے بہت پہلے کی بات ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کی بات ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے سسر، حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے کی بات ہے۔ ہزاروں سال پرانی تہذیب ہے کہ ہم اپنے اموال کے خود مختار ہیں۔ جیسے چاہیں کیا کریں۔ جو چاہیں پالیسی بنائیں۔

اَنْ تَفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ یہ فری اکانومی کا تصور تم نے دیا ہے۔ یا تم سے ہزاروں سال پہلے سے موجود تھا؟ تو میں کہوں گا، سود تھا یا نہیں تھا؟ جوا تھا یا نہیں تھا؟ لاٹری تھی یا نہیں تھی؟ سٹہ تھا یا نہیں تھا؟ آگے چلیے۔ تم اب کس تہذیب کی بات کرتے ہو۔ کون سے کلچر کی بات کر رہے ہو۔ تمہارے کلچر کی معراج یہ ہے۔ میری مائیں بہنیں سن رہی ہوں گی۔ اس لیے زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا۔

نئی تہذیب کا فیصلہ، متبادل جنسی عمل کو قانونی تحفظ فراہم کرنا

قاہرہ میں اقوام متحدہ بین الاقوامی خواتین فنکشن منعقد کرتی ہے۔ تم نے قاہرہ میں بیٹھ کر دنیا کو یہ پیغام دیا ہے اور دنیا کے مسلمان ممالک سے یہ مطالبہ کیا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ لیکن کہنا ضروری ہے۔ تم نے مطالبہ کیا قاہرہ میں بیٹھ کر بین الاقوامی کانفرنس میں۔ مسلمانوں

کے ملک میں۔ مسلمانوں کی تہذیب کے مرکز میں بیٹھ کر کہا جناب آپ کی تہذیب ثقافت اور کلچر کا تقاضا یہ ہے کہ متبادل جنسی عمل کو ہر حکومت قانونی تحفظ فراہم کرے۔

متبادل جنسی عمل کی وضاحت

قانونی تحفظ کیا ہے؟ متبادل جنسی عمل کیا ہے؟ جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں سے عذاب بھیجا اور بستیوں پر پتھر برسائے گئے۔ تمہاری تہذیب کا دعویٰ یہ ہے اور تم آج جس عروج پر پہنچے ہو کہ تم بین الاقوامی کانفرنس کر کے دنیا کی حکومتوں سے مطالبہ کر رہے ہو کہ متبادل جنسی عمل کو ہر حکومت قانونی تحفظ فراہم کرے۔ کونسا متبادل جنسی عمل۔ جس عمل پر لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے۔ جس عمل پہ سدوم اور عمورا کی بستیوں کو فرشتوں نے پروں پر اٹھا کر فضا میں لے جا کر الٹ دیا تھا۔ تم اس تہذیب کی بات کرتے ہو۔ اس کلچر کی بات کرتے ہو۔ آج تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ ایک اشارہ کر دیتا ہوں۔

لندن ہائی کورٹ کا فیصلہ، مرد مرد سے شادی کر سکتا ہے

ابھی ابھی لندن ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا یہ کہ برطانیہ میں یورپ میں امریکہ میں یہ اب قانونی حق حاصل ہے کہ مرد اور مرد آپس میں شادی کریں۔ مرد ہی بیوی، اور مرد ہی خاوند ہو اور قانونی شادی رجسٹرڈ ہوتی ہے اور ان کے میاں بیوی ہونے کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کے حقوق ہوتے ہیں میاں بیوی والے۔ ایک صاحب فوت ہو گئے۔ اس کے دوسرے پارٹنر نے عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ میں اور وہ میاں بیوی تھے۔ معلوم نہیں میاں کون تھا، بیوی کون تھی؟ لیکن بہر حال میں اور وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ تو ایک مر گیا ہے۔ میں اس کا وارث ہوں۔ وراثت مجھے دلوائی جائے۔ یہ باقاعدہ فیصلہ دیا ہے کہ جناب یہ بالکل درست کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ کہتی ہے۔ یہ میاں بیوی تھے۔ ان کی شادی رجسٹرڈ تھی۔ ایک فوت ہو گیا ہے دوسرا اس کا خاوند وارث ہے اس کو وراثت دی جائے۔ یہ نئی تہذیب ہے یا لوط علیہ السلام کے زمانہ کی تہذیب۔

شراب نیا کلچر ہے کہ پرانا، بدکاری نیا کلچر ہے کہ پرانا، لواطت نیا کلچر ہے کہ پرانا اور حرام خوری نیا کلچر ہے کہ پرانا، ناچ گانا نیا کلچر ہے کہ پرانا۔ اسلام سے پہلے ناچ گانا تھا یا نہیں؟ یہ نجوم اور کہانت بڑی ترقی کر گئی ہے اور آج یہاں ہم بھی بڑے شوق سے، بڑے اہتمام سے

روزانہ اخبار میں پڑھتے ہیں، ستارے کیا کہتے ہیں، آپ کا مہینہ کیسے گزرے گا؟ آپ کا مہینہ کیسے گزرے گا۔ یہ کیا ہے؟ یہ جی کلچر ہے۔ یہ کیا ہے کلچر۔ یہ کلچر آج کا ہے۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے یہ کلچر تھا یا نہیں؟ کہانت تھی یا نہیں؟ نجوم تھا یا نہیں؟۔

آج یہ ناچ گانا آرٹ ہے، فن ہے، کلچر ہے، یہ کنجریاں، یہ ناچ گانے، یہ طوائفیں۔ یہ جناب آرٹس کی علامت ہیں۔ فن کی علامت کلچر کی علامت ہے۔

میرا سوال تہذیب و کلچر کے نمائندوں سے

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے یہ ساری چیزیں تھیں یا نہیں تھیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں ایک جملہ فرمایا تھا۔ شیخ الحدیث صاحب تشریف فرما ہیں۔ حجۃ الوداع میں منٰی میں خطبہ دیتے ہوئے ایک جملہ فرمایا تھا: كُلُّ اَمرِ الجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَیَّ جاہلیت کی تمام قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ تاریخ سے میرا سوال ہے۔ تاریخ کا طالب علم ہوں۔ تاریخ سے میرا سوال ہے۔ آپ کی تہذیب اور کلچر کے نمائندے سے میرا سوال ہے کہ جب نبی کریم ﷺ یہ اعلان فرما رہے تھے كُلُّ اَمرِ الجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَیَّ جاہلیت اور جاہلیت کے کلچر کی ہر روایت میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ تمہارے کلچر کی کونسی بات تھی جو حضور ﷺ کے پاؤں کے نیچے نہ تھی۔ آج کے تمدن، آج کی ثقافت، آج سویلائزیشن۔ اس کو جو مرضی کہہ لو لیکن میرا سوال ہے گز بھی حاضر ہے، زمین بھی حاضر ہے۔ میں تو دو اور دو چار کی بات کرتا ہوں۔ آؤ بیٹھو بات کرو۔ بتاؤ تمہاری تہذیب کی کونسی قدر ہے تمہاری ثقافت کی کونسی قدر ہے جو نبی ﷺ کے پیروں کے نیچے نہیں تھی۔ جب حضور ﷺ فرما رہے تھے۔ كُلُّ اَمرِ الجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَیَّ ارے بھائی! ہم تمہاری تہذیب، تمہاری ثقافت، تمدن اور سویلائزیشن کو پاؤں کے نیچے روند کر آگے بڑھ چکے۔ پہلے بھی ہم نے تمہاری یہ ساری قدریں پاؤں کے نیچے روندی تھیں اور اب بھی ان شاء اللہ۔ ہمارے پاؤں کے نیچے آنے والی ہیں۔ یہ پیغام ہے میرا۔ آج مغرب کا دعویٰ ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ جناب اس کلچر کے حوالے سے یہ آخری کلچر ہے۔ کہتے ہیں: اینڈ آف دی ہسٹری، تاریخ انتہا تک پہنچ گئی۔ تہذیب اپنے آخری مقام پہ پہنچ گئی ہے۔ ہم آخری راؤنڈ ہیں۔

مغرب کا دعویٰ

اس پر مقالات ہیں، کتابیں ہیں، فلسفہ ہے۔ کہتے ہیں: ہم دنیا کی آخری تہذیب کا آخری مرحلہ ہیں۔ بس اس کے بعد کوئی تہذیب نہیں آئے گی۔ ارے بھائی غلط فہمی ہے تمہیں۔ اینڈ آف دی ہسٹری تم نہیں ہو۔ اینڈ آف دی ہسٹری کا اعلان آپ سے پہلے جناب نبی کریم ﷺ چودہ سو سال پہلے کر چکے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: اَنَا وَالسَّاعَةُ کَھَاتَیْنِ۔ صرف فرق تھوڑا سا ہے۔ ایک راؤنڈ ہو چکا پہلے۔ دوسرا راؤنڈ باقی ہے۔ کونسا راؤنڈ؟ حضرت امام مہدی کا راؤنڈ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا راؤنڈ۔ وہ راؤنڈ باقی ہے۔ اینڈ آف دی ہسٹری کب ہے۔ اینڈ آف دی ہسٹری تمہاری تہذیب نہیں ہے، تمہارا کلچر نہیں ہے، اینڈ آف دی ہسٹری اسلام ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ چودہ سو سال پہلے یہ اعلان کر چکے۔ اَنَا وَالسَّاعَةُ کَھَاتَیْنِ دنیا والو اینڈ آف دی ہسٹری میں ہوں۔ میرے بعد قیامت ہوگی اور کوئی نہیں ہے۔ ایک راؤنڈ ہم گزار چکے ہیں۔ ابھی ہمارا ایک راؤنڈ باقی ہے۔ روند نہ مارو، فاؤل نہ کھیلو، تہذیب ابھی کھیل میں باقی ہے۔ بھائی ہمارا راؤنڈ کیوں خراب کرتے ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ جو نکمی ٹیم ہوتی ہے، کہتی ہے کہ شاید اگلا راؤنڈ ہم نہ جیت سکیں۔ تو اپنے راؤنڈ میں کھیل کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کھیل والے دوست سمجھ گئے ہوں گے اس بات کو۔ راؤنڈ میں دیکھتے ہیں کہ ہمارا پلہ سو فی صد بھاری ہے تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ کھیل ہمارے راؤنڈ میں ختم ہو جائے۔ اگر ہم جیت نہیں سکتے تو برابر ہی رہ جائیں لیکن کھیل ہمارے راؤنڈ میں ختم ہو جائے۔ میرے بھائی نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی ایک راؤنڈ باقی ہے اور وہ راؤنڈ ہمارا ہے۔ دس سال کے بعد ہو، تیس سال کے بعد ہو، پچاس سال کے بعد ہو۔ ابھی ہم نے ایک راؤنڈ کھیلنا ہے اور ان شاء اللہ العزیز دنیا پر ایک بار پھر اسلام کا غلبہ ہونا ہے۔ جیسے پہلے ہم اس جاہلی تہذیب کو، شراب کی تہذیب کو، زنا کی تہذیب کو، لواطت کی تہذیب کو، سود کی تہذیب کو، حرام خوری کی تہذیب کو، ناچ گانے کی تہذیب کو اور فحاشی کی تہذیب کو اور عریانی کی تہذیب کو پہلے پیروں کے نیچے روند کر آگے بڑھے تھے۔ لیکن سوال کا جواب ابھی باقی ہے۔

میری گزارش اہل مغرب سے

میری گزارش یہ ہے کہ ہم تو بات کرنے والے ہیں چودہ سو سال پہلے کی اور تم دنیائے انسانیت کو لے جاچکے ہو سولہ سو سال پیچھے۔ ہم کب کی بات کررہے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے کی، تم نے جہاں کھڑا کیا ہے نسل انسانی کو، سولہ سو سال پہلے۔ تم بڑے دقیانوسی ہو یا ہم بڑے دقیانوسی۔ تم زیادہ پیچھے گئے ہو یا ہم زیادہ پیچھے گئے ہیں۔ تاریخ کے حوالہ سے، کلچر کے حوالہ سے، ثقافت کے حوالہ سے میں کہتا ہوں کہ تمہیں مصالحہ زیادہ لگ گیا ہے۔ زیادہ پیچھے چلے گئے ہو۔ اتنا پیچھے مت جاؤ۔ بھئی ہماری دعوت ایک ہی ہے۔ جاہلیت کے دور سے نکال کر تہذیب کے دور میں لانا چاہ رہے ہیں۔ جھگڑا یہ ہے کہ زیادہ پیچھے کی بات ہے تو ہم نے ایک دفعہ گھڑی کو پیچھے گھمایا ہے اور تم دو دفعہ گھما چکے ہو۔ کوئی میری گزارش سمجھ میں آئی ہے؟ بات ٹھیک ہے آگے جاتے ہیں۔

پانچویں سوال کا جواب

اہل مغرب کی اگلی بات۔ کہتے ہیں جناب ان مدارس میں جو پڑھایا جاتا ہے اس پر روزگار کا تحفظ نہیں۔ یہ قومی سطح پر بھی بات ہوتی ہے اور شخصی سطح پر بھی۔ میں نے عرض کیا جیسے کوئی آدمی اپنے بچے کو مدرسہ میں بھیجتا ہے تو یہ اردگرد والے برادری رشتہ داری والے، ہماری ذہنیت بڑی عجیب ہوگئی ہے۔

میرا اپنا ذاتی واقعہ

میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہوں۔ میرے اپنے بڑے بیٹے نے قرآن پاک یاد کیا۔ یاد کرنے کے بعد اس نے تھوڑی سے تیاری میں میٹرک بڑے اچھے نمبروں میں پاس کیا۔ تو میری اپنی مسجد کی کمیٹی کے ممبر آگئے۔ جناب مولوی صاحب مبارک ہو۔ خیر مبارک جی۔ ماشاء اللہ بچہ بڑا ذہین ہے۔ بچے نے تھوڑی تیاری میں میٹرک اچھے نمبروں میں پاس کیا ہے۔ میں نے کہا: الحمد للہ اللہ پاک کی مہربانیاں ہیں اور کہا ہماری ایک درخواست ہے۔ جی فرمائیں، بچے کی لائن تبدیل کردیں۔ یہ ہے آج کی ذہنیت، دیکھا جی۔

علماء نے کبھی احتجاج نہیں کیا تنخواہ بڑھانے کا

کیا کبھی دیکھا آپ نے کہ مولویوں نے جلسے کیے، ہڑتال کی اور مظاہرے کیے ہوں، کبھی پاکستان کی تاریخ میں مولویوں کی ہڑتال سنی ہے۔ مولویوں نے نماز پڑھانے سے انکار کیا ہو؟ ہماری تنخواہ بڑھا دو؟ کبھی سنا؟ دینی تنظیم نے مطالبہ کیا ہو، کبھی قاریوں نے ہڑتال کردی ہو۔ ہم نہیں پڑھاتے، ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ، ہوتا ہے۔ نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کسی قاریوں کی جماعت نے، حافظوں کی جماعت نے، مولویوں کی جماعت نے، اماموں کی جماعت نے، خطیبوں کی جماعت نے، مدرسین کی جماعت نے کبھی سڑک پر اخبار میں، قرارداد جلسے میں۔ کہیں مطالبہ کیا ہو کہ ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ کبھی ہوا ہے؟ ارے یہ تو خوش بیٹھے ہیں، ان کو روٹی ملتی ہے یا نہیں، دین کی خدمت جاری رکھیں گے۔ معلوم ہوا کہ روٹی ملے یا نہ ملے نماز پڑھاتے ہیں۔ تمہیں کس بات کی تکلیف ہو رہی ہے۔ تمہارے ایم اے کدھر ہیں۔ تمہاری پی ایچ ڈی، تمہارے ایم اے، تمہارے بی اے۔ روزانہ اخبارات میں مراسلے پڑھو، قراردادیں پڑھو، بیانات پڑھو، خودکشی اور احتجاج کی خبریں پڑھو۔ مقابلہ میں ایک خبر تو دکھا دو۔ یہ بات نہیں، یہ بات درست ہے ان علماؤں کو بے چاروں کو روزگار کیا ملتا ہے۔ بے چارے نہ کریں۔ اللہ پاک نے قناعت عطا فرمائی ہے۔ مشن کے ساتھ محبت بھی ہے۔

ایک بات تو میں نے عرض کردی۔

دوسری بات

ہمارے بہت سارے دوست کہتے ہیں جناب قرآن کو ذریعہ روزگار نہیں بنانا چاہیے۔ نماز پڑھانے والے کو تنخواہ نہیں ملنی چاہیے۔ اور نماز عبادت ہے جی اور یہ قرآن تو عبادت ہے جی۔ یہ تو مفت پڑھانا چاہیے۔ یہ تنخواہ کیوں لیتے ہیں جی۔ یہ وظیفہ کیوں لیتے ہیں جی۔ یہ تو جائز نہیں ہے جی۔ یہ باتیں ہوتی ہیں یا نہیں ہوتیں۔

میرا سوال آپ سے

میں آپ سے پوچھتا ہوں قوم کو تعلیم دینا کسی بھی شعبے میں، عبادت ہے کہ نہیں ہے۔ کسی بھی شعبے میں۔ میں تعلیم کی تفصیل کا قائل نہیں ہوں۔ بات ایک ہی ہے۔ کسی بھی شعبہ میں بچوں کو تعلیم دینا عبادت ہے یا نہیں ہے۔ قوم کو پڑھانا لکھانا زمانے کی ضرورت کے مطابق بنانا یہ قوم کے ساتھ نیکی ہے یا نہیں؟ قوم کو تعلیم میں، ثقافت میں، فنون میں اور آج کی ضروریات میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ لانا یہ نیکی ہے یا نہیں ہے۔ قوم کے ساتھ بھلائی ہے یا نہیں۔ تو آپ کا کام ہے یا نہیں ہے۔ اس پر تنخواہ دینی چاہیے یا نہیں دینی چاہیے۔ کبھی کسی نے سوال کیا کہ یونیورسٹی میں پروفیسر حضرات جو پڑھاتے ہیں، یہ تو ہے قوم کی خدمت۔ اس پر معاوضہ کیوں ہے۔

لیکن میرا سوال یہ ہے کہ یہاں تعلیم جو ہے اس پر اجرت ہونی چاہیے۔ یہ تعلیم جو پڑھاتے ہیں یونیورسٹی میں، کالج میں، ٹیکنیکل کالج میں۔ تعلیم کی اجرت لیتے ہیں۔ پڑھانے کی اجرت لیتے ہیں۔ کوئی پڑھانے کی اجرت لے سکتا ہے، دے سکتا ہے۔ ایک استاذ ہے دوسرا شاگرد۔ کیا کوئی شاگرد اپنے استاذ کو پڑھانے کا معاوضہ دے سکتا ہے۔ کس بات کی اجرت ہے۔ معاوضہ کس بات کا ہے۔ وقت کا۔ ارے بھئی وقت مقرر ہوتا ہے دوسرا کام نہیں کر سکتے۔ روزگار چلتا نہیں۔ اس لیے ان کو بے روزگاری سے بچانے کے لیے ان کے وقت کا معاوضہ ہے۔ تعلیم کا معاوضہ نہیں ہے۔

اگلی بات

دو لڑے ہوئے مسلمانوں میں صلح کرانا یہ نیکی ہے یا نہیں۔ دو مسلمان بھائیوں کے درمیان صلح کرانا کیا ہے۔ اس پر معاوضہ لینا چاہیے۔ کیوں جی ایک جھگڑا نمٹانے کے لیے ایک آدمی دس گھنٹے خرچ کرتا ہے اس کا معاوضہ لینا چاہیے۔ یہ نیکی نہیں ہے۔ یہ عبادت نہیں ہے۔ وہ لوکل سطح پر، پنجاب کی سطح پر، یا سپریم کورٹ کی سطح پر ہو مسئلہ تو یہی ہے۔ عدالت کیوں لگتی ہے۔ لوگوں کا جھگڑا نمٹائے، انصاف مہیا کرے۔ انصاف کا معاوضہ ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی دے سکتا ہے، لوگوں کے جھگڑے طے کرنے کا کوئی معاوضہ ہوتا ہے۔ تو میرے بھائیو

اس معاوضے کو نہیں دیکھتے اور یہ نہیں کہتے کہ جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دن کو تو انصاف مہیا کیا کریں لوگوں کو، اور شام کو پکوڑے بیچا کریں۔ انصاف کے ذریعے روزگار حاصل نہ کریں۔ انصاف کی کمائی نہ کھائیں۔ لوگوں میں فیصلہ کی کمائی نہ کھائیں۔ کبھی کسی نے مطالبہ کیا ہے۔ اگر کوئی مطالبہ کرے گا تو کیا کہیں گے۔ اگر کوئی عقلمند یہ مطالبہ کردے آپ اس کو کیا کہیں گے۔ بھائی کہہ دو کیا کہیں گے۔ ارے بھائی ان کا وقت صرف ہوتا ہے تو کیا دین والوں کا وقت صرف نہیں ہوتا؟

امام صلوٰۃ سے سخت کسی کی ڈیوٹی نہیں

پانچ وقت کے امام سے زیادہ سخت ڈیوٹی کس کی ہے۔ ذرا کر کے دیکھو، پتا چلے۔ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھانا۔ میں کہتا ہوں کوئی بڑے سے بڑا عقلمند کر کے دکھائے اور وہ جو بے چارہ پڑھاتا ہے اور وہ مدرسین جو چار گھنٹے، چھ گھنٹے پڑھاتے ہیں اور پانچ چھ گھنٹے مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک قاری صاحب ہیں۔ بچے پڑھا رہے ہیں۔ پتا نہیں آپ کے یہاں کیا معمول ہے۔ اچھا ہی معمول ہوگا۔

سرگودھا قرآن پاک کی تعلیم کی وجہ سے مشہور ہے۔ قاری صاحب جو اچھے پڑھانے والے استاذ ہیں، سردی میں صبح سحری میں بچوں کو لے کر بیٹھتے ہیں۔ صبح اذان کے بعد تک بچوں کو لے کر بیٹھتے ہیں۔ نماز کے بعد تھوڑا وقفہ ہوا۔ پھر گیارہ بارہ بجے تک بچوں کو لے کر بیٹھتے ہیں اور ظہر سے عصر تک، پھر مغرب سے عشاء تک اور بعض قاری ایسے بھی ہیں جو یہاں پر پتا نہیں کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن کرتے ہیں عشا کے بعد بھی سردیوں کی راتوں میں ایک گھنٹہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اتنی سخت ڈیوٹی پر کم از کم بارہ گھنٹے ڈیوٹی بنتی ہے چوبیس گھنٹے میں۔ ہم تنخواہ کیا دیتے ہیں، اتنی تنخواہ۔ اس سے زیادہ تنخواہ اپنے دکان کے پہرہ دار کو دے دیتے ہیں۔

جو قاری صبح سے لے کر شام تک اپنا وقت صرف کرتا ہے ان کا وقت صرف نہیں ہوتا۔ وہاں تمہارے قانون یہ ہیں کیونکہ وقت صرف کرتے ہو۔ ان کو روزگار کے لیے متبادل وقت ان کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے ان کے اخراجات کی کفالت ریاست کے ذمے ہے۔ بالکل

ٹھیک ہے۔ لیکن یہ اصول انصاف کے حوالہ سے ہے۔ یہ اصول تعلیم کے حوالہ سے ہے۔ وہ اصول دین کے حوالے سے تم کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ میری بات ٹھیک ہے یا نہیں۔

آخری بات

تو میں نے دو سوالات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ ایک اس سوال کا کہ یہ کہتے ہیں آج کے مدرسے پرانی تہذیب کی بات کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں نہیں۔ ہم پرانی تہذیب کی بات نہیں کرر ہے۔ تم پرانی تہذیب میں جاہلیت کی تہذیب میں نسل انسانی کو لے گئے ہو۔ ہم اس سے اگلے مرحلے کی بات کرر ہے ہیں۔ ہم کہہ رہے ہیں جاہلیت سے نکل کر تہذیب کے دور میں آجاؤ اور ان شاء اللہ کھینچ تان کر تمہیں لائیں گے۔ دوسری بات یہ دینی مدارس الحمد للہ ثم الحمد للہ تمام تر مشکلات کے باوجود میں تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ لوگ دیکھتے ہیں، شک کرتے ہیں، الحمد للہ جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ لوگوں سے اچھا کھاتے ہیں، اچھا پیتے ہیں، اچھی عزت پاتے ہیں۔ یہ دین کی برکت ہے جو دین سے وابستہ ہوتا ہے کبھی بھوکا نہ مرا ہے نہ مرے گا۔ ان شاء اللہ ہمارے روزگار کی فکر تم نہ کرو۔ تم اپنی فکر کرو کہ تمہارا حال کیا ہوگا۔ اس دنیا میں اور آخرت میں بھی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

فلاح انسانیت
اور
مدارس دینیہ
(۳)

بعد الحمد والصلوٰۃ:

حضرت علماء کرام، محترم بزرگو، دوستو، بھائیو، ساتھیو اور اگر سن رہی ہیں تو محترمہ ماؤ، بہنو اور بیٹیو! آج مدرسہ اسلامیہ محمودیہ کے سالانہ تعلیمی افتتاح کے موقع پر آپ حضرات کی خدمت میں ایک بار پھر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ میں اصل میں اس لیے حاضر ہوا تھا اور حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب سے میں نے گزارش کر دی تھی کہ اس دفعہ تو میں سننے کے لیے آرہا ہوں اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم سے ملاقات بلکہ گوجرانوالہ کے ایک پروگرام کے لیے ان کو وصول کرنے کے لیے آرہا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا نظام ہے آج ان کا پروگرام آپ کے ہاں تھا اور آنے والے کل کے لیے ہمارے ہاں طے تھا۔ اللہ پاک کے ہر فیصلہ میں حکمتیں ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی خیر ہوگی، بہتری ہوگی، انشاء اللہ۔

اللہ پاک حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی خوشدامن محترمہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ یہاں آکر پتا چلا کہ حضرت مولانا اپنی خوشدامن محترمہ کے انتقال کی خبر پر واپس تشریف لے گئے ہیں۔ یہ ان کا حق تھا، شرعی عذر تھا۔

یہاں حاضری پر حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا کہ اب آپ کو تفصیل سے

گفتگو کرنا ہوگی۔ حالانکہ میں اس ارادہ سے آیا نہیں تھا۔ خیال تھا کہ حاضری دوں گا لیکن آپ حضرات کی دعائیں شامل حال رہیں تو کچھ گزارشات تھوڑے سے وقت میں آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں گا۔ دعا فرمائیں اللہ پاک کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں اور دین حق کی جو باتیں علم میں آئے، سمجھ میں آئے اللہ پاک عمل کی توفیق سے نوازیں۔

آج کی گفتگو بھی مدرسہ کے حوالہ سے ہی ہوگی۔ آپ سے تقریباً ایک سال سے یہ گفتگو چل رہی ہے اور اسی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے میں دو تین باتیں آپ حضرات کے سامنے عرض کرنا چاہوں گا۔

دینی درسگاہ اور مغرب کی دانش گاہ کا تقابل

آج یہ دینی درسگاہ اور مغرب کی دانش گاہیں آمنے سامنے ہیں۔ ذرا یہ منظر سامنے رکھ لیجیے۔ آج دنیا میں فکر کی لڑائی ہے، فلسفہ کی لڑائی ہے، نظام کی لڑائی ہے، کلچر کی لڑائی ہے، تہذیب کی لڑائی ہے، تمدن کی لڑائی ہے اور آنے والے انسانی دور کی قیادت سنبھالنے کی لڑائی ہے کہ آنے والے دور میں انسانی سوسائٹی کی قیادت کس نے کرنی ہے۔ ایک طرف ایٹم بم والے ہیں، ڈیزی کٹر والے ہیں، میڈیا والے ہیں، انٹرنیٹ والے ہیں، سیٹلائٹس والے ہیں اور جبکہ دوسری طرف یہ چٹائیاں ہیں، بوریاں ہیں، مسجدیں ہیں، عمارتیں ہیں اور یہ بے سروسامانی ہے۔ یہ بے سروسامان درویشوں کی جماعت ہے اور دونوں آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آنے والے دور میں انسان کی سوسائٹی کی قیادت ہم نے کرنی ہے اور یہ مدرسہ کہتا ہے کہ نہیں یہ قیادت میں نے کرنی ہے۔ یہ مدرسہ دعوے دار ہے کہ آنے والے دور میں انسانی سوسائٹی کی قیادت میں نے کرنی ہے اور ان شاء اللہ العزیز اسی نے کرنی ہے۔ مستقبل کی بات کرنے سے پہلے میں ماضی کے حوالہ سے کچھ کہنا چاہوں گا۔

مغرب ہماری درسگاہ کا چور ہے

آج جس بات پر مغرب کی دانش گاہ، مغرب کا فلسفی، مغرب کا میڈیا کار، دنیا کے سامنے استحقاق جتاتا ہے کہ ہم نے انسانی سوسائٹی کو یہ یہ چیزیں دی ہیں اس لیے ہم انسانی

سوسائٹی کی قیادت کے حق دار ہیں۔ میں ان میں سے دو چار باتیں کہنا چاہوں گا۔ اس دعویٰ کے ساتھ کہ مغرب جس پیش رفت، ترقی، پیش قدمی اور جدیدیت کے نام سے جن دو چار قابل فخر باتوں کا ذکر کرتا ہے، مغرب نے وہ باتیں اسی درسگاہ سے چرائی ہیں۔ وہ ہماری چوری کی ہوئی چیزیں ہیں۔ جن پر آج مغرب اتراتا پھرتا ہے اور یہ میں صرف دعویٰ ہی نہیں کرتا۔ بلکہ آپ جانتے ہیں جو بات کرتا ہوں دلیل کی بنیاد پر کرتا ہوں۔ دلیل کے ساتھ کرتا ہوں۔ آیئے! تاریخ کے میزان پر ذرا دو تین باتوں کو پرکھیے۔

مغرب کا جھوٹا دعویٰ نمبر ۱

آج مغرب کا دعویٰ ہے، مغرب کہتا ہے کہ ہم نے دنیا کو ڈیما کریسی دی ہے۔ ہم نے دنیا کو رائے کی آزادی کا حق دیا ہے۔ ووٹ کا حق دیا ہے۔ ہم نے انسان کو یہ شعور بخشا کہ سوسائٹی میں وہ رہتا ہے تو اس کے کچھ حقوق بھی ہیں۔ آج مغرب جمہوریت کا چیمپئن اور ڈیما کریسی کا دعویدار ہے۔ انسان کی آزادی رائے کا ٹھیکیدار ہے اور آج مغرب یہ کہتا ہے کہ انسان کو آزادئ رائے کا شعور ہم نے بخشا ہے۔ ہم نے انسان کو بتایا ہے کہ حق کسے کہتے ہیں۔ حق مانگنا کسے کہتے ہیں۔ حق حاصل کرنا کسے کہتے ہیں اور اپنے حق کی حفاظت کسے کہتے ہیں۔ مغرب اپنے سارے فلسفے میں فخر کی بنیاد اس پر رکھتا ہے کہ ہم نے رائے کی آزادی دی۔ حق کا شعور بخشا۔ حق مانگنے کا حوصلہ دیا اور انسان کو بتایا کہ سوسائٹی میں اس کے حقوق ہیں۔ اس کو حقوق مانگنے چاہئیں، حاصل کرنے چاہئیں۔ اس کو حقوق کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ آج مغرب اس دعوے پر پوری دنیا میں فخر کا جھنڈا سر بلند کیے ہوئے ہے۔

دنیائے انسانیت کو سب سے پہلے حق کا شعور اسلام نے دیا

میرے پڑھے لکھے دوست بیٹھے ہیں۔ میں مغرب سے پوچھتا ہوں یہ حقوق آپ نے کب سے دیے ہیں۔ کتنے سال ہو گئے۔ کیوں جی؟ مغرب اپنے حقوق کی تاریخ کو کتنا پیچھے کھینچ کر لے جائے۔ یہاں تک جائے گا؟ انقلاب فرانس تک، بس اڑھائی سو سال پیچھے، تین سو سال پیچھے۔ میں کہتا ہوں او میں تم کو بتاتا ہوں اس سوسائٹی میں انسان کو حق کا شعور کس نے

بخشا اور انسان کے حق کا احترام کس نے کیا اور کب کیا؟

سیدہ عائشہؓ کی آزاد کردہ باندی کا قصہ

ڈھیلی ڈھالی بات نہیں کرتا۔ بخاری شریف کی روایت ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہؓ بڑے عمدہ انداز سے قصہ بیان کرتی ہیں۔ سنیں گے قصہ؟ قصہ بیان کرتی ہیں۔ کس کا؟ اپنی آزاد کردہ لونڈی کا، لونڈی تھی، ملکیت تھی، خریدی، پیسے دیے، خرید کے آزاد کی، حضرت عائشہؓ اس کا قصہ بیان کرتی ہیں۔ بریرہؓ نام ہے۔ حضرت عائشہؓ کے گھر میں رہتی ہیں۔ خادمہ کے طور پر رہتی ہیں، بک چکی ہیں، اس کی قیمت ادا کی گئی ہے۔ قیمت ادا کرنے کے بعد اس کو آزاد کر دیا گیا ہے۔ آزاد کردہ لونڈی کہا جاتا ہے اور خادمہ کی حیثیت رکھتی ہیں گھر میں۔ بخاری شریف میں روایت ہے، قصہ ہے کہ بریرہؓ جب آزاد ہوتی ہے، آزاد ہونے سے پہلے لونڈی ہونے کی حالت میں یہ نکاح میں تھیں ایک نوجوان کے۔ جس کا نام مغیث بتاتے ہیں۔ رضی اللہ عنہ۔ بریرہؓ بھی صحابیہ ہیں اور مغیث بھی صحابی ہیں۔ میاں بیوی ہیں۔ بریرہؓ لونڈی تھی۔ مغیث کی بیوی تھی۔ بریرہؓ آزاد ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ نے اس کو آزاد کر دیا، تو بریرہؓ کو مسئلہ کا پتا چلا کہ جب لونڈی آزاد ہو جائے، پہلے اس کا نکاح ہو تو آزاد ہونے کے بعد لونڈی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے پاس رہنا چاہتی ہے تو اس کی مرضی۔ نہیں رہنا چاہتی تو اس کی مرضی۔ اس کو ''خیارِ عتق'' کہتے ہیں کہ اس کی مرضی ہے پہلے خاوند کے نکاح میں رہنا چاہے تو رہے۔ نہ رہنا چاہے تو نہ رہے۔ بریرہؓ کو مسئلہ معلوم تھا۔ حضرت عائشہؓ کے گھر میں رہتی تھی۔ مسئلہ کیسے معلوم نہ ہوتا۔ آزاد ہوئی تو مغیثؓ کو اس نے پیغام بھیجا کہ جناب مہربانی فرمائیں اب آپ تشریف نہ لائیں۔ میں نے اپنا معاملہ الگ کر لیا ہے۔ مجھے یہ اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ آزاد ہونے کے بعد آپ کے نکاح میں رہوں یا نہ رہوں۔ میں نے آپ کے نکاح سے فارغ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب آپ جانیں، آپ کا کام جانے، میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں مغیث رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے۔ اچھا خاصا ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا۔ کئی سال سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ میاں بیوی تھے۔ بیوی جواب دے گئی کہ میں نہیں رہتی تیرے گھر میں۔ مغیثؓ پریشان ہو گئے۔ مغیثؓ کو بیوی سے محبت تھی۔ بخاری کی روایت

میں ہے کہ مغیثؓ پریشانی کی حالت میں کبھی اس کے پاس جاتا ہے کہ اللہ کے بندو میری سفارش کرو، کبھی اس سے کہتا ہے یار اس کو مناؤ، خدا کی بندی کیا کر گئی ہے۔ میرا اچھا خاصا ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا۔ کوئی منت کرو، کوئی زاری کرو، کوئی اس سے بات کرو، کوئی میری سفارش کرے۔ لوگ آتے ہیں اس سے بات کرتے ہیں۔ کہتی ہے نہیں نہیں۔ جناب میرا حق ہے۔
امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ مغیثؓ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے اور آنسو بہاتے رہتے تھے اور گلیوں میں آوازیں دیتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا دے۔ فی سکك المدینة مدینہ کی گلیوں میں مغیثؓ روتے پھرتے تھے۔ جب یہ کیفیت دیکھی جناب نبی کریم ﷺ نے اللہ اکبر تو حضرت عائشہؓ سے بات کی۔ دیکھ رہی ہو عائشہؓ؟ مغیثؓ کی حالت۔ مغیثؓ کی محبت دیکھو اور بریرہؓ کی نفرت۔ وہ اس کی خاطر آنسو بہاتا پھرتا ہے جبکہ بریرہؓ اس کا نام سننے کو تیار نہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ نے خود سفارش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کس سے؟ گھر کی خادمہ سے۔ آزاد کردہ لونڈی سے۔ آزاد کردہ لونڈی بھی بیوی کی ہے۔ تو آپ ﷺ نے بریرہؓ کو بلایا۔ فرمایا: بریرہؓ! کیا قصہ ہے؟۔ بریرہؓ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق میں نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ فرمایا: اللہ کی بندی! مغیثؓ کا حال بہت برا ہے۔ وہ بے چارہ گلیوں میں پھرتا ہے، روتا ہے، اس کی حالت پتلی ہوگئی ہے۔ تم اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر سکتی ہو؟

ذرا غور فرمائیے! سفارش کر رہے ہیں.......... اور کون کر رہے ہیں۔ آقائے دو جہان سرورِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور گھر کی خادمہ کے سامنے، آزاد کردہ لونڈی کے سامنے۔ فرماتے ہیں: بریرہؓ کیا مغیثؓ کے معاملے میں کچھ نظر ثانی کر سکتی ہو۔ کوئی گنجائش ہے؟۔ بریرہؓ نے سوال کر دیا الٹا۔ بریرہؓ بریرہ تھی۔ گھر میں رہتی تھی۔ یارسول اللہ ﷺ! حکم دے رہے ہیں یا سفارش کر رہے ہیں؟۔ اتنی بات پوچھی۔ سمجھتی تھیں کہ حکم کا مطلب کیا ہوتا ہے اور سفارش کا کیا ہوتا ہے۔ میرے آقا! آپ ﷺ کا یہ ارشاد جو ہے، یہ حکم ہے یا سفارش؟ حکم ہے تو اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے سامنے کس کی مجال ہے کہ سر اٹھائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حکم نہیں، سفارش ہے۔ یہ لفظ سنا، فوراً بے ساختہ بولی! لَا حَاجَةَ لِیْ بِهٖ یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لَا حَاجَةَ لِیْ بِهٖ حکم ہوتا تو سر تسلیم

ختم تھا۔ سفارش ہے، اختیار پھر بھی میرے ہاتھ میں ہے، تو پھر مجھے مغیثؓ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں مغیثؓ کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوں۔ کیا خیال ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کو گھر سے نکال دیا ہوگا؟ گفتگو بند کر دی ہوگی۔ کوئی آج کا بڑا اپنے گھر کی خادمہ سے سفارش کر کے سفارش مسترد ہونے پر اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر پوچھے۔ اس کے بعد بریرہؓ حضور کے گھر میں رہی۔ تو جناب نبی کریم ﷺ نے دنیا کو بتایا کہ حق کسے کہتے ہیں۔ حق کا شعور کسے کہتے ہیں۔ حق کی حفاظت کسے کہتے ہیں اور کب بتایا۔ جب سے یورپ حقوق کی بات کا آغاز کرتا ہے۔ اس سے گیارہ سو سال پہلے جب سے مغرب اپنے ہاں حق کے شعور کا آغاز کرتا ہے۔ اس سے گیارہ سو سال پہلے جب یورپ میں شاید عورت کو انسان بھی سمجھا جاتا تھا کہ نہیں؟۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ یورپ والو! تاریخ دیکھو۔ تاریخ کا ریکارڈ دیکھو جن باتوں کے تم دعویدار ہو۔ یہ تمہاری نہیں ہیں۔ یہ تم نے چرائی ہیں اور اپنا لیبل لگا کر دو نمبر کا مال دنیا میں بیچ رہے ہو۔ یہ کسی اور فرم کا مال ہے۔ یہ کسی اور کمپنی کا پروڈیکشن ہے اور تم نے اپنا لیبل لگا لیا ہے اور دنیا کے سامنے بیچتے پھرتے ہو۔

مغرب کا جھوٹا دعویٰ نمبر ۲

آج مغرب کا دعویٰ ہے بڑا خوبصورت دعویٰ لے کر آئے ہیں جسے دنیا گلوبلائزیشن عالمگیریت انٹرنیشنل ازم اور بین الاقوامیت کہتی ہیں کہ ہم قومیتوں اور قوموں کی سطح سے بالاتر ہو کر انٹرنیشنل ازم کی بات کرتے ہیں۔ ہم ملکوں کے جغرافیہ سے بالاتر ہو کر عالمیت کی بات کرتے ہیں۔ بین الاقوامیت کی بات کرتے ہیں۔ ہم انسانیت کو بین الاقوامیت سکھلا رہے ہیں کب۔ اکیسویں صدی میں...... نہیں غلط بات ہے۔ آؤ تاریخ کے میزان پر آؤ۔ تاریخ کی میز پر بیٹھو، عالمگیریت کی بات دنیا میں سب سے پہلے کس نے کی ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ صفاء...... پہاڑی پر کھڑے ہیں۔ سفید چادر ہلائی ہے۔ مکے والوں کو بلایا ہے، مکے والے پہاڑی کے گرد اکٹھے ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ اپنے مشن کی اپنی دعوت کی اپنے پروگرام کی بات کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ نقطہ آغاز ہے۔ کیا خیال ہے جناب نبی کریم ﷺ نے کیا خطاب فرمایا کہ یا اہل مکہ! اے مکے والو! اے قریشیو! اے عرب والو! سامنے تو مکے والے

تھے، سامنے تو عرب تھے، سامنے تو قریشی تھے۔ لیکن خطاب کس کو کیا۔ یَآَیُّھَا النَّاس! تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ دعویٰ ہے کہ پوری انسانیت کی تاریخ میں یہ سب سے پہلا نعرہ تھا، جو مکہ کی وادیوں میں گونجا تھا اور قومیتوں، نسل، زبان، علاقہ اور جغرافیہ کی تمام حدوں کو عبور کرتے ہوئے جس نے نسل انسانی کو مخاطب کیا۔ یَآَیُّھَا النَّاس! انٹرنیشنل ازم کا پہلا اعلان تھا۔ پہلا نعرہ تھا۔ عالمیت کا پہلا اعلان تھا اور خالی نعرہ نہیں تھا۔ خالی ماٹو نہیں تھا۔ اس کے ٹھیک اکیس سال بعد چند میل کے فاصلہ پر منیٰ کے میدان میں انٹرنیشنل اجتماع کرکے بین الاقوامی اجتماع کرکے بین الاقوامیت کا عملی منشور بھی حضور ﷺ نے پیش فرمایا۔ یہ منیٰ کا میدان ہے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار افراد جمع ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ منشور کا اعلان کر رہے ہیں۔ کس کا؟ بین الاقوامیت کا۔ لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ۔ اے عربیو! تمہیں عجمیوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اے گورو! سرخو! تم کو کالوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔ آج کے بعد فضیلت برتری فخر بالاتری کے سارے مصنوعی معیار میں نے توڑ دیے ہیں۔ نہ نسل کی بنیاد پر برتری ہوگی، نہ رنگ کی بنیاد پر برتری ہوگی۔ نہ زبان کی بنیاد پر برتری ہوگی۔ نہ علاقہ کی بنیاد پر برتری ہوگی۔ نہ براعظم کی بنیاد پر برتری ہوگی۔ آج کے بعد اگر کسی کو برتری کی بات کرنی ہے تو وہ تقویٰ سے ہوگی، کردار سے ہوگی، کریکٹر سے ہوگی، پھر میں مغرب سے پوچھتا ہوں کہ لوگوں کو اتنا اندھا اور اتنا بے وقوف سمجھنے کی تمہیں کب سے ضرورت پیش آگئی ہے؟۔ دنیا نے یہ منظر نہیں دیکھا کہ خلافت راشدہؓ کا دائرہ صرف عربوں میں تھا، یا کوئی عجمی بھی شریک تھے؟ بنو عباس کی، بنوامیہ کی خلافت صرف عربوں میں تھی کہ یورپ تک بھی پہنچی؟ بنو عباس کی خلافت صرف عربوں میں تھی یا ایشیا کے اس علاقے تک بھی پہنچی؟ جاؤ ساری باتیں میں چھوڑتا ہوں۔ مغرب والو! ابھی پون صدی پہلے تم نے خلافت عثمانیہ کا تیاپانچا کیا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں قسطنطنیہ کی خلافت عثمانیہ۔ میں پوچھتا ہوں جس دن تم نے وہ خلافت توڑی تھی اس دن اس میں یورپ، ایشیا اور افریقہ تینوں شامل تھے یا نہیں تھے؟ جس دن تم نے توڑی تھی، لولی لنگڑی یورپ کا مرد بیمار ارد گرد سے کانٹ چھانٹ کرکے آخری مرحلہ میں جب توڑا تھا، میں اس دن کی بات پوچھ لیتا ہوں، جس تاریخ کو تم نے خلافت عثمانیہ کو توڑ کر خلیفہ کو جلاوطن کر دیا تھا اور خلافت کا خاتمہ کروایا اتاترک مصطفیٰ

کمال پاشا سے۔ اس تاریخ کو خلافت کے فاتح کے اعلان سے پہلے اس خلافت میں یورپ تھا یا نہیں تھا۔ افریقہ تھا یا نہیں تھا۔ ایشیا تھا یا نہیں تھا۔ آدھے سے زیادہ عرب تھا یا نہیں تھا۔ تم کس گلوبلائزیشن کی بات کرتے ہو۔ تم کس عالمگیریت کی بات کرتے ہو۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ کل بھی یہ عالمگیریت اسلام کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور اب بھی دوبارہ قائم ہوتو آسمانی تعلیمات ہی کی بنیاد پر قائم ہوگی۔ یہ نعرہ بھی تم نے ہم سے چرایا ہے۔

مغرب کا جھوٹا دعویٰ نمبر ۳

آج مغرب کا دعویٰ ہے۔ مغرب کہتا ہے کہ ہم نے دنیا کو عورت کے حقوق سے روشناس کرایا۔ عورت کو آزادی دی، عورت کو حق کا شعور دیا، عورت کو رائے کا حق دیا، تعلیم کا حق دیا، آج مغرب چیختا چلاتا چنگھاڑتا ہے کہ اسلام عورت کی تعلیم کا مخالف تھا۔ اسلام عورت کی رائے کا مخالف تھا۔ ہم نے عورت کو تعلیم کا حق دیا۔ ہم نے عورت کو آزادی رائے کا حق دیا۔ ہم نے عورت کو مرد کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں شریک کیا۔ آج دعویٰ ہے مغرب کا عورت کی آزادی کا۔ اور عورت کی آزادی کے نام پر مغرب دنیا میں جو دھاچوکڑی مچائے ہوئے ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ آیئے میں بتاتا ہوں عورت کو تعلیم کا حق کس نے دیا ہے؟ عورت کو آزادی رائے کا حق کس نے دیا ہے؟ آیئے ذرا تیرہ سو سال پیچھے چلتے ہیں۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حافظ ابن کثیر ؒ تفسیر ابن کثیر میں واقعہ نقل کرتے ہیں: امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور کا واقعہ ہے۔ میں اپنی ماؤں بہنوں کے لیے بطور خاص عرض کروں گا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ ہے۔ عمر بن الخطابؓ منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہیں۔ امیر المؤمنین ہیں، خلیفہ راشد ہیں، حاکم وقت ہیں، اس وقت کی آباد دنیا کے نصف حصے کے حکمران ہیں۔ حاکم بھی کوئی ڈھیلا ڈھالا نہیں ہے۔ کوڑے والا حاکم ہے۔ ہمارے محترم بھائی اسفندیار خان ولی ہیں۔ انہوں نے یہ کہا کہ متحدہ مجلس عمل کی حکومت اگر صوبہ سرحد میں حضرت عمرؓ والا نظام

لائے تو میں ساتھ دوں گا۔ میرے دس ارکان ساتھ دیں گے۔ میں نے سوال کیا میرے بھائی حضرت عمرؓ آئیں گے تو ان کے ہاتھ میں کوڑا ہوگا کہ نہیں؟ کوڑا کسی کی پشت پر برسے گا کہ نہیں؟ پھر یہ شور کون مچائے گا کہ ڈنڈے کے زور پر اسلام پھیلا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ میری تقریر سے پہلے ایک حافظ صاحب نے نظم پڑھی۔ حافظ محمد خان۔ وہ نابینا ہیں۔ وہ نظم اچھی پڑھتے ہیں۔ ان کی نظم کے الفاظ تو یاد نہیں۔ لیکن مفہوم یہی تھا کہ یا اللہ! حضرت عمرؓ کو پھر بھیج دے یا ایک حضرت عمرؓ اور دے دے۔

یہ ایک تمنا ہے، آرزو ہے۔ میں کھڑا ہوا۔ میں نے کہا: حافظ جی! میں نے یوں ہاتھ جوڑے۔ دیکھ تو نہیں رہے تھے لیکن میں نے کہا: حافظ جی! میرے ہاتھوں کی طرف دیکھو، کوئی نیچے نیچے ہاتھ مارو، اتنا اونچا مت جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لیے تصور کر لو۔ ذرا تھوڑا سا میں اپنے گریبان میں جھانک لوں۔ آپ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں۔ اول تو یہ اللہ کے قانون کے خلاف ہے لیکن میں بالفرض بات کر رہا ہوں۔ اگر حضرت عمرؓ کو ہمارے درمیان دس منٹ کے لیے اللہ بھیج دیں تو ہم میں سے کسی کو وہ مسلمان بھی سمجھیں گے؟ میں نے کہا حافظ جی! پہلے میری پشت پر کوڑے پڑیں گے۔ پھر تیری پر پڑیں گے پھر کسی اور کی باری آئے گی۔ نیچے نیچے رہو۔ کسی صلاح الدین ایوبی، شمس الدین التمش کی بات کرو۔ کسی محمود غزنوی کی بات کرو، عالمگیر کی بات کرو۔ اب اتنے اونچے جانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ تو خیر حکمران بھی حضرت عمرؓ ہیں۔ منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے ہیں۔ خطبہ میں ایک اعلان فرمایا۔ حافظ ابن کثیر نقل کرتے ہیں حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ شادی بیاہ میں لوگوں نے مہر کی بڑی بڑی رقمیں مقرر کرنی شروع کر دی ہیں۔ شادی کا جوش و خروش ہوتا ہے۔ خوشی ہوتی ہے۔ آپس میں بڑی محبت و پیار ہوتا ہے۔ اس وقت جوش و خروش سے بڑی رقم مہر کی باندھ لی جاتی ہے بعد میں جب ادا کرنے کی باری آتی ہے تو ادھر ادھر دیکھتے ہیں کہ یار یہ تو پیسے دینے ہی پڑیں گے۔ آج کل بھی یہ ہوتا ہے۔ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟ میرے پاس تو مسئلے آتے ہیں لوگ آکر پوچھتے ہیں۔ شادی میں جوش و خروش میں لکھو۔ جی دس لاکھ لکھو۔ جی، مہر کتنا؟ جی دس لاکھ، پندرہ لاکھ جی۔ بیس لاکھ جی۔ ناک کا مسئلہ ہے۔ بعد میں دو تین مہینے گزرتے ہیں تو کوئی آتے ہیں مسئلہ پوچھنے کہ مولوی صاحب وہ شادی میں دس لاکھ روپے مہر مقرر کر لیا تھا۔ سارا ہی دینا ہے؟۔ ارے

بھائی سارا ہی دینا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے مہر مقرر کر لیا۔ میاں بیوی کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد آباد ہو گئے۔ تو اب وہ رقم خاوند کے ذمے قرضہ ہے۔ جیسے کسی سے دستی لیا ہوا قرضہ ہے ویسے ہی بیوی کا حق مہر بھی قرضہ ہے اور فقہاء لکھتے ہیں کہ خاوند کے مرنے کے بعد اگر اس نے زندگی میں مہر ادا نہیں کیا تو مہر کا شمار وراثت میں نہیں ہوگا۔ کس میں ہوگا؟ قرضے میں ہوگا۔ وراثت کا حق الگ ہوگا۔

ایک نوجوان کا واقعہ

دو سال پہلے کی بات ہے ایک نوجوان برطانیہ سے یہاں آیا۔ اس کی اپنی فیملی تھی۔ فیملی میں نکاح کیا اور اس وقت جوش و خروش سے مہر مقرر کر لیا۔ پچاس ہزار پونڈ۔ آپ پچاس ہزار پونڈ کا مطلب سمجھتے ہیں۔ آج کل پینتالیس لاکھ روپے۔ اس وقت اکتالیس لاکھ روپے تھا۔ دو تین مہینے گزرے نباہ نہیں ہوا۔ مزاج ملنا ضروری تو نہیں ہے۔ بیوی نے کہا ٹھیک ہے جی آپ کی مرضی ہے نہیں رکھنا چاہتے آپ کی مرضی۔ میرے پیسے دیں مجھے فارغ کریں۔ اب اس نے مسئلہ پوچھنا شروع کر دیا کہ کیا اکتالیس لاکھ روپے سارا ہی دینا ہے؟ اب اکتالیس لاکھ روپے دینا مسئلہ ہے۔ کہنا آسان ہے۔ وہ کورٹ میں مسئلہ گیا۔ ہائی کورٹ کے پنڈی بنچ نے فیصلے کے ذریعے وہ حق مہر دلوایا۔ ٹھیک کیا اس نے۔ عورت اس معاملے میں بہت مظلوم ہے۔ بے چاری۔ حق مہر تو اس کو ملتا ہی نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ

پشاور کی خاتون کا واقعہ

ابھی سال ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ پشاور سے ایک خاتون کا فون آیا۔ پوچھتی ہیں فون کر کے کہ مولوی صاحب میرے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں اور میری بھائیوں کے ساتھ جائیداد ہے۔ میں پروفیسر ہوں۔ اسلامیات کی لیکچرار ہوں کالج میں اور میرا حق بنتا ہے آٹھ دکانیں میری بنتی ہیں جائیداد میں سے اور بھائی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہم دے دیتے ہیں لیکن اس کے بعد ہمارا تمہارا تعلق نہیں رہے گا۔ اب مجھے بتائیے میں بھائیوں سے تعلق رکھوں یا دکانیں لوں۔ کیا کروں؟ مولوی صاحب میں کیا کروں؟ ایک طرف آٹھ دکانیں ہیں۔ بازار

میں، میرا حق بنتا ہے، جائز حق۔ باپ کی وراثت میں مجھے حصہ ملتا ہے۔ بھائی دینے کو تیار ہیں لیکن اس دھمکی کے ساتھ کہ اس کے بعد ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

تعیینِ مہر پر فاروقِ اعظمؓ کا آرڈر

تو خیر حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ لوگ مہر میں بڑی رقم مقرر کر لیتے ہیں۔ پھر بعد میں ادائیگی کے وقت جھگڑا پڑتا ہے۔ اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ چار سو درہم سے زیادہ کسی نکاح میں آج کے بعد مہر مقرر نہ کیا جائے۔ یہ اعلان کس نے کیا۔ امیر المومنین نے، خلیفۂ راشد نے، خلیفۂ راشد کا حکم ویسے ہی نافذ ہوتا ہے امیر المؤمنین بھی کون؟ حضرت عمرؓ انہوں نے اعلان فرمایا درہم چاندی کا سکہ ہے ہماری موجودہ کرنسی کے حساب سے میں نے حساب لگایا تو تقریباً دس ہزار روپیہ بنتے ہیں۔ دس ہزار روپے سے زیادہ کسی شادی میں مہر مقرر نہ کیا جائے۔ یہ آرڈیننس جاری کر دیا۔ کس نے؟ حضرت عمرؓ نے بحیثیت امیر المؤمنین کے بحیثیت چیف ایگزیکٹو کے بحیثیت خلیفہ راشد کے اعلان ہو گیا۔ آرڈیننس جاری ہو گیا۔

خلیفہ وقت کے سامنے قریشی خاتون کی جرأت اور اس کا علمی مقام

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: حضرت عمرؓ باہر تشریف لائے۔ مسجد کے دروازے پر ایک خاتون نے روک لیا۔ خاتون نے کہا: حضرت آپ نے اعلان کیا ہے کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے کسی شادی میں۔ فرمایا: ہاں میں نے اعلان کیا ہے۔ حضرت آپ کو یہ حق کس نے دیا؟ یہ کون پوچھ رہا ہے؟ قریشی خاتون کے نام سے ابن کثیر کی روایت میں یہ واقعہ درج ہے۔ اس نے کہا آپ نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ اَللّٰہُ اَکْبَرُ عورت قرآن یاد دلا رہی ہے۔ کس کو؟ حضرت عمرؓ کو آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ فرمایا اللہ کی بندی قرآن میں یہ مسئلہ کدھر ہے؟ اس نے کہا قرآن پاک میں یہ مسئلہ ہے۔ بھئی کہاں ہے؟ اس نے کہا امیر المؤمنین اللہ ربّ العزت نے قرآن کریم میں یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ جہاں عورتوں کو خاوندوں کی طرف سے مہر یا نفقہ یا ہدیہ یا پیسے جو کچھ ملتا ہے۔ اس جملہ میں قرآن کریم نے فرمایا: وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا۔ (النساء ۴: ۲۰) اے خاوندو! اگر تم نے عورتوں کو ''قنطارًا''

برابر دولت بھی دے دی ہے جو دے دی ہے تو دے دی ہے اب صبح، دے کر شام کو واپس مانگنا شروع نہ کر دو صبح کو خوش کر دو شام کو مجھے ضرورت ہے واپس کر دو۔ یہ نہیں وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْــًٔا۔ (النساء ۴:۲۰) ان کو جو دے دیا دے دیا، وہ ان کا ہو گیا۔ اب ان سے واپس مت مانگو اور اگر قنطار برابر بھی دے دیا ہے تو...... ''قنطار'' کسے کہتے ہیں۔ ڈھیر کو جو چیز گنی نہ جا سکے۔ ڈھیر کر کے جس کا اندازہ کیا جائے۔ ''قنطار'' ڈھیر کو کہتے ہیں اگر ڈھیروں دولت بھی تم نے اپنی بیویوں کو دے دی تو پھر دے دی۔

میری بہنیں یہ بات پکی کر کے دل میں باندھ لیں۔ قرآن کہتا ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا۔ لیکن یہ مسئلہ سن لیں یہ وہ پیسے ہیں جو ذاتی طور پر دیے گئے جو خرچہ کے طور پر وہ اس میں شامل نہیں ہے۔ گھر کا خرچہ الگ ہے۔ یہ ذاتی، ہدیہ اور تحفہ ہے نفقہ اس میں شامل نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہ گھر کا خرچہ دیا ہے اور شام کو تم کہو کہ وہ میرے ہو گئے۔ تم اور لاؤ۔ ادھر بھی اجازت نہیں ہے۔ تو اس نے کہا حضرت قرآن پاک کہتا ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْــًٔا۔ اگر قنطار'' (ڈھیر برابر) دولت بھی دے دی ہے تو واپس مت مانگو۔ حضرت قرآن تو ہمیں ڈھیروں دلواتا ہے اور آپ کہتے ہیں چار سو درہم سے زیادہ نہ دیا جائے۔ کیا خیال ہے حضرت عمرؓ نے کیا کوڑا اٹھایا ہوگا؟ کوڑا تو ہاتھ میں ہوتا ہی تھا۔

حاکمِ وقت کا اپنے غلط فیصلہ سے رجوع کرنا

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: الٹے پاؤں مسجد میں واپس گئے۔ منبر پر کھڑے ہوئے۔ لوگوں کو بلایا۔ اعلان فرمایا۔ فرمایا: دیکھو بھائی میں نے اعلان کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مہر کی رقم چار سو درہم سے زیادہ مقرر نہ کی جائے۔ یہ میرا اعلان تھا۔ میرا آرڈیننس تھا۔ مجھے ابھی جاتے ہوئے ایک قریشی خاتون نے راستے میں روکا ہے اور ٹوک دیا ہے۔ اس نے مجھے قرآن پاک کی آیت کا حوالہ دیا ہے۔ واللہ بخدا میرا اس آیت کی طرف دھیان نہیں تھا۔ اس نے یاد دلائی ہے۔ تو میرا دھیان ہوا ہے۔ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ میرا اعلان غلط تھا۔ میں اپنا اعلان واپس لیتا ہوں۔ اسلام نے عورت کو رائے کا یہ حق دیا ہے کہ وہ راستے میں امیر المؤمنین کو روک کر ان کو فیصلہ بدلنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ لیکن دلیل کے ساتھ ویسے نہیں۔

دلیل اگر اس کے پاس ہے۔ اس کے پاس قرآن کی حجت ہے تو امیر المؤمنین کو، حضرت عمرؓ کو راستہ میں روک کر ان کا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ آرڈیننس واپس لینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اسلام عورت کو یہ حق دیتا ہے اور اگلی بات کہتا ہے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے لیے بطور تحفہ کے بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہنستے ہنستے فرمایا: اب تو مدینہ کی عورتیں عمرؓ سے بھی زیادہ قرآن جاننے لگی ہیں۔ بات ہنستے ہنستے کہی۔ دل لگی کے انداز میں کہی لیکن بات کہہ گئے کہ اب تو مدینہ کی عورتیں عمرؓ سے بھی زیادہ قرآن جاننے لگی ہیں۔ اسلام نے عورت کو علم کا یہ مقام بخشا ہے۔ اسلام نے عورت کو رائے کا یہ مقام بخشا ہے۔ اسلام نے عورت کو حق کا یہ شعور بخشا ہے۔ آج مغرب تین سو سال سے یہ اچھل کود کر کے دنیا کے سامنے دعویدار ہے کہ ہم نے عورت کو آزادی دی ہے۔ ہم نے عورت کو رائے کا حق دیا ہے۔ ہم نے عورت کو انسانیت کا شعور بخشا ہے۔ مغرب غلط کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

برطانیہ کے ایک ممبر کی عجیب بات

چند سال پہلے کی بات ہے۔ برطانیہ میں ایک شہر لیسٹر ہے وہاں ایک بڑا اچھا ادارہ ہے، اسلامک فاؤنڈیشن پروفیسر خورشید احمد صاحب اس کے چیئرمین ہیں اور بڑا علمی کام کرتے ہیں۔ وہاں ایک فنکشن تھا۔ میں بھی شریک ہوا۔ اس میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر ہیں، جم مارشل۔ اس زمانے میں ایم پی (ممبر پارلیمنٹ) تھے۔ وہ آئے انہوں نے ایک بات کہی جو میں اپنے پڑھے لکھے دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ بڑی عجیب بات ہے جم مارشل برطانیہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ انہوں نے کہا دیکھو یار بات سنو، ہمارے سامنے اسلام کی تین تصویریں الگ الگ ہیں۔ ہمیں ہمارے بڑے جو اسلام کے بارے میں بتلا کر گئے وہ اور تصویر ہے۔ ہمارے ماں باپ دادا، تاریخ مؤرخین ہمیں اسلام کا جو نقشہ بتاتے ہیں کہ یہ خون خواروں کا مذہب ہے، یہ بھیڑیوں کا مذہب ہے۔ فلاں ہے، فلاں ہے۔ وہ شکل بالکل مختلف ہے۔ ہم بھی پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ہم جب خود تاریخ کے اوراق میں اور لٹریچر میں اسلام کو اسٹڈی کرتے ہیں تو اسلام کا نقشہ بالکل مختلف بنتا ہے۔ لیکن جب ہم آج کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو اسلام کی ایک تیسری تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ہمیں ہمارے بڑے جو بتا کر گئے ہیں اسلام

یہ ہے وہ اور تصویر ہے۔ ہم نے جو کتابوں میں اسٹڈی کیا ہے تاریخ کے اوراق میں اسٹڈی کیا ہے وہ اور تصویر ہے اور آج کے مسلمانوں کے دن رات دیکھ کر جو اسلام کی تصویر بنتی ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ ہمیں صحیح تصویر بتاؤ۔ آج بھی ہم اسلام کی بات سننے کو تیار ہیں۔ یہ کسی عام شہری کی بات نہیں کررہا ہوں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر کی بات کررہا ہوں کہ کمیونیکیشن گیپ دور کرو۔ خیر عورت کی علمی سطح کی ایک اور بات کرتے ہوئے سمیٹتا ہوں اپنی گفتگو کو۔

حضرت امام شافعیؒ کی والدہ کا علمی مقام

حضرت امام شافعیؒ کا نام سنا ہے؟ حضرت امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ کا قصہ امام تاج الدین سبکیؒ نے الطبقات الکبریٰ للشافعیہ میں ذکر کیا ہے۔ قاضی کی عدالت ہے، مقدمہ در پیش ہے۔ قرآن پاک نے فرمایا کہ معاملات کا مقدمہ ہو تو کتنے گواہ ہوں؟ کم از کم دو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر کتنے ہوں؟ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتٰنِ۔ (البقرہ۲: ۲۸۲) دو مرد گواہ ہوں، دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد ہو اور دو عورتیں ہوں۔ ایک مرد کے قائم مقام کتنی ہیں؟ دو عورتیں۔ رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتٰنِ۔ مقدمہ تھا قاضی کی عدالت میں۔ ایک گواہ مرد تھا، دو گواہ عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک عورت حضرت امام شافعیؒ کی والدہ تھیں۔ امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ ان دو عورت گواہوں میں ایک تھیں۔ قاضی صاحب نے کیس سنا۔ گواہی سنی، دونوں عورتوں کی گواہی سنی، باتیں سنیں، قاضی صاحب کا خیال ہوا کہ دونوں کی باتیں اکٹھی تو سن لی ہیں۔ ذرا الگ الگ کر کے بھی سنوں تاکہ اگر درمیان میں کوئی گڑبڑ ہو تو پتا چل جائے۔ قاضی نے امام شافعیؒ کی والدہ سے کہا کہ آپ ذرا وہاں بیٹھیں، میں اس سے ذرا پوچھ لوں۔ امام شافعیؒ کی والدہ نے کہا: آپ مجھے وہاں نہیں بھیج سکتے۔ میں یہیں بیٹھوں گی۔ انہوں نے کہا: میں قاضی ہوں۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے لیکن قرآن آپ کو یہ حق نہیں دیتا۔ خدا کی بندی قرآن میں یہ مسئلہ کدھر ہے؟ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ قاضی الگ الگ گواہی نہیں لے سکتا، اکٹھی لے سکتا ہے؟ اس نے کہا: قاضی صاحب! فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتٰنِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ أَن تَضِلَّ إِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدٰهُمَا الْأُخْرٰى۔ (البقرہ۲: ۲۸۲) قرآن پاک نے دو عورتوں کی گواہی کا فلسفہ بھی ساتھ ذکر کر دیا کہ

مرد ایک اور عورتیں کتنی؟ دو! اس کی وجہ بھی ساتھ بیان کر دی۔ فلسفہ ذکر کر دیا کہ عورت جلدی بھول جاتی ہے۔ یہ اللہ پاک نے عورت اور مرد کے درمیان میں فرق رکھا ہے۔ عورت بات یاد بھی جلدی کرتی ہے اور بھول بھی جلدی جاتی ہے۔ ہمارا تو یہ تجربہ ہے جو سبق مرد سال میں یاد کرتا ہے عورت چار مہینے میں یاد کرلیتی ہے۔ اساتذہ کرام میری بات کی گواہی دیں گے کہ عورت جلدی یاد کرتی ہے لیکن عورت بھلکڑ بھی ہے۔ جلدی بھول جاتی ہے۔ قرآن پاک نے یہ فلسفہ بیان کیا کہ دو اس لیے ہوں تا کہ ایک اگر بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى۔ بات کرتے کرتے اگر ایک بھول رہی ہو تو دوسری کہے نہیں بہن یہ بات بھی تھی۔ اس لیے قاضی صاحب ہم گواہی اکٹھی دیں گی۔ یہ قرآن کہتا ہے۔ ہماری اکٹھی گواہی کا فلسفہ یہ ہے تا کہ اگر ہم میں کوئی بھولے تو دوسری یاد دلا دے۔ اب ہمیں ایک دوسرے کو لقمہ دینے کی اجازت ہے۔ ویسے گواہوں میں ایک دوسرے کو لقمہ دینے کی اجازت نہیں ہے لیکن دو عورتیں گواہ ہوں تو ایک دوسرے کو لقمہ دینے کی اجازت ہے۔ قرآن پاک کہتا ہے: فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى۔ ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے کہ بہن یہ بات بھی ہوئی۔ ہاں ہاں یہ بات بھی ہوئی تھی۔ تو اس لیے حضرت ہم اکٹھی بیٹھیں گی۔ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ ہمیں الگ الگ کر کے گواہی لیں۔ امام سبکی لکھتے ہیں کہ قاضی نے کہا کہ تمہاری بات ٹھیک ہے۔ میری رائے غلط تھی تو میں عرض کر رہا تھا۔ بات دور نکل گئی۔ میں نے گزارش یہ کی تھی کہ یہ فیض کس کا ہے۔ یہ تعلیمات کہاں کی ہیں۔ اس درسگاہ کی۔ آج یہ درسگاہ اور مغرب کی دانش گاہ آمنے سامنے ہیں۔ میں تفصیلات میں جاؤں تو رات گزر جائے گی۔ مغرب جتنے سبق سنا رہا ہے وہ اسی درسگاہ کا فیض ہے۔ جتنے کام کے سبق ہیں۔ ایک ایک سبق پر بات کرنے کو تیار ہوں۔

سوشل ویلفیئر کا نظام انگریز دانشور نے فاروقِ اعظمؓ کے نظامِ حکومت سے لیا

ایک بات اور یاد آ گئی، کہہ دوں، ابھی چند دن قبل کی بات ہے۔ وزیر آباد میں ستائیس رمضان کو جلسہ تھا ختمِ قرآن کا، وزیر آباد گوجرانوالہ کے قریب ہمارا تحصیل صدر مقام ہے۔

ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس افتخار احمد چیمہ اور میں، ہم دو مقرر تھے۔ انہوں نے واقعہ سنایا تقریر کے دوران انہوں نے کہا جس زمانے میں میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو وہاں ایک پرانے انگریز دانشور تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کا جو موجودہ ویلفیئر اسٹیٹ کا سسٹم ہے بے روزگاروں کو روزگار دینا، وظیفہ دینا اس کو سوشل بینیفٹ کہتے ہیں۔ یہ جو موجودہ سسٹم ہے وہ اس دانشور نے بنایا ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے اس دانشور نے وہ سارا سسٹم بنایا اور اس کا سسٹم برطانیہ میں نافذ ہے۔ نام ابھی ذہن میں نہیں ہے۔ جسٹس صاحب نے نام لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ کیمبرج میں جب ہم پڑھتے تھے تو وہ زندہ تھے ہم چند طالب علم مل کر ان کے پاس گئے کہ آپ پرانے استاذ ہیں بزرگ ہیں۔ عالم عالم ہوتا ہے۔ خواہ کسی مذہب کا بھی ہو۔ صاحب علم ہیں صاحب مطالعہ ہیں۔ آپ نے بڑے کام کیے۔ ہمیں کوئی اپنی زندگی کے یادگار واقعات بتائیں۔ ہم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ تمہیں پتا ہے یہ برطانیہ میں اس وقت جو سوشل ویلفیئر کا تصور ہے یہ وظیفوں کا اور بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کا، ہر شہری کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے اور اسکے اخراجات کی کفالت کی اسٹیٹ ذمہ دار ہے۔ یہ جو برطانیہ نے ایک نمونے اور آئیڈیل کی اسٹیٹ کا سسٹم پیش کر رکھا ہے تمہیں معلوم ہے کہ یہ مرتب کرنے والوں میں میں بھی ہوں۔ میں نے یہ سارا خاکہ ترتیب دیا تھا۔ یہ میں نے کیا ہے اور یہ تمہیں بتاؤں کہ میں نے یہ سارا سسٹم کہاں سے لیا ہے ہم نے بنیادی خاکہ کہاں سے لیا ہے؟ یہ میں نے تمہارے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کے نظام حکومت سے لیا ہے۔ ان کے طرز حکومت سے لیا ہے اور ان کے سسٹم کو میں نے اپنایا ہے۔ آگے اس کو یہ قانونی شکل دی گئی ہے۔

خلاصہ بیان

حضرات محترم! آج مغرب جن باتوں کا دعویدار ہے، آج مغرب کو جن باتوں پر فخر ہے۔ سوشل ویلفیئر پر ہو یا آزادی رائے پر ہو یا عورت کی آزادی پر ہو، یا انسانی حق پر ہو، میں نے اجمالاً دو تین باتیں ذکر کی ہیں کہ یہ سب سبق کہاں سے سیکھے ہیں۔ اسلام سے۔ تم آج کی بات کرتے ہو ہم یہ باتیں دنیا کو چودہ سو سال پہلے دے چکے ہیں۔ سمجھا چکے بتا چکے۔ یہ ہماری

ہی بدنصیبی ہے ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ہم اس پر قائم نہیں ہیں۔خدا کرے کہ وہ دن آئے کہ یہ مدرسہ جو چیخ وپکار کررہا ہے اس مدرسہ کی چیخ وپکار سنی جائے۔آمین کہہ دیجیے۔ یہ مدرسہ جو کہتا ہے جو تعلیمات بخاری شریف میں ہیں مسلم شریف میں ہیں، مشکوٰۃ شریف میں ہیں ہدایہ میں ہیں جو سسٹم یہ مدرسہ پڑھاتا ہے اگر دنیا کے کسی خطے میں دس سال کے لیے وہ سسٹم آزادانہ طور پر نافذ ہوجائے اور دنیا کو نقشہ نظر آجائے کہ اسلام کا سسٹم کیا ہے تو خدا کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ دنیا کے کسی سسٹم کے پاس کھڑا رہنے کا جواز باقی نہ رہے۔ان شاءاللہ العزیز آج سے پہلے بھی اس مدرسہ نے دنیا کی انسانی سوسائٹی کی قیادت کی ہے۔یہ میں بالکل علی الاعلان کھلی بات کہتا ہوں آج کا ورلڈ سسٹم ڈنڈے کے زور سے قائم ہے۔نہ اس کے پاس دلیل ہے نہ اس کے پاس اخلاق ہے نہ اس کے پاس منطق ہے، ڈنڈے کے زور سے ڈیزی کٹر کے زور سے، ایٹم بم کے زور سے اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے زور سے یہ سسٹم قائم ہے۔ یہ ان شاءاللہ نہیں رہے گا اور دنیا پر بالآخر اسی مدرسہ کے فلسفہ کی حکمرانی قائم ہوگی۔ان شاءاللہ العزیز اللہ پاک مجھے اور آپ کو وہ دن دیکھنا نصیب فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

مغربی معاشرہ

اور

مسلمانوں کی نئی نسل کا مستقبل

مدیر ''الشریعہ'' مولانا زاہد الراشدی نے ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو پیرش ہال واشنگٹن ڈی سی میں اور ۲۷ دسمبر ۱۹۹۰ء کو بروک لین کی مکی مسجد میں خطابات کیے۔ ان خطابات کے مکررات حذف کر کے دونوں کو یکجا شائع کیا جا رہا ہے۔''

بعد الحمد والصلوٰۃ:

بزرگان محترم و برادران اسلام! مجھے امریکہ میں حاضری دیتے ہوئے چوتھا سال ہے۔ ہر سال کچھ دنوں کے لیے حاضری کا موقع ملتا ہے اور یہاں مکی مسجد میں آپ حضرات سے ملاقات کی سعادت بھی حاصل ہوتی ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۷ء میں حاضر ہوا تو یہیں مکی مسجد میں مسلسل آٹھ دس روز قادیانیت کے بارے میں روزانہ گفتگو ہوتی رہی۔ اس وقت یہاں آنے کا مقصد بھی قادیانی گروہ کی سرگرمیوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا اور امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کے حالات معلوم کرنا تھا۔ پھر جوں جوں مسائل و احوال سے واقفیت ہوتی گئی اس مشن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس بار امریکہ حاضری اسی مشن کے سلسلہ میں ہے۔ میں مکی مسجد کے خطیب محترم حافظ محمد صابر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس اجتماع میں آپ سے گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ حضرات محترم! میں آج کی گفتگو میں آپ دوستوں سے ایک اہم مسئلہ پر بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے امریکہ میں آباد مسلمانوں کے مذہبی مستقبل کا مسئلہ اور یہ سوال کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کی اگلی نسل کا تعلق اسلام کے

ساتھ باقی رہے گا یا نہیں؟ یہ سوال انتہائی نازک اور پریشان کن ہے اور شمالی امریکہ کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہاں کے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی سنگینی کی طرف توجہ دلانا انتہائی ضروری ہے کیونکہ ماضی کے تلخ تجربات شاہد ہیں کہ اگر مسلمانوں کی اگلی نسل کے ایمان کو بچانے کی ابھی سے سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو ماضی میں یہاں آنے والے ہزاروں مسلمان خاندانوں کی طرح موجودہ مسلمانوں کی اولادیں بھی خدانخواستہ بطور مسلمان اپنا تشخص باقی نہیں رکھ سکیں گی۔

میرے محترم دوستو! آپ لوگ بحمد اللہ مسلمان ہیں اور مختلف ممالک سے نقل مکانی کر کے روزگار کی تلاش میں اس سرزمین میں آ کر آباد ہو گئے ہیں روزگار کی تلاش اچھی بات ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الجمعة ۱۰:۶۲)

"زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

لیکن اس کے ساتھ ایک بات اور بھی شامل کر لیں کہ ان لوگوں کے حشر اور انجام پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو آپ سے پہلے یہاں آئے تھے اور آپ کے مسلمان بھائی تھے لیکن یہاں کی معاشرت اور تہذیب میں جذب ہو کر اپنا تہذیبی اور مذہبی امتیاز کھو بیٹھے ہیں اور آج مسلمان کی حیثیت سے ان کی پہچان ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ کے اردگرد سینکڑوں مشاہدات بکھرے پڑے ہیں صرف آنکھیں کھولنے اور دماغ کے دریچے وا کرنے کی ضرورت ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے، آپ کو قدم قدم پر عبرت کے مناظر دکھائی دیں گے۔ مجھے تو یہ مناظر دکھائی دیتے ہیں اور آپ کو بھی دکھانا چاہتا ہوں۔ صرف اس سفر کے چند مشاہدات سماعت فرما لیجیے۔ ابھی چند روز قبل میں واشنگٹن ڈی سی میں تھا ایک دوست کے ہاں شام کا کھانا تھا۔ ادارہ دعوت وارشاد واشنگٹن ڈی سی کے مولانا محمد رفیق بھی میرے ساتھ تھے۔ دس بارہ احباب کی محفل تھی جس میں صرف ہم دونوں باریش تھے۔ چار پانچ سال کا ایک بچہ آیا پہلے اس نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی مخلوق ہے۔ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر قریب آیا یہاں کے بچوں میں جھجک تو نہیں ہے وہ مولانا محمد رفیق کے پاس بیٹھ گیا۔ ان کی

ڈاڑھی کو ہاتھ میں لے کر ٹٹولا پھر اسے اچھی طرح ہلایا اور بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا کہ ''انکل یہ کیا ہے؟'' بات بظاہر چھوٹی سی تھی لیکن میں احساس کی گہرائیوں میں ڈبکیاں کھانے لگا کہ ایک مسلمان گھرانے کے بچے کو ڈاڑھی جیسی سنت رسول اور علامت دین کے بارے میں بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔

اسی سفر کے دوران اگستا جارجیا میں میرے دوست افتخار رانا مجھے ایک مقامی ہسپتال میں لے گئے جہاں ایک بوڑھا البانوی مسلمان بستر علالت پر موت وحیات کی کشمکش میں تھا، اسے اس حال میں پندرہ بیس روز گزر گئے تھے مگر امریکہ کے مختلف شہروں میں مقیم اس کے پانچ بیٹوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس کی بیمار پرسی کے لیے ہسپتال تک آسکیں اور وہ بوڑھا تمناؤں اور حسرتوں کا ایک طوفان دل میں دبائے زبان حال سے امریکی معاشرت کی ستم ظریفیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ پھر افتخار رانا نے ہی مجھے ایک ''اسٹیفی'' کا قصہ بھی سنایا جوان کے ساتھ اگستا جارجیا کے ایک پلانٹ پر کام کرتا ہے۔ اسے قرآن کریم کی مختلف سورتیں یاد ہیں اور وہ بتاتا ہے کہ اس کا دادا مسلمان تھا جس نے اسے یہ سورتیں یاد کرائیں لیکن وہ خود مسلمان نہیں ہے، عیسائی ہے۔ میرے بھائیو! خدا کے لیے آنکھیں کھولو اور دیکھ لو کہ تمہارے ارد گرد اس معاشرہ میں ہزاروں ''اسٹیفی'' موجود ہیں ان کو دیکھو اور پھر فیصلہ کرو کہ ان میں تم کتنے ''اسٹیفیوں'' کا اضافہ کرنا چاہتے ہو۔

میرے محترم دوستو! آپ لوگ یہاں آنے والے پہلے مسلمان نہیں ہیں۔ آپ سے پہلے بھی دو مرحلوں میں مسلمان یہاں آچکے ہیں۔ آپ تیسری کھیپ ہیں اس لیے یہاں قدم جمانے سے پہلے ان لوگوں کے حالات پر ضرور نظر ڈال لیجیے جنہوں نے آپ سے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھا اور پھر اس ''لکڑ ہضم پتھر ہضم'' معاشرہ میں گم ہو کر رہ گئے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ امریکہ میں مسلمان سب سے پہلے اندلس سے آئے تھے۔ جب صلیبی جنگوں کے نتیجے میں اندلس دوبارہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تو ہزاروں مسلمان اپنی جانیں اور ایمان بچانے کے لیے ہزاروں میل کا سمندر عبور کر کے یہاں آگئے تھے۔ یہ کم وبیش وہی دور ہے جب کولمبس نے مغربی راستے سے ہندوستان پہنچنے کے جنون میں براعظم امریکہ دریافت کیا تھا۔ اس لیے یہ بات ابھی تک تاریخ میں متنازعہ ہے کہ امریکہ میں کولمبس پہلے آیا تھا یا

مسلمانوں نے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔لیکن یہ بات طے ہے کہ اس دور میں ہزاروں مسلمان یہاں آئے اور اس وقت امریکہ میں سپینش نسل کے لاکھوں خاندان آباد ہیں۔ان میں سے اکثر انہی مسلمانوں کی اولاد ہیں لیکن ان میں شاذ ہی اب کوئی مسلمان رہ گیا ہوگا۔

مسلمانوں کی دوسری کھیپ رواں صدی کے آغاز میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور مشرقی یورپ پر کمیونزم کے غلبہ کے دوران یہاں آئی اور ایک روایت کے مطابق اس مرحلہ میں مشرقی یورپ کے مختلف ممالک سے دولاکھ کے لگ بھگ مسلمان خاندان ترک وطن کر کے امریکہ میں آباد ہوئے۔ان کی اولاد کا بھی ایک بڑا حصہ عیسائیت کی آغوش میں جاچکا ہے اور جو باقی ہیں ان کی بڑی اکثریت کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا۔

تیسرے مرحلہ میں امریکہ آنے والے مسلمان آپ لوگ ہیں جو مختلف ممالک سے روزگار اور زندگی کی بہتر سہولتوں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں اور ڈالر کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔میں آپ کو ڈالر کمانے سے منع کرنے کے لیے نہیں آیا خوب ڈالر کمایئے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کی ان بہتر سہولتوں سے نوازے اور اس سے کئی گنا زیادہ ڈالر دے لیکن صرف یہ سوچ لیجیے کہ ڈالر اور زندگی کی بہتر سہولتوں کے عوض آپ اس معاشرے کو کیا دے رہے ہیں اس کی آپ لوگ کیا قیمت ادا کر رہے ہیں؟ یہ قیمت اپنی اولاد کے ایمان کی صورت میں تو آپ کو ادا نہیں کرنا پڑے گی؟ اگر ایسا ہے تو یہ خسارے کا سودا ہے،اس سودے پر نظر ثانی کر لیجیے،اس کے نتائج پر غور کر لیجیے اور خدا کے لیے بہتر زندگی اور ڈالر کے عوض اپنی اگلی نسل کو کفر کی دلدل میں دھکیلنے کا سودا نہ کیجیے۔

ایک بات اور میں آپ سے دوٹوک کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ آپ کو ابھی کرنا ہے۔بعد میں آپ کسی فیصلہ کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔آپ امریکی معاشرت کی بھٹی میں داخل ہو چکے ہیں۔یہ بڑی سخت بھٹی ہے یہاں ہر چیز پگھل جاتی ہے یہ معاشرت اور کلچر جسے امریکی کہا جاتا ہے دراصل امریکی نہیں یورپی ہے اور اس نے بے شمار کلچر ہضم کیے ہیں، حتیٰ کہ یہ معاشرت امریکہ کی مقامی معاشرت کو بھی کھا گئی ہے۔آپ دیکھ لیجیے کہ اصل امریکی اس معاشرہ میں کہاں ہیں؟ ان کا تو اصل نام بھی کسی کو یاد نہیں رہا، ریڈ انڈین کے نام سے پکارے جاتے ہیں، یہ نام انہیں یورپی آبادکاروں نے دیا ہے، انہیں مخصوص علاقوں کی طرف دھکیل دیا

گیا ہے، امریکہ کی قومی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اور وہ یہاں کے اصل امریکی باشندے ہونے کے باوجود اجنبیوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ یورپی تہذیب کا کمال ہے اور اس کا ہاضمہ ہے کہ اس کان نمک میں جو بھی آیا ہے نمک ہو کر رہ گیا ہے۔ اب آپ یہ سوچ لیں کہ اس میں ہضم ہونے سے آپ نے کیسے بچنا ہے اور اپنی اولاد اور اگلی نسل کو کیسے بچانا ہے۔ اگر آپ ابھی اس کا فیصلہ نہیں کریں گے تو یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ آپ کی آنے والی نسلیں مسلمان نہیں رہیں گی۔ دوسری نسل لبرل ہوگی اور تیسری نسل عیسائیت کی آغوش میں چلی جائے گی اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی خدا کی بارگاہ میں بھی آپ اس کے مجرم ہوں گے اور تاریخ بھی اس کا ذمہ دار آپ ہی کو ٹھہرائے گی۔

آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کو یہاں سے واپس چلے جانے کا مشورہ دوں گا۔ نہیں اور بالکل نہیں اس لیے کہ یہ فرار ہے اور مسلمان کا کام مسائل سے فرار اختیار کرنا نہیں بلکہ مسائل کا سامنا کرنا ہے۔ ابھی چند روز قبل ایک مجلس میں یہ گذارشات میں نے پیش کیں تو ایک صاحب کہنے لگے کہ میں تو واپس چلے جانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں میں نے کہا کہ نہیں میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا اور کسی مسلمان کو مسائل سے فرار کا مشورہ کم از کم میں نہیں دے سکتا۔ مسائل کا سامنا کیجیے، ان کا تجزیہ کیجیے اور ان کا حل تلاش کیجیے۔

حضرات محترم! میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ اس سنگین مسئلہ کے حل کے لیے آپ دو باتوں کا اہتمام ضرور کر لیجیے ورنہ آپ ان نتائج سے نہیں بچ سکیں گے جن کا سامنا یہاں آپ سے پہلے آنے والے مسلمانوں کو کرنا پڑا ہے۔ ایک بات یہ کہ اپنے گھروں کے ماحول کو دینی بنانے کی کوشش کیجیے، گھر میں نماز روزہ اور تلاوت کلام پاک کے معمولات کا اہتمام کیجیے۔ اپنے مذہبی تشخص کا تحفظ کیجیے اور دوسری یہ کہ اپنی اولاد کی دینی تعلیم کا اہتمام ضرور کیجیے انہیں قرآن کریم اور دینی احکام و مسائل کی تعلیم دلایئے، مساجد و مدارس کا نظام قائم اور دین کی بنیادی تعلیم کے سلسلہ کو ہر مسلمان تک پھیلا دیجیے۔ اگر آپ اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دلائیں گے اور انہیں گھروں میں مذہبی ماحول مہیا کریں گے تو دین کے ساتھ ان کا تعلق باقی رہے گا اور وہ مسلمان کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھ سکیں گے ورنہ وہ نہ صرف یہاں کے کلچر میں ضم ہو جائیں گے بلکہ اس سوسائٹی کا مذہب بھی قبول کر لیں گے۔ انہیں اس انجام سے صرف آپ

کی سنجیدہ توجہ بچا سکتی ہے اور اس کا فیصلہ آپ کو ابھی اسی مرحلہ میں کرنا ہوگا۔

اس ملک میں ایک اور بات بھی عرض کیا کرتا ہوں اور آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن ممالک سے آپ آئے ہیں ان کے ماحول اور سوسائٹی پر آپ اس معاشرہ کو قیاس نہ کریں۔ وہاں اگر والدین اپنی اولاد کی مذہبی وابستگی اور تعلیم و تربیت کے فرض سے کوتاہی بھی کر جائیں تو کچھ متبادل ذرائع ہیں جو انہیں مذہب سے وابستہ رکھنے کا وسیلہ بن جاتے ہیں، محلہ کی مسجد سے ان کا تعلق جڑ سکتا ہے، سکول اور کالج میں اچھا استاد مل سکتا ہے، دوستوں کی اچھی سوسائٹی مل سکتی ہے حتیٰ کہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ بھی وقتاً فوقتاً اذان، تلاوت کلام پاک اور درس و وعظ کی آواز کان میں پڑتی رہتی ہے اور سب سے بڑھ کر معاشرہ اور سوسائٹی کا اجتماعی ماحول نئی پود کا تعلق مذہب کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ لیکن یہاں تو ان صورتوں میں سے کسی ایک کا امکان بھی نہیں ہے، سکول، کالج، سوسائٹی، میڈیا اور عمومی معاشرت ان سب کے رجحان سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ ان میں سے کسی سے آپ کو خیر کی توقع ہے؟ اور اپنی اولاد کے مذہبی اور تہذیبی مستقبل کے بارے میں آپ ان میں سے کسی پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ یہ تو سب کے سب کفر اور بے حیائی کے داعی ہیں اور ان سب نے قسم کھا رکھی ہے کہ مسلمان کو مسلمان باقی نہیں رہنے دینا۔ اس لیے یہاں نئی نسل کے مذہبی مستقبل کا انحصار صرف اور صرف والدین کی توجہ پر ہے والدین اپنی اولاد کو مسلمان رکھنا چاہیں گے تو وہ مسلمان رہے گی ورنہ نہیں رہے گی اور خوب سوچ سمجھ لیجیے کہ بالکل نہیں رہے گی۔ جناب رسالت مآب ﷺ کا ارشاد گرامی بیسیوں بار پڑھا اور بیسیوں بار بیان بھی کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا عملی مفہوم یہاں اس معاشرہ میں آ کر سمجھ میں آیا۔ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ او يُمَجِّسَانِهِ (صحیح بخاری: ۱۲۹۳)

”پیدا ہونے والا ہر بچہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس کے ماں باپ اس کو یہودی بناتے ہیں، عیسائی بناتے ہیں یا مسلمان بنا دیتے ہیں۔“

اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ اپنی اولاد، کو نئی نسل کو اور آنے والی مسلمان پود کو

آپ نے مسلمان باقی رکھنا ہے یا عیسائی اور یہودی بنا دینا ہے اس فیصلہ کا اختیار آپ کے پاس ہے اور اس کی ذمہ داری بھی صرف آپ پر ہوگی۔

قرآن کریم نے بھی یہ ذمہ داری آپ پر عائد کی ہے کہ صرف خود جہنم کی آگ سے بچنے کی کوشش پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی اس آگ سے بچائیں۔ یہ دین کا تقاضا ہے اور یہ عقل ومنطق کا تقاضا بھی ہے۔ دیکھیے ابھی سان فرانسسکو میں زلزلہ آیا ہے۔ یہ خدائی گرفت آتی رہتی ہے۔ اگر کسی جگہ زلزلہ آجائے، کسی مکان میں آگ لگ جائے تو کسی مکان کا مالک ایسا بے وقوف نہیں ہوگا کہ خود اکیلا مکان سے باہر کھلے میدان میں جا کھڑا ہو اور اطمینان کا اظہار کرے کہ میں تو آگ سے بچ گیا ہوں۔ ایسا کرنا عقلمندی نہیں بے وقوفی شمار ہوگا۔ عقلمند آدمی وہ سمجھا جائے گا جو پہلے گھر کے دوسرے افراد کو، بیوی بچوں کو، اہل وعیال کو آگ سے بچانے کی کوشش کرے گا اور پھر خود آگ سے بچنے کا سوچے گا۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ اے ایمان والو! اپنے آپ کو بھی جہنم کی آگ سے بچاؤ اور اپنے اہل و عیال کو بھی جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو۔ اس لیے اولاد کے دین وعقیدہ کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے اسی حقیقت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی بناتے ہیں عیسائی بناتے ہیں یا مجوسی بناتے ہیں۔

حضرات محترم! میں دیکھ رہا ہوں کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کو رفتہ رفتہ اپنی نئی نسل کو بطور مسلمان باقی رکھنے کی ضرورت کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ جذبہ بیدار ہو رہا ہے، فکر بڑھ رہا ہے لیکن اسے صحیح طریقہ سے منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا صحیح راستہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ ہے کہ آپ اپنے گھروں کے ماحول کو کسی نہ کسی حد تک مذہبی بنانے کی کوشش کریں۔ مذہبی اقدار سے وابستگی برقرار رکھیں، گھروں میں نماز اور دیگر عبادات کا اہتمام کریں اور سب سے بڑھ کر اپنی اولاد کی دینی تعلیم کا نظم قائم کریں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ اگر آپ نے اپنی اولاد کو مسلمان باقی رکھنا ہے تو آپ کو مساجد کا نظام قائم کرنا ہوگا۔ آپ کو دینی مدارس کا منظم طریقہ سے آغاز کرنا ہوگا۔ آپ کو اپنی اولاد کی عصری اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہونا ہوگا ورنہ آپ اپنی آئندہ نسل کو مذہب اور دین کے ساتھ

وابستہ نہیں رکھ سکیں گے اور خدانخواستہ اس کا حشر وہی ہوگا جو اس سے قبل یہاں بسنے والے مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں جہاں آپ کو اپنی اولاد کے دینی مستقبل کے تحفظ کے لیے مساجد اور دینی مدارس کے قیام کا مشورہ دے رہا ہوں اور دینی مراکز کے ناگزیر ہونے کا احساس دلا رہا ہوں وہاں ایک تلخ حقیقت کی طرف آپ کو متوجہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب آپ یہ مساجد، مدارس اور دینی مراکز قائم کریں گے، اور آپ کو بہر حال قائم کرنا ہوں گے تو انہیں آباد کرنے کے لیے، انہیں چلانے کے لیے آپ کو دینی افراد کی ضرورت ہوگی وہ کھیپ آپ کہاں سے لائیں گے؟ اتنی بڑی تعداد میں حفاظ، قراء اور علماء کہاں سے مہیا کریں گے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے، اور یہ آسان جواب ہے کہ ہم اپنی ضرورت کے لیے مذہبی افراد کی یہ کھیپ اپنے ملک سے منگوا لیں گے۔ یہ راستہ آسان ہے لیکن اس کے کچھ تلخ ثمرات بھی ہوں گے اور ان تلخ ثمرات کا تجربہ ہم اس سے قبل یورپ میں کر چکے ہیں۔

میرے بھائیو! جب ہم اپنے ملک میں دینی کام کرتے کرتے آپ کے یہاں منتقل ہوں گے تو ہمارے ساتھ بیماریوں کے وہ جراثیم بھی منتقل ہوں گے جو ہمیں لاحق ہیں۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جنہوں نے ہمیں اپنے ملکوں میں بھی کسی کام کا نہیں رہنے دیا اور باہر جا کر بھی یہ بیماریاں ہمارے لیے اور اسلام کے لیے بدنامی اور رسوائی کا باعث بن رہی ہیں۔

یورپ میں جب مسلمان منظم ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے اپنی ضرورت کے لیے علماء اور حفاظ اپنے وطن سے منگوا لیے اور ان جراثیم کا علاج نہ کیا جو ہماری مخصوص بیماریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے یورپ کو دیوبندی، بریلوی لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا دیا۔ مسجدوں کے جھگڑے ہوئے، خدا کے گھر سیل کر دیے گئے، عبادت گاہوں کو کتوں کے ذریعے خالی کرایا گیا اور ہم کفار کے سامنے ندامت اور شرمندگی کا عنوان بن کر رہ گئے۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ یہاں بھی یہی کھیل کھیلا جائے گا۔ اس لیے میں آپ حضرات کو قبل از وقت خبردار کر رہا ہوں کہ خدا کے لیے ان جراثیم کا کوئی علاج سوچ لیجیے، آج جب ہم ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں تو ایئرپورٹ پر ہیلتھ سرٹیفکیٹ چیک کیا جاتا ہے کہ کہیں اس ملک کی بیماریوں کے جراثیم تو ساتھ نہیں لے آئے۔ آپ کو بھی ایسا کرنا ہوگا اور ان جراثیم کو

اپنے ملک میں آنے سے روکنا ہوگا ورنہ آپ اس معاشرہ میں مذاق بن کر رہ جائیں گے اور دین کی خدمت کے بجائے دین کی رسوائی کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

محترم بزرگو! میں آپ کو ایک اصول بتانا چاہتا ہوں۔ ہمارے دین کی تین بنیادیں ہیں۔ان کو کسی حالت میں نظر انداز نہ کریں۔ا:۔قرآن کریم۔ ۲:۔سنت رسول ﷺ اور ۳:۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو شخص قرآن کو مانتا ہے، حدیث رسول ﷺ کو تسلیم کرتا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کو قبول کرتا ہے، وہ حنفی ہو، شافعی ہو، مالکی ہو، حنبلی ہو، یا کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو، اس سے کسی مسئلہ میں جھگڑا نہ کریں، کسی اختلاف میں نہ الجھیں اور اگر آپ کو کوئی الجھانے کی کوشش کرے تو اسے ٹوک دیں، جھٹک دیں اور اس کی بات کو تسلیم نہ کریں۔تو میں گزارش یہ کر رہا تھا کہ اپنی اولاد کی دینی تعلیم اور نئی نسل کی مذہب سے وابستگی برقرار رکھنے کے لیے مساجد، مدارس اور دینی مراکز کا اہتمام آپ کی ذمہ داری ہے لیکن ان مراکز کے لیے افراد کی تلاش میں احتیاط سے کام لیں اور اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو ایسے افراد کو درآمد کرنے کا ہی نہ سوچیں کیونکہ جن افراد نے آپ کے ماحول میں تربیت نہیں پائی، آپ کے ماحول میں کام نہیں کیا وہ آپ کے ماحول کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔وہ اپنی ذہنی ساخت اور تربیت و ماحول کے سانچے میں آپ کو ڈھالنے کی کوشش کریں گے جس کے نتیجہ میں وہ بیماریاں بھی آپ میں عود کر آئیں گی جو خود ہمارے ملکوں میں ہمارے لیے بربادی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔اس کے بجائے آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ آپ ضروریات کے لیے یہاں کے حفاظ، قراء اور علماء کی کھیپ خود یہاں تیار کریں۔ایک معیاری دارالعلوم کے قیام کی طرف توجہ دیں۔ واشنگٹن ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دارالسلطنت ہے۔یہاں کے مسلمانوں پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ایک دارالعلوم بنائیں۔اس میں حفاظ، قراء اور علماء تیار کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو نوجوان اس ماحول میں رہ کر دین کی تعلیم حاصل کریں گے وہ یہاں کے تقاضوں اور مشکلات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھیں گے اور وہ زیادہ مؤثر طریقے سے آپ کی مساجد و مدارس کو آباد کر سکیں گے۔میرے سامنے پڑھے لکھے دانشور دوست بیٹھے ہیں۔وہ اس نکتہ کو ضرور سمجھ رہے ہوں گے اور یقیناً میری گزارش پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے۔

میرے محترم بزرگو! میں نے آپ حضرات کا خاصا وقت لے لیا ہے لیکن یہ باتیں آپ

سے دوٹوک انداز میں کرنا میں اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ اب پھر ان گزارشات کا خلاصہ دہرا دیتا ہوں۔ میں نے آپ حضرات سے تین گزارشات کی ہیں:۔

۱۔ اپنے سے پہلے آنے والے مسلمانوں کی اولاد کے حشر سے سبق حاصل کریں اور اپنی اولاد اور نئی نسل کو مذہب کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے اپنے گھروں کا ماحول مذہبی بنانے کی کوشش کریں۔

۲۔ مذہب کے ساتھ اپنی اور اپنی اولاد کی وابستگی کو صحیح رکھنے کے لیے مساجد، دینی مدارس اور دینی مراکز کے نظام کو منظم طریقے سے قائم کریں۔

۳۔ مذہبی ضروریات کے لیے یہاں کے ماحول اور تقاضوں سے ناواقف افراد کو درآمد کرنے کے بجائے ایک بڑا دارالعلوم قائم کر کے خود یہاں حفاظ، قراء اور علماء کی کھیپ تیار کریں تاکہ وہ یہاں کے ماحول اور تقاضوں کے مطابق آپ حضرات کی بہتر دینی رہنمائی اور خدمت کر سکے۔

محترم بزرگو اور دوستو! بس اس پیغام کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ گزارشات شاید کچھ تلخ ہوں لیکن میں اسی قسم کی باتوں کا عادی ہوں، ''لوریاں'' دینا نہیں جانتا۔ ان گزارشات پر پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں، اپنی اولاد کے مستقبل کی فکر کریں، اسے کفر کی آغوش میں جانے سے بچائیں اور وہ تمام ذرائع اختیار کریں جو یہاں مسلمانوں کی اگلی نسل کو مسلمان باقی رکھنے کے لیے ضروری ہوں اور اس کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اسلام اور مسلمانوں کے بہتر مستقبل کے لیے مخلصانہ کام کرنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا الٰہ العالمین۔

(مطبوعہ ماہنامہ الشریعہ)

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

جہاد کا مفہوم

شیخ زید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت مآب ﷺ کی سیرت طیبہ کے موضوع پر 16 مئی 2002ء کو منعقد ہونے والی ''سیرت النبی کانفرنس'' میں شرکت اور گفتگو کے اعزاز سے نوازا اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرماتے ہوئے کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

مجھے گفتگو کے لیے سیرت نبوی کی روشنی میں جہاد کا مفہوم کا عنوان دیا گیا ہے جس کے مختلف پہلوؤں کے احاطہ حتیٰ کہ تذکرہ بھی اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے اس لیے بہت سے امور کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک ایسے سوالات کا جائزہ لینا چاہوں گا جو جہاد کے حوالہ سے آج کے دور میں عالمی سطح پر موضوع بحث ہیں اور ان کے بارے میں مثبت اور منفی طور پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے۔

''الجہاد'' کا لفظ لغوی مفہوم کے حوالہ سے کوشش محنت اور تگ و دو کی مختلف شکلوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسے دینی پس منظر میں لیا جائے تو اسلام کی سر بلندی دعوت و تبلیغ ترویج وتنفید اور تحفظ و دفاع کے لیے کی جانے والی مختلف عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنی خواہشات پر کنٹرول اور نفس کی اصلاح کی مساعی پر بھی جہاد کا لفظ بولا گیا جس کی قرآن وسنت میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن جہاد کا ایک خصوصی مفہوم جنگ اور محاربہ بھی ہے جسے قرآن کریم میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور ''قتال'' کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے اور سینکڑوں آیات قرآنی اور ہزاروں

احادیث نبویہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور اس ''جہاد'' کے فضائل، احکام، مسائل اور مقصدیت پر قرآن وسنت میں پورے اہتمام کے ساتھ جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ہے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کافروں کے خلاف میدان جنگ میں صف آراء ہو کر ہتھیاروں کے ساتھ ان سے معرکہ آرائی کرنا اور قتل وقتال کے ذریعہ کفر پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا جس کی اہمیت وفضیلت پر قرآن کریم اور سنت نبوی کی سینکڑوں تصریحات گواہ ہیں اور اس کو آج کے دور میں اس وجہ سے سب سے زیادہ تنقید واعتراض کا نشانہ بنایا جارہا ہے کہ جدید عقل و دانش کے نزدیک عقیدہ مذہب کے فروغ اور غلبہ کے لیے ہتھیار اٹھانا تہذیب وتمدن کے تقاضوں کے خلاف ہے اور ایسا کرنا بنیاد پرستی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے دائرہ میں آتا ہے۔اس سلسلہ میں آگے بڑھنے سے قبل ایک کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عقیدہ ومذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے اور باطل مذاہب پر حق مذہب کی بالادستی کے لیے عسکری جنگ لڑنے کا آغاز حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا بلکہ جہاد کا یہ عمل آسمانی ادیان میں پہلے سے تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے اس حوالہ سے تاریخ میں کسی نئے عمل اور اسلوب کا اضافہ کرنے کی بجائے آسمانی مذاہب کی اسی مسلسل روایت کو برقرار رکھا چنانچہ جس طرح قرآن کریم میں جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ پایا جاتا ہے اسی طرح بائبل میں بھی ان مجاہدین اور مذہبی جنگوں کا ذکر موجود ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے مذہب کے دفاع اور اپنی آزادی اور تشخص کے تحفظ کے لیے لڑیں مثال کے طور پر قرآن کریم نے فلسطین کی سرزمین پر لڑی جانے والی ایک مقدس جنگ کا سورۃ البقرۃ میں تذکرہ کیا ہے جو جالوت جیسے ظالم حکمران کے خلاف حضرت طالوت کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت بادشاہ کا معجزانہ طور پر خاتمہ ہوا اور اس جنگ کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے اور اس میں حضرت طالوت کا ساؤل بادشاہ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔اس لیے اگر آج کی جدید دانش کو مذہب کے نام پر ہتھیار اٹھانے پر اعتراض ہے تو اس کا ہدف صرف قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی نہیں بلکہ اصولی طور پر بائبل اور بنی اسرائیل یعنی یہود ونصاری کی پوری تاریخ اس کی زد میں ہے صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ ''بائبل'' کے ماننے والوں نے ''بائبل'' پر ایمان کے دعوی کے باوجود اس کے عملی احکام اور ماضی سے دست

برداری کا اعلان کر دیا ہے جبکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے تمام تر عملی کمزوریوں کے باوجود اپنے ماضی اور قرآنی احکام وتعلیمات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس وضاحت کے بعد جہاد کی مقصدیت کے حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا مقصد جناب نبی اکرم ﷺ نے ''اعلاء کلمۃ اللہ'' قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جس کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں حکم اور قانون کا درجہ انسانی خواہشات اور ظن و گمان کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور آسمانی تعلیمات کو حاصل ہونا چاہئے اور کلمۃ اللہ کی اسی سربلندی کے لیے قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک ارشاد مبارک میں یہ کہہ کر اس جدوجہد کے قیامت تک جاری رہنے کا اعلان فرما دیا ہے کہ "الجهاد ماض الى اليوم القيامة"

یہ فکر وفلسفہ کی جنگ ہے اسلوب زندگی کی معرکہ آرائی ہے اور تہذیب وثقافت کا محاذ ہے جس میں شروع سے آسمانی مذاہب کا یہ موقف رہا ہے اور اب آسمانی مذاہب وادیان کے حقیقی وارث سے اسلام کا موقف بھی یہی ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہ نمائی اور اس کے مسائل کے حل کے لیے انسانی خواہشات اور عقل ودانش تنہا کفایت نہیں کرتیں بلکہ ان پر آسمانی تعلیمات کی نگرانی ضروری ہے کیونکہ اس ''چیک اینڈ بیلنس'' کے بغیر انسانی خواہشات اور انسانی عقل کے لیے پوری نسل انسانی کی ضروریات ومفادات میں ''توازن'' قائم رکھنا ممکن نہیں ہے لیکن آج کا سب بڑا المیہ یہ کہ ''تہذیب جدید'' نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری کا اعلان کر کے ''خواہشات'' اور ''عقل'' ہی کو تمام امور کی فائنل اتھارٹی قرار دے رکھا ہے جس سے توازن بگڑ گیا ہے۔ اجتماعی اخلاقیات دم توڑ گئی ہیں طاقت کا بے لگام گھوڑا وحی الٰہی کی لگام سے آزاد ہو گیا ہے اور پوری دنیا میں ہر طرف ''جنگل کے قانون'' کا دور دورہ ہے۔

آج کی جدید دانش نے چونکہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے شخصی زندگی کے دائروں میں محدود کر دیا ہے اس لیے ''عقل جدید'' کے نزدیک مذہب کو وہ مقام حاصل نہیں رہا کہ اس کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں اور اس کے فروغ وتنفیذ کے لیے عسکری قوت کو استعمال میں لایا جائے ورنہ ہتھیار آج بھی موجود ہیں اور جتنے ہتھیار آج پائے جاتے ہیں اور تیار ہو رہے ہیں انسانی تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ ہتھیار استعمال بھی ہوتے ہیں

اور وہ تباہی لاتے ہیں کہ اس سے قبل کی انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے مگر ان ہتھیاروں کے استعمال کرنے والوں کے مقاصد اور عنوانات مختلف ہیں۔

جرمنی نے جرمن نسل کی برتری کے عنوان سے ہتھیار بنائے اور دو عظیم جنگوں میں پوری دنیا کے لیے تباہی کا سامان فراہم کیا۔ روس نے محنت کشوں کی طبقاتی بالادستی کے نام پر عسکری قوت کا بے تحاشہ استعمال کیا اور نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو تہہ تیغ کر دیا۔ اسرائیل نے ایک نسلی مذہب کی برتری کے لیے اپنے سائز سے سینکڑوں گنا زیادہ ہتھیار جمع کئے ہوئے ہے اور فلسطینیوں کی مسلسل نسل کشی میں مصروف ہے اور امریکہ نے مغرب کی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام پر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر نسلی برتری طبقاتی بالادستی اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانا اور صرف اٹھانا نہیں بلکہ اسے وحشیانہ انداز میں اندھا دھند استعمال کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا دہشت گردی نہیں ہے تو آسمانی تعلیمات کے فروغ اور وحی الٰہی کی بالادستی کے لیے ہتھیار اٹھانے کو کون سے قانون اور اخلاقیات کے تحت دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے؟

باقی تمام پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے آج کی معروضی صورتحال میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے طرز عمل کا جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کا نام لینے والوں کے خلاف ''عالمی اتحاد'' کے پرچم تلے جو وحشیانہ فوج کشی جاری ہے اس کے جواز میں اس کے علاوہ اب تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکی کہ اسلام کا نام لینے والے ان مبینہ انتہا پسندوں سے آج کی عالمی تہذیب کو خطرہ ہے اور بین الاقوامی نظام کو خطرہ ہے اس لیے ان انتہا پسندوں کا خاتمہ ضروری ہے اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عقیدہ و مذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے کو دہشت گردی کہنے والے خود ایک مذہب اور عقیدہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے میدان جنگ میں مسلسل صف آراء ہیں۔

میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک عقیدہ فلسفہ اور تہذیب کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانے اور اسے استعمال کرنے کا ایک فریق کو حق حاصل ہے تو اس کے خلاف دوسرے عقیدہ فلسفہ اور تہذیب کے علمبرداروں کو ہتھیار اٹھانے کے حق سے کسی طرح محروم نہیں کیا جاسکتا

اور ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے کے لیے یہ کوئی وجہ جواز نہیں ہے چونکہ ایک فریق کے پاس ہتھیار بنانے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اسے ان ہتھیاروں کے استعمال کے مواقع زیادہ میسر ہیں اس لیے اسے تو ہتھیار بنانے اور چلانے کا حق حاصل ہے اور دوسرا فریق اس صلاحیت میں کمزور اور ان مواقع کی فراوانی سے محروم ہے اس لیے اس کا سرے سے کوئی حق نہیں ہے۔

آج امریکہ اور اس کے اتحادی اس بات پر مطمئن ہیں کہ جو جنگ وہ لڑ رہا ہے وہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔ انسانیت کی بھلائی کی جنگ ہے اور ان کے بقول اعلیٰ ترین تہذیبی اقدار کے تحفظ کی جنگ ہے۔ جنگ کی اسی مقصدیت کی وجہ سے انہیں اس عظیم جانی و مالی نقصان کی کوئی پروا نہیں ہے جو دنیا بھر میں ان کے ہاتھوں مسلسل جاری ہے انسان مر رہے ہیں عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں بچے یتیم ہو رہے ہیں عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو رہی ہیں ملکوں اور قوموں کی معیشتیں تباہ ہو رہی ہیں اور امن و امان کا توازن مسلسل بگڑتا چلا جا رہا ہے لیکن ایسا کرنے والے چونکہ اپنے زعم کے مطابق یہ سب کچھ اعلیٰ مقاصد کے لیے کر رہے ہیں اور ان اقدامات کے ذریعہ اعلیٰ تہذیب وثقافت کا تحفظ کر رہے ہیں اس لیے ان کے خیال میں یہ سب کچھ جائز ہے اور جنگ کا حصہ ہے جسے کسی چون و چرا کے بغیر پوری نسل انسانی کو برداشت کرنا چاہیے۔

یہی بات اسلام کہتا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ نسل انسانی کے لیے نجات کا راستہ انسانی خواہشات اور صرف انسانی عقل نہیں ہے بلکہ وحی الٰہی کی نگرانی اور آسمانی تعلیمات کی برتری انسانی سوسائٹی کے لیے ضروری ہے اور اسلام کے نزدیک انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور تہذیبی روایات کا سرچشمہ انسانی خواہشات اور عقل محض نہیں بلکہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہیں اس لیے ایک مسلمان اگر ان مقاصد کے لیے ہتھیار اٹھاتا ہے تو دنیا کی مسلمہ روایات اور تاریخی عمل کی روشنی میں اسے یہ کہہ کر اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ مخالف فریق کے نزدیک اس کا یہ عمل دہشت گردی قرار دیا گیا ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد قرآن وسنت کی رو سے جہاد کی چند عملی صورتوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے حوالہ سے "جہاد" کے ایک حکم کا تذکرہ سورۃ المائدہ میں کیا

کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے چنگل سے بنی اسرائیل کو نکال کر صحرائے سینا میں خیمہ زن ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو حکم ملا کہ وہ "بیت المقدس" کو عمالقہ سے آزاد کرنے لیے جہاد کریں اور آگے بڑھ کر حملہ آور ہوں مگر غلامی کے دائرہ سے تازہ تازہ نکلنے والی مرعوب قوم کو اس کا حوصلہ نہ ہوا اور پھر اس کے چالیس سال بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جنگ لڑ کر بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل ہی کے حوالہ سے ایک اور جہاد کا تذکرہ کیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں کہ جالوت نامی ظالم بادشاہ نے فلسطین کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے بنی اسرائیل کو مظالم کا شکار بنانا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت شموئیل علیہ السلام کے حکم پر طالوت بادشاہ کی قیادت میں بنی اسرائیل کی مٹھی بھر جماعت نے جالوت کا مقابلہ کیا اور اسے میدان جنگ میں شکست دے کر فلسطین کے علاقے آزاد کرائے۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں کفار مکہ کے خلاف پہلے بڑے معرکہ کی قیادت بدر کے میدان میں کی اور قریش کو شکست دے کر شاندار کامیابی حاصل کی یہ جنگ قریش مکہ کے ان عزائم پر ضرب لگانے کے لیے بپا ہوئی تھی جو وہ اسلام کو ختم کرنے اور جناب نبی اکرم ﷺ اور ان کی جماعت کو ناکام بنانے کے لیے اختیار کئے ہوئے تھے اس کے بعد احد اور احزاب کی جنگیں بھی اسی پس منظر میں تھیں اور اس کشمکش کا خاتمہ اس وقت ہوا جب نبی اکرم ﷺ نے 8ھ میں خود پیش قدمی کر کے مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا۔

یہود مدینہ کے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ نے امن و امان کے ماحول میں وقت بسر کرنے کی کوشش کی لیکن یہودیوں کی سازشوں اور عہد شکنیوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ رہا تو جناب نبی کرم ﷺ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مرکز خیبر پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا اور یہود کا زور توڑ دیا۔

قیصر روم کے باجگزاروں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور یہ خبر ملی کہ خود قیصر روم مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے تو جناب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں اس کا انتظار کرنے کی بجائے روم کی سرحد کی طرف پیش قدمی کی اور تبوک میں ایک ماہ قیام کر کے رومی فوجوں کا انتظار کر کے واپس تشریف لائے۔

یہ تو چند کھلی جنگیں ہیں جو اعلانیہ طور پر لڑی گئیں لیکن ان سے ہٹ کر ایسی متعدد کارروائیاں بھی سیرت النبی کے ریکارڈ میں ملتی ہیں جنہیں چھاپہ مار کارروائیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مدینہ منورہ کے ایک سازشی یہودی سردار کعب بن اشرف کو جناب نبی اکرم ﷺ کے ایماء پر حضرت محمد بن مسلمہؓ اور ان کے رفقاء نے شبخون مار کر قتل کیا۔ خیبر کے نواح کے ایک اور سازشی یہودی سردار ابورافع کو جناب نبی اکرم ﷺ کے حکم پر حضرت عبداللہ بن عتیک نے اسی قسم کی چھاپہ مار کارروائی کے ذریعہ قتل کیا۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں یمن کے اسلامی صوبہ پر ایک نئے مدعی نبوت اسود عنسی نے قبضہ کر کے جناب نبی کرم ﷺ کے مقرر کردہ گورنر کو شہید کر دیا اور اسلامی ریاست کے عمال کو یمن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو جناب نبی اکرم ﷺ کے ایماء پر حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے چھاپہ مار کارروائی کر کے اسود عنسی کو رات کی تاریکی میں قتل کیا اور یمن پر اسلامی اقتدار کا پرچم دوبارہ لہرا دیا۔

صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی بعض ناجائز اور یکطرفہ شرائط کیخلاف دباؤ ڈالنے کے لیے حضرت ابوبصیر اور حضرت ابوجندلؓ نے سمندر کے کنارے ایک باقاعدہ چھاپہ مار کیمپ قائم کیا اور قریش کا شام کی طرف تجارت کا راستہ غیر محفوظ بنا دیا جس سے مجبور ہو کر قریش کو صلح حدیبیہ کے معاہدہ میں شامل اپنی یکطرفہ شرائط واپس لینا پڑیں اور ابوبصیرؓ کی چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آ کر قریش کو جناب نبی اکرم ﷺ سے دوبارہ گفتگو کرنا پڑی۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ کے ساتھ ساتھ میڈیا کے محاذ پر بھی کفار کے خلاف صف آرائی کی چنانچہ غزوہ احزاب کے بعد نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کے ایک اجتماع میں باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کیا کہ اب قریش مکہ کو مدینہ منورہ حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوگی لیکن اب وہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور مسلمانوں کے خلاف پورے عرب میں پراپیگنڈے اور منافرت انگیزی کا بازار گرم کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر شعر و خطابت سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرامؓ کو میدان میں آنے کی ترغیب دی چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے کھلے بندوں اعلان کر کے یہ محاذ سنبھالا اور شعر و شاعری کے محاذ پر کفار کے حملوں کا پوری جرأت کے

ساتھ مقابلہ کیا۔

زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے لیکن ان گزارشات سے اتنی بات ضرور سامنے آ گئی ہو گی کہ نبی اکرم ﷺ نے اسلام کی سر بلندی اور امت مسلمہ کے تحفظ واستحکام کے لیے موقع محل کی مناسبت سے جنگ کی ہر ممکن صورت اختیار کی اور محاذ آرائی کے جس اسلوب نے بھی جناب نبی اکرم ﷺ کے سامنے اپنا چیلنج رکھا اسے جواب میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

آج کے حالات میں جہاد کے حوالہ سے دو سوال عام طور پر کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا کسی علاقہ میں جہاد کے لیے ایک اسلامی حکومت کا وجود اور اسکی اجازت ضروری نہیں؟ اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبصیرؓ کا کیمپ اور حضرت فیروز دیلمیؓ کی چھاپہ مار کارروائی ہمارے سامنے واضح مثال کے طور پر موجود ہے۔ حضرت ابوبصیرؓ نے اپنا کیمپ جناب نبی اکرم ﷺ کی اجازت سے قائم نہیں کیا تھا لیکن جب یہ کیمپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف اس کے نتائج کو قبول کیا بلکہ قریش کی طرف سے یکطرفہ شرائط سے دستبرداری کے بعد اس کیمپ کے مجاہدین کو باعزت طور پر واپس بلا لیا۔

اسی طرح یمن پر اسود عنسی کا غیر اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ سے فوج بھیج کر لشکر کشی نہیں کی بلکہ یمن کے اندر کے مسلمانوں کو بغاوت کرنے کا حکم دیا اور اس بغاوت کی عملی شکل وہ چھاپہ مار کارروائی تھی جس کے نتیجہ میں اسود عنسی قتل ہوا۔

دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر جہاد شرعی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے تو جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں اقلیت کے طور پر رہتے ہیں ان کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا ان کے لیے جہاد میں شمولیت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں دو واقعات کا حوالہ دینا چاہوں گا ایک یہ کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور انکے والد محترم جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کی خدمت میں جہاد میں شمولیت کے لیے حاضر ہو رہے تھے کہ راستہ میں کفار کے ایک گروہ نے گرفتار کر لیا اور اس شرط پر انہوں نے رہا کیا ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر حصہ نہیں لیں گے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے یہ فرما کر انہیں بدر کے معرکہ میں شریک ہونے سے روک دیا کہ اگر تم نے اس

بات کا وعدہ کرلیا ہے تو اس وعدہ کی پاسداری تم پر لازم ہے چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد محترم موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معرکہ میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکے تھے۔

اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول اکرم ﷺ قبا میں قیام فرما تھے اور ابھی مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے لیکن حضرت سلمان فارسیؓ کا ذکر نہ بدر کے مجاہدین میں ملتا ہے اور نہ ہی وہ احد میں شریک ہوسکے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت آزاد نہیں تھے بلکہ ایک یہودی کے غلام تھے چنانچہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے بعد ان کی شمولیت جس پہلے غزوہ میں ہوئی وہ احزاب کا معرکہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے جہاد کے حوالہ سے مسلمانوں کے معروضی حالات اور ان کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا ہے اس لیے جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں رہتے ہیں اور ان کے ان ریاستوں کے ساتھ وفاداری کے معاہدات موجود ہیں ان کے لیے ان معاملات کی پاسداری لازمی ہے البتہ اپنے ملکوں کے قوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد ہمدردی اور خیر خواہی کے لیے وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ ان کی دینی ذمہ داری ہے اور اس میں انہیں کسی درجہ میں بھی کوتاہی روا نہیں رکھنی چاہیے۔

گزشتہ سال افغانستان پر امریکی حملہ کے موقع پر میں برطانیہ میں تھا مجھ سے وہاں کے بہت سے مسلمانوں نے دریافت کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہودیوں کی پیروی کرنی چاہیے اور ان سے کام کا طریقہ سیکھنا چاہیے کیونکہ یہودی ان ممالک میں رہتے ہوئے جو کچھ یہودیت کے عالمی غلبہ اور اسرائیل کے تحفظ و دفاع کے لیے کر رہے ہیں اسلام کے غلبہ اور مظلوم مسلمانوں کے دفاع کے لیے وہ سب کچھ کرنا مسلمانوں کا بھی حق ہے مگر یہ کام طریقہ اور ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے اور جن ملکوں میں مسلمان رہ رہے ہیں ان کے ساتھ اپنے معاملات اور کمٹمنٹ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔

آج دنیا کی عمومی صورتحال پھر اس سطح پر آگئی ہے کہ خواہشات اور محدود عقل پرستی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور آسمانی تعلیمات کا نام لینے کو جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ آج کی اجتماعی عقل نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے انکار کر کے حاکمیت مطلقہ کا منصب خود سنبھال لیا ہے اور وحی الٰہی سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے اس کے نشانات و اثرات کو ختم کرنے

کی ہر سطح پر کوشش ہو رہی ہے۔ اس فضا میں ''اعلاء کلمۃ اللہ'' کا پرچم پھر سے بلند کرنا اگرچہ مشکل بلکہ مشکل تر دکھائی دیتا ہے لیکن جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت وسیرت کا تقاضہ یہی ہے کہ نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی کے فریب سے نکالا جائے اور اسے آسمانی تعلیمات کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے وحی الٰہی کی ہدایات کے دائرہ میں لانے کی کوشش کی جائے۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان جس مظلومیت اور کسمپرسی کے عالم میں ظلم اور متسلط قوتوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہیں اور انہیں جس بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ ان کے مذہبی تشخص کے ساتھ ساتھ قومی آزادی اور علاقائی خودمختاری سے محروم کیا جا رہا ہے اس کے خلاف کلمہ حق بلند کرنا اور ان مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جبر کے ماحول سے نجات دلانے کے لیے جو کچھ ممکن ہو کر گزرنا یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات وارشادات کا ایک اہم حصہ ہے جس سے صرف نظر کر کے ہم نبی اکرم ﷺ کی اتباع اور پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ان دو عظیم تر ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کے مختلف شعبے ہیں فکر و فلسفہ کا میدان ہے۔ میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی جولانگاہ ہے۔ تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے تعلیم و تربیت کا دائرہ ہے۔ لابنگ اور سفارتکاروں کا شعبہ ہے اور عسکری صلاحیت کے ساتھ ہتھیاروں کی معرکہ آرائی ہے۔ یہ سب جہاد فی سبیل اللہ کے شعبے ہیں اور ''اعلاء کلمۃ اللہ'' کے ناگزیر تقاضے ہیں۔

اس لیے آج کے دور میں ''سنت نبوی کی روشنی میں جہاد کا مفہوم'' یہ ہے کہ

نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور آسمانی تعلیمات کی عملداری کی طرف لانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔

اسلام کی دعوت اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو نسل انسانی کے ہر فرد تک پہنچانے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق اسے دعوت اسلام کا مقصد وافادیت سمجھانے کا اہتمام کیا جائے۔

ملت اسلامیہ کو فکری وحدت، سیاسی مرکزیت، معاشی خودکفالت ٹیکنالوجی کی مہارت اور عسکری قوت وصلاحیت کی فراہمی کے لیے بھرپور وسائل اور توانائیاں بروئے کار لائی جائیں۔

مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کے لیے تگ ودو کی جائے نیز دینی تعلیم و تربیت کے نظام کو

ہر سطح پر مربوط و منظم کیا جائے۔

مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانے اور ان کے دینی تشخص اور علاقائی خودمختاری کی بحالی کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔

مسلم ممالک میں قرآن وسنت کی عملداری اور شرعی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کر کے تمام مسلم ملکوں کو عالمی سطح پر کنفیڈریشن کی صورت میں خلافت اسلامیہ قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

دینی جذبہ وغیرت کے تحت ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں ہتھیار اٹھانے والے مجاہدین کو عالمی استعمار کے ہاتھوں ذبح کرانے اور ان کے قتل عام پر خوش ہونے کی بجائے ان کو بچانے کی کوشش کی جائے اور اس عظیم قوت کو ضائع ہونے سے بچانے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرتے ہوئے انہیں ملت اسلامیہ کے لیے حقیقی معنوں میں ایک کارآمد قوت بنانے کی راہ نکالی جائے۔

اسلامی تعلیمات قرآن وسنت کے قوانین اور جہاد کے بارے میں عالمی استعمار اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے یکطرفہ اور معاندانہ پروپیگنڈہ سے متاثر و مرعوب ہونے کی بجائے اس کو مسترد کیا جائے اور دلیل و منطق کے ساتھ اسلامی احکام اور جہاد کی ضرورت و افادیت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ یہ کام دراصل مسلم حکومتوں کے کرنے کے ہیں اور انہیں او آئی سی کے عملی ایجنڈے کا حصہ ہونا چاہئے لیکن اگر دینی مراکز اور اسلامی تحریکات بھی باہمی ربط و مشاورت کے ساتھ ان مقاصد کے لیے مشترکہ پیش رفت کا اہتمام کر سکیں تو حالات کو خاصا بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

جہاد، مستشرقین اور مغربی دنیا

۵۔اگست کو ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک سیمینار تھا جو مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی کے ادارے میں "ندوۃ الشباب الاسلامی العالمی" سعودی عرب کے تعاون سے منعقد کیا گیا۔ حافظ عبدالرحمٰن مدنی اہل حدیث علمائے کرام میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا روپڑی خاندان سے تعلق ہے اور وہ روایتی مسلکی دائرے پر اکتفا کرنے کے بجائے وسیع تر ملی مفاد کے ماحول میں کام کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا ادارہ "مجلس التحقیق الاسلامی" اور ماہوار جریدہ "محدث" نوجوان علما میں آج کے معروضی مسائل پر غور و تحقیق کا ذوق بیدار کرنے اور دینی حلقوں کو ان کی طرف توجہ دلانے کی سعی میں مصروف ہیں، جبکہ "ندوۃ الشباب الاسلامی" ریاض کی طرف سے ڈاکٹر قاری محمد انور اس پروگرام کے لیے تشریف لائے ہوئے ہیں۔

مجھے ان دونوں حضرات نے اس سیمینار میں "جہاد" کے بارے میں گفتگو کی دعوت دی اور جہاد کے حوالے سے پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات پر کچھ گزارشات پیش کرنے کے لیے کہا جو میرا ادل پسند موضوع ہے۔ اس لیے سیمینار میں حاضر ہو گیا اور جب ہال میں پہنچا تو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے صدر پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر مستشر قین کے طریق واردات کو اپنی گفتگو میں بے نقاب کر رہے تھے۔ حافظ محمود اختر میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم دونوں نے قرآن کریم ایک ہی استاد سے حفظ کیا ہے۔ ہمارے استاد محترم حافظ قاری محمد انور صاحب ایک عرصہ تک گکھڑ میں پڑھاتے رہے ہیں اور اب کم و بیش بیس سال سے مدینہ منورہ میں تحفیظ القرآن کے ایک مدرسے میں قرآن کریم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ کبھی کبھار مدینہ منورہ میں حاضری کے موقع پر انہیں مسجد نبوی ﷺ میں شاگردوں سے منزل سنتے دیکھتا ہوں تو رشک و افتخار کی ایک عجیب سی

کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حافظ محمود اختر صاحب کی گفتگو میں مستشرقین کی فکری جدوجہد اور طریق واردات کی باتیں سن کر میرے ذہن میں بھی یہ داعیہ پیدا ہوا کہ جہاد پر کیے جانے والے اعتراضات کا مستشرقین کے حوالے سے ہی جائزہ لے لیا جائے ورنہ سیمینار کے منتظمین کی طرف سے مجھے کہا گیا تھا کہ میں جہاد کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی اور بعض دیگر شخصیات کے موقف کا جائزہ لوں جو جہاد کو آج کے دور میں منسوخ قرار دے رہے ہیں یا اس کے بارے میں معذرت خواہانہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے اس میں طرح طرح کی تاویلات پیش کر رہے ہیں۔ مگر میں نے اپنی گفتگو کی تمہید میں عرض کیا کہ جہاں اصل فریق سامنے ہو اور اس سے براہ راست بات کرنا ممکن ہو تو پھر نمائندوں سے گفتگو کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا، اس لیے میں اصل فریق یعنی مستشرقین کو سامنے رکھ کر بات کروں گا۔ میں ابھی گفتگو کے ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ بزرگ اہل حدیث عالم دین مولانا محمد یحییٰ عزیز میر محمدی تشریف لائے اور مجھے بتایا گیا کہ وقت کم ہے اور انہوں نے بھی خطاب کرنا ہے، لہٰذا میں نے بڑے اختصار کیساتھ کچھ معروضات پیش کیں، جن کا خلاصہ قارئین کی معلومات کے لیے اصلاح شدہ صورت میں چند ضروری اضافوں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

جہاد کی فرضیت اسلام کے جاری کردہ احکام میں سے نہیں ہے بلکہ کلمہ حق کی سربلندی اور انسانی سوسائٹی پر آسمانی تعلیمات کی بالادستی کے لیے جہاد اس سے قبل بھی ہوتا رہا ہے اور قرآن کریم نے اس جہاد کے مختلف مراحل کا تذکرہ بھی کیا ہے جہاد کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے، چنانچہ کتاب استثنا ۱۰:۲۰ میں جہاد کا حکم اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا، اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لیے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گزار بن کر تیری خدمت کریں اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا، لیکن عورتوں اور بال بچوں کو اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال کو اپنے لیے رکھ لینا''

اس کے ساتھ ہی جناب نبی اکرم ﷺ کی اس ہدایت کو بھی دیکھ لیا جائے جو انہوں نے اپنے متعدد کمانڈروں کو جہاد کے لیے بھیجتے وقت دی ہے کہ جب تم دشمن کے سامنے جاؤ تو پہلے اسلام قبول کرنے کی دعوت دو، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ہمارے بھائی ہیں اور اگر وہ یہ دعوت قبول نہ کریں تو جزیہ دے کر اسلام کی بالادستی قبول کر لیں۔ اس صورت میں انہیں جان و مال اور آبرو کا تحفظ حاصل ہوگا، اپنے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہب پر عمل کرنے، اس کی تعلیم اپنے اور اپنی عبادت گاہوں کو قائم و آباد رکھنے کا حق حاصل ہوگا اور مسلمان ان کی جان و مال کے تحفظ کے ضامن ہوں گے۔ اور اگر وہ اس کو بھی قبول نہ کریں تو پھر ان سے جنگ کرو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کا مقصد کافروں کو زبردستی اسلام قبول کرانا نہیں بلکہ انہیں اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ بے شک اپنے مذہب پر قائم رہیں، اس پر آزادی کے ساتھ عمل کریں اور اپنے دائرے میں اس کی تعلیم بھی دیں لیکن انسانی سوسائٹی پر آسمانی تعلیمات کی بالادستی اور فروغ میں رکاوٹ نہ بنیں اور ان کے مقابل نہ ہوں، کیونکہ آسمانی تعلیمات کا یہ حق ہے کہ ان کا انسانی آبادی میں کسی روک ٹوک کے بغیر فروغ ہو اور ان کی دعوت و تعلیم کی راہ میں کوئی مزاحم نہ ہو۔ البتہ بائبل کی تعلیمات اور حضور نبی اکرم ﷺ کی ہدایات میں چند فرق ضرور موجود ہیں جن کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

صلح کی صورت میں بائبل کا حکم یہ ہے کہ مقامی آبادی باج گزار بن کر فاتحین کی خدمت کرے جبکہ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کی رو سے انہیں صرف ''جزیہ'' دینا ہوگا اور انہیں اس کے عوض جان و مال کا تحفظ، مذہبی آزادی اور دیگر تمام شہری حقوق حاصل ہوں گے اور انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا۔

فتح کی صورت میں بائبل نے دشمن کے تمام مردوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے مگر اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے۔ اس طرح شہر کے سارے مال کو غنیمت بنانے کا حکم بائبل میں تو موجود ہے جبکہ اسلام میں غنیمت صرف وہی ہے جو میدان جنگ میں حاصل ہو۔ شہروں کی لوٹ مار کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ لیکن ان باتوں سے قطع نظر بائبل کا حوالہ دینے سے میری غرض یہ ہے کہ جہاد کا حکم اسلام کا کوئی امتیازی حکم نہیں ہے بلکہ یہ سابقہ آسمانی مذاہب کے احکام کا تسلسل ہے جسے اسلام نے بھی باقی رکھا اور اس پر پہلے سے بہتر انداز میں عمل جاری رکھا ہے۔

مذہب کے لیے تلوار اٹھانے اور قوت استعمال کرنے کا یہ حکم مسیحیوں اور مسلمانوں میں موجود رہا ہے۔ مسیحیوں نے اسے لوگوں کو زبردستی اپنے مذہب میں لانے کے لیے صدیوں تک استعمال کیا ہے جیسا کہ سپین میں مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنانے اور یورپ کے مختلف ملکوں میں یہودیوں کو ان کے مذہب سے دست بردار ہونے کے لیے لاکھوں افراد کا قتل عام تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے، مگر مسلمانوں نے اسلام قبول کرانے کے لیے کبھی تلوار کا استعمال نہیں کیا اور کسی سے اسلحہ کی نوک پر کلمہ نہیں پڑھایا۔ البتہ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کی راہ میں مزاحمت کرنے والوں سے ضرور جنگ کی ہے اور اسی کا نام جہاد ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس صورت حال میں تبدیلی اس وقت آئی جب یورپ نے اپنے مذہب کے جمود، مذہبی قیادت کی تنگ نظری اور چرچ کی ظالمانہ روش سے بے بس ہو کر مذہب سے بغاوت کر دی اور سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے مذہب کو بے دخل کر دیا۔ انہوں نے مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیا اور سوسائٹی کے ساتھ اس کے تعلق کو منقطع کر دیا تو اس کے باعث ان کے نزدیک مذہب کے لیے ہتھیار اٹھانا ممنوع قرار پایا اور ''مقدس جنگ'' کا تصور ان کے ہاں ختم ہو گیا مگر انہوں نے سوسائٹی کی فکری بنیاد کے طور پر جس چیز کو مذہب کے متبادل کا درجہ دیا، اس کے لیے طاقت اور ہتھیار کے استعمال کا جواز ان کے ہاں نہ صرف موجود ہے بلکہ اس میں روز بروز ترقی اور پیش رفت ہو رہی ہے۔

مغرب نے سوسائٹی کی بنیاد نیشنلزم، سولائزیشن اور تہذیب و ثقافت کو قرار دیا جو مذہب کا متبادل ہیں اور قوم و ملک اور سولائزیشن کے لیے طاقت کے استعمال کو نہ صرف مغرب نے جائز قرار دے رکھا ہے بلکہ کئی بار اس کا خوف ناک مظاہرہ بھی کر چکا ہے۔ اقوام متحدہ نے اپنے قوانین میں نیشنلزم کی بنیاد پر سرحدوں کو جائز قرار دے کر ایک دوسرے کے خلاف طاقت کے استعمال سے روکا ہے مگر کسی ایک طرف سے طاقت کے استعمال کی صورت میں دوسرے کو دفاع میں ہتھیار اٹھانے کا حق دیا ہے، حتیٰ کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ (۱) امن کو لاحق خطرہ (۲) امن و امان کو توڑنے اور (۳) ظلم و تعدی کے کسی واقعہ کی صورت میں وہ کسی بھی ملک پر پابندیاں عائد کر سکتی ہے اور اگر ان پابندیوں سے کام نہ چلے تو

سلامتی کونسل کو فوج کشی کا حق بھی حاصل ہے۔ یہ فوج کشی سلامتی کونسل کا حق ہے اور سلامتی کونسل کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی نمائندہ کہلاتی ہے لیکن پانچ ملکوں کے ویٹو پاور کے حق نے اسے عملاً صرف پانچ ملکوں کی اجارہ داری کی علامت بنا دیا ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی اجازت سے امریکہ نے افغانستان کے خلاف جو فوج کشی کی اور عراق پر امریکی اتحاد کا پہلا حملہ بھی سلامتی کونسل کی اجازت سے ہوا تھا، ان حملوں کے جواز کے بارے میں مغربی لیڈروں نے جو کچھ کہا وہ تاریخ کے ریکارڈ میں ثبت ہو چکا ہے۔ ان میں سے صرف دو باتوں پر غور کر لیجیے۔ ایک یہ کہ افغانستان اور عراق اقوام متحدہ کے طے کردہ نظام سے بغاوت کر رہے ہیں اور اس کی پابندیوں سے انحراف کے مرتکب ہوئے ہیں اور دوسرا یہ کہ جمہوریت اور سولائزیشن کے تحفظ کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ سوال یہ ہے کہ اقوام متحدہ کا نظام اور مغرب کی سولائزیشن دنیا بھر سے خود کو منوانے کے لیے طاقت کا وحشیانہ استعمال کر رہی ہے، یہ ورلڈ سسٹم اور مغربی سولائزیشن دونوں یک طرفہ اور جانب دارانہ ہیں جن کی تشکیل اور کنٹرول میں مسلمانوں کو کوئی قابل ذکر حیثیت حاصل نہیں ہے کیا اس نظام اور ثقافت کے فروغ اور تسلط کے لیے طاقت کا استعمال فکر اور عقیدے کے لیے طاقت کا استعمال نہیں ہے؟ فرق صرف تعبیر کا ہے۔ ہم سے مذہب کے لیے قوت کا استعمال ترک کرنے کا مطالبہ کرنے والا مغرب خود مذہب کے اس متبادل کے لیے طاقت کا اندھا دھند استعمال کر رہا ہے جسے اس نے سوسائٹی کی فکری بنیاد کے طور پر مذہب سے دست برداری کے بعد اختیار کر رکھا ہے مگر ہم سے مغرب کا تقاضا کیا ہے؟ اس کی ایک جھلک یورپین مستشرق اینڈرسن کی اس گفتگو میں دیکھی جا سکتی ہے جس کا ذکر عرب دنیا کے معروف عالم دین اور دانش ور استاذ وہبہ زحیلی نے اپنے ایک مقالے میں کیا ہے اور جس میں اینڈرسن نے مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ جہاد کو اسلامی احکام کی فہرست سے نکال دیں اس لیے کہ جہاد آج کے عالمی نظام اور بین الاقوامی اداروں کے قوانین وضوابط سے ہم آہنگ نہیں ہے اور فکر وعقیدے کو طاقت کے زور سے فروغ دینے کا وسیلہ ہے جو حریت اور عقلی ارتقا کے عالمی ماحول کے منافی ہے۔ لیکن جس عالمی نظام اور عقلی ارتقا کو مغرب نے مذہب کے لیے طاقت کے استعمال سے روکنے کا باعث قرار دیا ہے وہ دونوں آج پوری طرح بے نقاب ہو چکے ہیں، جبکہ اقوام متحدہ نے افغانستان، عراق اور دوسرے متعدد ممالک پر

امریکہ کی فوج کشی کو جواز کی سند دے کر ان کی اخلاقی حیثیت ختم کر دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغرب اپنے اس عقیدے سے منحرف ہو گیا ہے کہ طاقت کا استعمال صرف دفاع کے لیے ہو سکتا ہے، فکر و عقیدے کے لیے ہتھیار کا استعمال ناجائز ہے۔ یہ صرف نظری بات ہے اور خوشنما فکری دھوکہ ہے جبکہ امریکہ کے دفاع کے لیے سات سمندر پار پیشگی فوجی حملوں اور سولائزیشن کے تحفظ کے لیے عسکری قوت کے بے محابا استعمال نے اس کو صرف ایک کھوکھلے نعرے کی حیثیت دے دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مغرب نے اسلام کے اس فلسفے کو عملاً تسلیم کر لیا ہے کہ قوت کا استعمال صرف دفاع کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کسی عقیدے اور تہذیب کی بالادستی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنے کے لیے بھی طاق کا استعمال ناگزیر ہوا کرتا ہے۔ میرے نزدیک یہ آج کے دور میں اسلام کی اخلاقی فتح ہے۔

اب میں آتا ہوں اس بات کی طرف کہ ہمارے بعض حلقوں میں اسلام کے نام پر جہاد کے بارے میں گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران جو فکری تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب مغرب نے مذہب کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہو کر مذہب کے لیے تلوار اٹھانے کو ممنوع قرار دے دیا تو ہمارے بعض دانش وروں کے ذہنوں میں بھی یہ خیال پیدا ہوا۔ مرزا غلام احمد قادیانی طرز کے بعض لوگوں نے جہاد کو سرے سے منسوخ قرار دینے میں ہی عافیت سمجھی، لیکن ذہنی طور پر اس مقام پر نہ پہنچنے والے بعض دانش وروں نے جہاد کے، احکام اور فرضیت میں ایسی تاویلات کو ضروری قرار دیا جن سے جہاد کے تصور کو مغرب کے جدید فکر کے زیادہ سے زیادہ قریب لایا جا سکے اور مغرب کو مطمئن کیا جا سکے کہ ہم بھی مذہب کے لیے تلوار اٹھانے کے حق میں نہیں ہیں۔ میں اس سلسلے میں سب کو ایک درجے میں نہیں سمجھتا اس لیے کہ بہت سے حضرات مرعوبیت کا شکار ہوئے اور شعوری طور پر انکی کوشش رہی کہ جہاد کے حکم کو اسلامی تعلیمات کی فہرست سے نکال دیا جائے مگر بعض ایسے حضرات بھی ہیں جو لاشعوری طور پر اس فریب کا شکار ہیں اور بڑے خلوص کے ساتھ اسلام کی تصویر کو آج کے عالمی منظر میں درست اور قابل قبول بنانے کے لیے جہاد کو ایسے انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے مغرب کو تعرض نہ ہو لیکن میرا خیال ہے کہ اب اس تکلف کی ضرورت نہیں رہی۔ مغرب نے صرف دفاع کے لیے طاقت کے استعمال کے نام نہاد فلسفے کا بھانڈا خود ہی بیچ چورا

ہے میں چھوڑ دیا ہے، اس لیے ہمیں کسی معذرت خواہی کی ضرورت نہیں ہے اور بحمد اللہ ہم نے کبھی اس معذرت خواہی کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ جس طرح مغرب اپنی سولائزیشن کے فروغ اور اپنے قائم کردہ یک طرفہ ورلڈ سسٹم کے تحفظ کے لیے خود اپنے لیے طاقت کے پیشگی استعمال کا حق مانگتا ہے، اسی طرح اسلام کا بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنے سسٹم کے تحفظ کو سوسائٹی میں بروئے کار لانے اور اپنے عقیدہ وثقافت کے فروغ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرے۔

باقی رہی ورلڈ سسٹم اور مغربی سولائزیشن کی بات تو ہم کسی جھجک کے بغیر یہ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ یک طرفہ، جانب دارانہ، استحصالی، ظالمانہ اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی ہے اور ہمارے لیے کسی سطح پر بھی قابل قبول نہیں ہے۔ جو لوگ اس پر ایمان لا چکے ہیں اور اسے جائز اور حق تصور کرتے ہیں، وہ اس کا دفاع کریں اور اس کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے اسلامی احکام میں تاویلات کا شوق بھی پورا کرتے رہیں مگر ہم اسے یکسر مسترد کرتے ہیں۔ عالم اسلام کے دینی حلقوں اور علمی مراکز سے ہماری ہمیشہ یہ گزارش رہی ہے کہ وہ موجودہ ورلڈ سسٹم، اقوام متحدہ کے نظام اور مغربی سولائزیشن کے بارے میں اپنا موقف اجتماعی طور پر سامنے لائیں اور متفقہ طور پر مغرب پر واضح کر دیں کہ یہ سسٹم اور سولائزیشن دونوں ہمارے لیے ناقابل قبول ہیں اور ہم ان کی خاطر اسلامی تعلیمات اور احکام وقوانین میں کسی ردو بدل اور تاویل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

کیا افغان مجاہدین کی جنگ

مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے؟

۱۲۔ ۱۳ نومبر ۱۹۸۹ء کو جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور میں حرکۃ الجہاد الاسلامی (عالمی) کا سالانہ اجتماع ہوا جس کی صدارت حرکۃ الجہاد الاسلامی (عالمی) کے امیر مولانا قاری سیف اللہ اختر نے کی اور اس کی مختلف نشستوں سے ملک کے اکابر علماء کرام اور زعماء نے خطاب فرمایا۔ مدیر ''الشریعہ'' نے اپنے خطاب میں جہاد افغانستان کے بارے میں مختلف حلقوں کی طرف سے اٹھائے جانے والے اہم سوالات کا جائزہ لیا۔ ان کا خطاب درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

جناب صدر، قابل صد احترام علماء کرام اور میرے مجاہد بھائیو!

میں حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا قاری سیف اللہ اختر کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس اجتماع میں حاضری اور جہاد افغانستان کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ وقت مختصر ہے اور علماء کرام کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے آپ سے مخاطب ہونا ہے اس لیے انتہائی اختصار کے ساتھ کسی تمہید کے بغیر جہاد افغانستان کے بارے میں عام طور پر کیے جانے والے دو اہم سوالوں کا جائزہ لوں گا۔

میرے محترم بھائیو! آپ حضرات میں بہت سے دوست وہ ہیں جو محاذ جنگ پر جا کر عملاً جہاد میں شریک ہو چکے ہیں اور بہت سے نوجوان ایسے ہیں جن کے دلوں میں جہاد کا جذبہ موجزن ہے اور وہ محاذ جنگ پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ جہاد

افغانستان کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے شکوک کا جائزہ لیا جائے تا کہ ذہنوں میں کسی قسم کا خلجان نہ رہے۔

حضرات محترم! جہاد افغانستان کے بارے میں اس وقت جن دو سوالوں پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ جب روسی افواج افغانستان سے چلی گئی ہیں تو اب جہاد جاری رکھنے کا شرعی جواز کیا باقی رہ گیا ہے؟ اور کیا افغانستان میں ہونے والی موجودہ جنگ مسلمان کی مسلمان کے ساتھ جنگ نہیں ہے؟۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ افغان مجاہدین نے اب تک جو جنگ لڑی ہے اس میں انہیں امریکہ پاکستان اور دوسرے ممالک کی پشت پناہی حاصل تھی مگر اب ان ممالک کی پالیسیوں میں تبدیلی نظر آ رہی ہے اور پشت پناہی اور امداد کی پہلی کیفیت باقی نہیں رہی۔ ان حالات میں افغانستان کی جنگ اب کس حال میں ہے؟ اس کا مستقبل کیا ہے؟ اور اس کے جیتنے کے امکانات کس حد تک ہیں؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جہاد افغانستان کا اصل ہدف کیا تھا یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ افغان مجاہدین نے روسی فوجوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا۔ اس لیے روسی فوجوں کی واپسی کے ساتھ ہی یہ جہاد ختم ہو گیا ہے کیونکہ جب افغانستان میں جہاد کا آغاز ہوا تھا اور افغانیوں نے جہاد کا فتویٰ دے کر ہتھیار اٹھائے تھے اس وقت افغانستان میں روسی فوجوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ افغان علماء نے کابل میں کمیونسٹ نظام کے تسلط اور اسلامی اقدار و روایات کے خلاف کابل کی کمیونسٹ حکومت کے اقدامات کے علی الرغم علم جہاد بلند کیا تھا۔ روسی فوجیں تو بہت بعد میں آئی ہیں اور اس وقت آئی ہیں جب افغان مجاہدین باقاعدہ عملی جنگ کے ذریعے افغانستان کا ایک اچھا خاصا علاقہ کابل کی کمیونسٹ حکومت کے تسلط سے آزاد کرا چکے تھے۔ روسی فوجیں کابل میں اپنی حکومت اور نظام کو بچانے کے لیے آئی ہیں اور کمیونسٹ انقلاب کو مجاہدین کے ہاتھوں شکست سے بچانے کے لیے جنگ میں شریک ہوئی ہیں۔ اس پس منظر میں آپ دیکھیں کہ کابل میں جس کمیونسٹ حکومت اور کمیونسٹ نظام کے خلاف افغان مجاہدین نے جہاد کا آغاز کیا تھا کیا اس کا خاتمہ ہو گیا ہے؟ اگر کابل کی حکومت موجود ہے اور اپنے نظریاتی موقف اور نظام و انقلاب پر قائم ہے تو اس کے خلاف افغان مجاہدین کا جہاد بھی

اپنی مکمل شرعی حیثیت کے ساتھ جاری ہے۔ یہ جس طرح پہلے دن شرعی جہاد تھا آج بھی شرعی جہاد ہے اور اس وقت تک شرعی جہاد رہے گا جب تک کابل پر کمیونسٹ انقلاب کا تسلط ختم نہیں ہو جاتا اور اس کی جگہ ایک خالص نظریاتی شرعی حکومت قائم نہیں ہو جاتی۔

دوسری گذارش سوال کے اس پہلو کے بارے میں ہے کہ یہ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے اور دونوں طرف سے مسلمان ہلاک ہو رہے ہیں۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا کہ جو نام نہاد مسلمان کفر کی حمایت وحفاظت کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں ان کا مسلمان ہونا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے میں انہی بھائیوں کی زبان میں بات کرتا ہوں جو کہتے ہیں کہ یہ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے اس لیے شرعاً اسے جہاد کہنے کا جواز باقی نہیں رہا۔

دیکھئے جس نوعیت کی جنگ آج افغان مجاہدین روسی استعمار کے خلاف لڑ رہے ہیں اسی طرح کی جنگ ہمارے اکابر نے برٹش استعمار کے خلاف لڑی تھی۔ برطانوی استعمار نے اسی طرح برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش پر قبضہ کر کے اپنا نظام مسلط کیا تھا اور ہمارے بزرگوں نے علماء حق نے اکابر نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور علماء حق نے مختلف اوقات میں مختلف محاذوں پر انگریزوں سے جنگ لڑی تھی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان جنگوں میں فرنگی کی فوجوں میں مسلمان تھے یا نہیں تھے؟ کئی ریاستوں کے مسلم حکمران اور ان کی فوجیں فرنگی مقاصد کے لیے مجاہدین آزادی کے خلاف جنگ میں شریک ہوئی تھیں یا نہیں؟ شہدائے بالاکوٹ کو دیکھ لیجئے۔ امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور امام المجاہدین شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے جن سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا کیا ان کے ساتھ مسلمان نہیں تھے؟ کیا کفار کی فوج میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے شریک ہو جانے سے یہ جنگ مسلمان اور مسلمان کی جنگ بن گئی تھی اور شرعی جہاد نہیں رہا تھا؟

۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کو دیکھ لیجئے۔ ہم آج تک اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ مسلمان کہلانے والے نوابوں، جاگیرداروں سرداروں، خان بہادروں اور وڈیروں نے اس جنگ میں انگریز کا ساتھ دیا تھا، انگریزی فوج کو سپاہی مہیا کیے تھے۔ ہم مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے خاندان کی انگریزی حکومت سے وفاداری ثابت کرنے کے لیے مرزا قادیانی کی کتابوں سے یہ حوالے دیتے ہیں کہ اس کے باپ نے اور دادا نے انگریزی فوج کے لیے

۱۸۵۷ء میں سینکڑوں گھوڑے اور سپاہی مہیا کیے۔ کفر کا فتویٰ تو مرزا غلام احمد پر اس کے دعوائے نبوت کی وجہ سے لگا ہے۔ اس کے باپ اور دادا پر تو کسی نے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا تھا۔ کیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے فرنگی فوجوں میں شامل ہو جانے سے اس کا جہاد ہونا مشکوک ہو گیا تھا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے کیونکہ ہم سب یہ مانتے ہیں کہ شہدائے بالاکوٹ کی جنگ شرعاً جہاد تھی اور ۱۸۵۷ء کا معرکہ شرعاً جہاد تھا تو افغان مجاہدین کی جنگ بھی مسلمان اور مسلمان کی جنگ نہیں بلکہ شرعی جہاد ہے۔

ایک بات میں علماء کرام سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی مسلمان کفر کے نظام کا حمایتی بن جائے۔ اور نظام کفر کی فوج میں شامل ہو کر جنگ میں مسلمانوں کے مقابل آجائے تو اس کا حکم شرعاً کیا ہے کیا اس کو گولی مارنے سے اس لیے گریز کریں گے کہ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور کیا اس کو گولی مارنے سے اس جنگ کی شرعی حیثیت تبدیل ہو جائے گی؟

میرے محترم بزرگو اور بھائیو! یہ سب پروپیگنڈا ہے اور جہاد افغانستان کو سبوتاژ کرنے کی سازش ہے جس کا مقصد مجاہدین کے حوصلوں کو پست کرنے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کی حمایت سے روکنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اب آیئے دوسرے سوال کی طرف کہ امریکہ اور پاکستان کی افغان پالیسی میں محسوس کی جانے والی منفی تبدیلی کے بعد جہاد افغانستان کس حال میں ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ کہنا ہی خلاف واقعہ ہے کہ افغان مجاہدین نے یہ جہاد امریکہ اور دوسرے ممالک کی پشت پناہی کی وجہ سے شروع کیا تھا کیونکہ جب افغان علماء نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور ان کی قیادت میں مجاہدین پہلے کابل حکومت اور پھر روسی فوجوں کے خلاف صف آراء ہوئے تھے تو امریکہ اور دوسرے حمایتیوں کا کہیں دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس وقت تو یہ سمجھا جا رہا تھا یہ چند بے وقوف مولوی ہیں۔ روسی فوجوں سے ٹکرانا ان کے بس کی بات نہیں۔ دو چار ہفتوں میں صاف ہو جائیں گے لیکن جب مجاہدین ڈٹے رہے اور انہوں نے افغانستان کا کم از کم چالیس فی صد علاقہ روسی فوجوں کے تسلط سے محفوظ کر لیا تو امریکہ اور دوسری طاقتیں متوجہ ہوئیں اور انہوں نے افغان مجاہدین کی عملی امداد کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جہاد افغانستان کے آغاز کے بعد کم از کم تین سال تک

مجاہدین نے تنِ تنہا جنگ لڑی ہے روسی فوجوں کا اسلحہ چھین کر لڑی ہے بے سروسامانی کی حالت میں لڑی ہے فقر و فاقہ اور کسمپرسی کے عالم میں لڑی ہے اور ایمانی قوت کے ساتھ میدان میں ڈٹ کر دنیا کو بتایا ہے کہ ایمان اور جذبہ آج بھی دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔

دوسری بات یہ ذہن میں رکھیں کہ امریکہ کی امداد کے بارے میں مجاہدین اور ان کے ہمنوا کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں رہے کہ یہ آخر وقت تک جاری رہے گی۔ سب جانتے ہیں کہ یہ امداد اپنے مفادات کے لیے امریکہ نے دی ہے جب تک روسی فوجیں افغانستان میں موجود تھیں امریکہ کا مفاد اس میں تھا کہ مجاہدین کو امداد دی جائے اور انہیں مضبوط کیا جائے اور جب روسی فوجیں چلی گئی ہیں تو امریکہ کا مفاد اس میں ہے کہ مجاہدین کو کمزور کیا جائے اور کابل پر ان کی حکومت کو قائم ہونے سے ہر قیمت پر روکا جائے۔ یہ صرف امریکہ کا مفاد نہیں بلکہ اسلام آباد ڈھاکہ انقرہ، قاہرہ، خرطوم، جکارتہ اور دوسرے تمام مسلم دارالحکومتوں کا مشترکہ مفاد ہے کیونکہ اگر کابل میں خالص نظریاتی شرعی حکومت قائم ہو جاتی ہے تو مسلم ممالک کے دارالحکومتوں میں منافقت کا اسلام کابل کی اسلامی حکومت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اسے میدان سے ہٹنا پڑتا ہے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور مسلم ممالک میں منافقت اور دکھاوے کے اسلام کی شکست ہے اس کے مفادات کی شکست ہے اور عالم اسلام پر اس کی بالادستی کی شکست ہے۔ اس لیے سب مل کر اس گٹھ جوڑ میں مصروف ہیں کہ کابل پر مجاہدین کی حکومت قائم نہ ہونے دی جائے اور ظاہر شاہ یا اس قسم کے کسی اور نام سے دکھاوے کی مسلمان حکومت کابل میں بھی قائم کرا دی جائے لیکن میں افغان مجاہدین اور جہاد افغانستان کے زعماء کی بصیرت و جرأت کو سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے گٹھ جوڑ کو مسترد کر دیا ہے وہ لمبی جنگ لڑنے کے لیے تیار ہیں مگر کفر اور منافقت کے ساتھ مفاہمت پر آمادہ نہیں ہیں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ صورت حال کچھ بدل گئی ہے، حالات میں تغیر آیا ہے مجاہدین کی مشکلات بڑھی ہیں۔ ان کی جنگ لمبی ہو گئی ہے۔ آزمائش کا عرصہ طویل ہو گیا ہے لیکن جہاد کی کامیابی کا راستہ یہی ہے۔ کفر و منافقت کی مکمل شکست اور اسلام کی مکمل بالادستی کا راستہ یہی ہے۔

میں نے مجاہدین کو محاذ جنگ پر دیکھا ہے ان کے مورچوں میں گیا ہوں اور ان کے عزم و حوصلہ کا مشاہدہ کیا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ مشکلات ان کی راہ میں حائل نہیں ہوں گی۔ میرا

تجزیہ یہ ہے کہ جہادِ افغانستان اپنی فطری رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ اور اسلام آباد کے رویہ میں تبدیلی کے باوجود مجاہدین کے قدم رُکے نہیں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور فطری رفتار میں بڑھ رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب مجاہدین کابل پر شریعت اسلامیہ کی بالادستی کا پرچم لہرائیں گے اور میرے نزدیک وہ دن جہاد کے اختتام کا نہیں ہوگا بلکہ وہ دن پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں استعماری نظاموں اور منافقت کے اسلام کے خلاف جہاد کے آغاز کا دن ہوگا۔ خدا ہمیں وہ دن جلدی دکھائے اور اس دن کے لیے خود کو تیار رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِیْنَ۔

بیت المقدس ۔ تاریخی پس منظر

برطانیہ کے شہر ہڈرسفیلڈ میں مرکزی جمعیۃ علماء برطانیہ کے زیر اہتمام ''القدس کانفرنس'' منعقد ہوئی جس کی صدارت مولانا ڈاکٹر اختر الزمان غوری نے کی اور اس سے مولانا حافظ محمد اسحاق آف راولپنڈی، مولانا امداد الحسن نعمانی، مولانا قاری عبد السلام، مولانا محمد عرفان غوری، مفتی زبیر ڈوڈا، مولانا محمد قاسم، مولانا حافظ محمد اکرم، مولانا مفتی محمد نذیر اور دیگر علماء کرام کے خطابات کے علاوہ حضرت مولانا زاہد الراشدی کو بھی بیت المقدس اور فلسطین کے مسئلہ پر کچھ بیان کرنے کا موقع ملا ان کے بیان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

بیت اللہ کی طرح بیت المقدس بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اور اس کی تعمیر بیت اللہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد ہوئی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ تعمیر کر کے وہاں اپنے ایک بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور فلسطین میں بیت المقدس تعمیر کر کے وہاں دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو بسا دیا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا عظیم الشان سلسلہ قائم فرمایا۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے اور انہی کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے اس خاندان کو اپنے دور میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی عظمتوں سے نوازا ہے اور دین و دنیا کی شوکتیں عطا فرمائی ہیں۔ ہزاروں نبی اس خاندان میں پیدا ہوئے چار بڑی آسمانی کتابوں میں سے تین یعنی تورات، زبور اور انجیل اس خاندان کے نبیوں پر نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے دنیوی بادشاہت بھی ایسی عطاء فرمائی کہ پھر ایسی حکومت کسی کو نہ مل سکی قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ: رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا

يَنۢبَغِىْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (ص ۳۸:۳۵) یا اللہ مجھے ایسی بادشاہت دے جو میرے بعد کسی اور کو نہ ملے۔ یہ دعاء قبول کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے انہیں انسانوں، جنوں، جانوروں، ہوا اور سمندر پر حکمرانی عطا فرمائی اور بے پناہ قوت و اقتدار سے نوازا لیکن جب یہی بنی اسرائیل سرکشی اور نافرمانی پر آ گئے اور انہوں نے بغاوت کی ساری حدوں کو عبور کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسری اقوام کے ذریعہ سزا دی بیت المقدس کئی باران کے ہاتھ سے نکلا اور دنیا کی متعدد جابر قوموں نے عذاب الٰہی بن کر بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً برباد کر دیا لیکن پھر جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اپنے گناہوں سے توبہ کی تو خالق کائنات نے ان کا ہاتھ تھاما اور ان کی مدد کر کے انہیں بیت المقدس کی حکمرانی پر بحال کر دیا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے دو جنگوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ایک بار جب بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں فرعون کے مظالم سے نجات ملی اس کی غلامی سے آزاد ہو کر انہوں نے بحیرۂ قلزم عبور کرتے ہوئے صحرائے سینا میں پڑاؤ کیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت بحیرہ قلزم میں غرق ہو گیا تو اس کے بعد بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ وہ ''بیت المقدس'' کو اس وقت کی جابر قوم سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کریں اور اس مقدس شہر پر اپنا اقتدار بحال کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل سے اپنی مدد کا وعدہ کیا اور جہاد میں کامیابی کی ضمانت دی مگر غلامانہ ذہنیت کی حامل قوم کی نظر ظاہری اسباب سے آگے نہ جا سکی اور انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر یقین نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف طور پر کہہ دیا کہ ''بیت المقدس'' پر قابض قوم بڑی طاقتور اور جابر ہے اور ہم کسی طرح اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے: قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدہ ۵:۲۴) حضرت موسیٰ اور ان کا خدا دونوں جا کر جنگ کریں جب وہ کامیاب ہو کر اس طاقتور قوم کو بیت المقدس سے نکال دیں گے تو ہم وہاں داخل ہو جائیں گے اس وقت تک ہم یہیں بیٹھے ہیں اور جہاد کے لیے جانے کو قطعاً تیار نہیں ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر چالیس سال تک ''بیت المقدس'' میں داخلہ حرام قرار دے دیا اور وہ چالیس سال تک صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے۔

اس کے بعد نئی نسل آئی جس نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کیا اور بیت المقدس کو آزاد کرایا دوسری جنگ جس کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے وہ جالوت بادشاہ کے زمانے میں ہوئی جو اپنے وقت کا سب سے جابر اور ظالم حکمران تھا اور اس نے بنی اسرائیل پر مظالم کی انتہاء کردی تھی (سورۃ البقرہ رکوع نمبر ۳۲، ۳۳ میں اس کا ذکر موجود ہے) اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت" کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا کر جالوت کے خلاف جہاد کا حکم دیا اور وہ عظیم الشان معرکہ بپا ہوا جس میں ایک طرف حضرت طالوت کی کمان میں صرف تین سو تیرہ مجاہد تھے اور دوسری طرف جالوت کم وبیش ساٹھ ہزار کے لشکر جرار کی کمان کرتا ہوا میدان میں تھا اس جنگ میں خود جالوت کا مقابلہ حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوا جو ابھی نوجوان تھے جالوت سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈھکا ہوا ''بکتر بند لباس'' میں ملبوس تھا اور دو آنکھوں کے سوا اس آہنی لباس میں کہیں کوئی سوراخ نہیں تھا جبکہ دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں مگر حضرت داؤد علیہ السلام سادہ کپڑوں میں ''گوپیا'' ہاتھ میں پکڑے اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے ''گوپیا'' خاص طرز کی غلیل ہوتی ہے جس میں ایک ڈوری کے سرے پر چھوٹا سا پتھر لپیٹ کر ڈوری کو گھماتے ہوئے اسے نشانے پر مارتے ہیں اور وہ پتھر گولی کا کام کرتا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام سامنے آئے تو جالوت کی آنکھ کا نشانہ لے کر پتھر مارا تو وہ سیدھا آنکھ کے سوراخ میں داخل ہو کر دماغ میں گھس گیا اور جالوت وہیں ڈھیر ہو گیا اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فتح سے ہمکنار کیا اور یہ بتایا کہ اصل قوت ظاہری اسباب ووسائل میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت میں ہے۔

یہ وہ دور تھا جب بنی اسرائیل حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے وارث اور علمبردار تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے کفر وجبر کے مقابلہ میں ان کی بہت سے مواقع پر مدد کی لیکن آج صورت حال برعکس ہے بنی اسرائیل کے دونوں گروہ یہودی اور عیسائی آسمانی تعلیمات سے محروم ہو چکے ہیں اور انہوں نے نہ صرف وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کو تاریخ کے دھندلکوں میں گم کر دیا ہے بلکہ وہ انسانی سوسائٹی میں آسمانی تعلیمات کی عملداری سے اعلانیہ طور پر دستبردار بھی ہو چکے ہیں اس لیے انبیاء کرام علیہم السلام کے مولد ومسکن اور مرکز ومستقر ''بیت المقدس'' پر ان کا کوئی استحقاق باقی نہیں رہا اور ''بیت المقدس'' کے وارث صرف اور صرف وہ

مسلمان ہیں جو آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں انسانی سوسائٹی میں وحی الٰہی اور خداوندی قوانین کے نفاذ کے علمبردار اور وحی الٰہی ان کے پاس محفوظ حالت میں موجود بھی ہے اس لیے صرف وہی حضرات انبیا کرام علیہم السلام کی تعلیمات و مشن اور بیت المقدس کے وارث ہیں اور انشاء اللہ العزیز جلد یا بدیر ''بیت المقدس'' پر ان ہی کا اقتدار قائم ہو کر رہے گا۔

آج ''بیت المقدس'' کی بازیابی اور فلسطینی مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کی جدوجہد کے حوالے سے ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر مسلم ممالک کے حکمران طبقات آسمانی تعلیمات سے دستبرداری اور انسانی سوسائٹی پر وحی الٰہی کی حکمرانی سے انکار کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کے ہم خیال ہو چکے ہیں اور وہ عملاً انہی کے کیمپ میں شمار ہوتے ہیں اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں جیسا کردار ادا کر رہے ہیں جنہوں نے جہاد سے انکار کر کے پیچھے بیٹھے رہنے کا مطالبہ کیا تھا اسی لیے ان سے ''جہاد فلسطین'' میں کسی مثبت کردار کی توقع نہیں کی جا سکتی اور اس لحاظ سے اسلامی تحریکات کو بیک وقت دو محاذوں کا سامنا ہے ایک طرف یہود و نصاریٰ بلکہ یہود اور ہندوؤں کی مشترکہ قوت ہے اور دوسری طرف انہی کے مشن کی حامل نام نہاد مسلمان حکومتیں ہیں اس لیے راستہ بڑا کٹھن اور جدوجہد بہت صبر آزما ہے لیکن خدا آج بھی وہی ہے جس نے جالوت جیسے آہن پوش اور کمانڈر کے مقابلہ میں حضرت داؤد علیہ السلام جیسے نہتے نوجوان کو فتح دی تھی اس لیے اگر آج بھی ہم اللہ تعالیٰ کی سب سے طاقتور ''پاور ہاؤس'' کے ساتھ اپنا کنکشن جوڑ لیں اور ایمانی قوت کے ساتھ کفر اور منافقت کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں تو یقیناً دونوں محاذوں پر فتح ہو گی اور آج بھی نہ صرف غلیل سے لڑنے والے مسلمانوں کے ہاتھوں بیت المقدس آزاد ہو گا بلکہ پورے عالم اسلام پر بھی خلافت کا پرچم ایک بار پھر آن بان کے ساتھ لہرا کر رہے گا۔ انشاء اللہ۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹ مارچ ۱۹۹۰ء کو ''الشبان المسلمون سیالکوٹ'' کے زیر اہتمام نماز عصر کے بعد اسلامک پبلک سکول باجوہ سٹریٹ رنگپورہ سیالکوٹ میں تحریک پاکستان کے عظیم راہ نما شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب پروفیسر میاں منظور احمد نے کی اور مدیر الشریعہ مولانا زاہد الراشدی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ تقریب سے ان دونوں حضرات کے علاوہ پروفیسر محمد عبد الجبار شیخ، مولانا محمد انذر قاسمی اور جناب حامد عثمان عبیدی نے بھی خطاب کیا۔ مدیر ''الشریعہ'' کا خطاب درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

آج کی یہ تقریب "الشبان المسلمون" کے زیر اہتمام پاکستان کے عظیم راہ نما شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمات اور جدوجہد کے تذکرہ کے لیے منعقد ہو رہی ہے۔ پہلے پروفیسر محمد عبد الجبار صاحب اور مولانا محمد انذر قاسمی صاحب اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں جبکہ پروفیسر میاں منظور احمد صاحب حضرت علامہ عثمانیؒ کے شاگرد بھی ہیں میرے بعد اظہار خیال کرنے والے ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت ان کی باتیں عرض کرنے کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔ حضرات محترم! شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زندگی کو میں تین حصوں میں تقسیم کروں گا۔ ایک حصہ اس میں سے جب آپ نے دیوبند اور ڈابھیل میں علمی خدمات انجام دیں ہزاروں تشنگانِ علوم کو قرآن وسنت کے علم سے سیراب کیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی

جانشین کی حیثیت سے قرآن کریم کے حواشی مکمل کیے جو قرآن کریم کے اُردو تراجم اور حواشی میں آج بھی سب سے زیادہ وقیع اور جامع شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے مسلم شریف کی شرح فتح الملہم لکھ کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کیا اور میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی علمی خصوصیت یہ ہے کہ حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی طرح علامہ عثمانیؒ بھی اپنے دور کے سب سے بڑے متکلم تھے۔ انہوں نے اسلامی نظریات وعقائد اور احکام و قوانین کو جس زور استدلال کے ساتھ پیش کیا اس کی مثال اس دور میں نہیں ملتی اور علامہ عثمانیؒ کی علمی عظمت کے اعتراف کی ایک جھلک اس واقعہ کے حوالہ سے دیکھی جا سکتی ہے جو میں نے حضرت مولانا عبید اللہ انور نور اللہ مرقدہ کی زبانی سنا۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ العزیز نے ایک دور میں شیرانوالہ لاہور میں اکابر علماء دیوبند کے اجتماع کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ تعالیٰ آف واں بھچراں اور حضرت دین پوری رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے عظیم اکابر بھی موجود تھے اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی تشریف فرما تھے۔ اجتماع میں لاہور کے سرکردہ حضرات کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن میں سرفہرست علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم تھے۔ اس اجتماع میں جب حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے خطاب شروع کیا تو علامہ اقبالؒ سٹیج پر تشریف فرما تھے لیکن چند لمحوں کے بعد وہ سٹیج سے اٹھ کر یہ کہتے ہوئے سامنے سامعین میں بیٹھ گئے کہ ''اس پیکر علم کا خطاب سامنے بیٹھ کر طالب علموں کی طرح سننا چاہیے'' یہ علامہ عثمانیؒ کی علمی عظمت کا اعتراف ہے اور اس سے ان کے علمی مقام کا مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی علمی خدمات اور جدوجہد کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ پہلو میں ان کے شاگرد جناب پروفیسر میاں منظور احمد صاحب کے لیے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں، اس دور کی طرف جس میں علامہ عثمانیؒ نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا بلکہ فیصلہ کن قائدانہ کردار ادا کیا۔ انہوں نے یہ کردار تنہا نہیں بلکہ علماء کی ایک جماعت کے ساتھ تحریک پاکستان میں شرکت کی اور قیام پاکستان کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

ہمارے ہاں ایک بات تسلسل کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ علماء نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور وہ قیام پاکستان کے خلاف تھے۔ یہ تاثر ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت

عام کیا جارہا ہے اور اس کے پیچھے ایک مقصد کارفرما ہے۔ اس سلسلہ میں مقالات ومضامین کی اشاعت ہورہی ہے اور اخبارات میں مہم کے انداز میں کام کیا جارہا ہے۔ گذشتہ سال ایک صاحب نے اسی تاثر کو بنیاد بنا کر ایک اور مقدمہ کھڑا کیا ہے جو کہ مہم کا اصل مقصود ہے۔ انہوں نے اپنے مسلسل مضمون میں یہ مقدمہ قائم کیا کہ علماء نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور قوم نے پاکستان بنا کر علماء کے موقف کو مسترد کردیا جبکہ تحریک پاکستان کی قیادت جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے کی اس لیے پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے علماء کی بیان کردہ تعبیرو تشریح کو بنیاد نہیں بنایا جائے گا۔ بلکہ وہ تعبیر وتشریح اختیار کی جائے گی جو ان کے بقول جدید تعلیم یافتہ طبقہ قرآن وسنت کے لیے ازسر نو طے کرے گا۔ یہ ایک نئی گمراہی کا دروازہ ہے جسے کھولنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ بات مسلسل کہی جارہی ہے کہ علماء نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی تاکہ اس کو نئی گمراہی کی فکری اساس بنایا جاسکے لیکن یہ خلاف واقعہ بات ہے اور جھوٹ ہے کیونکہ سب علماء نے تحریک پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی یہ درست ہے کہ علما کی ایک بڑی جماعت نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی ہم اس سے انکار نہیں کرتے اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں میں اس موقع پر اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ تحریک پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء نے قیام پاکستان کی صورت میں جن خدشات و خطرات کا اظہار کیا تھا پاکستان بننے کے بعد کے چالیس سالہ دور نے ان کی تصدیق کی یا ان کو رد کیا ہے میں اس بحث کی طرف بھی نہیں جاؤں گا کہ قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء کا سیاسی تشخص تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے کس حد تک سہارا بنا ہے اور ان علماء کے سیاسی تشخص نے ان مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ کے لیے کیا رول ادا کیا ہے۔ مباحث میں الجھے بغیر میں کھلے دل سے یہ تسلیم کرتا ہوں کہ علماء کے ایک بڑے طبقہ نے قیام پاکستان کے خلاف کام کیا تھا لیکن اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علماء ہی کے ایک بڑے طبقہ نے قیام پاکستان کی جدوجہد کا ساتھ دیا تھا اور ان کے سرخیل شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تھے۔

تحریک پاکستان کا ساتھ دینے والے انہی علماء میں حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانویؒ بھی تھے جن کے بارے میں خود قائداعظم کا یہ مقولہ تاریخ کے ریکارڈ میں

موجود ہے کہ ہمارے ساتھ ایک اتنے بڑے عالم ہیں کہ ان کا علم ہندوستان کے تمام علماء کے علم پر بھاری ہے۔‘‘

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہدایت پر اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں علماء کرام کی ایک بڑی تعداد تحریک پاکستان میں عملاً شریک ہوئی اور فرداً فرداً نہیں بلکہ ایک باقاعدہ جماعت کی صورت میں انہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔

آج یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان مسلم لیگ نے بنایا میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ تنہا مسلم لیگ نے نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک اور جماعت بھی تھی جو تحریک پاکستان میں شریک تھی اور اس جماعت کا نام ’’جمعیۃ علماء اسلام‘‘ ہے جمعیۃ علماء اسلام کا قیام ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں عمل میں لایا گیا اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو اس کا سربراہ چنا گیا اور اس جماعت نے باقاعدہ پلیٹ فارم قائم کر کے مسلم لیگ کے ساتھ شریک ہو کر تحریک پاکستان میں کام کیا۔ اس میں مولانا اطہر علیؒ جیسے بزرگ تھے۔ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا غلام مرشدؒ، مولانا راغب احسن، مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور دوسرے علماء تھے جنہوں نے تحریک پاکستان کا نظریاتی تشخص اجاگر کیا اور مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ تحریک پاکستان کا نظریاتی اور اسلامی تشخص انہی علماء کی وجہ سے اُجاگر ہوا۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء بھی تھے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی بھی تھے، پیر صاحبؒ آف مانکی شریف بھی تھے، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹیؒ بھی تھے۔ میں تحریک پاکستان میں ان میں سے ہر کردار کا اعتراف کرتا ہوں اور اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ تحریک پاکستان کو اگر اسلامی تحریک سمجھا گیا ہے اور اس کے نظریاتی تشخص پر لوگوں کا اعتماد قائم ہوا ہے تو ان علماء کی وجہ سے ہوا ہے اور عوام نے ان علماء پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے ذہنوں اور دلوں میں تحریک پاکستان کو ایک اسلامی نظریاتی تحریک کی حیثیت سے جگہ دی ہے ورنہ اگر مسلم لیگی قیادت یہ سمجھتی ہے کہ تحریک پاکستان کا نظریاتی تشخص اس کی وجہ سے قائم ہوا تھا تو یہ بات خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے وقت دو علاقوں کے بارے میں فیصلہ ہوا تھا کہ ان علاقوں کے عوام سے ریفرنڈم کے ذریعہ رائے لی جائے کہ وہ پاکستان یا بھارت میں کس کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں؟ ایک صوبہ سرحد تھا جہاں کانگریس کی حکومت تھی اور

ڈاکٹر خان مرحوم اس کے وزیر اعلیٰ تھے اور دوسرا سلہٹ کا علاقہ تھا۔ ان علاقوں میں ریفرنڈم جیتنا کوئی آسان بات نہ تھی اور ریفرنڈم کے لیے جب مہم چلانے کا فیصلہ کیا گیا تو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفیق کار علامہ ظفر احمد عثمانیؒ سے درخواست کی گئی کہ وہ اس مہم کی قیادت کریں۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صوبہ سرحد میں اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سلہٹ میں انتخابی مہم کی قیادت کی۔ ان علاقوں میں مسلم لیگ کی پوزیشن بہت کمزور تھی لیکن یہ ان علماء کی مہم تھی کہ ریفرنڈم کا فیصلہ پاکستان کے حق میں ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ قیام پاکستان کے وقت کراچی میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ہاتھوں قومی پرچم لہرانے کا تاریخی واقعہ دراصل ان دو بزرگوں کے اس کردار اور جدوجہد کا عملی اعتراف تھا جو انہوں نے قیام پاکستان میں کی۔

حضرات محترم! شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی جدوجہد کا تیسرا دور قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی میں ان کی جدوجہد کا دور ہے جب انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے پاکستان کی نظریاتی بنیاد کے تعین کی جنگ لڑی۔ اس حوالہ سے یہ بحث الگ گفتگو کی متقاضی ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر بنا، لا الٰہ الا اللّٰہ کے نعرہ پر بنا اور جسے دنیا کی پہلی اسلامی نظریاتی مملکت کا عنوان دیا گیا۔ اس ملک کے قائم ہوتے ہی اس کی دستور ساز اسمبلی میں یہ مسئلہ کیسے کھڑا ہو گیا کہ ملک کا دستور اسلامی ہونا چاہیے یا سیکولر بنیادوں پر ملک کا نظام ترتیب دیا جائے۔ یہ سوال آخر کیسے اُٹھا؟ اس کا پس منظر کیا تھا؟ اس پر مستقل بحث کی ضرورت ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا تجزیہ کیا جائے، اسے کھنگالا جائے اور اس بات کو معلوم کیا جائے جس نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو ملاازم کی بحث میں الجھا دیا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دستور ساز اسمبلی میں نظریاتی اسلامی دستور کی مخالفت ملاازم، پاپائیت اور تھیا کریسی کے طعن کسے گئے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کا عمومی رجحان غیر اسلامی نظام کی طرح ہو چکا تھا لیکن شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس مہم کا تن تنہا سامنا کیا اور تمام اعتراضات کا منفرد استدلال کے ساتھ مفصل جواب دیتے ہوئے بالآخر اسمبلی کو تسلیم کرا لیا اور قرارداد مقاصد منظور کرا کے پاکستان کی نظریاتی اسلامی بنیاد ہمیشہ کے لیے طے کر دی۔ قرارداد مقاصد کی بنیاد اس پر ہے کہ حاکم حقیقی اللہ تعالیٰ

کی ذات گرامی ہے پاکستان کے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین نافذ کریں گے۔ یہ بات طے ہوگئی اور اب تک ملک کے سیکولر حلقوں کے گلے میں ہڈی بن کر پھنسی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ پھنسی رہے گی۔ قرارداد مقاصد کو نظر انداز کرنا اب کسی کے بس کی بات نہیں رہی اور اس کے ذریعہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پاکستان کی اسلامی بنیاد کا ہمیشہ کے لیے تحفظ کر دیا ہے۔

اس موقع پر ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے کہ غلطی اگرچہ خلوص سے ہو۔ مگر اس کے نتائج بہرحال سامنے آتے ہیں مجھے ۱۹۸۷ء میں ایران کے بارے میں گفتگو کا موقع ملا۔ ایک ایرانی لیڈر نے اس موقع پر مجھ سے سوال کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایرانی علماء نے سال کی محنت کے ساتھ انقلاب بپا کر دیا اور پاکستان کے علماء کرام جن کی جدوجہد دوسو سال تک آزادی کے لیے تھی آزادی کے بعد چالیس سال سے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے محنت کر رہے ہیں لیکن ان کی جدوجہد کے ثمرات نظر نہیں آرہے اور انہیں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی، میں نے اس سوال کے جواب میں اپنے ذہن کے مطابق ان اسباب وعوامل کا ذکر کیا جو پاکستان میں نفاذ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس پر ایرانی لیڈر نے کہا کہ جناب اصل بات یہ نہیں بلکہ اصل قصہ یہ ہے کہ ایرانی علماء نے بادشاہت کے خلاف تن تنہا جنگ نہیں لڑی۔ اس جنگ میں ایران کے شوشلسٹ اور کمیونسٹ حلقے بھی ان کے ساتھ تھے۔ مذہبی کمیونسٹ تو دہ پارٹی اور ڈاکٹر مصدق کی نیشنلسٹ پارٹی نے مل کر بادشاہت کو شکست دی لیکن شاہ ایران کے ملک سے باہر چلے جانے کے بعد ایرانی علماء نے اقتدار دوسروں کے حوالے نہیں کیا بلکہ بتدریج انہیں منظر سے ہٹا کر اقتدار پر مکمل قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے وہ انقلاب کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور اس پر کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوگئے جبکہ پاکستان کے قیام کے بعد وہ علماء جنہوں نے تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا وہ ضرورت سے زیادہ خلوص کا شکار ہوگئے اور مدارس و مساجد پر قناعت کرتے ہوئے انہوں نے اقتدار کا راستہ دوسرے لوگوں کے لیے صاف کر دیا اب ظاہر بات ہے کہ جن لوگوں نے اقتدار حاصل کیا ملک کا نظام بھی انہی کی مرضی کے مطابق ہی چلتا ہے۔

یہ ایک ایرانی لیڈر کی بات کا خلاصہ ہے جو میں نے آپ سے عرض کیا ہے ممکن ہے یہ سوفی صد درست نہ ہو سوفی صد غلط بھی نہیں ہے بلکہ مجھے اگر اس جسارت پر معاف فرمائیں تو عرض کروں گا کہ برصغیر کی تاریخ کی دو بڑی غلطیاں ایسی ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ کا رخ موڑ دیا اور غلطیاں خلوص کے ساتھ ہوئیں۔ ایک غلطی احمد شاہ ابدالی ؒ کی ہے جس نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو شکست دے کر انہیں ہمیشہ کے لیے جنوبی ہند کی طرف دھکیل دیا لیکن اقتدار پر قبضہ برقرار رکھنے کے بجائے اسے پھر مغل شاہزادوں کے حوالے کر کے وطن واپس لوٹ گیا۔ وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کرسکا کہ مغل شاہزادوں میں اب ہندوستان کا اقتدار سنبھالنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مغل شہزادے اقتدار نہ سنبھال سکے اور بالآخر برطانوی استعمار کو یہاں پاؤں جمانے کا موقع مل گیا۔ دوسری بڑی غلطی پاکستان بننے کے فوراً بعد علماء سے ہوئی کہ انہوں نے اقتدار میں شرکت اور حصہ داری پر اپنا دعویٰ نہیں جتایا حالانکہ یہ ان کا حق تھا لیکن انہوں نے خلوص کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیا کہ ہم نے اقتدار میں شریک نہیں ہونا بلکہ باہر رہ کر اقتدار والوں کی راہ نمائی کرنی ہے کہ اس کے نتائج آج ہمارے سامنے ہیں اور خدا جانے کب تک ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

الغرض علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کی جدوجہد کا یہ دور بھی بڑا تابناک ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحتیں اور توانائیاں صرف کر کے قرارداد مقاصد منظور کرائی اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو سیکولرازم کی بنیاد پر دستور طے کرنے سے روک دیا۔

حضرات گرامی قدر! شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کی یہ جدوجہد ہمارے ذمہ قرض ہے اور یہ قرض ہم نے بہر صورت ادا کرنا ہے۔ قرارداد مقاصد منظور کرا کے ملک کی اسلامی نظریاتی بنیاد کا تعین علامہ عثمانی ؒ نے کیا تھا اور ملک کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانا اور مکمل اسلام کے نظام کا نفاذ و غلبہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین یا الٰہ العالمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

انسانی حقوق اور اسوۂ نبوی ﷺ

۳ جولائی ۲۰۰۰ء کو ۱۱ بجے دن ڈسٹرکٹ کونسل ہال گوجرانوالہ میں محکمہ اوقاف پنجاب کے زیر اہتمام سالانہ ڈویژنل سیرت ﷺ کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت محکمہ اوقاف کے زونل ایڈمنسٹریٹر نے کی جبکہ کمشنر گوجرانوالہ ڈویژن جناب خوشنود اختر لاشاری مہمان خصوصی تھے۔ کانفرنس سے مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ مدیر ''الشریعہ'' مولانا زاہد الراشدی نے بھی خطاب کیا۔ ان کے خطاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوة:

سب سے پہلے محکمہ اوقاف پنجاب کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت مآب ﷺ کی سیرت طیبہ اور حیات مبارکہ کے حوالہ سے منعقد ہونے والی اس تقریب میں شرکت اور آپ حضرات سے گفتگو کا موقع فراہم کیا۔

سیرت نبوی ﷺ پر گفتگو کرنے والا اپنی بات شروع کرنے سے پہلے اس الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس وسیع و عریض چمنستان کے سدا بہار پھولوں میں سے کس کا انتخاب کرے اور کسے چھوڑے کیونکہ اس باغ کے ہر پھول کی خوشبو نرالی ہے اور کسی ایک کو چھوڑ کر آگے نکل جانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی کشمکش میں، میں نے آج کے دور میں دنیا میں زیر بحث آنے والے سب سے بڑے موضوع کے حوالہ سے سیرت طیبہ کے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا ہے اور وہ ہے انسانی حقوق کا موضوع جو آج کا سب سے اہم عنوان ہے اور دنیا بھر میں اس پر گفتگو اور بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی صاف اور شفاف سیرت مبارکہ کو ہم نہ

آج کی دنیا کے سامنے تحریر وتقریر کی صورت میں صحیح طور پر پیش کر رہے ہیں اور نہ ہی ہماری عملی زندگی میں اس کی کوئی جھلک پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ہمارا مسلمانوں کا وجود اسلامی تعلیمات اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ تک نسل انسانی کی رسائی میں رکاوٹ اور حجاب بن کر رہ گیا ہے۔

بہر حال آج کی دنیا کا سب سے اہم موضوع ''انسانی حقوق'' ہے اور مغرب آج نسل انسانی کو یہ باور کرانے میں مصروف ہے کہ اس نے انسانوں کو حقوق کا شعور بخشا اور ان کے حقوق کا تعین کیا ہے لیکن تاریخ کے میزان پر یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے عنوان سے حقوق کا جو تعارف اور تفصیلات قرآن میں چودہ سو برس پہلے سامنے آچکی ہیں آج کا کوئی نظام خدا اور اس کے بندوں کے درمیان اور پھر خود انسانوں کے آپس میں حقوق کے بارے میں اس طرح کا جامع تصور اور نظام پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جناب سرور کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ میں بے شمار واقعات ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں بلکہ جانوروں تک کے حقوق کی وضاحت کی ہے۔ ان کی ادائیگی کی تلقین کی ہے اور اپنے حقوق کی پاسداری کے جذبہ کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آج کی مجلس میں انہی میں سے چند واقعات پیش کرنا چاہ رہا ہوں۔

ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ ایک دفعہ مدینہ منورہ کے کسی باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک کمزور اور لاغر سا اونٹ کھڑا تھا، رسول اکرم ﷺ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ اپنی زبان میں کچھ شکایت کرنے لگا۔ نبی اکرم ﷺ نے دریافت کیا کہ اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا کہ یارسول اللہ! یہ اونٹ میرا ہے، اس پر نبی اکرم ﷺ نے اسے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس جاندار کے حقوق میں کوتاہی نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ اس اونٹ نے تمہارے بارے میں دو شکایتیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اس سے کام اس کی ہمت سے زیادہ لیتے ہو اور دوسری یہ کہ اسے اس کی ضرورت کے مطابق خوراک نہیں دیتے۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس پر ہمت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور ضرورت کے مطابق خوراک مہیا کیا کرو۔

اس سے اندازہ کر لیجیے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف انسانوں کے بلکہ جانوروں کے حقوق بھی بیان فرمائے ہیں اور ان میں کوتاہی کو ظلم قرار دیا ہے۔

ابوداؤد شریف ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز پیدل کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے، ایک صحابی نے جو گدھے پر سوار تھے دیکھا تو نبی اکرم ﷺ کے پاس آ کر آپ سے درخواست کی کہ اس کے ساتھ گدھے پر سوار ہو جائیں۔ یہ کہہ کر وہ صحابی گدھے پر اپنی جگہ سے پیچھے ہٹے تاکہ نبی اکرم ﷺ ان سے آگے بیٹھ جائیں مگر جناب رسول اکرم ﷺ نے یہ کہہ کر آگے بیٹھنے سے احتراز فرمایا کہ صاحب الدابہ احق بصدرھا "جانور کا مالک آگے بیٹھنے کا زیادہ حقدار ہے۔" اس صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں بخوشی اپنے اس حق سے دست بردار ہوتا ہوں تو اس کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ گدھے پر اس کے آگے بیٹھ گئے۔ یہ بات بظاہر ایک عام اور معمولی لگتی ہے لیکن اس میں جناب نبی اکرم ﷺ کی یہ سنت اور تعلیم موجود ہے کہ باہمی حقوق کا احترام کس قدر ضروری ہے اور حقوق کے بارے میں بڑے چھوٹے کی کوئی ترجیح نہیں ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے دائیں جانب حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے تھے اور بائیں جانب حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے اور ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ان کی حقیقی خالہ تھیں اس لیے دونوں حضور نبی اکرم ﷺ کے بھانجے بھی لگتے تھے۔ اس مجلس میں جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں کوئی مشروب پیش کیا گیا جو آپ نے نوش فرمایا جس کا کچھ حصہ بچ گیا تو وہ بائیں جانب بیٹھے ہوئے حضرت خالد بن ولیدؓ کو دینا چاہا مگر یہ حق دائیں جانب والے کا تھا جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے جو اگرچہ چھوٹے بچے تھے اس لیے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر صرف تیرہ برس تھی لیکن اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے ان سے اجازت مانگی اور پوچھا کہ تم اجازت دو تو یہ بچا ہوا پانی بائیں جانب والے کو دے دوں؟ مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ "میں آپ کے تبرک کے بارے میں خود پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا۔" یہ جواب سن کر نبی اکرم ﷺ نے پیالہ انہی کو دیا لیکن روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تلّه فی یدہٖ "پیالہ زور سے ان

کے ہاتھ میں تھما دیا۔'' جس کے بارے میں شارحین کہتے ہیں کہ اس انداز میں ناگواری کا پہلو جھلکتا تھا۔ اس واقعہ پر غور کر کے نتیجہ اخذ کیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کا اپنا جی بائیں جانب پیالہ دینے کو چاہتا تھا لیکن جس کا حق تھا اس سے اجازت مانگنا ضروری سمجھا کہ اجازت نہ دینے پر اگرچہ ناگواری بھی ہوئی مگر پیالہ دیا اسی کو جس کا حق تھا، خواہ وہ چھوٹا بچہ ہی تھا۔ اس سے زیادہ دوسرے کے حق کے احترام اور اپنے حق کے لیے اڑ جانے کے جذبہ کی حوصلہ افزائی کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

یہ واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے اور اس کی تفصیلات حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی خرید کر آزاد کر دی جس کا نام ''بریرہؓ'' تھا۔ وہ لونڈی ہونے کی حالت میں ''مغیثؓ'' نامی ایک نوجوان کے نکاح میں تھیں۔ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر لونڈی کا اس کے مالک نے کسی سے نکاح کر دیا ہو اور اس کے بعد کسی مرحلہ پر وہ لونڈی آزاد ہو جائے تو اسے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے خاوند کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ بریرہؓ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ فیصلے پر نظر ثانی کر لے۔ مگر بریرہؓ نے کوئی بات سننے سے انکار کر دیا۔

روایات میں آتا ہے کہ جناب مغیثؓ کی پریشانی اس حالت تک پہنچ گئی کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں دیوانہ وار آنسو بہاتے پھرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ خدا کے لیے کوئی بریرہؓ کو اس فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے آمادہ کر دے حتیٰ کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک صحابیؓ کے سامنے اس تعجب کا اظہار کیا کہ اس کی محبت دیکھو کہ وہ گلیوں میں آنسو بہاتا پھر رہا ہے اور اس کی نفرت دیکھو اس کا نام سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر خود جناب نبی اکرم ﷺ نے بریرہؓ سے مغیثؓ کی سفارش کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے بلا کر اس خواہش کا اظہار فرمایا۔ جناب نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی خواہش سن کر بریرہؓ نے ایک سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ حکم ہے یا محض سفارش؟ یہ سوال پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مومنہ تھی اور صحابیہؓ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر حکم ہوا تو اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرما دیا ہے کہ: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب ۳۳:۳۶) جب

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کسی بات کا حکم دے دیں تو پھر کسی مومن مرد یا عورت کا یہ حق باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس کے بعد اپنا اختیار استعمال کریں۔ اس لیے بریرہؓ نے اس کی وضاحت چاہی اور جب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ حکم نہیں بلکہ صرف سفارش ہے تو اس نے فوراً کہہ دیا کہ "مجھے اس (مغیثؓ) کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

آپ غور فرمائیے کہ سفارش کرنے والے کون ہیں؟ کائنات میں اس سے بڑی اور کوئی سفارش نہیں ہو سکتی لیکن اپنے حق پر اڑتے ہوئے اس سفارش کو قبول نہ کرنے والی کون ہے؟ ایک عام خاتون جو چند روز پہلے تک کسی کی لونڈی تھی اور اب خود جناب نبی اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خادمہ ہے۔ لیکن کیا مجال کہ اس کے اس فیصلے پر نبی اکرم ﷺ کی پیشانی پر کوئی بل آیا ہو یا آپ نے اس کے بعد اسے کبھی جتلایا بھی ہو حالانکہ وہ بطور خادمہ اکثر حضرت عائشہؓ کے پاس ہی رہتی تھی۔

آج ہمارا کوئی ماتحت ہماری سفارش رد کر کے دیکھے کہ پھر اس کے ساتھ ہمارا کیا معاملہ ہوتا ہے۔ لیکن جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کے بعد کبھی اس کا ذکر تک نہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف حقوق کا تعین کیا ہے، ان کی وضاحت کی ہے اور ان کی ادائیگی کی تلقین کی ہے بلکہ اپنے حق کے لیے اڑ جانے والے کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے اور کسی کو اس کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی۔

حضرات محترم! یہ چند واقعات میں نے انسانی حقوق کے حوالہ سے جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی طرف توجہ دلانے کے لیے عرض کیے ہیں اور آخر میں پھر یہی عرض کرتا ہوں کہ یہ آج کی دنیا کی ضرورت ہے اور ہماری ذمہ داری ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ کو دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کرنے کے لیے ہم سنجیدگی کے ساتھ محنت کریں کیونکہ آج نسل انسانی کو جو مشکلات اور مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسی میں ہے۔

عورت: ثقافتی جنگ میں مغرب کا ہتھیار

جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی میں ۱۴ ستمبر ۲۰۰۰ء کو پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام ''اسلام میں عورت کا مقام اور مغربی دنیا'' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمٰن درخواستی نے کی اور اس سے ممتاز دانش ور جناب اقبال احمد صدیقی، مولانا عبدالرشید انصاری، مولانا احسان اللہ ہزاروی، مولانا حافظ اقبال اللہ، مولانا لیاقت علی شاہ، مولانا چراغ الاسلام اور دیگر حضرات کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے بھی خطاب کیا۔ سیمینار میں اجتماعی قرارداد کے طور پر دو باتوں کی طرف بطور خاص توجہ دلائی گئی۔ ایک یہ کہ ٹی وی، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ میں عریانی اور فحاشی کو جو مسلسل فروغ حاصل ہو رہا ہے اسے کنٹرول کرنے کے لیے سرکاری سطح پر سنجیدہ اقدامات اور ایک ''ضابطہ اخلاق'' کی ضرورت ہے اور حکومت کو اس کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ مجوزہ بلدیاتی اداروں میں عورتوں کی نصف نمائندگی کا فارمولا قطعی طور پر ناقابل عمل ہے۔ حتیٰ کہ عورت کی آزادی اور مرد عورت میں مکمل مساوات کے علمبردار مغربی ممالک میں بھی یہ تناسب موجود نہیں ہے اور اس سے ہماری معاشرتی اقدار اور خاندانی ڈھانچے کے سبوتاژ ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔ اس لیے حکومت اس تجویز پر نظر ثانی کرے اور اس سلسلہ میں دینی حلقوں کو اعتماد میں لے۔

سیمینار سے مولانا راشدی کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ:

اس وقت عالم اسلام اور مغرب میں فلسفہ حیات اور کلچر وثقافت کی جو کشمکش جاری ہے اور جسے خود مغرب کے دانشور ''سولائزیشن وار'' قرار دے رہے ہیں، اس میں مغرب کا دعویٰ ہے کہ وہ جس کلچر اور ثقافت کا علمبردار ہے وہ ترقی یافتہ اور جدید ہے۔ اس لیے ساری دنیا کو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ لیکن مغرب کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ جدید تہذیب کی اقدار و روایات میں کوئی ایک بات بھی ایسی شامل نہیں ہے جسے نئی قرار دیا جا سکے۔ بلکہ یہ سب کی سب اقدار و روایات وہی ہیں جو ''جاہلیت قدیمہ'' کا حصہ رہ چکی ہیں اور اسلام نے ان کو جاہلی اقدار قرار دے کر انسانی معاشرہ کو ان سے نجات دلائی ہے۔ ان اقدار و روایات پر ایک نظر ڈالیں (۱) سود (۲) زنا (۳) ناچ گانا (۴) کہانت (۵) لواطت (۶) جوا (۷) شراب نوشی (۸) بت پرستی (۹) بے پردگی وعریانی اور (۱۰) نسلی ولسانی عصبیت وتفاخر آج کے تمدن کی نمایاں علامات ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو نئی کہلانے کی مستحق ہو اور جسے ''جاہلیت قدیمہ'' کے ساتھ کشمکش کے موقع پر اسلام نے شکست نہ دی ہو حتیٰ کہ ان اقدار و روایات کے حوالہ سے جو دلائل ان کے جواز کے لیے آج پیش کیے جا رہے ہیں وہ بھی وہی ہیں جو ''جاہلیت قدیمہ'' کے علمبردار پیش کیا کرتے تھے۔ مثلاً بے پردگی اور عریانی کو فطرت اور نیچر کی طرف واپسی قرار دیا جا رہا ہے جبکہ جاہلیت کے دور میں بیت اللہ کا عریاں حالت میں طواف کرنے والے مشرکین بھی یہی کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے گھر میں فطری حالت میں پیش ہونا چاہتے ہیں۔ اسی طرح آج سود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بزنس کا حصہ ہے اور اس کے بغیر تجارت کامیابی سے نہیں چل سکتی جبکہ سود کے حق میں مشرکین مکہ نے بھی یہی دلیل دی تھی جسے قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ: إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ''سود اور تجارت ایک جیسے ہی ہیں'' اس لیے اس تہذیبی کشمکش میں ہمیں کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بعینہٖ اسی تہذیب اور کلچر کو ہم ایک بار پہلے مکمل شکست دے چکے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے جب نبوت کا دعویٰ پیش کیا تھا اس وقت عرب معاشرہ میں یہ ساری چیزیں موجود تھیں لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر اپنے

مشن کی کامیابی کا اعلان فرمایا تھا تو عرب معاشرہ ان تمام خرابیوں سے پاک ہو چکا تھا۔ لہٰذا تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے تاریخ عالم کے پورے نشیب و فراز کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ کل کی طرح آج بھی اس ''جاہلیت جدیدہ'' کو شکست ہو گی اور نسل انسانی کا مستقبل اسی تمدن اور ثقافت پر استوار ہو گا جس کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے اور جس کی نمائندگی اس وقت اسلام کر رہا ہے۔

دوسری بات جو میں اس موقع پر عرض کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ''فری سوسائٹی'' یا اباحیت مطلقہ کا یہ فلسفہ جس پر مغربی تہذیب کی عمارت استوار ہے آج جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے تمام دائرے توڑ کر اپنے عروج اور انتہا کو پہنچ چکا ہے اور اس کا اندازہ مغربی ممالک کی اسمبلیوں اور عدالتوں کے ان فیصلوں سے لگایا جا سکتا ہے جو گزشتہ ربع صدی سے مسلسل سامنے آ رہے ہیں اور جائز و ناجائز کے ان دائروں اور حدود کو پامال کرنے کی مہم میں اسمبلیوں اور عدالتوں کے ساتھ اب چرچ بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو تین حالیہ فیصلوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔

☆ چرچ آف انگلینڈ نے چند سال قبل اپنی شاخوں کو یہ ہدایت جاری کیں کہ چونکہ بغیر شادی کے میاں بیوی کے طور پر اکٹھے رہنے والے جوڑوں کا تناسب پچاس فیصد سے بڑھ گیا ہے اور سوسائٹی نے اس عمل کو قبول کر لیا ہے اس لیے اس عمل کو آئندہ گناہ نہ کہا جائے اور نہ ہی اس کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

☆ گزشتہ سال برطانیہ کے ایک ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ میاں بیوی کے طور پر اکٹھے رہنے والے دو ہم جنس پرست مرد قانون کی نظر میں میاں بیوی متصور ہوتے ہیں اس لیے ایک کے مرنے کے بعد دوسرا اس کا وارث قرار پائے گا۔

☆ ابھی گزشتہ ہفتے اٹلی کی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند کے علاوہ دوسرے مردوں کے ساتھ بھی تعلقات قائم کر سکتی ہے لیکن اسے رات بہر حال خاوند کے ساتھ رہنا چاہیے۔

یہ خاندانی نظام کے حوالہ سے مغربی سوسائٹی کے ''فری سسٹم'' کی انتہا ہے اور اسی سے ہمیں اندازہ کر لینا چاہیے کہ مغربی ثقافت کے نام پر بین الاقوامی قوانین کو قبول کر لینے کا

مشورہ دینے والے ادارے اور این جی اوز ہمیں کس راستہ پر ڈالنا چاہتی ہیں اور پاکستان میں کس قسم کے کلچر کو فروغ دینے کے لیے کوشش کر رہے ہیں؟ اس حوالہ سے آپ حضرات کی خدمت میں میری تیسری گزارش یہ ہے کہ مغربی حکومتیں اور عالمی ادارے اس کلچر کو ہم پر مسلط کرنے کے لیے مسلسل دباؤ بڑھا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی خواتین کانفرنسوں، اقوام متحدہ کے منشور، جنیوا انسانی حقوق کمیشن کی قراردادوں، انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں اور عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے ہم سے بار بار یہ تقاضا کیا جا رہا ہے کہ اسلام کے نکاح، طلاق اور وراثت کے قوانین کو آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین کے مطابق بنایا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نکاح، طلاق اور وراثت کے متعدد اسلامی قوانین اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والے بین الاقوامی قوانین سے متصادم ہیں اور اسی وجہ سے عالم اسلام کی حکومتیں اس سلسلہ میں تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ ترکی نے ایک طرف دوٹوک فیصلہ کرتے ہوئے اسلامی قوانین سے دستبردار ہو کر مغربی قوانین کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے۔ دوسری طرف افغانستان کی طالبان حکومت نے یہ واضح اعلان کر رکھا ہے کہ وہ کسی اسلامی قانون سے دستبردار نہیں ہوں گے اور شرعی قوانین کے حوالہ سے اقوام متحدہ سمیت کسی کی بات سننے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں لیکن دوسری مسلمان حکومتیں دوہرے طرز عمل کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ عالمی اداروں کا دباؤ بڑھتا ہے تو بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کر دیتی ہیں اور اپنے ملکوں کے عوام اور دینی حلقوں کے دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے تو اسلامی احکام کی من مانی تعبیر و تشریح کا راستہ اختیار کرنے لگتی ہیں ہمارے ہاں صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں "عائلی قوانین" اسی عالمی دباؤ کے تحت نافذ کیے گئے تھے جن کی متعدد دفعات قرآن وسنت کے صریح احکام سے متصادم ہیں۔ چند سال قبل سپریم کورٹ کے جسٹس ناصر اسلم زاہد کی سربراہی میں "خواتین حقوق کمیشن" نے جو سفارشات پیش کیں وہ بھی اسی بین الاقوامی دباؤ کا نتیجہ تھیں اور اب ہماری اعلیٰ عدالتوں میں اس حوالہ سے جو فیصلے ہو رہے ہیں اس کے پس منظر میں بھی یہی عالمی دباؤ کارفرما ہے اور اس سلسلہ میں بطور مثال صرف دو فیصلوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک سندھ ہائی کورٹ کے جسٹس عثمانی کا فیصلہ ریکارڈ پر ہے جس میں وراثت کے کسی کیس میں لڑکی اور لڑکے کے حصوں میں فرق کو غیر مساویانہ بتا کر غیر منصفانہ قرار دیا گیا

ہے۔ اور دوسرا فیصلہ لاہور ہائی کورٹ کا ہے جو حال ہی میں سامنے آیا ہے کہ لڑکی نے گھر سے بھاگ کر ایک لڑکے سے تعلق قائم کیا اور کچھ عرصہ اکٹھے رہ کر نکاح کر لیا تو ہائی کورٹ نے ان سب مراحل کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ''محبت کی شادی'' قرار دے کر قانونی جواز کی سند فراہم کر دی۔

اسلام میں عورت کو جو مقام دیا گیا ہے اور اس کے حقوق کے بارے میں قرآن وسنت کی جو واضح ہدایات موجود ہیں ان کے بارے میں میرے پیش رو مقررین نے تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے اس لیے میں نے اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے آج کے اس سیمینار کے موضوع کے دوسرے پہلو پر کچھ گزارشات پیش کی ہیں کہ مغرب نے عورت کو اس کلچرل جنگ اور سولائزیشن وار میں اپنا ہتھیار بنا کر اس کی تذلیل کا جو سامان فراہم کر رکھا ہے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں صحیح صورت حال کا ادراک کریں اور مطالعہ وتحقیق کے تقاضے پورے کرتے ہوئے مدارس کے طلبہ مساجد کے نمازیوں اور اخبارات وجرائد کے قارئین کی ذہن سازی اور راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دینے میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

اسلام اور خواتین کے حقوق

انسانی نسل کی بقا اور معاشرت کی گاڑی جن دو پہیوں پر رواں دواں ہے، ان میں ایک عورت ہے جس کا نسل انسانی کی نشو ونما اور ترقی میں اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا مرد کا ہے۔ اس لیے اسلام نے عورت کے وجود کو نہ صرف تقدس اور احترام بخشا بلکہ اس کی اہمیت وافادیت کا بھرپور اعتراف کیا ہے اور اسے ان تمام حقوق اور تحفظات سے نوازا ہے جو مرد اور عورت کے فطری فرائض کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل عورت کو انسانی معاشرہ میں ایک آزاد اور خودمختار وجود کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ بالخصوص جاہلی معاشرہ میں عورت کو نہ وراثت میں حقدار تسلیم کیا جاتا تھا اور نہ اس کی رائے کو وقعت دی جاتی تھی، بلکہ بعض علاقوں میں تو عورت اور جانور میں کوئی فرق روا نہ رکھا جاتا تھا۔ مگر جناب نبی اکرم ﷺ نے عورت کے بارے میں جاہلی تصورات کی نفی کی اور اسے وہ تمام حقوق اور تحفظات بخشے جو فطری طور پر اس کے لیے ضروری ہیں۔ جناب نبی اکرم ﷺ کا دور اور خلافت راشدہ کا زمانہ اسلام کی عملداری کے لحاظ سے ایک مثالی دور ہے۔ اور جب ہم اس دور میں عورت کے معاشرتی مقام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں عورت کے حوالہ سے اسلام کے خلاف مغربی میڈیا کے وہ تمام اعتراضات بے بنیاد نظر آتے ہیں جن کا ایک عرصہ سے مسلسل اور منظم پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اور خواتین کو اسلامی قوانین واحکام کے نفاذ کی صورت میں بنیادی حقوق سے محرومی کا خوف دلا کر نفاذ اسلام کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اہم انسانی حقوق کے حوالہ سے اسلام کے خلاف مغربی لابیوں کے اعتراضات کا جائزہ لیا جائے۔

رائے کی آزادی

آزادی رائے کو انسانی حقوق میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ آزادی رائے کا جو معیار اسلام نے قائم کیا ہے، دوسرا کوئی نظام آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ خلیفہ وقت کو سرعام ٹوک دینا اور اسے اپنی پوزیشن کی وضاحت کیے بغیر خطبہ میں آگے نہ بڑھنے دینا عوامی احتساب اور آزادی رائے کی ایک قابل فخر مثال ہے۔ لیکن یہ واقعہ مرد کا ہے، جبکہ تاریخ ایک اور منظر بھی پیش کرتی ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک بوڑھی خاتون خولہ بنت حکیمؓ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو سرعام روک کر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے: ''عمر! وہ دن یاد رکھو جب تمہیں عکاظ کے بازار میں صرف عمر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور آج تم امیر المومنین کہلاتے ہو اس لیے خدا سے ڈرتے رہو اور انصاف کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو''۔

حضرت عمرؓ اس بڑھیا کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں اور اپنے عمل کے ساتھ دنیا کو بتا رہے ہیں کہ انسانی معاشرہ میں مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ راہ چلتے امیر المومنین کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے اور انصاف کی طلب گار ہو۔

حق طلبی

اسلام مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے جائز حق کے لیے ڈٹ جائے اور اس کے خلاف کسی بڑے سے بڑے دباؤ کی پروا نہ کرے۔ حضرت عائشہؓ کی باندی بریرہؓ کو آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے سابقہ خاوند مغیثؓ کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اس سے الگ ہو جائے۔ بریرہؓ نے اپنا یہ حق استعمال کیا تو مغیثؓ پریشان ہو گئے، وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں روتے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو دوبارہ میرے ساتھ رہنے پر آمادہ کرے؟ اس کی حالت دیکھ کر خود جناب نبی اکرم ﷺ نے بریرہؓ سے بات کی اور اسے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے کہا۔ بریرہؓ نے صرف یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ صرف مشورہ ہے تو بریرہؓ نے دو ٹوک کہہ دیا کہ یہ مشورہ قبول نہیں کر سکتی۔ چنانچہ بریرہؓ

مغیثؓ سے الگ رہنے کے فیصلہ پر قائم رہی اور اپنے عمل کے ساتھ اسلام کا یہ اصول دنیا کے سامنے پیش کیا کہ عورت اپنے جائز حق سے از خود دستبردار نہ ہونا چاہے تو اسے اس کے حق سے کسی صورت میں محروم نہیں کیا جاسکتا۔

اجتماعی معاملات میں مشاورت

خلافت راشدہ کے دور میں عورت اجتماعی معاملات میں بھی مشاورت کے دائرہ میں شامل رہی ہے۔ بالخصوص ازواج مطہراتؓ کو تو اس دور میں امت مسلمہ کی اجتماعی راہنمائی کا مقام حاصل تھا۔ اہم امور میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا اور ان سے اجتماعی معاملات میں راہنمائی حاصل کی جاتی تھی حتیٰ کہ ایک موقع پر مدینہ منورہ کے عامل امیر مروان بن حکم نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''جب تک ازواج مطہراتؓ موجود ہیں، ہمیں دوسرے لوگوں سے مسائل دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

اور عورتوں سے متعلقہ امور میں تو مشورہ ہی عورتوں سے کیا جاتا تھا۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ذمہ لگایا کہ وہ سمجھدار عورتوں سے مشورہ کر کے بتائیں کہ ایک عورت کتنا عرصہ آسانی کے ساتھ خاوند کے بغیر گزارا کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی رائے پر حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا کہ ہر فوجی کو چھ ماہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے ضرور گھر بھیجا جائے۔

تعلیم اور افتا

خلافت راشدہ کے دور میں خواتین کو علم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کے آزادانہ مواقع میسر تھے۔ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھ بیسیوں خواتین کو رسول اللہ ﷺ کے ارشادات امت تک پہنچانے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے شاگردوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ وہ نہ صرف احادیث بیان کرتی تھیں بلکہ فتویٰ بھی دیتی تھیں اور ان کے فتویٰ پر عمل کیا جاتا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے جو فتاویٰ منقول ہیں، ان سے ایک بڑا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے علماء صحابہؓ مسائل میں رجوع کرتے تھے اور اپنے

اشکالات کا تسلی بخش جواب پاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہؓ سے بھی علمی معاملات میں رجوع کیا جاتا تھا۔ الغرض علم اور افتا کا میدان بھی خواتین کے لیے کھلا تھا اور اس میں ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔

معاشی تحفظ

اسلام نے عورت کے معاشی حقوق اور تحفظات کا جو متوازن نظام پیش کیا ہے، وہ بھی اسلامی صداقت کی دلیلوں میں سے ایک بڑی دلیل ہے۔ یہ شعبہ ایسا جہاں بڑے بڑے نظام افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن اسلام نے اعتدال اور توازن کا اصول یہاں بھی پوری طرح قائم رکھا ہے۔

آج ''عورت اور مرد کی ہر میدان میں برابری'' کے خوشنما نعرے کے ساتھ عورت کو دوہری ذمہ داریاں ادا کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک ذمہ داری وہ ہے جو فطری طور پر اسی کے ذمہ ہے اور اس ذمہ داری سے نہ دست کش ہو سکتی ہے اور نہ اسے کسی اور کو منتقل کر سکتی ہے۔ یہ ذمہ داری بچے کی پیدائش، پرورش اور گھر کے اندرونی نظام کو کنٹرول کرنے کی ہے۔ مرد کچھ بھی کرے، وہ ان میں سے کوئی ذمہ داری نہیں نباہ سکتا۔ یہ تینوں ڈیوٹیاں لامحالہ عورت ہی سنبھالتی ہے۔ لیکن مغرب کا آزادی اور برابری کا فلسفہ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ کمانے کی ذمہ داری بھی قبول کرے اور مرد کی برابری کرنے کے شوق میں ملازمت بھی اختیار کرے۔ اس طرح مغرب کا مرد عورت کی فطری ذمہ داریوں میں سے کوئی ذمہ داری اپنے سر لیے بغیر اپنی نصف ذمہ داری عورت کے کھاتے میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اسے معاشی آزادی اور برابری کا نام دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر ظلم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں آبادی کا بہت بڑا حصہ قتل ہو جانے کے بعد دفاتر اور کارخانوں میں افرادی قوت کی کمی ہوئی تو یورپ کے دانش وروں نے عورتوں کے ذریعہ یہ خلا پر کرنا چاہا اور انہیں گھروں سے نکال کر دفاتر اور کارخانوں میں لانے کے لیے معاشی برابری کا خوشنما نعرہ ایجاد کیا۔ ورنہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ سراسر ظلم ہے اور اس ظلم کا نقد نتیجہ یورپی معاشرہ کو مل گیا ہے کہ وہاں خاندانی زندگی کا ڈھانچہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے عورت کو کوئی

فریب نہیں دیا اور اسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ چونکہ گھر کے اندر کا نظام عورت کی سپرداری میں ہے اس لیے باہر کی کوئی ڈیوٹی اس کے سپرد کرنا اس پر ظلم ہے۔ اسی لیے عورت کے تمام اخراجات مرد کے ذمہ لگا دیے گئے ہیں اور ان اخراجات کے سلسلہ میں عورت کو عدالتی تحفظات بھی دیے گئے ہیں تا کہ کوئی مرد اس معاملہ میں عورت کے ساتھ ناانصافی نہ کر سکے۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ کمانا اور ملازمت کرنا فرائض میں سے ہے، یہ ایک مشقت کی بات ہے اور اس کا شمار ذمہ داریوں میں ہوتا ہے، لیکن مغرب کے فلسفہ نے اس پر حقوق کا لیبل لگا کر عورتوں کو یہ باور کرانے کی مہم چلا رکھی ہے کہ انہیں ملازمت سے الگ رکھ کر حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے اور بے چاری عورت یہ دیکھے بغیر اس نعرے کے پیچھے لپکی جا رہی ہے کہ حقوق کے نام پر اس کے فرائض کو ڈبل کیا جا رہا ہے۔ اسلام نے فرائض کی ایک فطری تقسیم کر دی ہے کہ گھر کے اندر کی ذمہ داری عورت کی ہے اور باہر کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ اور مرد و عورت کی خلقت میں فطرت نے جو طبعی فرق رکھا ہے، اس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے سوا کوئی تقسیم ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام عورت کے ملازمت کرنے پر کلی پابندی لگاتا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ اسلام عورت کو ایسی ہر ملازمت کی اجازت دیتا ہے جس سے اس کی نسوانی حیثیت متاثر نہ ہو، اس کی خاندانی ذمہ داریوں پر زد نہ پڑے اور اس پر اس کی طاقت و صلاحیت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

الغرض اسلام عورت کو انسانی زندگی کی گاڑی کا برابر کا پہیہ تسلیم کرتا ہے اور اس کو وہ تمام حقوق دیتا ہے جو انسانی معاشرہ میں اپنا فطری کردار ادا کرنے کے لیے اسے درکار ہیں، البتہ فرائض کی تقسیم وہ مرد اور عورت کے طبعی تقاضوں اور فطری ضروریات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے اور عورت کو ہر ایسے عمل سے روکتا ہے جو اس کے نسوانی وقار، فطری ذمہ داریوں اور طبعی مناسبت کے منافی ہو اور مغربی میڈیا کے تمام تر بلند بانگ دعووں اور پراپیگنڈہ کے باوجود اسلام کا یہ اصول حق تلفی نہیں بلکہ عین انصاف ہے جس کے بغیر انسانی معاشرت کو متوازن رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزی کون کررہا ہے
مسلمان یا قادیانی؟

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام مرکزی جامع مسجد برمنگھم برطانیہ میں ۱۶ اگست ۱۹۹۲ء کو منعقد ہونے والی سالانہ عالمی ختم نبوت کانفرنس سے خطاب۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

مجھے تھوڑے سے وقت میں صرف ایک پہلو پر کچھ گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کرنی ہیں دعا کریں اللہ تعالیٰ مقصد کی باتیں کہنے کی توفیق دیں اور دین حق کی جو بات علم اور سمجھ میں آئے اس پر عمل کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائیں۔

قادیانی گروہ کی طرف سے اس کی سرپرست لابیوں اور ویسٹرن میڈیا کی طرف سے قادیانی مسئلہ کے حوالہ سے ایک الزام پاکستان کے مسلمانوں پر پاکستان کی حکومت پر اور پاکستان کے دستوری اور قانونی ڈھانچے پر پورے شدومد کے ساتھ دنیا بھر میں دھرایا جارہا ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال کردیے گئے ہیں ان کے شہری حقوق معطل ہوگئے ہیں اور قادیانیوں کے ہیومن رائٹس ختم کردیے گئے ہیں ابھی حال میں اسی ماہ کے آغاز میں برطانیہ میں ٹل فورڈ کے مقام پر قادیانیوں کے سالانہ اجتماع میں بھارتی ہائی کمشنر نے شرکت کی ہے اور اپنی تقریر میں انسانی حقوق کے حوالہ سے قادیانیوں کی نام نہاد مظلومیت کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان سے ان کی جلاوطنی کا ذکر کیا ہے اور انسانی حقوق کی دہائی دی ہے یہی وہ بنیاد ہے جس بنیاد پر مغربی ممالک اسلام دشمن عناصر اور ویسٹرین میڈیا قادیانی گروہ کی مکمل پشت پناہی کررہا ہے اس لیے آج میں یہ چاہتا ہوں کہ ٹھنڈے دل ودماغ کے

ساتھ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ پاکستان میں قادیانیوں کے کون سے انسانی حقوق پامال ہوئے ہیں اور ان کے ہیومن رائٹس پر کیا زد پڑی ہے؟ جذبات سے ہٹ کر منطق اور استدلال کے ساتھ اس مسئلہ کا تھوڑے سے وقت میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قادیانی مسلم تنازعہ کی اصل بنیاد کو تلاش کیا جائے کہ اصل جھگڑا کیا ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے نئی نبوت اور نئی وحی کے ساتھ اپنے لیے نئے مذہب کا انتخاب کیا ہے اور مسلمانوں سے اپنا مذہب الگ کر لیا ہے یہ بات مسلمات میں شامل ہے کہ نئی نبوت اور نئی وحی کے ساتھ مذہب بھی الگ ہو جاتا ہے تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک حولہ سے بات عرض کروں گا۔ آپ کے اس برطانوی معاشرہ میں یہودی اور عیسائی دونوں رہتے ہیں تورات پر یہودی اور عیسائی دونوں ایمان رکھتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دونوں اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر دونوں متفق ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں کا مذہب ایک نہیں ہے بلکہ دونوں الگ الگ مذہب کے پیروکار ہیں اس لیے کہ عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر ایمان رکھنے کے باوجود ایک نئے نبی اور نئی وحی کو تسلیم کرتے ہیں جن پر یہودیوں کا ایمان نہیں ہے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو بھی مانتے ہیں جن پر یہودیوں کا ایمان نہیں ہے اس لیے عیسائیوں کا مذہب یہودیوں سے الگ ہو گیا اور دونوں الگ الگ مذہب کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح مسلم قادیانی تنازعہ میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کا مذہب ایک نہیں ہے بلکہ دونوں الگ الگ مذہب کے پیروکار ہیں اس حقیقت کو قادیانی گروہ بھی تسلیم کرتا ہے اور تاریخ کے ریکارڈ میں اس کی متعدد دستاویزی شہادتیں موجود ہیں جن میں سے بعض کا میں اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

جب پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم ہو رہی تھی۔ پنجاب کی تقسیم کے لیے ریڈکلف کمیشن بیٹھا تھا، پنجاب کو اس بنیاد پر تقسیم کیا جا رہا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان میں شامل ہوں گے اور جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں وہ بھارت کا حصہ ہوں گے گورداسپور کا علاقہ جہاں قادیان واقع ہے۔ اس علاقہ کی صورت حال یہ تھی کہ اگر قادیانی آبادی خود کو مسلمانوں میں شامل کراتی ہے تو یہ خطہ زمین پاکستان کے حصہ میں آتا

ہے اور اگر قادیانی گروہ مسلمانوں سے الگ شمار ہوتا ہے تو گورداسپور کا علاقہ بھارت کے پاس چلا جاتا ہے اس وقت قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے جو مرزا غلام احمد قادیانی کا فرزند اور طاہر احمد کا باپ تھا اپنا کیس مسلمانوں سے الگ پیش کر کے یہ فیصلہ تاریخ میں ریکارڈ کروایا کہ قادیانی خود کو مسلمانوں سے الگ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ چودھری ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر قادیانیوں کی فائل مسلمانوں سے الگ ریڈ کلف کمیشن کے سامنے پیش کی جس کی بنیاد پر گورداسپور غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار پایا اور بھارت کے حوالے کر دیا گیا اس کے نتیجہ میں بھارت کو کشمیر کے لیے راستہ ملا اور اس نے کشمیر پر قبضہ کر لیا اور آج بھی لاکھوں کشمیری عوام بھارت کے تسلط اور وحشت و درندگی کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

دوسری شہادت

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا جنازہ تھا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی جنازہ پڑھا رہے تھے۔ ملک بھر کے سرکردہ حضرات اور غیر ملکی سفراء جنازہ میں شریک تھے۔ حکومت پاکستان کا قادیانی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان بھی موجود تھا لیکن جنازہ میں شریک نہیں ہوا اور غیر مسلم سفیروں کے ساتھ الگ بیٹھا رہا یہ بات قومی پریس کے ریکارڈ میں ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان سے پوچھا گیا کہ آپ وزیر خارجہ ہیں لیکن جنازہ میں شریک نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس پر ظفر اللہ خان نے کہا کہ "مجھے کافر حکومت کا مسلمان وزیر خارجہ سمجھ لیا جائے یا مسلمان حکومت کا کافر وزیر خارجہ" اس طرح چودھری ظفر اللہ خان نے بھی تاریخ میں اپنی یہ شہادت ریکارڈ کرائی کہ مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور قادیانی ان سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار ہیں۔

۱۹۷۴ء میں جب پاکستان کی قومی اسمبلی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی آئینی ترمیم پر بحث کر رہی تھی اسمبلی نے یک طرفہ فیصلہ کرنے کی بجائے قادیانیوں کے دونوں گروہوں کو اسمبلی کے سامنے اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا۔ قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد نے گیارہ روز تک اور لاہوری گروپ کے سربراہ مولوی صدر الدین نے دو روز تک اسمبلی کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت کی اور ان کا موقف پوری طرح سننے کے بعد

اسمبلی نے اپنا فیصلہ صادر کیا اس موقع پر مرزا ناصر احمد سے پوچھا گیا کہ وہ دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ ان مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے مرزا ناصر احمد نے پہلے اس سوال کو گول کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر پارلیمنٹ کے فلور پر انہیں اپنے اس عقیدہ کا دوٹوک اظہار کرنا پڑا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لانے والے دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اور اس طرح مرزا طاہر احمد کے بڑے بھائی مرزا ناصر احمد نے بھی تاریخ کی عدالت میں اپنی یہ شہادت ریکارڈ کرادی کہ وہ قادیانیت کو مسلمانوں سے الگ مذہب قرار دیتے ہیں۔

آج مرزا طاہر احمد دنیا بھر میں مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف واویلا کر رہا ہے لیکن میں مرزا طاہر احمد کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایک شہادت تو خود تم نے بھی ریکارڈ کرائی ہے جو تازہ ترین شہادت ہے۔ ابھی حال ہی میں ٹل فورڈ میں قادیانیوں کا سالانہ اجتماع ہوا ہے مسلمانوں کے اجتماعات ہوتے ہیں تو مہمان خصوصی امام کعبہ ہوتے ہیں۔ شیخ الازہر ہوتے ہیں مسلم ممالک کے سفراء آتے ہیں اور دیگر مسلم شخصیات شریک ہوتی ہیں ہماری اس ختم نبوت کانفرنس میں حضرت مولانا خان محمد تشریف فرما ہیں پاکستان کے مفتی اعظم تشریف فرما ہیں لیکن ٹل فورڈ کے قادیانی اجتماع میں مہمان خصوصی کون تھا؟ بھارت کا ہندو ہائی کمشنر اور ساؤتھ آل کونسل کا سکھ میئر! یہ بھی تاریخ کی شہادت ہے۔

حضرات محترم! جب یہ بات طے شدہ ہے کہ قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں سے الگ ہے اور دونوں ایک مذہب کے پیروکار نہیں ہیں تو ظاہر بات ہے کہ اسلام کا نام ان میں سے ایک ہی فریق استعمال کرے گا۔ دونوں استعمال نہیں کر سکتے۔ اسلام کا نام اور اس کے شعائر مثلاً کلمہ طیبہ، مسجد، امیر المومنین، ام المومنین خلیفہ اور صحابی جو اسلام کے ساتھ مخصوص ہیں اور مسلمانوں کی پہچان بن چکے ہیں انہیں استعمال کرنے کا حق ایک فریق کو ہوگا۔ آپ حضرات خانہ خدا میں بیٹھے ہیں۔ آپ ہی انصاف سے کہیں کہ کیا دونوں گروہوں کو اسلام کا نام اسلام کا لیبل اور اس کا ٹریڈ مارک استعمال کرنے کا حق ہے؟ اگر نہیں اور انصاف کا تقاضا ہے کہ نہیں تو پھر انصاف کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیجیے کہ یہ حق دونوں میں سے کس فریق کا ہے جو چودہ سو سال سے اس نام اور اصطلاحات کو استعمال کر رہا ہے یا اس کا جو ایک سو سال سے اس کا

دعویدار ہے؟ اصل بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ایک عام کاروباری سی بات ہے عام سی مثال ہے اس حوالہ سے بات عرض کرتا ہوں۔ایک کمپنی جو سو سال سے کام کر رہی ہے اس کا ایک نام ہے ایک لیبل ہے ایک ٹریڈ مارک ہے وہ اس نام لیبل اور ٹریڈ مارک کے ساتھ مارکیٹ میں متعارف ہے اس کی ساکھ ہے اس حوالہ سے اس کا اعتبار قائم ہے اب کچھ لوگ اس سے الگ ہو کر ایک نئی کمپنی بناتے ہیں ایمان کے ساتھ بتائیے کہ کیا وہ نئی کمپنی اپنا مال مارکیٹ میں لانے کے لیے پہلی کمپنی کا نام استعمال کرتی ہے اس کا ٹریڈ مارک اور لیبل استعمال کرتی ہے تو انصاف کی زبان اسے کیا کہتی ہے؟ قانون اسے کیا کہتا ہے (لوگوں نے کہا فراڈ! فراڈ!) میں ان مغربی لابیوں سے پوچھتا ہوں کہ انصاف کا تقاضا کیا ہے؟ قانون کا تقاضا کیا ہے؟ دانش کا تقاضا کیا ہے؟ خدا کے لیے ہمارا موقف بھی سمجھنے کی کوشش کریں نبوت کا دعویٰ بہاء اللہ نے بھی کیا تھا۔اس کے ماننے والے بہائی بھی ہم سے الگ مذہب رکھتے ہیں ہم انہیں کافر کہتے ہیں لیکن ہمارا ان سے قادیانیوں کی طرز کا کوئی تنازعہ نہیں ہے کشمکش کی فضا نہیں ہے اس لیے کہ وہ اسلام کا نام استعمال نہیں کرتے انہوں نے اپنا نام اور اصطلاحات الگ کر لی ہیں وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر لوگوں کو دھوکہ نہیں دیتے اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہتے لندن ماسک کے نام پر اپنا لٹریچر تقسیم نہیں کرتے اور اپنے مرکز کو اسلام آباد نہیں کہتے ہم انہیں کافر کہتے ہیں لیکن ہمارا ان سے جھگڑا کوئی نہیں ہے۔قادیانیوں کے ساتھ تنازعہ یہ ہے کہ مذہب نیا ہے کمپنی نئی ہے لیکن نام ہمارا استعمال کرتے ہیں لیبل اور ٹریڈ مارک ہمارا استعمال کرتے ہیں ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے یہ دھوکہ ہے فراڈ ہے اور کھلا فریب ہے ہم دنیا بھر کے دانش وروں کو دہائی دیتے ہیں کہ خدا کے لیے ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لو کہ اصل قصہ کیا ہے اور تنازعہ کس بات پر ہے۔

انسانی حقوق اور صدارتی آرڈیننس

حضرات محترم! اب میں اس صدارتی آرڈیننس کی طرف آتا ہوں جسے مرزا طاہر احمد اور اس کی سرپرست لابیوں کی طرف سے پوری دنیا میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا عنوان دے کر بدنام کیا جا رہا ہے۔یعنی ۱۹۸۴ء کا وہ صدارتی آرڈیننس جس کے تحت

صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے قادیانیوں کو اسلام کا نام اور اصطلاحات استعمال کرنے سے روک دیا ہے اور جس کے بارے میں مغربی لابیاں یہ کہہ رہی ہیں کہ اس کے ذریعہ قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال ہو گئے ہیں لیکن پہلے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ آرڈیننس صدر جنرل ضیاء الحق کا تیارہ کردہ نہیں ہے نہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر نے ترتیب دیا ہے بلکہ آرڈیننس تحریک ختم نبوت کے ان مطالبات پر مشتمل ہے جن کے لیے ہم نے ملک بھر میں تحریک چلائی سٹریٹ پاور کو منظم کیا لوگوں کو سڑکوں پر لائے اور راولپنڈی کی طرف لانگ مارچ کیا اس پر مجبور ہو کر ہمارے مطالبات کو آرڈیننس کی شکل دی گئی اس لیے یہ مارشل لاء ریگولیشن یا کسی ڈکٹیٹر کا نافذ کردہ قانون نہیں بلکہ عوامی مطالبات پر مشتمل ایک قانونی ضابطہ ہے۔

مرزا طاہر احمد کی مہم

اس کے بعد صدارتی آرڈیننس پر بحث سے قبل آپ حضرات کو مرزا طاہر احمد کی اس مہم سے بھی متعارف کرانا چاہتا ہوں جو اس آرڈیننس کے خلاف ابھی تک جاری ہے اس مہم کے مختلف مراحل کا آپ کے سامنے لایا جانا ضروری ہے تاکہ آپ لوگ دیکھ سکیں کہ ان کا طریق واردات کیا ہے بالخصوص برطانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے اس مہم سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے تو حضرات محترم! ۱۹۸۴ء میں صدارتی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد مرزا طاہر احمد لندن میں آ کر بیٹھ گیا اور مغربی لابیوں کو اپروچ کر کے یہ دہائی دی کہ پاکستان میں امتناع قادیانیت کے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کے انسانی حقوق چھین لیے گئے ہیں ان کے ہیومن رائٹس پامال کر دیے گئے ہیں۔ انہیں عبادت کے حق سے روک دیا گیا ہے اور ان کے اپنے مذہب پر عمل کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ویسٹرن میڈیا بھی اس مہم میں شریک ہو گیا۔ اسے تو انتظار رہتا ہے کہ اسلام اور پاکستان کے خلاف کوئی بات کہنے کو ملے وہ تو بہانے تلاش کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف کسی بات پر شور اٹھا سکیں۔

جنیواء کا انسانی حقوق کمیشن

پھر بات یہیں تک نہیں رہی بلکہ جنیواء میں انسانی حقوق کے کمیشن کو اپروچ کیا گیا یہ کمیشن یو این او کے تحت قائم ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک پر نظر رکھتا ہے اور جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہو اس کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر مغربی حکومتیں اپنی پالیسیاں مرتب کرتی ہیں قادیانیوں کی طرف سے اس کمیشن کے پاس درخواست کی گئی کہ پاکستان میں ان کے شہری حقوق پامال کیے جا رہے ہیں لیکن اس درخواست سے پہلے ایک اور بات کا اہتمام ہو چکا تھا کہ جنیواء میں پاکستان کی سفارت اور نمائندگی مسٹر منصور احمد سنبھال چکا تھا جو معروف قادیانی ڈپلومیٹ ہے پاکستان کا سینئر سفارت کار ہے اور اس وقت جاپان میں پاکستان کا سفیر ہے اب راستہ صاف تھا۔ درخواست قادیانیوں کی طرف سے تھی اور کمیشن کے سامنے پاکستان کی نمائندگی اور حکومت پاکستان کے موقف کی وضاحت کی ذمہ داری ایک قادیانی سفارت کار پر تھی نتیجہ وہی ہونا تھا جو امور خارجہ کے انسانی حقوق کمیشن نے اس مضمون کی قرارداد منظور کر لی کہ پاکستان میں واقعتاً قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال کر دیے گئے ہیں اور حکومت پاکستان اس کی ذمہ دار ہے۔

امریکی سینٹ کی قرارداد

بات اور آگے بڑھی اور قادیانی گروہ اس قرارداد کو لے کر واشنگٹن پہنچا جہاں پریسلر رہتا ہے جہاں سولارز رہتا ہے آپ جانتے ہیں ان کو؟ اور پاکستان کا کون سا باشعور شہری ہے جو پریسلر اور سولارز کو نہیں جانتا وہاں لابنگ ہوئی۔ اس وقت امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی پاکستان کی اقتصادی اور فوجی امداد کے لیے شرائط طے کر رہی تھی جنیواء انسانی حقوق کمیشن کی یہ قرارداد اس کے سامنے پیش ہوئی اور امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کے لیے امداد کی شرائط والی قرارداد میں قادیانیت کا مسئلہ شامل کر لیا یہ ہے مرزا طاہر احمد کی مہم اور یہ ہے اس کا طریق واردات جسے آپ کے علم میں لانا میں نے ضروری سمجھا ہے۔

پاکستان کی امداد کے لیے امریکی شرائط

امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کی امداد کے لیے جن شرائط کو اپنی قرارداد میں شامل کیا ان کا خلاصہ روزنامہ جنگ لاہور نے ۵ مئی ۱۹۸۷ء اور روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء کو شائع کیا ہے یہ میرے پاس موجود ہے اور آپ حضرات میں اکثر نہیں جانتے کہ ان شرائط میں کون کون سی باتیں شامل ہیں عام طور پر صرف ایٹمی تنصیبات کے معائنہ کی شرط کا ذکر کیا جاتا ہے بلاشبہ وہ بنیادی شرط ہے اور ہم اس مسئلہ پر پاکستان حکومت اور قوم کے موقف کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں بلکہ ہم تو اس سے بھی آگے کی بات کہتے ہیں ہمارا موقف یہ ہے کہ ایٹم بم پاکستان کا اور دیگر مسلمان ملکوں کا حق ہے اور اس سلسلہ میں معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے خیر امریکی شرائط میں صرف ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ نہیں اور امور بھی ہیں۔ جن میں دو کا بطور خاص آپ کے سامنے ذکر کرنا چاہتا ہوں امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کی اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی امداد کے لیے ضروری ہوگا کہ امریکی صدر ہر سال ایک سرٹیفکیٹ جاری کرے گا جس میں یہ درج ہوگا کہ حکومت پاکستان نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالہ میں نمایاں ترقی کی ہے۔

یہ کتنا خوبصورت جملہ ہے لیکن کلمة حق اريد بها الباطل اس کے اندر جو زہر چھپا ہوا ہے آپ حضرات نہیں جانتے آپ کہیں تو میں عرض کردوں کہ اس شوگر کے پردے میں کون سا زہر ہے؟ اس شرط میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو روکنے کی بات کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان مغربی ملکوں کے ہاں انسانی حقوق کا تصور کیا ہے؟ اور یہ کس چیز کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں اس بات کو سمجھنے کے لیے دیکھنا پڑے گا کہ پاکستان میں مغربی میڈیا کے "بوسٹر" کیا کہتے ہیں مغربی میڈیا کے بوسٹر ہر جگہ موجود ہیں۔

پاکستان میں بھی ہیں۔ امریکی سینٹ کی اس قرارداد کے بعد پاکستان میں بھی انسانی حقوق کمیشن قائم ہوا ہے جس کے سربراہ ریٹائرڈ جسٹس داراب پٹیل جو پارسی ہیں اور سیکرٹری جنرل عاصمہ جہانگیر ہیں جو ایک قادیانی ایڈووکیٹ مسٹر جہانگیر کی بیوی ہے یہ

لوگ پاکستان میں ہیومن رائٹس کے عنوان سے فورم منعقد کرتے ہیں جلسوں کا اہتمام کرتے ہیں مظاہرے کرتے ہیں اور امریکی سفارت کاران کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

ذرا سنیے اس کمیشن کے سربراہ مسٹر پٹیل کیا کہتے ہیں روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء کے مطابق مسٹر داراب پٹیل نے کہا کہ "کمیشن کو بہت سے ایسے قوانین منسوخ کرانے کی کوشش بھی کرنا ہوگی جو یکطرفہ ہیں اور جن سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا راستہ کھلتا ہے اس سلسلہ میں حدود آرڈیننس قانون شہادت غیر مسلموں کو مسلمانوں کی شہادت پر سزا دینے کا مسئلہ قادیانیوں اور احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے والا قانون جداگانہ انتخابات کا قانون سیاسی جماعتوں کا قانون یہ سارے قوانین ختم کرنا ہوں گے۔ یہ قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت نے ۲۷ اپریل ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں بیگم عاصمہ جہانگیر کے حوالہ سے کمیشن کے جنرل اجلاس میں کیے جانے والے مطالبات بھی شائع کیے ہیں جن کے مطابق تعزیرات اور حدود آرڈیننس کی بعض سزاؤں کو ظالمانہ اور غیر انسانی قرار دیا گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ سنگسار کرنے پھانسی پر لٹکانے اور موت کی سزا کو فی الفور ختم کیا جائے نیز کوڑے لگانے، ہاتھ کاٹنے اور قید تنہائی کی سزائیں بھی ختم کردی جائیں۔ جنرل اجلاس میں منظور کردہ ڈیکلریشن میں تمام مذہبی اقلیتوں کی تائید کی گئی ہے اور اس ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ حکومت کسی بھی شخص کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ مذہب یا فرقے کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہ کرے۔

حضرات محترم! اب تو آپ اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ انسانی حقوق سے ان کی مراد کیا ہے اور ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی کو روکنے کے عنوان سے مغربی ممالک اور لابیاں ہم سے کیا تقاضا کر رہی ہیں؟ امریکہ ہم سے یہ ضمانت چاہتا ہے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اسلامی قوانین نافذ نہیں کریں گے قرآن کریم کے احکام نافذ نہیں کریں گے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے جناب رسول مآب ﷺ کی توہین پر موت کی سزا کا قانون منظور کیا ہے جس پر ایک محترمہ نے کہا ہے کہ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ معاذ اللہ توہین رسالت کو بھی انسانی

حقوق میں شامل کیا جا رہا ہے اور یہ حق مانگا جا رہا ہے کہ کوئی بدبخت توہین رسالت کا ارتکاب کرنا چاہے تو اسے اس کا حق حاصل ہو اور قانون کو حرکت میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ ہے ان لوگوں کا انسانی حقوق کا تصور اور یہ اسی قسم کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ اس وقت کانفرنس کے سٹیج پر پنجاب کے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل جناب نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ بھی تشریف فرما ہیں ان سے معذرت کے ساتھ میں ایک "ریڈ لائن" کراس کرنے لگا ہوں کہ ہم پر "انسانی حقوق" کا کیسا تصور تھوپا جا رہا ہے۔ گزشتہ سال چکوال میں اغوا اور قتل کی ایک واردات ہوئی خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا عدالت نے قاتل کو موت کی سزا سنائی اور یہ فیصلہ دیا کہ پھانسی برسرعام لوگوں کے سامنے دی جائے۔ اسلام کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ سزا سرعام دی جائے تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور ۲۴:۲)

مجرموں کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے یہ اسلامی قانون کا تقاضا ہے لیکن ہماری عدالت عظمیٰ نے اس سزا پر عملدرآمد روک دیا ہے اور سپریم کورٹ میں گزشتہ چار پانچ ماہ سے اس نکتہ پر بحث جاری ہے کہ مجرم کو لوگوں کے سامنے سزا دینا اس کی عزت نفس کے منافی ہے اور یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اس لیے قاتل کو سرعام پھانسی نہیں دینی چاہیے۔ محترم بزرگو اور دوستو! یہ مثالیں میں نے وضاحت کے ساتھ اس لیے آپ کے سامنے رکھی ہیں تاکہ آپ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ انسانی حقوق سے مغربی ممالک کی مراد کیا ہے اور یہ طاقتیں جب ہم سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہ کرنے کی ضمانت طلب کرتی ہیں تو اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اب ایک اور شرط بھی سماعت فرما لیجیے جو امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کے لیے امریکی امداد کی شرائط کے ضمن میں اپنی قرارداد میں ذکر کی ہے اس کے مطابق امریکی صدر ہر سال اپنے سرٹیفکیٹ میں یہ بھی لکھیں گے کہ حکومت پاکستان اقلیتی گروہوں مثلاً احمدیوں کی مکمل شہری اور مذہبی آزادیاں نہ دینے کی روش سے باز آ رہی ہے اور ایسی تمام سرگرمیاں ختم کر دی ہے جو مذہبی آزادیوں پر قدغن عائد کرتی ہیں۔

آپ حضرات کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے اور معاملات کہاں تک

آگے پہنچ چکے ہیں آپ میں سے بیشتر حضرات یہ کہہ دیں گے کہ ہمیں تو ان باتوں کا علم ہی نہیں ہے لیکن کیا آپ کا نہ جاننا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے؟ کیا یہ بھی ہمارا قصور ہے کہ آپ حضرات مغرب میں رہتے ہوئے بھی ان امور سے واقف نہیں ہیں خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور اپنی ذمہ داری کا احساس کیجیے۔

حضرات محترم! اب میں آتا ہوں صدارتی آرڈیننس کی طرف یہ میرے ہاتھ میں صدارتی آرڈیننس کی کاپی ہے اس آرڈیننس کا مقصد اور منشا صرف یہ ہے کہ چونکہ قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں سے الگ ہے اس لیے قادیانی اسلام کا نام اور مسلمانوں کے مخصوص مذہبی شعائر استعمال نہ کریں۔ اس کے علاوہ اس آرڈیننس میں کچھ نہیں اس آرڈیننس کی رُو سے قادیانیوں کو اس امر کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ

ا۔ اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ نہ کریں اور خود کو مسلمان کے طور پر ظاہر نہ کریں۔

۲۔ اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہ کہیں اور اپنی عبادت کے لیے لوگوں کو بلانے کا طریقہ اذان سے الگ اختیار کریں اور اسے اذان نہ کہیں۔

۳۔ جناب نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کے علاوہ کسی اور خاتون کو ام المومنین نہ کہیں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور خلفاء کے علاوہ کسی اور کے لیے صحابی یا خلیفہ کی اصطلاح استعمال نہ کریں۔

آرڈیننس میں ان امور کو جرم قرار دیتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کے ارتکاب میں تین سال تک قید یا جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی ہے میں مغربی لابیوں سے پوچھتا ہوں کہ اس آرڈیننس میں قادیانیوں کو عبادت گاہ بنانے یا عبادت کرنے سے کہاں روکا گیا ہے؟ انہیں صرف اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنے سے روکا گیا ہے۔ اذان دینے سے روکا گیا ہے اور اسلام کے دیگر شعائر کے استعمال سے روکا گیا ہے اور جب قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے الگ ایک جداگانہ مذہب ہے تو یہ پابندیاں اس کا منطقی تقاضا ہیں اور ان اصولی اور منطقی پابندیوں کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ ہماری یہ آواز ویسٹرن میڈیا تک پہنچنی چاہیے اور مغربی لابیوں کے علم میں آنی چاہیے۔ برطانیہ میں رہنے

والے مسلمان بھائیو! ہم تو مجبور ہیں سال میں ایک آدھ بار آتے ہیں اور آواز لگا کر چلے جاتے ہیں یہ آپ کی ذمہ داری ہے اگر مرزا طاہر احمد یہاں کے ذرائع استعمال کرتا ہے تو مغرب کے ذرائع ابلاغ آپ کی دسترس سے باہر نہیں اگر مرزا طاہر احمد مغربی لابیوں کو اپروچ کر سکتا ہے تو آپ حضرات بھی کر سکتے ہیں خدا کے لیے آپ بھی اپنے فرائض پہچانیں اور اسلام اور پاکستان کے دفاع کے لیے سائنٹیفک بنیادوں پر کام کا طریقہ اختیار کریں۔

انسانی حقوق کے مجرم! قادیانی

حضرات محترم! اگر بات انسانی حقوق کی ہے تو میں یہ بات ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہم نہیں کر رہے بلکہ قادیانی کر رہے ہیں اور عملی صورت حال یہ ہے کہ خود ہمارے انسانی حقوق قادیانیوں کے ہاتھوں پامال ہو رہے ہیں اس لیے کہ اسلام کا نام مسجد اذان کلمہ طیبہ اور دیگر اسلامی شعائر دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کی پہچان ہیں اور ان کی شناخت ہیں اپنی شناخت کا تحفظ مسلمانوں کا حق ہے اور شناخت کی حفاظت انسانی حقوق میں شامل ہے جسے قادیانی مسلسل پامال کر رہے ہیں اور جب قادیانیوں کے خلاف اس جرم میں قانونی کارروائی ہوتی ہے تو مغربی لابسٹ چیخ اٹھتے ہیں کہ قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں اب دیکھیے میں ایک شخص ہوں۔ مجھے زاہد الراشدی کے نام سے پہچانا جاتا ہے گوجرانوالہ سے ماہنامہ الشریعہ شائع کرتا ہوں اور اس کا ایڈیٹر ہوں کوئی اور شخص یہ دعویٰ کرے کہ زاہد الراشدی میں ہوں یا الشریعہ کا ایڈیٹر میں ہوں تو کیا اس سے میری شناخت مجروح نہیں ہوتی؟ اور کیا میرے انسانی حقوق پر زد نہیں پڑتی اور اگر میں اس شخص کے خلاف دھوکہ دہی کا مقدمہ درج کرادوں اور قانون اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دے تو کیا مغربی لابیاں اس پر شور مچانا شروع کر دیں گی کہ اس کے انسانی حقوق پامال ہو گئے ہیں میں مغرب میں بیٹھ کر اسلام اور پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والی لابیوں سے خدا کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ کچھ انصاف کریں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کریں کہ وہ اپنی شناخت اور پہچان کی حفاظت کر سکیں اور اسلام کا نام اور اس کا لیبل اور ٹریڈ مارک غلط استعمال کرنے والوں کو ایسا کرنے سے باز رکھ سکیں یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے مذہبی نام کا

تحفظ کریں اپنی شناخت کا تحفظ کریں۔ اپنی علامات اور نشانیوں کا تحفظ کریں اور اپنی پہچان کو بچائیں۔ قادیانی گروہ مٹھی بھر ہونے کے باوجود مغربی طاقتوں اور لابیوں کی شہ پر ہماری پہچان کو خراب کر رہا ہے اور ہماری شناخت کو مجروح کر رہا ہے صدارتی آرڈیننس میں قادیانیوں کو اسی جرم سے روکا گیا ہے اس لیے انصاف کی بات یہ ہے کہ امتناع قادیانیت کا صدارتی آرڈیننس انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا نہیں بلکہ ان کی حفاظت اور ہیومن رائٹس کے تقاضوں کی تکمیل کا آرڈیننس ہے۔

میرے محترم بزرگو اور دوستو! کہنے کی باتیں ابھی بہت سی ہیں لیکن وقت کا دامن تنگ ہوتا جا رہا ہے اور میرے بعد دوسرے فاضل مقررین نے بھی آنا ہے اس لیے آخر میں آپ حضرات سے پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مغرب کے ممالک اور لابیاں ایک بات طے کر چکی ہیں کہ کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام کو کسی قیمت پر نافذ نہ ہونے دیا جائے یہ صرف ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ مصر اور مراکش کا بھی یہی مسئلہ ہے دنیا کے ہر مسلمان ملک میں مغربی میڈیا کے بوسٹر موجود ہیں جو انسانی حقوق اور بنیاد پرستی کے عنوان سے اسلامی قوانین کی مخالفت کر رہے ہیں اور قادیانیت جیسے گمراہ کن گروہوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں ان مسائل کا ادراک حاصل کرنا مغربی لابیوں کے طریق واردات کو سمجھنا اور اس کا توڑ پیدا کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے لیکن اس جسارت پر مجھے معاف فرمائیں کہ اس سلسلہ میں پہلی ذمہ داری آپ لوگوں کی ہے جو مغربی ممالک میں مقیم ہیں اور یہاں کے ذرائع تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اس کے بعد ہماری ذمہ داری ہے آیئے ہم سب عہد کریں کہ اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے دفاع میں اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس کریں گے اور اسے پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دیں آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

مسلم پرسنل لاء

اور

موجودہ عالمی صورتحال

> ۲۰ اگست ۱۹۹۰ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسگو (برطانیہ) میں جمعیۃ اتحاد المسلمین کے زیراہتمام ایک نشست میں "مسلم پرسنل لاء" کے حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

کچھ عرصہ سے یورپ میں مختلف حلقوں کی طرف سے یہ آواز بلند ہورہی ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو پرسنل لاء میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کیلیے آواز بلند کرنی چاہیے۔ سرکردہ علماء کرام کی یورپی کونسل نے دو ماہ قبل جرمنی میں معروف سکالر ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی کی زیرصدارت اجلاس منعقد کر کے اس تجویز کی طرف دینی اداروں کو توجہ دلائی ہے، اور برطانوی دارالامراء کے مسلمان رکن لارڈ نذیر احمد نے بھی ایک حالیہ تقریر میں اس کا تذکرہ کیا ہے اس لیے اس بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہ رہا ہوں لیکن قبل اس کے کہ غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں مسلم اقلیتوں کیلیے مسلم پرسنل لاء کی اہمیت پر کچھ عرض کروں خود مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں مسلم پرسنل لاء کی صورتحال کے بارے میں گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ ہمارے شخصی قوانین اور فیملی لاز خود مسلم ممالک میں خطرے میں ہیں اور مسلم حکومتوں پر بین الاقوامی طور پر دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے ممالک میں عمومی قوانین اور خاص طور پر پرسنل لاء یعنی نکاح و طلاق اور وارثت سے متعلقہ قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کیلیے قرآن وسنت

کے بیان کردہ ضابطوں میں تبدیلی کریں اور انہیں عالمی معیار کے مطابق بنائیں۔

اس سلسلہ میں بین الاقوامی معیار سے مراد اقوام متحدہ کا بنیادی حقوق کا چارٹر اور اس کی تشریح میں اقوام متحدہ کے مختلف اداروں اور کانفرنسوں کی قراردادیں ہیں جن کی بہت سی باتیں نکاح وطلاق اور وراثت کے بارے میں قرآن وسنت کے صریح احکام سے متصادم ہیں اور اسی لیے بین الاقوامی اداروں اور لابیوں کی طرف سے مسلم ممالک سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جب وہ اقوام متحدہ کے رکن ہیں اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر چکے ہیں تو انہیں اس کے مطابق اپنے قوانین میں ترمیم کرنی چاہیے اور اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کے اداروں کے فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی بنیاد پر مروجہ بین الاقوامی قوانین اور قرآن وسنت کے شرعی احکام میں کیا فرق اور تضاد ہے؟ اس کو واضح کرنے کیلیے دو تین باتوں کا بطور مثال ذکر کرنا ضروری ہے۔ مثلاً بین الاقوامی قوانین کے مطابق کوئی بھی مرد اور عورت رنگ نسل اور مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر آپس میں آزادانہ مرضی سے شادی کر سکتے ہیں، مگر اسلام میں مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم مرد سے نہیں ہو سکتا اور مسلمان مرد بھی اہل کتاب کے علاوہ کسی اور غیر اسلامی مذہب سے تعلق رکھنے والی خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جس کا اظہار آپ کے سامنے اس وقت ہوتا ہے جب یہاں کسی مغربی ملک میں کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم نوجوان کے ساتھ عدالت کے ذریعہ شادی کر لیتی ہے اور آپ عدالت سے رجوع کرتے ہیں کہ اسلام اس شادی کی اجازت نہیں دیتا تو یہاں کی عدالت آپ کا اعتراض سننے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور مروجہ بین الاقوامی معیار کے مطابق نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دے دیتی ہے بلکہ یہاں کا سسٹم اس شادی کو مکمل تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح نکاح کا رشتہ ختم کرنے میں مروجہ بین الاقوامی قانون خاوند اور بیوی کا یکساں حق تسلیم کرتا ہے کہ دونوں میں جو بھی چاہے اس رشتہ کو ختم کر سکتا ہے جبکہ اسلام نے نکاح کا رشتہ غیر مشروط طور پر ختم کرنے کا حق خاوند کو دیا ہے، جسے قرآن کریم نے "بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ" (البقرہ ۲:۲۳۷) کے ساتھ بیان کیا ہے اور عورت کو یہ حق براہ راست اور غیر مشروط طور پر نہیں دیا گیا بلکہ خلع کے عنوان سے عورت کا یہ حق عدالتی پراسیس کے ذریعے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام عورت کو نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا حق غیر مشروط طور

پر نہیں دیتا اور یہ بات مروجہ بین الاقوامی قانون سے متصادم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں برطانیہ میں کوئی مسلمان خاتون اپنے خاوند کو عدالت کے ذریعہ طلاق دے دے اور عدالت اس کی طلاق کو تسلیم کر لے تو کوئی عدالت خاوند کا یہ اعتراض سننے کے لیے تیار نہیں ہوگی کہ چونکہ شرعی قوانین کی رو سے طلاق دینے کا حق صرف اس کا ہے، اس لیے یہ طلاق واقع نہیں ہوئی چنانچہ قانونی طور پر وہ طلاق واقع ہو جائے گی اور یہاں کا سسٹم اس طلاق کا تحفظ بھی کرے گا۔ اس کے علاوہ وراثت کے معاملہ میں بھی قرآن کریم نے حصوں کی جو تقسیم کی ہے وہ واضح طور پر غیر مساویانہ ہے۔ خاوند کے فوت ہو جانے کی صورت میں بیوی کو ایک صورت میں ”آٹھواں اور دوسری صورت میں چوتھا حصہ ملتا ہے اور بیٹی کا حصہ ہر صورت میں بیٹے سے نصف ہوتا ہے“ جبکہ بین الاقوامی قانون اس سلسلہ میں برابری کا متقاضی ہے اور قرآن کریم کے بیان کردہ غیر مساویانہ حصوں کو غیر منصفانہ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا جب وراثت کے قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ حصوں پر نظر ثانی کر کے ان میں ترمیم کی جائے۔

یہ تین مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ نکاح، طلاق اور وراثت کے باب میں قرآن وسنت کے بیان کردہ قوانین آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین سے متصادم ہیں اور اقوام متحدہ کے مختلف اداروں سمیت بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے مسلم ممالک پر دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے قوانین میں ردو بدل کر کے انہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائیں۔ اس پر مسلم ممالک اور حکومتوں کا ردعمل تین طرح کا ہے ایک ردعمل ترکی کا ہے کہ اس نے پون صدی قبل ہی قرآن وسنت کے احکام سے اعلانیہ دست برداری اختیار کر کے مغربی قوانین کو قبول کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلہ پر سختی کے ساتھ قائم ہے بلکہ اگر ترکی میں اس حوالہ سے قرآن وسنت کے احکام کی طرف واپسی کا معمولی سا رجحان بھی نظر آنے لگتا ہے تو ریاستی قوانین اور ادارے اسے روکنے کیلیے پوری طرح سرگرم ہو جاتے ہیں۔ دوسرا ردعمل امارت اسلامی افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ قرآن کے احکام کے ساتھ بے لچک وابستگی قائم رکھتے ہوئے اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والے مروجہ بین الاقوامی قوانین کو قبول کرنے سے صاف

انکار کر رہے ہیں اور ان کا یہ واضح انکار بھی اس بات کی ایک بڑی وجہ ہے کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر کنٹرول اور دارالحکومت کا قبضہ حاصل کرنے اور اپنے زیر تسلط علاقے میں مکمل امن قائم کر لینے کے باوجود ان کی حکومتوں کو اقوام متحدہ میں تسلیم نہیں کیا جا رہا اور انہیں اقوام متحدہ میں افغانستان کی نشست سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

ترکی اور افغانستان کے فیصلے تو دوٹوک اور غیر مبہم ہیں جو سب کے سامنے ہیں لیکن ایک تیسرا ردعمل بھی ہے جو پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک کا ہے کہ قرآن وسنت پر عملدرآمد کا ٹائٹل بھی ہاتھ میں رہے اور مغرب کو بھی مطمئن رکھا جائے اس کے لیے ایک الگ راستہ اختیار کیا گیا کہ قرآن وسنت کے احکام وقوانین کی ایسی تعبیر وتشریح کی جائے جس سے قوانین کو مغرب کے معیار کے قریب تر لایا جائے، ہمارے ہاں اس سلسلہ میں پہلی کوشش صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں مسلم فیملی لاز آرڈیننس یعنی عائلی قوانین کے نفاذ کی صورت میں ہوئی تھی جس کی متعدد دفعات کو ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر قرآن وسنت سے متصادم قرار دیا لیکن اس کے باوجود وہ نافذ ہوئے اور ابھی تک ریاستی قوت کے بل بوتے پر مسلسل نافذ العمل ہیں۔ ان قوانین میں سے صرف ایک مثال دوں گا کہ نکاح کے فارم میں خاوند کی طرف سے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دینے کا خانہ رکھ کر ہم نے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہم نے پاکستان میں عورت کو بھی طلاق کا حق دیدیا ہے۔ اسی سے باقی قوانین کے رخ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اب اقوام متحدہ کی قاہرہ اور بیجنگ میں ہونے والی خواتین کانفرنسوں کے بعد ان کی قراردادوں اور فیصلوں کی روشنی میں اگلے مرحلوں کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے اس سلسلہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک حاضر سروس جسٹس کی سربراہی میں قائم ہونے والے ''خواتین حقوق کمیشن'' نے کچھ عرصہ قبل جو سفارشات پیش کی ہیں وہ قانون سازی کیلیے وزارت قانون کی میز پر ہیں اور ان میں واضح طور پر سفارش کی گئی ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح طلاق کا مکمل حق دیا جائے اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم ختم کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی عدالتوں میں بھی اس نوعیت کے فیصلے ہونے لگے ہیں مثلاً لاہور ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا ہے اور سندھ

ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں وراثت میں بیٹی کے نصف حصے کو انصاف کے منافی قرار دیدیا ہے اور اس طرح ہم نے قرآن وسنت کا ٹائٹل برقرار رکھتے ہوئے بین الاقوامی معیار کے قریب آنے کیلیے شرعی احکام کی نئی اور من مانی تعبیر وتشریح کا راستہ اختیار کرلیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی قوانین کے معیار کو پورا کرنے اور مغربی اداروں کو مطمئن کرنے کیلیے قرآن وسنت کے احکام وقوانین کی نئی تعبیر وتشریح کا یہ عمل مسلم ممالک کی حکومتوں اور حکومتی اداروں کا ہے۔ مگر عام مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی رائے عامہ نے اس عمل کو قبول نہیں کیا کیونکہ ہر مسلمان ملک میں دینی حلقے اور عام مسلمان قرآن وسنت کے احکام وقوانین کی اسی تعبیر وتشریح پر سختی سے عمل پیرا ہیں جو چودہ سو سال سے اجماعی طور پر چلی آرہی ہے اور وہ اس میں کسی قسم کا ردو بدل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دینی ادارے ہر جگہ مزاحمت کر رہے ہیں چنانچہ ابھی بنگلہ دیش سے آئے ہوئے ہمارے پرانے بزرگ مولانا محی الدین خان نے مجھے لندن میں بتایا کہ بنگلہ دیش کے ہائیکورٹ نے کومیلا کے ایک مقدمہ میں طلاق یافتہ خاتون کو سابقہ خاوند کی طرف سے زندگی بھر نان ونفقہ دیے جانے کا حکم صادر کردیا تو سرکردہ علماء کرام نے شریعت کونسل قائم کرکے اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا اور عدالت عظمیٰ نے علماء کرام کا موقف سننے کے بعد ہائیکورٹ کے فیصلے کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیدیا۔ الغرض یہ ایک الگ کشمکش ہے جو مسلمان حکومتوں اور دینی حلقوں کے درمیان جاری ہے اور عام مسلمان ہر ملک میں قرآن و سنت کے حوالہ سے علماء کرام اور دینی حلقوں کے ساتھ ہیں۔

یہ قدرے تفصیل میں نے اس لیے عرض کی ہے تاکہ آپ حضرات کے سامنے وہ صورتحال واضح ہو جو اس وقت مسلم ممالک میں نکاح وطلاق اور وراثت کے اسلامی قوانین کے حوالہ سے مسلمانوں کو درپیش ہے اور اسی بنیاد پر میں نے عرض کیا ہے کہ مسلم پرسنل لاء خود مسلم ممالک میں خطرہ میں ہیں اور انہیں مغربی ممالک کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک مسلسل عمل جاری ہے اور صرف پرسنل لاء اور خاندانی قوانین کی بات نہیں بلکہ قرآن وسنت کے دیگر احکام وقوانین بھی مغربی دباؤ کی زد میں ہیں مثلاً اقوام متحدہ کے چارٹر کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ کسی مجرم کو دی جانے والی سزا اہانت، ذہنی اذیت اور جسمانی تشدد سے

خالی ہونی چاہیے یعنی سزا ایسی ہو کہ اس میں مجرم کی توہین نہ ہوتی ہو، وہ ذہنی اذیت کا شکار نہ ہو اور اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی نہ بننا پڑے۔ اس بنیاد پر ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور کھلے بندوں عام لوگوں کے سامنے سزا دینے کے سب قواعد وضوابط اس بین الاقوامی معیار کے منافی قرار پاتے ہیں۔ جرائم کی شرعی سزاؤں کی بین الاقوامی اداروں کی طرف سے جو مخالفت ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ہے اور جرائم کی شرعی سزاؤں کو بعض سیاسی لیڈروں کی طرف سے وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دیے جانے کا پس منظر بھی یہی ہے۔ اب مغرب والوں کا یہ موقف تو سمجھ میں آتا ہے کہ بہت سے اسلامی احکام وقوانین آج کے بین الاقوامی برادری کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں اس کے احکام وضوابط بھی قبول کرنا ہونگے۔ اسی طرح بین الاقوامی اداروں کی یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جن مسلم ممالک نے اقوام متحدہ کی رکنیت قبول کر کے اس کے چارٹر پر دستخط کیے ہوئے ہیں انہیں اس بین الاقوامی معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ البتہ ان مسلم حکومتوں کا طرز عمل سمجھ سے بالاتر ہے جو بین الاقوامی معیار اور قرآن وسنت کے قوانین کو ساتھ ساتھ لیکر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کوشش میں شرعی احکام کا حلیہ بگاڑ دینا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد کی وہ بات بہت پسند آئی تھی جو انہوں نے اقوام متحدہ کے پچاس سالہ تقریبات کے موقع پر مسلم حکومتوں کے سامنے رکھی تھی، ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں اقوام متحدہ کے چارٹر پر نظر ثانی کر کے اسے از سر نو مرتب کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ چارٹر پچاس سال قبل ترتیب دیا گیا تھا، جب اکثر مسلم ممالک غلامی کی حالت میں تھے اور آج صورتحال بدل گئی ہے اس لیے عالم اسلام کے موقف اور پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اس چارٹر پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت مہاتیر محمد کی یہ بات مسلم حکومتوں نے قبول نہیں کی، لیکن یہی موقف حقیقت پسندانہ ہے اور مسلم ممالک کو بالآخر اسی موقف پر آنا ہوگا۔

یہ تو ہے صورتحال مسلم پرسنل لاء کے حوالہ سے خود مسلم ممالک کی۔ اب آیئے ان ممالک کی طرف جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں بھارت کے مسلمان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ تمام تر مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے خاندانی قوانین کا تحفظ کیے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں تمام مکاتب فکر کا

مشترکہ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے پرسنل لاء کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بھارت میں ''کامن سول کوڈ'' کے نفاذ کے نام سے مسلمانوں کے جداگانہ شخصی قوانین کو ختم کرنے کی مہم ایک عرصہ سے چل رہی ہے اور مسلمانوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ قومی یکجہتی کی خاطر نکاح وطلاق اور وراثت میں اپنے جداگانہ مذہبی قوانین سے دست بردار ہو کر ''کامن سول کوڈ'' قبول کر لیں اور یہاں بھی کامن سول کوڈ سے مراد وہی بین الاقوامی قوانین اور معیار ہے جس کا تذکرہ میں نے پہلے اقوام متحدہ کے چارٹر کے حوالہ سے کر دیا ہے مگر انڈین مسلمان اس معاملہ میں بالکل بے لچک ہیں اور پرسنل لاء میں اپنے مذہبی احکام وقوانین کے تحفظ کا پوری طرح عزم کیے ہوئے ہیں جس پر وہ بلاشبہ تبریک، تحسین اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ جہاں تک مغربی ممالک کا تعلق ہے۔ میں نے چند ایسے مسائل کا ابتدا میں ذکر کر دیا ہے جن کا سامنا آپ حضرات کو یہاں درپیش ہے مثلاً مسلمان لڑکی کی غیر مسلم لڑکے سے شادی، مسلمان بیوی کا عدالتی سسٹم کے ذریعہ خاوند کو طلاق دینا اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم، اس قسم کے مسائل آپ حضرات کو مسلسل پیش آتے ہیں اور آپ جب مذہب اور اپنی روایات کے حوالہ سے بات کرتے ہیں تو آپ کی بات قطعی طور پر نہیں سنی جاتی، لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں، لڑکے باغی ہو جاتے ہیں، انہیں اس سلسلہ میں ریاستی سسٹم کی طرف سے مکمل تحفظ اور پشت پناہی مہیا ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں سینکڑوں مسلم خاندان تتر بتر ہو کر رہ جاتے ہیں جبکہ عالمی صورتحال یہ ہے کہ پرسنل لاء اور کلچر میں ہر قوم کے جداگانہ تشخص کو اصولاً تسلیم کیا گیا اس لیے اسے عملی طور پر تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کی حکومت کو اس سے کوئی انکار ہوگا کیونکہ اسی برطانیہ نے جب برصغیر پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور برما پر مشتمل متحدہ ہندوستان میں مغلوں سے اقتدار حاصل کیا تھا تو مغلوں کے دور سے چلا آنے والا عدالتی نظام ختم کر دیا تھا، اس وقت متحدہ ہندوستان کی عدالتوں میں فتاویٰ عالمگیری نافذ تھا اور اس کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔ جسے انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ختم کر کے انگریزی قوانین نافذ کر دیے تھے جو اب تک چلے آ رہے ہیں لیکن انہوں نے پرسنل لاء یعنی نکاح وطلاق اور وراثت کے باب میں مسلمانوں کا یہ حق اس وقت بھی بحال

رکھا تھا کہ وہ ان معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں اور "محمڈن لاء" کے نام سے پرسنل لاء اور خاندانی قوانین میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تسلیم کیا گیا تھا۔ اس لیے اس دور میں جبکہ ہم برطانوی استعمار کے غلام تھے اور برطانیہ کی نوآبادی تھے مگر ہمارے اس حق سے انکار نہیں کیا گیا تو آج برطانیہ میں رہنے والے مسلمان غلام نہیں بلکہ برابر کے شہری ہیں تو ان کے اس حق کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو پرسنل لاء میں جداگانہ تشخص فراہم کیا گیا ہے خود پاکستان کے دستور میں ان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے اور سب سے پہلے علماء کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں اس اصول کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا کہ پرسنل لاء میں تمام اقلیتوں کو اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔ اس لیے جب پاکستان میں عیسائی اقلیت اور دیگر اقلیتوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا گیا تو برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرنے میں بھی کوئی حجاب نہیں ہونا چاہیے۔

ان گزارشات کے ساتھ میں مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے خاندانی نظام کے تحفظ کی طرف توجہ دیں اور پرسنل لاء میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کیلیے منظم جدوجہد کا آغاز کریں کیونکہ اس کے بغیر وہ خاندانی نظام کے حوالہ سے درپیش ان مسائل اور مشکلات سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے، جنہوں نے مغرب میں رہنے والے ہر حساس اور دیندار مسلمان خاندان کو پریشان کر رکھا ہے اور جدوجہد سے میرا مقصد لڑائی جھگڑا اور بے تکا شور وغوغا نہیں ہے بلکہ جدوجہد سے مراد یہ ہے کہ معقولیت اور منطق کے ساتھ اپنا موقف متعلقہ اداروں اور شخصیات کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لیے لابنگ کی جائے، بریفنگ کی جائے اور رائے عامہ کو مؤثر طریقہ سے ہموار کر کے مغرب کی حکومتوں کو اس کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے ایک جائز اور مسلمہ حق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے اپنے ملکوں میں اسے دستوری تحفظ فراہم کریں۔

انسانی حقوق کا مغربی تصور
سیرت طیبہ کی روشنی میں

۲۸ نومبر ۹۴ء کو مظفر آباد میں حکومت آزاد کشمیر کے زیر اہتمام سردار سکندر حیات خان کی زیر صدارت منعقدہ سیرت کانفرنس سے خطاب۔

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصّلوۃ والسلام علی سید المرسلین
محمد والہ واصحابہ اجمعین، اما بعد!

صدر ذی وقار، معزز مہمان خصوصی اور قابل صد احترام شرکاء سیرت کانفرنس۔

جناب رسالت مآب ﷺ کی سنت ہے کہ اسلام کی دعوت اور پیغام کو مخاطب کی زبان میں اس کی ذہنی سطح اور نفسیات کے مطابق پیش کیا جائے۔ مکہ مکرمہ کے قریشی سردار جب رسول اللہ ﷺ کی دعوت توحید کے اثرات سے پریشان ہو کر جرگے کی صورت میں آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا کہ آخر آپ کی دعوت کا مقصد کیا ہے اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے مزاج و نفسیات اور ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ:

"میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ اگر تم اسے قبول کر لو تو عرب و عجم تمہارے تابع ہوں گے"۔

آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ غلبہ، قوت اور اقتدار کے سوا کسی اور زبان کو نہیں سمجھتے، اس لیے آپ ﷺ نے ان ہی کی زبان میں دعوت اسلام کے نتائج و فوائد سے انہیں آگاہ کیا اور یہ بات خلاف واقعہ بھی نہ تھی، اس لیے کہ اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کے بے شمار نتائج و منافع میں سے ایک منفعت یہ بھی تھی اور چونکہ سوال کرنے والوں کے ہاں اس

منفعت کی اہمیت زیادہ تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اسی منفعت کا حوالہ دے کر ان کے سوال کا جواب مرحمت فرمایا۔

اس پس منظر میں آج کے دور میں دعوت اسلام کی ضروریات اور تقاضوں کا جائزہ لیا جائے اور جناب رسالت مآب ﷺ کی سیرت طیبہ کو نسل انسانی کے سامنے پیش کرنے کے لیے ترجیحات پر غور کیا جائے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے بارے میں قرآن کریم کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات واحکام کو زیادہ اہمیت کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے انسانی معاشرہ کو بتایا جائے کہ انسانی حقوق کے تعین اور تحفظ کا جو معیار اور دائرہ کار اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ﷺ نے کم وبیش ڈیڑھ ہزار سال قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، انسانی عقل تدریج وترقی کے تمام مراحل طے کرنے اور مختلف نظام ہائے زندگی کا تجربہ کرنے کے باوجود اس کا کوئی متبادل سامنے نہیں لا سکی، اور انسانی معاشرہ ایک بار پھر پریشانی اور اضطراب کے عالم میں اپنے مسائل ومشکلات کے حل کے لیے کسی مسیحا کے انتظار میں ہے۔

آج دنیا میں انسانی حقوق کی زبان سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ سنی جانے والی زبان ہے جبکہ ورلڈ میڈیا نے اسے صرف زبان کی حد تک نہیں رہنے دیا بلکہ وقت کا موثر ترین ہتھیار بنا دیا ہے جو عالم اسلام اور تیسری دنیا کی اقوام کے خلاف مغرب کے ہاتھوں میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے اور مغرب جسے چاہتا ہے، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور جنیوا کنونشن کی قراردادوں کے شکنجے میں جکڑ کر انسانی حقوق کی چھری کے ساتھ ذبح کر دیتا ہے۔

حضرات محترم!

مغرب انسانی حقوق کے حوالہ سے جتنے بلند وبانگ دعوے کرلے، مگر انسانی حقوق اور فری سوسائٹی کے مغربی تصور پر مبنی سولائزیشن نے نتائج وثمرات کے لحاظ سے آج جو روپ دھار لیا ہے، اس نے خود مغربی دانشوروں کو حیران وششدر کر دیا ہے اور مغربی معاشرہ میں جنسی انارکی اور فیملی سسٹم کی تباہی نے گورباچوف جیسے مدبر کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ:

"ہم نے عورت کو گھر سے نکال کر غلطی کی ہے اور اب اسے گھر واپس لے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا"۔

دراصل مغرب حقوق و فرائض میں توازن قائم رکھنے اور ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں ناکام رہا ہے جبکہ جناب نبی اکرم ﷺ نے حقوق اور فرائض کو نہ صرف یکجا ذکر کیا بلکہ ان کے درمیان ایک ایسا حسین توازن قائم کر دیا جو گاڑی کے دو پہیوں کی طرح انسانی زندگی کا یکساں بوجھ اٹھا سکتا اور اسے لے کر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے مگر مغرب نے حقوق و فرائض کو آپس میں گڈمڈ کر دیا اور ان کے درمیان کوئی خط امتیاز قائم نہ رہنے دیا، جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ ذہنی انتشار اور فکری انارکی کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے۔

مثلاً اقتدار اور حکومت کو نبی اکرم ﷺ نے فرائض اور ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے اور قدم قدم پر اس ذمہ داری کی نزاکت اور سنگینی سے خبردار کیا ہے، جس کا منطقی نتیجہ حکمرانوں میں احساس ذمہ داری اور خدا خوفی کی صورت میں ظاہر ہوا اور لوگ اقتدار کی دوڑ میں شریک ہونے کے بجائے اس سے بچنے میں عافیت محسوس کرنے لگے۔ مگر مغرب نے اسے حقوق کی فہرست میں رکھ دیا اور اس حق کو حاصل کرنے کے لیے جو دوڑ لگتی ہے، اس کے فوائد و نقصانات کا تناسب ہر ذی شعور پر واضح ہے۔

اسی طرح محنت، مزدوری اور ملازمت کے ذریعے روزی کمانا اور اہل خانہ کی کفالت کرنا رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی رو سے فرائض کا حصہ ہے اور ڈیوٹی ہے جو گھر کے سربراہ پر عائد ہوتی ہے، مگر مغرب نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بے شمار افراد کے قتل ہو جانے کی ضرورت محسوس کی تو ملازمت اور محنت و مزدوری کی ڈیوٹی پر ''حقوق'' کا خوشنما لیبل چسپاں کر کے اس غریب کو ورغلا لیا اور وہ ''عقل کی پوری'' بچہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کی ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ اسے کما کر کھلانے کی ڈیوٹی میں بھی شامل ہو کر خوش ہونے لگی کہ اب میں مردوں کے شانہ بشانہ ''مساوی حقوق'' سے بہرہ ور ہو گئی ہوں۔

اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ نے "اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرْ" اور حکومت کے غلط طرز عمل پر نقد و جرح کو فرائض میں شمار کیا ہے جو حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی کسی تقسیم کے بغیر معاشرہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے کو جہاد قرار دیا ہے اور یہ تعلیم دی ہے کہ جو شخص دیکھتے جانتے ہوئے بھی غلط کو غلط نہیں کہتا، وہ شریعت کی نظر میں مجرم ہے۔ مگر مغرب نے آزادی رائے اور حکومت کی غلط

پالیسی پر اسے ٹوکنے کو فرائض کے زمرہ سے نکال کر حقوق کے دائرہ میں شامل کرلیا، جس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ یہ ایک اختیاری امر بن گیا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ''حقوق'' کے تصور نے اقتدار اور اپوزیشن کی صف بندی کردی اور پوری قوم کو حصوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔

یہ چند مثالیں اس باب کو واضح کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ مغرب نے ''حقوق وفرائض'' کو خلط ملط کر کے انسانی معاشرہ کی گاڑی کے دونوں پہیوں کا توازن بگاڑ دیا ہے جس کی وجہ سے گاڑی مسلسل لڑکھڑاتی چلی جارہی ہے جبکہ جناب رسالت مآب ﷺ نے حقوق وفرائض میں توازن قائم کیا اور اس کا عملی نمونہ خلافت راشدہ کی صورت میں پیش کر کے دنیا کو دکھا دیا۔

سامعین گرامی قدر!

مغرب سے انسانی حقوق کے حوالہ سے دوسری بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ حقوق کے تعین کا معیار قائم کرنے میں اس کی نگاہ انسانی معاشرے کی وسیع تر ضروریات کا احاطہ نہ کرسکی۔ مغرب نے حق کے تعین میں معیار یہ پیش کیا کہ ہر شخص کو اپنی مرضی پر عمل کرنے کا حق ہے، جب تک کہ دوسرے شخص کی آزادی متاثر نہ ہو۔ اس طرح مغرب نے حق اور ناحق، جائز اور ناجائز کے تعین میں شخصی مفادات وضروریات میں ہم آہنگی یا ٹکراؤ کو بنیاد بنایا اور اس سے آگے نسل انسانی اور انسانی معاشرہ کی اجتماعی ضروریات ومفادات تک اس کی نگاہ نہ جاسکی، جس کا خمیازہ مغرب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

مثلاً مرد عورت کے اختلاط میں مغرب نے یہ تصور پیش کیا کہ جس درجہ کے اختلاط پر وہ دونوں باہم رضا مند ہوں، کسی تیسرے کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی قانون کو گرفت کرنی چاہیے۔ یہاں مغرب نے مرد اور عورت کی باہمی رضا مندی تو لی مگر پورے معاشرہ پر اس اختلاط کے اثرات کو نہ دیکھ سکا جس کے نتیجے میں کنواری ماؤں اور ناجائز بچوں کے تناسب میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے اور فیملی سسٹم تباہی کی آخری حدود کو چھو رہا ہے جبکہ جناب نبی اکرم ﷺ نے مرد وعورت کی اس باہمی رضا مندی کو بھی جرم قرار دیا ہے جو پورے معاشرے کے لیے منفی نتائج کا باعث بن سکتی ہو اور مرد وعورت کے اختلاط اور میل جول کا ایک دائرہ قائم کر کے باقی ہر قسم کے میل جول سے منع فرمادیا ہے، کیونکہ کسی بھی عمل

کے جائز ہونے کے لیے صرف اس عمل کے دو فریقوں کا رضا مند ہونا کافی نہیں بلکہ انسانی معاشرہ کا اس کے منفی اثرات سے محفوظ رہنا بھی ضروری ہے اور یہی بنیاد ہے اُس توازن کی جو رسول اللہ ﷺ نے مرد و عورت کے تعلقات کے حوالہ سے قائم فرمایا ہے۔

اسی طرح سود کے بارے میں مغرب نے کہا ہے کہ جب سود لینے اور دینے والے آپس میں متفق ہیں تو کسی اور کو کیا اعتراض ہے؟ یہاں بھی مغرب نے دو افراد کی رضامندی کے محدود دائرہ کو بنیاد بنایا جبکہ جناب رسالت مآب ﷺ نے معاشرہ پر مجموعی طور پر اس کے منفی اثرات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حرمت کا اعلان فرمایا اور آج سودی معیشت نے جس طرح پوری دنیا کو چند مخصوص گروہوں کی معاشی اجارہ داری کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے وہ اسلامی تعلیمات کی صداقت اور جناب رسالت مآب ﷺ کی خداداد فہم و بصیرت کی روشن اور کھلی شہادت ہے۔

ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ جناب رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالہ سے ہمیں آج کھلے دل و دماغ کے ساتھ انسانی حقوق کے مغربی تصور کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کے وسیع تر پراپیگنڈہ سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کے کھوکھلے پن کو تقابلی مطالعہ کے ساتھ سامنے لا کر تعلیمات و احکام کو واضح کرنا چاہیے تاکہ مشکلات و مصائب کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کی اسوۂ حسنہ کے شفاف اور خوش ذائقہ چشمہ حیات کی طرف راہنمائی کی جا سکے۔

حضرات گرامی قدر!

مغرب اور انسانی حقوق کے حوالہ سے گفتگو چلی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے فلسفہ کی فکری بنیادوں سے ہٹ کر اس کے واقعاتی پہلوؤں پر بھی کچھ معروضات پیش کر دی جائیں، بالخصوص اس تضاد اور دو عملی کے پس منظر میں جو مغرب نے عالم اسلام کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے اور جس نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی ہے کہ مغرب کے نزدیک ''انسانی حقوق'' کسی فلسفہ یا اصول کا نام نہیں بلکہ یہ محض ایک ہتھیار ہے جو اس نے مخالف اقوام پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔ ورنہ مغرب جو ووٹ، الیکشن اور بیلٹ بکس کے تقدس کا علمبردار ہے اور غیر جمہوری حکومتوں کا اپنے ساتھ برابر کی سطح پر

بیٹھنا گوارا نہیں کرتا، الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کی انتخابی کامیابی پر آتش زیر پا کیوں ہے؟ اور اسلامک فرنٹ کی جمہوری قوت کو کچلنے کے لیے الجزائر کی غیر جمہوری حکومت کی پشت پناہی کیوں کر رہا ہے؟ آج اس مغرب کو بوسنیا کے خلاف سربوں کی جارحیت اور بوسنیا کے مسلمانوں کا گاجر مولی کی طرح کٹتے چلے جانا نظر نہیں آرہا، صرف اس لیے کہ جن کی عصمتیں لٹ رہی ہیں اور جن کی گردنیں کٹ رہی ہیں، وہ مسلمان کہلاتے ہیں اور مغرب، سلامتی کونسل کی اٹھک بیٹھک اور زبانی جمع خرچ کے ساتھ سربوں کی مکمل فتح کا انتظار بلکہ عملاً اس کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے۔

سامعین ذی وقار!

اس مغرب کو وادی کشمیر میں گھر گھر بہنے والا خون بھی نظر نہیں آرہا اور نہ حوا کی بیٹیوں کی دل فگار چیخیں مغرب کے کانوں تک پہنچ پا رہی ہیں۔ کشمیر میں انسانی حقوق کے ساتھ ہولی کھیلی جا رہی ہے مگر چونکہ مرنے والے مسلمان ہیں اور ان کے ساتھ مغرب کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، اس لیے کشمیر کے حوالے سے مغرب کے کان اور آنکھیں بند ہیں اور اس کے انسانی حقوق کے سارے کے سارے فلسفے مصلحتوں کے فریزر میں منجمد پڑے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ کشمیر، بوسنیا، فلسطین نے اور اب چیچنیا کے خلاف روسی جارحیت کے حوالہ سے منافقانہ طرز عمل نے مغرب کے چہرے سے ''انسانی حقوق'' کا ریاکارانہ نقاب نوچ پھینکا ہے اور اس کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے کر دیا ہے جس کے بعد اس کے پیش کردہ انسانی حقوق کا ظاہری بھرم بھی قائم رہتا نظر نہیں آتا۔ اس لیے مسلم علماء اور دانشوروں کو چاہیے کہ وہ حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھیں فلسفہ اور متوازن نظام وہی ہے جو جناب رسالت مآب ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا اور آج بھی انسانی معاشرہ کی فلاح و کامیابی اسی نظام کو اپنانے پر منحصر ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات

صفہ اکیڈمی گوجرانوالہ رمضان المبارک کے دوران روزانہ نماز فجر کے بعد ''ہدیٰ للناس کورس'' کے عنوان سے مختلف موضوعات پر لیکچرز کا اہتمام کرتی ہے، جس میں حضرات وخواتین کی ایک بڑی تعداد اہتمام کے ساتھ شریک ہوتی ہے اور مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام اور ارباب دانش اظہار خیال کرتے ہیں۔ 28 اکتوبر کو ''انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات'' کے عنوان پر راقم الحروف کو کچھ گزارشات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس موقع پر جو معروضات پیش کیں، ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے: انسانی حقوق آج کی دنیا کا ایک اہم موضوع ہے جس پر غالباً سب سے زیادہ گفتگو ہوتی ہے اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے انسانی حقوق پر گفتگو ضروری ہے، مگر آج کی مجلس میں صرف ایک پہلو پر کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ انسانی حقوق کے آج کے فلسفے اور حقوق انسانی کے اسلامی فلسفے میں کیا فرق ہے۔ جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے، قرآن کریم نے بھی اس کے متعدد پہلوؤں پر گفتگو کی ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کے بیسیوں پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے، لیکن آج کے دور کے انسانی حقوق کے فلسفہ اور اس سلسلے میں قرآن وسنت کی تعلیمات میں چند بنیادی اور اصولی فرق ہیں، جن کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں پہلا فرق تو اصطلاح کا ہے کہ انسانوں کے باہمی حقوق جن کو آج کے جدید فلسفے میں ''انسانی حقوق'' اور ''ہیومن رائٹس'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اسلام نے ان کا ذکر ''حقوق العباد'' کے عنوان سے کیا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ میں ہدایات واحکام کا ایک وسیع سلسلہ موجود ہے اور وہ ایسا منظم اور مربوط ہے کہ شاید ہی

کوئی اور سسٹم حقوق انسانی کی وہ تفصیلات اور ترجیحات بیان کرتا ہو، جن کی نشاندہی قرآن وسنت نے کی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ آج کا فلسفہ حقوق کی فہرست کو صرف انسانی سوسائٹی تک محدود رکھتا ہے اور انسان کو پیدا کرنے والے رزق دینے والے اور بے شمار نعمتوں سے نوازنے والے خالق و مالک کے حقوق سے کوئی بحث نہیں کرتا، اسے اس بات سے سرے سے کوئی غرض ہی نہیں ہے کہ خدا کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں، اس پر ایمان لانا ضروری ہے یا نہیں اور خالق و مالک کی حیثیت سے اس کا اپنے بندوں پر کوئی حق ہے یا نہیں؟ جبکہ اسلام اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے نہ صرف وجود پر ایمان کو ضروری قرار دیتا ہے، بلکہ اس کی توحید اور پھر اس کے حقوق کے اقرار کو بھی ناگزیر سمجھتا ہے اس لیے اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بات کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان توازن کو دین کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

اسلام نے اس سلسلے میں دونوں انتہاؤں کی نفی کی ہے۔ ایک طرف یہ انتہا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی میں ہی مصروف رہا جائے اور انسانوں کے حقوق کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے۔ اسے اسلام نے ''رہبانیت'' سے تعبیر کیا ہے اور قرآن کریم نے اس کی صاف طور پر نفی کردی ہے، جبکہ دوسری طرف یہ انتہا ہے کہ صرف بندوں کے حقوق اور انسانوں کے ساتھ معاملات پر ہی ساری توجہ صرف کردی جائے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کو غیر ضروری تصور کرلیا جائے۔ اسلام نے اسے دنیا پرستی قرار دیا ہے اور اس کی نفی بھی کی ہے۔ اسلام کی تعلیم اس سلسلے میں واضح ہے کہ خالق و مالک کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے رسولوں کی تعلیمات کی پیروی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار اور اس کی بندگی اور اطاعت بھی ضروری ہے اور انسانی سوسائٹی میں اپنے ساتھ رہنے والے انسانوں کے حقوق کی پاسداری بھی ضروری ہے قرآن وسنت نے ان کے درمیان توازن اور ترجیحات کا ایک مربوط نظام پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا وہ ارشاد اصولی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے جو انہوں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا اور بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کی تصدیق و توثیق فرمادی تھی کہ ''تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیری جان کا تجھ پر حق ہے تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے اور تیرے مسلمان بھائی کا تجھ پر حق ہے اس

لیے (دین اس کا نام ہے کہ) ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو"۔

انسانی حقوق کے حوالے سے اسلامی تعلیمات اور آج کے جدید فلسفے میں تیسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام میں حقوق کا تعین آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جبکہ جدید فلسفے کے پاس اس کے تعین کی بنیاد صرف انسانی سوسائٹی کی خواہشات ہیں۔ انسانی سوسائٹی کی اکثریت جس بات کو حق قرار دے، وہ حقوق کی فہرست میں شامل ہو جائے گی اور جسے وہ حقوق کی فہرست سے نکال دے، وہ خارج ہو جائے گی۔ جمہوریت اور ووٹنگ انسانی سوسائٹی کی خواہش معلوم کرنے کا طریقہ ہے۔ اصل بنیاد انسانی سوسائٹی کی خواہشات پر ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ چونکہ انسانی سوسائٹی کی خواہشات کو کہیں قرار نہیں ہے اور انہیں کسی جگہ بریک نہیں لگتی، اس لیے حقوق کی یہ فہرست ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کام جو ایک زمانے میں جرائم کی فہرست میں شمار ہوا کرتا تھا دوسرے دور میں وہ جرائم کی فہرست سے نکل کر حقوق کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے میں دو مثالوں سے یہ بات واضح کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ مرد اور عورت کا بغیر شادی کے اکٹھے رہنا جنسی تعلق قائم کرنا اور بچے پیدا کرنا ایک دور میں جرم سمجھا جاتا تھا، بائبل کے نزدیک آج بھی وہ جرم ہے، لیکن آج کے دور میں اس عمل کو نہ صرف یہ کہ جرائم کی فہرست سے نکال دیا گیا ہے، بلکہ متعدد قوانین کے ذریعے مغربی ممالک نے اس کے جواز کو تسلیم کرتے ہوئے اسے حقوق کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

اسی طرح ہم جنس پرستی کچھ عرصہ پہلے تک جرم تصور ہوتی تھی اور اس کی مذمت کے ساتھ ساتھ اس پر سنگین سزا کی آیات آج بھی بائبل میں موجود ہیں، لیکن سوسائٹی کی اجتماعی سوچ بدلنے کے ساتھ ہی اسے جرائم کی فہرست سے نکال کر حقوق کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے اور مغربی ممالک کی اسمبلیاں اس حوالے سے مسلسل قانون سازی کر رہی ہیں جبکہ اسلام اس کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کا موقف یہ ہے کہ اس سلسلے میں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات میں جو اصول طے کر دیے گئے ہیں اور جو دائرے حقوق و معاملات اور حرام و حلال کے حوالے سے قطعی طور پر متعین کر دیے ہیں، انسانی سوسائٹی کو انہیں کراس کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسے ان حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی اپنے معاملات طے کرنے کا

اختیار ہے۔ اسی طرح اسلام ان امور کو انسانی حقوق کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جنہیں انسانی سوسائٹی نے وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کو کراس کرتے ہوئے حقوق تصور کر لیا ہے۔

انسانی حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور آج کے جدید فلسفے میں چوتھا اہم فرق یہ ہے کہ اسلام دوسروں کے حقوق ادا کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے اور ایک لمبی فہرست بیان کرتا ہے کہ تم پر خدا کا یہ حق ہے، رسول کا یہ حق ہے، ماں باپ کا یہ حق ہے، بیوی اور بچوں کا یہ حق ہے، رشتہ داروں کا یہ حق ہے، پڑوسیوں کا یہ حق ہے وغیر ذلک...... اور اسلامی تعلیمات کا زیادہ تر رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ تم دوسروں کے حق ادا کرو گے تو تمہارے حقوق خود بخود ادا ہو جائیں گے، جبکہ جدید فلسفہ و نظام کا رجحان اور اسلوب یہ نظر آتا ہے کہ دوسروں کے ذمہ تمہارے حقوق یہ ہیں وہ ایک انسان کے سامنے اس کے حقوق کی ایک فہرست پیش کرتا ہے اور اسے تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنے یہ حقوق حاصل کرے۔ ان دونوں میں نتیجے کے اعتبار سے جو فرق ہے، وہ اہل دانش پر مخفی نہیں۔ جب یہ انسان دوسروں کے حقوق ادا کرنے پر آ جائے گا تو اس کے حقوق بھی اسے ملیں گے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں باہمی محبت، اعتماد اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہوگی، لیکن جب ہر شخص دوسروں سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی فکر میں ہوگا تو باہمی کشمکش کی ایسی فضا قائم ہوگی کہ نفسا نفسی کا ماحول پیدا ہو جائے گا اور باہمی ربط و محبت کی وہ فضا قائم نہیں ہو سکے گی جو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لیے ضروری ہے...... انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات کے بہت سے پہلوؤں پر گفتگو کی گنجائش اور ضرورت ہے لیکن وقت کے اختصار کے باعث چند اصولی باتوں پر اکتفاء کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں...... ”آمین ثم آمین“۔

مسئلہ کشمیر اور عالمی سازشیں

18 جون 2000ء کو دھیر کوٹ آزاد کشمیر کے مقامی صحافیوں کی تنظیم ''گروپ آف ایسوسی ایٹڈ جرنلسٹس'' نے ایک ہوٹل میں ''مسئلہ کشمیر اور عالمی سازشوں کا آغاز'' کے عنوان پر سیمینار کا اہتمام کیا جس میں آزاد جموں و کشمیر کے سابق وزیر اعظم سردار عبدالقیوم خان صاحب اور راقم الحروف کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی جبکہ گروپ کے چیئر مین جناب عابد علی عابد اور سیکرٹری جناب محمد ندیم نے نظامت کے فرائض سرانجام دیئے۔

گروپ کے منتظمین کی طرف سے شرکاء کو بتایا گیا کہ مسئلہ کشمیر نے مجاہدین کی قربانیوں کی وجہ سے کارگل کے معرکہ کے بعد پھر سے عالمی سطح پر ایک اہم ایشو کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس کے ساتھ ہی مسئلہ کشمیر کو نقصان پہنچانے کے لیے کشمیری عوام کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ اس لیے اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ اس قسم کی فکری نشستوں کا اہتمام کیا جائے تاکہ مسئلہ کشمیر کی تازہ ترین صورتحال اور کشمیری عوام کے خلاف سازشوں سے ارباب علم و دانش اور عوام کی آگاہی کا سامان ہوتا رہے اور اسی مقصد کیلیے سیمینار منعقد کیا گیا ہے۔

سردار عبدالقیوم خان صاحب نے زیر بحث موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی اور بعد میں شرکاء کے سوالات کے جوابات دیے جن میں سے زیادہ تر سوالات ان کے بعض حالیہ متنازعہ بیانات کے بارے میں تھے جبکہ دوسرے روز سردار صاحب سے ان کے گھر ''غازی آباد'' میں ناشتے کی میز پر بھی مختلف امور پر بات چیت ہوئی۔

سردار محمد عبدالقیوم خان موجودہ حالات کے تناظر میں مسئلہ کشمیر، عالمی سازشوں، جہاد اور بین الاقوامی سرگرمیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ اس کے بارے میں اگلے کالم میں کچھ گزارشات پیش کی جائیں گی سر دست ان معروضات کو قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے جو مذکورہ سیمینار میں راقم الحروف نے شرکاء کے گوش گزار کی ہیں۔

راقم الحروف نے اس سیمینار میں اظہار خیال کی دعوت دینے پر "گروپ آف ایسوسی ایٹڈ جرنلسٹس دھیرکوٹ" کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ کشمیری عوام اور خطۂ کشمیر کے خلاف عالمی سازشوں کے آغاز والی بات مجھے عجیب سی لگی ہے اس لیے کہ ان سازشوں کا آغاز آج نہیں ہوا بلکہ ان کا سلسلہ ایک طویل عرصہ سے جاری ہے بلکہ انہی سازشوں کے نتیجہ میں مسئلہ کشمیر پیدا ہوا اور اس مقام تک پہنچا ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے اور یہاں صدیوں تک مسلم اقتدار قائم رہا ہے لیکن کشمیر کے مسلم تشخص کو نظرانداز کرتے ہوئے اس خطہ جنت نظیر کو ٹکوں کے عوض ہندو ڈوگروں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا جو کشمیری عوام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی۔ تقسیم ہند کے موقع پر نظریاتی، جغرافیائی اور ثقافتی ہر لحاظ سے کشمیر کو پاکستان کا حصہ سمجھا جا رہا تھا لیکن تقسیم پنجاب کے فارمولا میں جان بوجھ کر گورداس پور کو بھارت کے حوالہ کرنے کا اہتمام کیا گیا جس کا مقصد انڈیا کو کشمیر تک زمینی راستہ فراہم کرنا اور اسے فوجی دخل اندازی کا موقع دینا تھا۔ اگر گورداس پور بھارت کے حصہ میں نہ جاتا تو کشمیر کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا لیکن انگریزوں نے سازش کر کے اس مسئلہ کو کھڑا کیا اور یہ سازش صرف کشمیری عوام کے خلاف نہیں تھی بلکہ پاکستان اور جنوبی ایشیا کے تمام لوگوں کے خلاف تھی جس کے ذریعہ اس خطہ کے ممالک کو آمنے سامنے کھڑا کر کے ان کے وسائل اور توانائیوں کو ترقی وخوشحالی میں صرف ہونے کی بجائے باہمی محاذ آرائی کی آگ میں نصف صدی سے جھونکا جا رہا ہے۔

پھر یہ بھی کشمیری عوام کے خلاف سازش تھی جب 1948ء کی جنگ میں سیز فائر قبول کر کے مجاہدین کشمیر کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا اور عالمی قوتوں اور برادری نے اس مسئلہ کو کشمیری عوام کے ہاتھ سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اسے دھیرے دھیرے سرد خانے میں ڈال دیا۔ عالمی برادری نے اس مسئلہ کو ہاتھ میں لے کر کشمیری عوام سے وعدہ کیا کہ یہ مسئلہ ان کی آزادانہ رائے کے ذریعہ حل کیا جائے گا۔ مگر اس وعدہ کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر اقوام متحدہ یا عالمی برادری کشمیری عوام کو ان کا یہ مسلمہ حق دلوانے کے لیے ابھی تک سنجیدہ نہیں ہے۔

آج اگر کشمیر کا مسئلہ ایک بار پھر عالمی سطح پر اہم حیثیت اختیار کر گیا ہے تو اس کے پیچھے

مجاہدین کشمیر کی عظیم قربانیاں، کم وبیش ستر ہزار شہداء کی جانوں کا نذرانہ اور جہاد کشمیر کی وہ صبر آزما جدوجہد ہے جس میں نہ صرف مجاہدین بلکہ مقبوضہ کشمیر کے عام کشمیری مسلمان بھی ایثار اور قربانی کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کر رہے ہیں۔ اس جہاد کا اصل سرچشمہ ”جہاد افغانستان“ ہے جس نے کشمیر، فلسطین، کوسوو، بوسنیا، چیچنیا، صومالیہ، اری ٹیریا، مورو، اراکان اور دنیائے اسلام کے دیگر علاقوں کے حریت پسندوں کو ہتھیار پکڑنا اور ظالم وغاصب کفار کے مقابلہ میں صف آراء ہونا سکھایا ہے اور اسی کی کوکھ سے ”جہاد کشمیر“ نے بھی جنم لیا ہے جو آج پورے جنوبی ایشیا بلکہ دنیا بھر کی توجہات کو اپنی جانب مبذول کئے ہوئے ہے۔

عالمی فورم پر مسئلہ کشمیر کی اہمیت میں اضافہ کے لیے کارگل کے معرکہ اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے مگر اس میں بنیادی کردار مجاہدین کشمیر کا ہے جو اپنی جانوں پر کھیل کر مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اس کی اہمیت میں مسلسل اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ اس پس منظر میں بین الاقوامی سطح پر جو قوتیں اور ادارے مسئلہ کشمیر میں دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کے حل کے لیے کسی نہ کسی درجہ میں متحرک نظر آتے ہیں ان کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

وہ ممالک جن کے مفادات اس مسئلہ کے ساتھ وابستہ ہیں مثلاً امریکہ، چین، وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے ممالک اور دیگر علاقائی قوتیں جو ظاہر ہے کہ اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کریں گی، ان کے مفادات میں ٹکراؤ بھی ہوگا اور یہ مفادات اور ان کا ٹکراؤ مسئلہ کشمیر کے حل پر اثر انداز بھی ہوگا۔

وہ قوتیں جو جہاد افغانستان کے عالمی اثرات بالخصوص دنیائے اسلام میں جہادی تحریکات کے آغاز اور اسلامی گروپوں کی بیداری سے پریشان ہیں اور اس میں اضافہ کو ہر قیمت پر روکنا چاہتی ہیں ان قوتوں کی خواہش ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کو ”جہاد“ کے حوالہ سے الگ کر دیا جائے اور کشمیر کی اسلامی حیثیت اور مجاہدین کشمیر کی جدوجہد کے حوالے سے کاٹ کر مسئلہ کشمیر کو ایک علاقائی مسئلہ کے طور پر حل کیا جائے۔

چنانچہ کچھ ادارے اور گروپ مخلص بھی ہوں گے جو فی الواقع اس مسئلہ کو حل کر کے علاقائی کشیدگی کو کم کرنا چاہتے ہیں اور کشمیری عوام کے حقوق اور آزادی سے دلچسپی رکھتے ہیں

اس لیے ہمیں مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلہ میں بین الاقوامی طور پر متحرک سب گروپوں کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے اور نہ ہی ہر ایک کی کوشش کو سازش تصور کر لینا چاہیے بلکہ ان کے پس منظر، دلچسپی کی وجوہ اور مقاصد وعزائم کا تجزیہ کر کے انہیں ڈیل کرنا چاہیے البتہ سازش، مفادات اور خیر خواہی کے عوامل میں فرق معلوم کرنے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی حدِ فاصل اور اصول ضرور قائم کر لینا چاہیے اور میرے خیال میں اس سلسلہ میں دو نکتے کسوٹی کا کام دے سکتے ہیں اور انہیں بہر حال پیش نظر رکھنا چاہیے۔

1۔ جموں وکشمیر کی وحدت کا برقرار رہنا اس خطہ کے عوام کا تاریخی حق ہے اس لیے جو فارمولا یا کوشش کشمیر کی وحدت کو ختم کرنے اور اس خطہ جنت نظیر کو تقسیم کرنے کے حوالہ سے ہو میرے نزدیک وہ کشمیری عوام کے خلاف سازش ہے اور ایسی ہر کوشش کو مسترد کرنا چاہیے۔

2۔ کشمیر کی اسلامی نظریاتی حیثیت ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے ”جہاد کشمیر“ کے دوران لاکھوں کشمیری عوام کی مختلف النوع اور بے پناہ قربانیوں بالخصوص کم وبیش ستر ہزار شہداء کے خون نے اور زیادہ مستحکم کر دیا ہے اس لیے جو فارمولا یا کوشش کشمیر کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنے یا کمزور کرنے کی غرض سے سامنے آئے وہ بھی کشمیر اور کشمیری عوام کے خلاف سازش ہے اور اسے سازش کے طور پر ہی دیکھا جانا چاہیے۔

ملی مسائل اور دینی قیادت

30، مارچ 2003 کو مجلس احرار اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں 1953ء کی تحریک ختم نبوت کے شہداء کی یاد میں پیر جی سید عطاء المہیمن شاہ بخاری کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک تقریب میں کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے چند اہم معروضات قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

آج ہم ان عظیم شہدا ختم نبوت کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلیے جمع ہیں جنہوں نے 1953ء میں عقیدہ ختم نبوت اور ناموس رسالت کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور قادیانیت کے بڑھتے ہوئے قدموں کو بریک لگا دی۔ اس تحریک میں جس کی قیادت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ حضرت مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ جیسے عظیم بزرگوں کے ہاتھوں میں تھی دینی جماعتوں کے دو بڑے مطالبات تھے ایک یہ کہ قادیانیوں کو ملک میں دستوری حوالہ سے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور دوسرا یہ کہ قادیانی لیڈر چودھری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے برطرف کیا جائے جو قیام پاکستان کے بعد سے ملک کے وزیر خارجہ چلے آرہے تھے۔ اور جن کی وجہ سے نہ صرف ملک کے اندر سرکاری طور پر قادیانیوں کا اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا بلکہ بیرون ملک بھی پاکستان کے سفارتخانے قادیانیت کی تبلیغ اور اثر ونفوذ کے اڈے بنتے جا رہے تھے۔ ملک کی دینی جماعتوں نے چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ کیا لیکن ان کا مطالبہ منظور کرنے کی بجائے تحریک کے راہنماؤں اور کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد شہید ہوئے اور ہزاروں علماء کرام اور دینی کارکن جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیئے گئے۔ میں اس حوالہ سے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج جس خارجہ

پالیسی نے پوری قوم کو بند گلی میں دھکیل دیا اور امریکی غلامی کے ریموٹ کنٹرول شکنجے نے اسے بری طرح جکڑ رکھا ہے کہ ہم بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ خارجہ پالیسی چودھری ظفر اللہ خان کی تشکیل کردہ ہے اس قادیانی وزیر خارجہ نے پاکستان کو امریکا نواز پالیسی کی پٹڑی پر چڑھایا اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک پانچ چھ سال کے عرصہ میں ملک کو امریکی مفادات کے چنگل میں اس قدر پھنسا دیا کہ ہم آج تک اس میں مزید آگے کی طرف دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں پیچھے ہٹنے بلکہ دائیں بائیں دیکھنے کا بھی کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ سارا کرشمہ چودھری ظفر اللہ خان کا ہے اور اس کی بوئی ہوئی فصل آج پوری قوم کو کاٹنی پڑ رہی ہے دینی حلقوں نے تو پاکستان بننے کے بعد سے ہی اس پر واویلا مچانا شروع کر دیا تھا لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہ دی اور آج اس کا خمیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے ہمارا المیہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ قومی و ملی معاملات میں دینی قیادت کے موقف کو نظر انداز کیا ہے اور ہر بار اس کی سزا بھگتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے طرز عمل میں کوئی تبدیلی ابھی تک دیکھنے میں نہیں آ رہی۔ آج سے ایک صدی قبل جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کیلئے عرب ممالک میں عرب قومیت کے نام پر اور ترکی میں ترک نیشنلزم کے نام پر جذبات کو ابھارا جا رہا تھا اور خلافت کو بے فائدہ قرار دیکر اس کو ختم کرنے کی سازش کی جا رہی تھی ہماری دینی قیادت نے اس وقت بھی شور مچایا تھا کہ خلافت کے خاتمہ کی یہ تحریک یہودیوں کی سازش ہے عرب علماء نے آواز اٹھائی ہمارے ہاں جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں زبردست عوامی تحریک خلافت بپا ہوئی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ خلافت کا تحفظ کیا جائے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کے اس ادارے کو بچایا جائے لیکن نہ ترکوں نے بات سنی اور نہ ہی عربوں نے اس آواز پر توجہ دی حتی کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو تو شریف مکہ نے اسی جرم میں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کیا تھا کہ انہوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت کے جواز کے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس موقع پر جنوبی ایشیا کی دینی قیادت نے ایک اور آواز بھی اٹھائی کہ یہاں کے مسلمان برطانیہ کی فوج میں بھرتی نہ ہوں۔ متحدہ ہندوستان کے سینکڑوں علماء کرام نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ برطانیہ کی فوج میں مسلمانوں کا بھرتی ہونا حرام ہے اس لیے کہ یہ فوج اسلام کے

خلاف استعمال ہوگی۔اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کیلیے استعمال ہوگی۔مگر اس فتویٰ پر کسی نے کان نہ دھرے ہزاروں کی تعداد میں لوگ انگریزی فوج میں بھرتی ہوئے اور پھر یہی فوجی مشرق وسطیٰ لے جائے گئے اور انہیں کے ہاتھوں ترک فوجیوں کو شکست دلوا کر خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی راہ ہموار کی گئی۔اگر آج خلافت کا فورم موجود ہوتا اور خواہ کتنی ہی کمزور اور ڈھیلی ڈھالی خلافت ہوتی مگر عالمی سطح پر اپنی بات کہنے کا کوئی فورم تو ہوتا اور یقیناً حالات اس مقام تک نہ پہنچتے جن کا ہم اب سامنا کر رہے ہیں ہم تو اس دور سے کہہ رہے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہے لیکن آج اسرائیلی وزیر دفاع جنرل موفاذ نے کھلے بندوں یہ بات کہہ کر ہمارے موقف کی تصدیق کر دی ہے کہ ہمیں عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید دوم نے فلسطین میں آباد ہونے کیلیے جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا اس کے نتیجے میں ہم نے صرف اس کی حکومت ختم کرادی بلکہ سرے سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کرادیا۔جنرل موفاذ نے ایک بات اور بھی کہی ہے کہ عراق پر اب ہمارا قبضہ ہوگا اور اسرائیل کے عزائم میں جو بھی رکاوٹ بنے گا اس کا یہی حشر ہوگا۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسرائیل کے عزائم کیا ہیں اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عراق پر امریکا اور برطانیہ کا حملہ دراصل اسرائیل کی توسیع اور عظیم تر اسرائیل کے قیام کے منصوبے کا حصہ ہے جس میں عراق مصر شام لبنان اور دیگر علاقوں کے علاوہ مدینہ منورہ سمیت سعودی عرب کا بھی ایک بڑا علاقہ شامل ہے۔

ہماری دینی قیادت نے اس وقت بھی واویلا کیا تھا جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر کے اپنا گورنر بٹھا دیا تھا اور دنیا بھر کے یہودیوں کو یہ حق دے دیا تھا کہ وہ فلسطین میں آ کر آباد ہو سکتے ہیں اور زمین خرید کر کالونیاں بنا سکتے ہیں۔اس وقت سرکردہ عرب علماء کرام نے فتویٰ دیا تھا کہ یہودی چونکہ فلسطین میں آباد ہو کر اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں اور بیت المقدس پر قبضہ بھی ان کے پروگرام میں شامل ہے اس لیے فلسطین میں یہودیوں کو زمین کا بیچنا شرعاً جائز نہیں۔یہ فتویٰ ہمارے بزرگوں نے بھی جاری کیا۔حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان دیوبندیؒ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتاویٰ موجود ہیں اور حضرت تھانویؒ کا تفصیلی فتویٰ ان کی کتاب ''بوادر النوادر'' میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن کسی نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس

نہیں کی اور فلسطینی اپنی زمینوں کو ڈیڑھ گنا اور دو گنا قیمت کی لالچ میں یہودیوں پر فروخت کرتے چلے گئے جس کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے کہ جن یہودیوں کا آج سے ایک صدی قبل فلسطین میں شاید ایک گھرانہ بھی آباد نہ تھا آج وہ وہاں نہ صرف قابض ہیں بلکہ پوری عرب دنیا کیلیے عذاب بنے ہوئے ہیں۔

حالیہ عالمی بحران کے آغاز میں بھی ہماری دینی قیادت نے امت کی بروقت رہنمائی کی کہ امریکی خواہشات اور عزائم کے سامنے گردن جھکانے اور ہاں میں ہاں ملاتے چلے جانے کی بجائے جرات وحوصلہ کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہماری بات پر بروقت توجہ نہ دی گئی اور آج وہی بات سارے کہہ رہے ہیں۔ میں اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی سربراہ کانفرنس (او آئی سی) نے آج جو موقف اختیار کیا ہے کہ عراق کی سرحدوں، ملکی سیاست اور قومی وحدت کا تحفظ ضروری ہے اور اس کے خلاف کسی اقدام کی حمایت نہیں کی جائے گی یہ موقف آج سے ڈیڑھ سال قبل افغانستان پر امریکا کے حملہ سے پہلے اختیار کرنے کی ضرورت تھی اور اس موقف کا صحیح وقت وہ تھا کیونکہ افغانستان کی قومی وحدت اور سرحدوں کے تقاضے بھی اس نوعیت کے تھے لیکن ہم نے اس وقت جائز موقف اختیار نہیں کیا اسی طرح ہمارے عرب بھائیوں نے بھی اس وقت یہ سوال کھڑا کر دیا کہ کسی عرب ملک پر حملہ نہ کیا جائے لیکن آج صرف ایک سال بعد ایک عرب ملک پر نہ صرف حملہ ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ کئی عرب ممالک کی سرحدات اور قومی سلامتی بھی خطرات سے دوچار ہو گئی ہے ہمارے خیال میں او آئی سی اور عرب لیگ نے آج موقف اختیار کیا ہے اور اس پر سٹینڈ کیا ہے اس کا صحیح وقت افغانستان پر امریکا کی یلغار سے قبل تھا اب بھی غنیمت ہے کہ ہمارے مسلم اور عرب حکمرانوں نے کسی جگہ کھڑا ہونے کی ضرورت تو محسوس کی لیکن امر واقعہ یہ ہے یہ موقف اگر افغانستان پر امریکی حملہ سے قبل اختیار کر لیا جاتا اور مسلم حکمران اس پر سنجیدگی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو نہ صرف افغانستان تباہی سے بچ سکتا تھا بلکہ عراق اور اس کے ساتھ دیگر کئی عرب ممالک کی تباہی کو بھی ٹالا جا سکتا ہے۔

بہرحال میری معروضات کا مقصد یہ ہے کہ ہماری دینی قیادت نے ہر دور میں اور ہر مسئلہ پر امت کو حالات کی سنگینی سے خبردار کیا ہے اور صحیح موقف کی طرف راہ نمائی کی

لیکن ہم نے قومی اور ملکی سطح پر کبھی اس بات پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور ہر بار اس کی سزا بھگتی ہے۔ آج بھی حالات کا تقاضا ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام کے حالیہ بحران اور ملکی مسائل کے حوالہ سے دینی قیادت کی آواز کو سنا جائے اور اسے سنجیدہ توجہ دی جائے کیونکہ ملی حمیت اور دینی غیرت کا تقاضا یہی ہے اور مشکلات و مصائب کی دلدل سے نکلنے کا راستہ بھی صرف یہی ہے۔

قادیانی مسئلہ
اور
تحریک ختم نبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۴ جولائی ۱۹۹۲ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسکو (برطانیہ) میں عصر کی نماز کے بعد عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر مولانا خواجہ خان محمد سجادہ نشین کندیاں شریف کی زیر صدارت ختم نبوت کے موضوع پر جلسہ عام منعقد ہوا جس سے مولانا مفتی مقبول احمد، مولانا منظور احمد الحسینی، الحاج عبد الرحمٰن باوا اور مولانا محمد اکرم طوفانی کے علاوہ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے مدیر مولانا زاہد الراشدی نے بھی مفصل خطاب کیا۔ خطاب درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ!

حضرت الامیر! قابل صد احترام علماء کرام، بزرگو، دوستو اور ساتھیو!

یہ جلسہ دراصل ساتویں سالانہ عالمی ختم نبوت کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلہ میں ہو رہا ہے۔ جو ۲۶ اگست ۱۹۹۲ء کو برمنگھم کی مرکزی جامع مسجد میں منعقد ہوگی اور اس میں مختلف مکاتب فکر اور ممالک کے علماء کرام عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے تقاضوں پر روشنی ڈالیں گے انشاء اللہ تعالیٰ یہ کانفرنس کوئی روایتی جلسہ نہیں بلکہ تحریک ختم نبوت کے تاریخی تسلسل کا ایک حصہ ہے اور اس کی یہی اہمیت آپ حضرات پر واضح کرنے کے لیے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں ایک دور تھا جب مرزا غلام احمد قادیانی کی امت کا ہیڈ کوارٹر قادیان تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب قادیانیت کے خلاف کوئی بات کہنا حکومت وقت کے غیظ وغضب کو دعوت دینا تھا۔ تب مجلس احرار اسلام کے شعبہ تبلیغ نے قادیان میں کانفرنس کا اہتمام کیا جہاں

قادیانی امت اپنا سالانہ اجتماع منعقد کیا کرتی تھی اور اسے معاذ اللہ حج کی طرح مقدس اجتماع کی حیثیت دی جاتی تھی اس دور میں قادیان میں مسلمانوں کا اجتماع منعقد کرنے میں احرار کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یہ ایک الگ داستان ہے بہر حال اس دور میں یہ روایت قائم ہوگئی کہ قادیانی گروہ کے سالانہ اجتماع کے ساتھ مسلمان بھی اپنا اجتماع قادیان میں منعقد کرنے لگے۔ پھر قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں کا سالانہ اجتماع ربوہ (مولانا منظور احمد چنیوٹی ؒ کی کوششوں سے اب اس کا نام چناب نگر رکھ دیا گیا ہے) میں منتقل ہوا تو مجلس تحفظ ختم نبوت نے ربوہ سے چند میل کے فاصلہ پر چنیوٹ میں سالانہ ختم نبوت کانفرنس کے انعقاد کا سلسلہ شروع کر دیا اور جب ۱۹۸۴ء میں قادیانی امت کے سربراہ مرزا طاہر احمد نے امتناع قادیانیت کے صدارتی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ربوہ کو چھوڑ کر اپنا ہیڈ کوارٹر لندن میں منتقل کر لیا اور سالانہ اجتماع بھی لندن میں منعقد ہونے لگا تو ۱۹۸۵ء سے سالانہ ختم نبوت کانفرنس بھی برطانیہ میں منتقل ہوگئی پہلے چند سال لندن کے ویمبلے کانفرنس سنٹر میں ختم نبوت کانفرنس کا انعقاد ہوتا رہا پھر برطانیہ کے مسلمانوں کے اصرار پر مختلف شہروں میں اس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ گزشتہ سال یہ کانفرنس بریڈفورڈ میں منعقد ہوئی اور اس سال ساتویں سالانہ عالمی ختم نبوت کانفرنس برمنگھم کی مرکزی جامع مسجد میں ۱۶ اگست کو منعقد ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات محترم! مجھ سے پہلے فاضل مقررین نے عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور اس کے تقاضوں پر مفید اور معلوماتی گفتگو کی ہے لیکن میں اس روایتی انداز سے کچھ ہٹ کر اس سلسلہ میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور ان سوالات واشکالات کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا خواہشمند ہوں جو مغربی میڈیا اور قادیانیت کی سرپرست لابیاں قادیانیت کے حوالہ سے اسلام پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل ابھار رہی ہیں اور آپ حضرات کیونکہ ویسٹرن میڈیا کی براہ راست زد میں ہیں اس لیے آپ دوستوں کے سامنے ان امور کا تجزیہ انتہائی ضروری ہے لہٰذا میری گزارشات تین امور کے بارے میں ہوں گی سب سے پہلے اس سوال کا جائزہ لوں گا کہ مسلمان اسے کہتے ہیں جو قرآن پاک اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتا ہو اور قادیانی بھی ان دونوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں تو آپ لوگوں کے پاس

انہیں غیر مسلم کہنے کا آخر کیا جواز ہے؟ دوسرے نمبر پر اس سوال پر اظہار خیال کروں گا کہ جب آپ لوگ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے چکے اور ایک آرڈیننس کے ذریعہ ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگا چکے تو آپ ان کے پیچھے لٹھ لیے کیوں پھر رہے ہیں اور انہیں ان انسانی اور شہری حقوق سے کیوں محروم رکھے ہوئے ہیں جو ملک کے شہری کی حیثیت سے انہیں حاصل ہونے چاہیں اور آخر میں تحریک ختم نبوت کی تازہ ترین صورت حال سے آپ حضرات کو آگاہ کرنا چاہوں گا کہ قادیانیت کے خلاف جس تحریک کا آغاز حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا وہ آج کس مرحلہ میں ہے اور حضرت مولانا خان محمد صاحب کی زیر قیادت کون سے مورچہ پر صف آراء ہے۔ محترم بزرگو اور دوستو! قادیانیوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے اور آج کی نئی مسلمان نسل کے لیے یہ سوال بظاہر خاصا پیچیدہ ہے کہ قادیانی گروہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا اظہار کرتا ہے اور قرآن کریم کو بھی ماننے کا دعویدار ہے تو پھر وہ غیر مسلم کیوں ہے۔ جواب میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف قرآن کریم اور جناب رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو مان لینا کافی نہیں ہے اور دلیل میں دو واقعات پیش کرنا چاہوں گا جو خود جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں پیش آئے اور جن میں صرف رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کافی نہیں سمجھا گیا ایک واقعہ حافظ ابن عبدالبر نے ''الاستیعاب'' میں نقل کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے ایک نوجوان صحابی حضرت حبیب بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ کذاب کے کچھ ساتھی پکڑ کر لے گئے، مسیلمہ یمامہ کے علاقہ میں بنو حنیفہ قبیلہ کا سردار تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا اس کا نام مسیلمہ تھا کذاب کا خطاب اسے جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا حبیب بن زید رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ کے دربار میں پیش کیا گیا مسیلمہ نے ان سے سوال کیا کیا تم حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے ہو۔ جواب دیا ہاں مانتا ہوں! دوسرا سوال کیا۔ کیا تم مجھے اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے ہو! جواب میں اس نوجوان صحابی نے جو جملہ کہا وہ ایمان واستقامت اور عشق ومحبت کا کمال اظہار ہے ارشاد فرمایا:

"اِنَّ فِیْ اُذُنَیَّ صَمَمًا عَنْ سِمَاعِ مَا تَقُوْلُ"

اس جملہ میں جو زور اور وزن ہے ترجمہ میں شاید اس کا دسواں حصہ بھی ادا نہ کر سکوں مگر اس محاورہ کا ترجمہ یہ ہے کہ "میرے کان تمہاری یہ بات سننے سے انکار کرتے ہیں"۔ روایات میں ہے کہ مسیلمہ نے اس عاشق رسول نوجوان صحابی رضی اللہ عنہ کا ایک بازو کاٹنے کا حکم دیا جو کاٹ دیا گیا پھر مسیلمہ نے اپنا سوال دہرایا مگر جواب وہی ملا پھر دوسرا بازو کاٹا گیا مگر سوال دہرانے پر جواب حسب سابق تھا حتیٰ کہ حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہ کے جسم مبارک کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں شہید کر دیا گیا مگر ختم نبوت کے اس سب سے پہلے شہید نے جناب رسالت مآب ﷺ کی رسالت کے بعد کسی اور کے لیے رسالت و نبوت کا جملہ سننے کے لیے اپنے کانوں کو آمادہ نہیں پایا۔ دوسرا واقعہ امام حاکم نے "المستدرک" میں بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کی طرف سے دو قاصد آئے انہوں نے مسیلمہ کا خط پیش کیا جس کا عنوان تھا۔

"محمد رسول اللہ کے نام مسیلمہ رسول اللہ (معاذ اللہ) کی طرف سے"

اور خط میں یہ کہا گیا تھا کہ آپ اپنے بعد مجھے اپنا جانشین نامزد کر دیں یا شہروں کی نبوت اپنے پاس رکھیں اور دیہات کی نبوت میرے حوالہ کر دیں پھر میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے خط کا جواب تو یہ دیا کہ میں مسیلمہ کو ایک تنکا دینے کا بھی روادار نہیں ہوں زمین خدا کی ہے وہ جسے چاہے اس کا وارث بنا دے البتہ مسیلمہ کے قاصدوں سے پوچھا کہ کیا تم بھی مسیلمہ کو رسول مانتے ہو۔ انہوں نے جواب ہاں میں دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر قاصدوں کا قتل سفارتی آداب کے منافی نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا یہاں ضمناً ایک بات اور بھی عرض کرتا جاؤں کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے تو سفارتی آداب کا لحاظ رکھا اور صاف طور پر فرما دیا کہ سفارتی آداب کی وجہ سے تمہاری جاں بخشی ہوگئی ہے ورنہ میرے پاس تمہارے لیے قتل کے سوا کوئی سزا نہ تھی لیکن مسیلمہ کذاب نے سفارتی آداب کو پامال کر دیا اور جب خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے اپنا قاصد مسیلمہ کے پاس بھیجا تو مسیلمہ نے اسے شہید کرا دیا۔

میں نے دو واقعات آپ کے سامنے پیش کیے ہیں دونوں دور رسالت کے واقعات ہیں اور دونوں میں مسیلمہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے اقرار کے بعد ثانوی حیثیت سے اپنی رسالت کی بات کر رہا ہے لیکن اس کی بات قبول نہیں کی گئی حتیٰ کہ ایک نوجوان صحابی رضی اللہ عنہ نے اس تصور کو رد کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کافی نہیں بلکہ آپ کو آخری نبی ماننا اور آپ کے بعد کسی بھی شخص کے لیے رسالت و نبوت کے تصور کو رد کرنا ضروری ہے۔

پھر ایک اور حوالہ سے بھی مسئلہ کا جائزہ لے لیجیے مذاہب کا مسلمہ اصول ہے کہ نبی کے بدلنے سے مذہب بدل جاتا ہے جب کوئی قوم کسی نئے نبی اور اس کے ساتھ نئی شریعت پر ایمان لائے گی اس کا مذہب پہلے سے چلے آنے والے مذہب سے الگ ہو جائے گا آپ کے ہاں برطانیہ میں یہودی بھی رہتے ہیں عیسائی بھی رہتے ہیں، یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر ایمان رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور تورات پر دونوں کا ایمان ہے لیکن چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل پر بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں یہودی تسلیم نہیں کرتے اس لیے عیسائیوں کا مذہب یہودیوں سے الگ ہو گیا اور دونوں قومیں الگ الگ مذاہب کے پیروکار کی حیثیت سے دنیا میں آباد ہیں اب اگر کوئی عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہوئے یہودی کہلائے گا یا اپنا تعارف یہودیت کے حوالے سے کرائے گا یا یہودیوں کے مخصوص مذہبی شعائر اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے استعمال کرے گا تو جھگڑا پیدا ہوگا اور دنیا کا کوئی یہودی کسی عیسائی کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ وہ خود کو یہودی کہلائے اور عیسائی مذہب کے پرچار کے لیے یہودیوں کے مذہبی شعائر و علامات کا استعمال کرے اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ جب مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اپنے لیے رسول اللہ کا لقب اختیار کیا۔ اسلام کے احکام کو منسوخ کرنے کا دعویٰ کیا، نئی وحی اور نئے احکام کی بات کی تو اس کے ماننے والے مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار بن گئے اور اس گروہ کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے الگ ہو گیا اور یہ بات تو قادیانی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کے مذہب سے مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کا مذہب

الگ ہے اس لیے جب دونوں الگ الگ مذہب کے پیروکار ہیں تو دونوں کا نام بھی الگ الگ ہونا چاہیے اور قادیانیوں کو اپنے لیے اسلام اور مسلمانوں سے الگ کوئی اور نام اختیار کرنا چاہیے ورنہ ان کا یہ عمل معروف زبان میں دھوکہ اور فراڈ کہلائے گا۔ آپ خود دیکھیے کہ ایک کمپنی ایک صدی سے ایک نام اور ٹریڈ مارک کے ساتھ کام کر رہی ہے مارکیٹ میں اس کا تعارف اسی نام اور ٹریڈ مارک سے ہے۔ اب اسی کمپنی میں سے کچھ لوگ الگ ہو کر نئی کمپنی بنا لیتے ہیں تو کیا اس نئی کمپنی کو پرانی کمپنی کا نام اور ٹریڈ مارک استعمال کرنے کا حق ہے؟ یقیناً نہیں ہے بلکہ اگر نئی کمپنی اپنے تعارف اور مال کی سپلائی کے لیے پرانی کمپنی کا نام اور ٹریڈ مارک استعمال کرے گی تو قانون کی زبان میں یہ فراڈ کہلائے گا اسے دھوکہ قرار دیا جائے گا اور اسی فراڈ اور دھوکہ کے سدباب کے لیے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے ہم قادیانیوں سے کہتے ہیں کہ جب ہم دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارا مذہب الگ الگ ہے اور ہم دونوں ایک مذہب کے پیروکار نہیں ہیں تو سیدھی سی بات ہے کہ اسلام اور مسلمان کا نام ایک ہی فریق استعمال کرسکتا ہے دوسرے کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں اور یہ نام بھی اسی فریق کا حق ہے جس کا قبضہ مقدم ہے اور جو چودہ سو سال سے اس نام اور ٹریڈ مارک کے ساتھ متعارف چلا آرہا ہے۔

محترم بزرگو اور دوستو! اب آیئے دوسرے سوال کی طرف کہ جب پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا ہے اور ان کی سرگرمیوں کے سدباب کے لیے آرڈیننس بھی نافذ العمل ہو چکا ہے تو اب ان کے ساتھ کیا جھگڑا ہے اور انہیں انسانی اور شہری حقوق سے کیوں محروم رکھا گیا ہے۔ اس کے جواب میں پہلے آپ حضرات کو قادیانیوں کی اس تگ و دو سے آگاہ کرنا چاہوں گا جو انہوں نے اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اسے مغربی ممالک کے سامنے انسانی حقوق کی پامالی کے مسئلہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے کی ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ قادیانی گروہ کے کام کا انداز کیا ہے اور اس کا طریقہ واردات کیا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کی سرگرمیوں پر بعض پابندیاں عائد کر دیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ قادیانی غیر مسلم اقلیت قرار دیے جا چکے ہیں۔ اس لیے وہ اسلام کے نام پر اپنے

مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتے، خود کو مسلمان نہیں کہلا سکتے، اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے اور مسلمانوں کے مخصوص مذہبی شعائر اور علامات کو استعمال نہیں کر سکتے۔ آرڈیننس میں ایسا کرنے کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔

اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد مرزا طاہر احمد نے اپنا ہیڈ کوارٹر ربوہ سے لندن میں منتقل کر لیا اور اپنی سرپرست لابیوں کے ذریعے یہ دھائی دینا شروع کر دی کہ پاکستان میں ہمارے شہری حقوق سلب کر لیے گئے ہیں یہ پراپیگنڈا سائنٹفک انداز سے آگے بڑھایا گیا اور مغربی میڈیا نے مرزا طاہر احمد کی سرپرستی کی حتیٰ کہ جنیوا کے انسانی حقوق کے کمیشن سے اس مضمون کا ریزولیشن حاصل کر لیا گیا کہ پاکستان میں واقعتاً قادیانیوں کے شہری حقوق پامال ہو رہے ہیں اس ریزولیشن کا بھی ایک عجیب پس منظر ہے جو قادیانیوں کے مخصوص طریق واردات کی غمازی کرتا ہے پہلے پاکستان کے ایک معروف قادیانی سفارت کار مسٹر منصور احمد کو جنیوا میں پاکستان کا سفیر بنوایا گیا اور انسانی حقوق کے کمیشن کے سامنے درخواست گزاری گئی کہ حکومت پاکستان قادیانیوں کے شہری حقوق کو پامال کر رہی ہے۔ اب پاکستان اور حکومت پاکستان کے دفاع کی ذمہ داری مسٹر منصور احمد پر تھی اور ان کی نمائندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمیشن نے اپنی قرارداد میں حکومت پاکستان کو قادیانیوں کے شہری حقوق غصب کرنے کا مجرم قرار دے ڈالا۔ یہ قرارداد امریکہ پہنچائی گئی امریکہ سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے ارکان کو پیش کی گئی قادیانیوں کی سرپرست لابیاں حرکت میں آئیں، کمیٹی نے پاکستان کی امداد کے لیے عائد کی جانے والی شرائط میں قادیانی مسئلہ بھی شامل کر لیا اور صراحت کے ساتھ شرائط میں لکھ دیا کہ حکومت پاکستان کو قادیانیوں کے خلاف اقدامات واپس لینے کی ضمانت دینا ہوگی آج کل امریکہ نے پاکستان کی امداد بند کر رکھی ہے اس کی بنیاد امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کی قرارداد اور پریسلر ترامیم ہیں یہ قرارداد اور ترامیم کیا ہیں؟ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں اور پاکستانیوں کو ان کی تفصیل سے آگاہ ہونا چاہیے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امداد کے لیے امریکی شرائط کا تعلق صرف ایٹمی تنصیبات کے معائنہ سے ہے یہ درست ہے کہ اس میں سب سے بنیادی اور اہم شرط ایٹمی تنصیبات کے معائنہ کے حوالہ سے ہی ہے اور ہم اس سلسلہ میں قومی موقف سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں لیکن اس کے ساتھ دوسری شرائط بھی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ

حکومت پاکستان اس امر کی ضمانت دے کہ وہ پاکستان میں ان کے حقوق کے منافی کوئی قانون نافذ نہیں کرے گی یہاں انسانی حقوق سے مراد مغربی ممالک کا وہ معروف تصور ہے جس کے تحت وہ ہاتھ کاٹنے، کوڑے مارنے اور سنگسار کرنے کی اسلامی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی سمجھتے ہیں اور اسی بنیاد پر پاکستان پر حدود آرڈیننس پر عمل نہ کرنے بلکہ اسے واپس لینے کے لیے مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ (۲۰۰۶ء میں اسی دباؤ کے پیش نظر مسلم لیگ ق اور پیپلز پارٹی کے تعاون سے اس آرڈیننس میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ از مرتب)

اور ہماری مرعوبیت کا یہ حال ہے کہ پاکستان کی عدالت عظمیٰ میں کئی ماہ سے یہ سوال موضوع بحث ہے کہ قاتل کو سرعام پھانسی دینا اس کی عزت نفس اور انسانی حقوق کے منافی ہے یا نہیں؟ چکوال کے ایک شخص نے اغوا کیا اور پھر قتل کیا قاتل کو ایک عدالت نے سرعام پھانسی دینے کا حکم سنا دیا۔ عدالت عظمیٰ نے اس پر عملدرآمد روک دیا اور اب یہ بحث چل رہی ہے کہ مجرم کی عزت نفس کا تقاضا ہے کہ اسے لوگوں کے سامنے سزا نہ دی جائے خیر پاکستان کے لیے امریکی امداد کی شرائط میں یہ بات شامل ہے کہ پاکستان میں انسانی حقوق کے منافی قوانین نافذ نہ کرنے کی ضمانت دی جائے اور ایک مستقل شرط کے طور پر یہ بات بھی ان شرائط میں ہے کہ احمدیوں اور دیگر غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کی واپسی کو یقینی بنایا جائے۔ (اس کے لیے حکومتی پارٹی نے پیش بندی کر لی ہے اور ہو سکتا ہے ۲۰۰۷ء کے الیکشن کے بعد یہ ترمیم بھی کرا لیں۔ از مرتب)

یہ تفصیلات آپ کے سامنے میں نے اس لیے بیان کی ہیں تاکہ آپ بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اگر مرزا طاہر احمد (مرزا طاہر احمد بھی پہنچ گیا جہاں پہنچنا تھا اب مرزا مسرور احمد اسکا جانشین ہے۔ از مرتب) مغربی لابیوں اور ویسٹرن میڈیا کو استعمال کر کے اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے تو یہ آپ کی دسترس سے باہر نہیں ہے آپ بھی منظم ہو کر اپنا اور اپنے ملک کا دفاع کر سکتے ہیں اور آپ کو یہ کرنا چاہیے یہ آپ کی ذمہ داری ہے اور اس کے بارے میں آپ کو خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔

حضرات محترم! یہ تو قادیانیوں کے انسانی حقوق کی پامالی کے بارے میں اس پراپیگنڈہ مہم کی تفصیل ہے جو قادیانی گروہ اور اس کی سرپرست لابیوں کی طرف سے مسلسل کیا جا رہا

ہے اور یہ بات بھی آپ کے علم میں لانا ضروری ہے کہ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ پوری طرح قادیانی گروہ کی سرپرستی کر رہا ہے چند سال قبل میں جمعیت علماء اسلام کے ایک وفد کے ساتھ لاہور میں امریکی قونصل جنرل مسٹر رچرڈ مکی سے ملا اور گفتگو کے دوران یہ شکوہ کیا کہ امریکہ قادیانی گروہ کی سرپرستی کر رہا ہے جبکہ تحریک ختم نبوت کے راہنماؤں سے امریکی حکام نے کبھی ان کا موقف معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی ہے اور نہ ان کی شکایات سنی ہیں اس پر مسٹر رچرڈ مکی چند موٹی موٹی فائلیں اٹھا لائے جن میں چک سکندر کے تنازع کے بارے میں اس قدر تفصیلات درج تھیں کہ اتنی تفصیل خود ہمیں معلوم نہیں تھی جو اس جھگڑے کے مقدمہ کو ڈیل کر رہے تھے۔ چک سکندر ضلع گجرات تحصیل کھاریاں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں کچھ عرصہ قبل قادیانیوں اور مسلمانوں میں تصادم ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ مارے گئے تھے اور کچھ مکانات نذر آتش ہو گئے تھے یہ لاہور سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں کا مقامی جھگڑا تھا مگر لاہور میں امریکہ کا قونصل جنرل اس جھگڑے کی بڑی بڑی فائلیں میز پر رکھے اس کے اسباب پر ہم سے بحث کر رہا تھا اس حوالہ سے جو بات آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں وہ امریکی سفارت کار کا یہ جملہ تھا کہ پاکستان میں قادیانیوں کو کسی جگہ کوئی تکلیف پہنچے تو واشنگٹن ہم سے جواب طلبی کرتا ہے اس لیے ہمیں ان معاملات میں دلچسپی لینا پڑتی ہے۔ ان حالات میں مغربی ممالک میں مقیم پاکستانی مسلمان اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں ضرور سوچیں کہ اس حوالہ سے ان پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں خدا کی بارگاہ میں کس طرح سرخرو ہو سکتے ہیں۔

اب اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ آخر ہم نے قادیانی گروہ کے کون سے انسانی حقوق کو پامال کیا ہے؟ اور ۱۹۸۴ء کے صدارتی آرڈیننس میں انسانی حقوق کے منافی کون سی بات ہے۔ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کا مذہب الگ الگ ہے یہ بات منطقی اور بدیہی ہے کہ اسلام کا نام دونوں میں سے ایک ہی فریق استعمال کر سکتا ہے اور اس امر کو بھی کسی منطق کی رو سے رد نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام اور مسلمان کے نام اور اسلام کے مخصوص شعائر پر دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کا حق مقدم ہے ان واضح حقائق کے باوجود اگر قادیانی گروہ اپنے مذہب کو اسلام کے نام پر پیش کرنے، مسلمان کہلانے اور مسجد، امیر

المومنین، ام المومنین اور دیگر مخصوص اسلامی اصطلاحات وعلامات کو استعمال کرنے پر اصرار کرتا ہے تو خدا کے لیے انصاف کیا جائے کہ کس کے انسانی حقوق پامال ہورہے ہیں اور کون فریق ان حقوق کی پامالی کا مجرم ہے؟ بحیثیت مسلمان ہمارا یہ حق ہے کہ ہم اپنے مذہبی نام اور امتیازات کا تحفظ کریں، اپنی مذہبی شناخت کو مشتبہ ہونے سے بچائیں اور کسی گروہ کو یہ حق نہ دیں کہ وہ اپنے لیے ہمارا نام اور ہماری امتیازی علامات استعمال کرے قادیانی گروہ ہمارا یہ حق غصب کررہا ہے، وہ ہماری مذہبی شناخت کو مجروح کررہا ہے۔ ہماری پہچان کو مشتبہ کررہا ہے اور ہمارا یہ حق ہے کہ قادیانی گروہ کو اس سے روکیں اگر یہ انسانی حقوق کا مسئلہ ہے تو میں پوری صفائی کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ انسانی حقوق کی پامالی کا مجرم قادیانی گروہ ہے اور وہ دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کی شناخت پر حملہ آور ہے اور یہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس حقیقت کو یہاں رائے عامہ پر واضح کریں اور قادیانی گروہ کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا توڑ کریں۔ اگر مرزا طاہر احمد لاکھوں پونڈ خرچ کر کے سیٹلائٹ کے ذریعہ اپنا خطبہ جمعہ پورے یورپ میں نشر کراسکتا ہے تو آپ لوگ بھی یہاں کے ذرائع استعمال کرسکتے ہیں لیکن اس کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت ہے مسائل کا ادراک اور احساس کی ضرورت ہے اور ہم یہی احساس بیدار کرنے کے لیے برطانیہ کے ایک ایک شہر میں آپ کے پاس حاضر ہورہے ہیں۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ حضرات کا خاصا وقت لے لیا ہے لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ باقی ہے اور وہ ہے تحریک ختم نبوت کی موجودہ صورت حال اور وہ مسائل جن کا اس وقت ہمیں سامنا ہے اس سلسلہ میں یہ اصولی بات آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم نے اپنے تحریکی مطالبات کی بنیاد اپنے جذبات پر نہیں رکھی آپ ہماری تقاریر میں بہت سی جذباتی باتیں سنتے ہیں ہمارے مقررین واجب القتل ہونے کی بات بھی کرتے ہیں اور مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مسلح جہاد وقتال کے حوالے بھی دیتے ہیں ہمارے جذبات یہی ہیں اور ہر مسلمان کے جذبات یہی ہونے چاہیں لیکن ہم نے اپنے مطالبات کی بنیاد ان جذبات سے بہت پیچھے ہٹ کر ایک سادہ اور منطقی سے تقاضے پر رکھی ہے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے بعد اس کے منطقی اور قانونی تقاضے

پورے کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ ہمارا نہیں تھا بلکہ سب سے پہلے یہ مطالبہ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال نے کیا تھا اور انہوں نے اپنے بیانات اور خطوط میں اسے ناگزیر قرار دیا تھا ہم نے اسے قبول کر لیا اور اسے ہی اپنی تحریک کی بنیاد بنالیا اسی مطالبہ پر ۱۹۷۴ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعہ پاکستان کی پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا اور اسی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد اور تحریک کے نتیجہ میں ۱۹۸۴ء میں جنرل محمد ضیا الحق مرحوم نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعہ قادیانیوں کو اسلام کا نام اور مسلمانوں کی مخصوص مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے سے روک دیا تھا اور اس وقت ہم قادنیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے سلسلہ میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے اسی مطالبہ کے منطقی اور بدیہی تقاضوں کو پورا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

حضرات محترم! ہمارے ہاں اس وقت ایک مسئلہ چل رہا ہے اور ہم اس کے لیے حضرت الامیر مولانا خواجہ خان محمد کی قیادت میں جدوجہد کر رہے ہیں وہ مسئلہ پاکستان کے قومی شناختی کارڈ میں مذہب کے خانہ کے اضافہ کا ہے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ جب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر اسلام کا نام اور اسلامی اصطلاحات کے استعمال سے روک دیا گیا ہے اور جب انتخابات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نشستیں الگ الگ کر کے جداگانہ بنیادوں پر الیکشن کا طریق کار اختیار کر لیا گیا ہے اور جب الیکشن میں ووٹ کا استعمال شناختی کارڈ کی بنیاد پر ہوتا ہے تو ان تمام فیصلوں کا منطقی اور ناگزیر تقاضا ہے کہ قومی شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ بڑھا کر ہر شہری کی مذہبی حیثیت کو واضح کر دیا جائے تاکہ ووٹ کے استعمال، بیرون ملک سفر یا کسی بھی معاملہ میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ جونیجو حکومت کے دور میں یہ سوال اٹھایا گیا تو کہا گیا کہ اصولاً یہ مطالبہ درست ہے لیکن عملاً سارے ملک میں جاری شدہ شناختی کارڈوں کو منسوخ کرنا اور سب کارڈ نئے سرے سے جاری کرنا مشکل ہے۔ بینظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت میں بھی یہ بات اٹھائی گئی اور مطالبہ سے اتفاق کرتے ہوئے عملی مجبوری ظاہر کی گئی۔ اب میاں نواز شریف صاحب کی حکومت میں یہ اعلان ہوا کہ پورے ملک میں تمام شناختی کارڈوں کو کمپیوٹرائزڈ کیا جا رہا ہے تو ہم نے از سر نو مہم شروع کی کہ اب تو کوئی عملی رکاوٹ نہیں رہی اب نئے شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ بڑھا دیا جائے تو صدر پاکستان، وزیراعظم اور وزیر داخلہ

سے متعدد وفود ملے صدر محترم نے تو دو دفعہ قومی پریس میں وعدہ کیا کہ یہ مطالبہ درست ہے اور پورا کیا جائے گا۔ وزیراعظم اور وزیر داخلہ نے بھی وفود سے وعدے کیے لیکن صدر پاکستان نے جس شناختی کارڈ کے ذریعہ ملک میں کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈوں کے اجراء کا افتتاح کیا اس میں مذہب کا خانہ نہیں تھا۔ ہم نے پھر احتجاج کیا اسلام آباد میں تمام مکاتب فکر کی احتجاجی کانفرنس منعقد کی جس پر ہمیں بتایا گیا کہ شناختی کارڈوں کا اجراء روک دیا گیا ہے اور مذہب کے خانہ کے ساتھ نیا کارڈ تیار کیا جا رہا ہے لیکن صورت حال ابھی جوں کی توں ہے اور تحریک ختم نبوت کے حوالہ سے آپ ہماری مشکلات کا اندازہ کریں کہ ایک سیدھی سی منطقی اور ناگزیر ضرورت کے لیے بھی ہمیں کن مراحل سے گزرنا پڑ رہا ہے مجھے یہاں برطانیہ آنے کے بعد یہ افسوسناک بات معلوم ہوئی ہے کہ جناب وزیراعظم نے تحریک ختم نبوت کے ایک وفد کو چند روز پہلے لاہور میں یہ کہا ہے کہ میں تو یہ کام کرنا چاہتا ہوں لیکن ایک بہت بڑی لابی رکاوٹ ہے۔

محترم بزرگو اور دوستو! یہ ہیں وہ حالات جن سے ہم اس وقت تحریک ختم نبوت کے حوالہ سے دو چار ہیں ان حالات میں آپ حضرات سے گزارش ہے کہ ۱۷ اگست ۹۲ء کو برمنگھم کی مرکزی جامع مسجد میں منعقد ہونے والی ساتویں سالانہ عالمی ختم نبوت کانفرنس میں پورے احساس اور اہتمام کے ساتھ شریک ہوں تاکہ ہم مل جل کر تحریک ختم نبوت کو مؤثر طور پر آگے بڑھانے کے لیے قابل عمل لائحہ عمل اور خطوط طے کر سکیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

قرنِ اول
اور
دورِ حاضر کے مدعیانِ نبوت

> ۷ اگست ۲۰۰۵ء کو جامعہ مفتاح العلوم سرگودھا میں ''مطالعہ مذاہب'' کے حوالہ سے منعقدہ سیمینار کی دو نشستوں سے خطاب۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ:

حضرات اساتذہ کرام، عزیز طلباء:

پہلے اس بات پر خوشی کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ اپنے دور کے فتنوں سے آگاہی کے لیے اب اس نوعیت کے کورسز اور تربیتی پروگراموں کا سلسلہ الحمد للہ وسعت پکڑتا جا رہا ہے جو آج کے دور کی بڑی اہم ضرورت ہے۔ جامعہ مفتاح العلوم سرگودھا کی انتظامیہ بالخصوص حضرت مولانا مفتی محمد طیب سلیم اور حضرت مولانا مفتی محمد طاہر مسعود شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ پیش رفت کی اور بھی مختلف اداروں میں اس سلسلہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ اللہ پاک اسے جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ہر دور میں وقت کی ضرورت رہی ہے کہ فتنوں سے واقف ہونا ان کی نشاندہی کرنا، ان سے امت کو واقف کرا کر ان کے خطرات سے آگاہ کرنا، اس کا علاج بتلانا اور ان کے سدباب کے لیے امت کی رہنمائی کرنا۔ یہ دین کے شعبوں میں ایک بنیادی شعبہ ہے۔ اسے یونہی سمجھ لیجیے جیسے عام سوسائٹی میں جسمانی اعتبار سے ہیلتھ کا محکمہ ہے (محکمہ صحت)۔ اس میں ایک خصوصی شعبہ ہوتا ہے جو ماحولیات کو چیک کرتا رہتا ہے کہ پانی کی کیفیت کیا ہے، ہوا کی

کیفیت کیا ہے، گندگی کیسے پھیل رہی ہے، آلودگی کیسے پھیل رہی ہے اور پھر ماحول کو سونگھ کر خطرات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اب ہیپا ٹائٹس کا خطرہ ہے، ہیضے کا خطرہ ہے، ملیریے کا خطرہ ہے، پانی میں فلاں جراثیم بڑھتے جا رہے ہیں، فضا میں آلودگی بڑھتی جا رہی ہے، نالیوں میں گندگی بڑھتی جا رہی ہے، یا یہ کہ مچھروں کی بہتات ہوگئی ہے۔ کچھ لوگ مستقل اسی کام پر لگے رہتے ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ اپنا کام چھوڑ دیں، اگرچہ ہوتے چند ہی لوگ ہیں لیکن دو، چار، پانچ سال بعد معاشرے کا کیا حشر ہوگا۔ بالکل یہی صورتحال دینی و روحانی معاملات میں ہے۔ جس طرح جسمانی معاملات میں جراثیم پھیلتے ہیں، بڑے بڑے خطرات ہوتے ہیں، مثبت و منفی دونوں وائرس پھیلتے ہیں۔ اسی طرح دین میں بھی جراثیم اور وائرس پھیلتے ہیں جو ہر چیز کی صفائی کر دیتے ہیں۔ نظر تو نہیں آتے لیکن ہر چیز کی صفائی ہو جاتی ہے۔

حذیفی ذوق

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں بہت سے وائرس کی نشاندہی کی ہے۔ یہ میرا موضوع تو نہیں بلکہ ضمناً تمہیدی طور پر یہ بات شروع کی ہے۔ میں ایک دن گننے لگا کہ اللہ رب العزت نے قرآن کریم کے اندر حبط اعمال کے اسباب کیا بیان فرمائے ہیں۔ تو اس وقت کے سرسری مطالعہ میں آٹھ دس اسباب تک پہنچا تھا کہ کن کن کام کے کرنے سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ وائرس کیسا ہے جو سی ڈی صاف کر دیتا ہے، نیکیاں برباد کر دیتا ہے۔ دین کے معاملات میں بھی ایسا ہی ہے کہ خطرات کو سونگھنا، نشاندہی کرنا اور ان سے خبردار کرنا دین کے تقاضوں میں سے بنیادی تقاضا ہے اور جس طرح اللہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں دین کے باقی شعبوں میں کچھ ذوق تقسیم فرما دیے تھے، اور بنیاد بنی گئی تھی۔ یہ شعبہ بھی اللہ پاک نے کچھ بندوں کے ذمے لگا دیا۔ دین کے باقی شعبے بھی ہیں حدیث کی روایت کا شعبہ ہے اس کی اصل تلاش کریں گے تو آپ کو ابو ہریرۃؓ ملیں گے، انس بن مالکؓ ملیں گے، عبداللہ بن عمرؓ ملیں گے۔ چار پانچ، چھ بڑے آدمی ہیں جو اس شعبے کی بنیاد بنے ہیں۔

تفقہ، استنباط اور استدلال کا پس منظر تلاش کریں گے تو اس کے پیچھے آپ کو حضرت عمر

رضی اللہ عنہ ملیں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ملیں گے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ملیں گے، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ملیں گے، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ملیں گے۔ دین کے ہر شعبہ میں اللہ رب العزت نے تکوینی طور پر صحابہ کرامؓ میں یہ کام تقسیم کر دیے تھے اور پھر یہ کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں جو دو دو تین تین آدمیوں کا ذوق الگ رہا تھا، امت میں آگے چل کر وہی مستقل طبقات کی بنیاد بنا۔ یہ بھی (فتنوں سے آگاہی کا) ایک شعبہ ہے۔ اس کے پیچھے بھی ایک بڑے صحابیؓ کا نام ہے وہ یہی کام کیا کرتے تھے اور وہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لیے میں اس کو حذیفی ذوق کہا کرتا ہوں۔ یہ حذیفی ذوق ہے۔

حضرت حذیفہؓ اپنا ذوق اپنے الفاظ میں خود بیان کرتے ہیں:

اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کَانُوْا یَسْئَلُوْنَہٗ عَنِ الْخَیْرِ وَکُنْتُ اَسْئَلُہٗ عَنِ الشَّرِّ۔

"باقی صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ سے خیر کی باتیں پوچھا کرتے تھے اور میں شر کی باتیں پوچھا کرتا تھا"۔

کیا مطلب؟ ان کا ذوق تھا کہ وہ یہ سوال کیا کرتے تھے کہ یارسول اللہ ﷺ فلاں فتنہ کیسے پیدا ہوگا، خرابیاں کیسے پیدا ہوں گی، فلاں بیماری کیسے آئے گی، فلاں بات کیسے گڑ بڑ ہوگی، دین میں فساد کیسے آئے گا، پھر اصلاح کیسے ہوگی۔ یہ ان کا ذوق تھا اللہ پاک نے دے دیا۔ یہ کریدتے رہے، کریدتے رہے، کریدتے رہے۔ اس لیے اگر آپ احادیث کی کتابوں میں ابواب الفتن کو دیکھیں گے تو اس میں روایات کی ایک بڑی تعداد حضرت حذیفہؓ سے ملے گی بلکہ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مجلس میں سوال کیا کہ تم میں فتنوں کے بارے میں کون زیادہ جانتا ہے تو حضرت حذیفہؓ نے کہا کہ میں زیادہ جانتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے کام ہی یہی کیا ہے۔

علماء و طلباء سے گزارش

بہر حال یہ دین کا ایک شعبہ ہے۔ پہلی بات بطور تمہید کے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جس طرح دنیا کے معاملات و سوسائٹی میں خرابیوں کے اسباب پر نظر رکھنا اور نشاندہی کرنا جسمانی

صحت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح روحانی اور دینی خرابیوں کے اسباب کو تلاش کر کے نشاندہی کرنا یہ دینی صحت کا تقاضا ہے اور ہر دور میں علماء کرام کا ایک مکمل طبقہ رہا ہے جنہوں نے تکلیفیں برداشت کیں اور خرابیوں کی نشاندہی کی۔ بسا اوقات بیمار بھی مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی بیمار کو بیماری کا بتاؤ تو وہ خوش ہوتا ہے اور کسی کو بیماری کا بتاؤ تو وہ ڈرتا ہے۔

میں طلباء کرام اور علماء کرام سے یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر اس شعبہ کو صحیح معنوں میں دیکھنا ہو کہ علماء نے مختلف ادوار میں دینی فتنوں عقیدہ ایمانیات، عبادات، اخلاقیات، اجتماعیات، معاشرت کے حوالے سے فتنوں کی نشاندہی میں کیا کیا قربانیاں دی ہیں تو ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے اس شعبہ کی پوری چودہ سو سالہ تاریخ مرتب کی ہے۔ اس سے پورا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے کہ ہر دور میں علماء حق نے لوگوں کے ایمان اور عقیدے کی حفاظت کے لیے، اصل دین کی ترویج کے لیے اور دین میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی کانٹ چھانٹ کے لیے کیا کام کیا ہے اور انہوں نے کیا قربانیاں دی ہیں۔

دوسری بات: میری گفتگو کا عنوان ہے ''منکرین ختم نبوت''۔ جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر سلسلہ نبوت مکمل ہو گیا۔ آپ کے بعد کسی کو نبوت نہ ملی ہے اور نہ ملے گی۔ پہلے انبیاء میں سے ایک بزرگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر حیات بیٹھے ہیں، تشریف لائیں گے لیکن اور کسی کو نئی نبوت نہ ملی ہے اور نہ قیامت تک ملے گی، نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ البتہ نبوت کا دعویٰ حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی لوگوں نے کیا اور چودہ سو سال سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے دجاجلہ بھی ہیں اور چھوٹے چھوٹے گروہ بھی ہیں۔ اس پر میں ایک حوالہ دوں گا۔

اس پر ایک مستقل کتاب حضرت مولانا ابوالقاسم محمد رفیق دلاوریؒ کی ہے جو ہمارے اکابرین میں سے گزرے ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ ان کی کتاب ''ائمہ تلبیس'' دو جلدوں میں ہے۔ تحفظ ختم نبوت والوں نے چھاپی ہے۔ انہوں نے تقریباً کوئی دو سو سے زیادہ منکرین ختم نبوت کا احاطہ کیا ہے کہ کس کس نے کس دور میں دعویٰ کیا اور کون سا کیا۔ اس کا خلاصہ ایک کتابچہ میں آیا ہے اس کا نام

''ایمان کے ڈاکو'' ہے۔ اگر کوئی لمبی کتاب نہ پڑھ سکے تو ''ایمان کے ڈاکو'' نامی کتابچہ ہی پڑھ لے۔ میرا طریقہ کار ہے کہ جب مجھے اس موضوع پر بات کا موقعہ ملتا ہے، میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ عقائد کے حوالے سے تو متکلمین اور مناظرین آپ سے بات کریں گے، میں تاریخی حوالے سے بات کرتا ہوں اور یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ نصاب کی ابتداء پوری ہو اور انتہا پوری ہو تو درمیان پورا ہو ہی جاتا ہے۔ لہٰذا میں مسئلہ کی نوعیت سمجھانے کے لیے تھوڑی سی ابتداء کی بات کرتا ہوں اور تھوڑی سی انتہا کا۔ میں تاریخی حوالے سے یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ جناب نبی کریم ﷺ کے دور کے مدعیان نبوت کون تھے۔ ان کے ساتھ حضور ﷺ کا اور صحابہؓ کا طرز عمل کیا تھا۔ تھوڑی سی گفتگو اس پر کروں گا۔ پھر اصل گفتگو اس پر ہوگی کہ آج کے دور میں دنیائے اسلام میں نبوت کے نام پر چلنے والے کتنے گروہ ہیں، کہاں کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ ان کی تاریخ کیا ہے؟ وہ کس حوالے سے کام کر رہے ہیں؟ ہم آج کے دور میں رہتے ہیں۔ اس لیے ان کا تعارف بھی ہمیں ہونا چاہیے کہ کون کہاں کہاں کس حوالے سے کام کر رہا ہے؟ ان کا طریقہ واردات کیا ہے؟ ان کا دعویٰ کیا ہے؟ ان کی پہچان کیا ہے؟ میں دو مرحلوں پر بات کروں گا۔ پہلے مرحلہ میں اختصار کے ساتھ جناب نبی کریم ﷺ کے دور کے مدعیان نبوت کی بات ہوگی۔ اس کے بعد پھر لمبی چھلانگ لگا کر آج کے دور میں آجاؤں گا اور آج کے دور میں جو مدعیان نبوت ہیں ان کا آپ سے تھوڑا سا تعارف کراؤں گا۔

حیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں مدعیان نبوت

حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں تین آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ یمامہ کے مسیلمہ نے خیبر کے علاقہ میں بنو اسد کے طلیحہ نے اور یمن کے اسود عنسی نے عیہلہ یا عبہلہ اس کا نام بتاتے ہیں۔ یہ تین آدمی تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

مسیلمہ کذاب

مسیلمہ بنو حنیفہ قبیلے کا سردار تھا۔ یہ کوئی کمزور آدمی نہیں تھا بلکہ یمامہ کے علاقے میں

طاقتور آدمی تھا۔ جب وہ مسلمانوں کے مقابلے میں لشکر لے کر آیا تو بتایا جاتا ہے کہ اس کے جھنڈے نیچے اسی ہزار کا لشکر تھا اور جب پہلے مسلمان لشکر نے حضرت عکرمہؓ کی قیادت میں جنگ لڑی تو اس لشکر کو شکست ہوئی، تاریخی واقعہ ہے یہ کمزور آدمی نہیں تھا۔ نجد کا علاقہ جہاں آج کل ریاض وغیرہ ہے یہ سارا وہی علاقہ ہے تو یہ نجد کا علاقہ یمامہ کا علاقہ تھا اور مسیلمہ بنو حنیفہ کا سردار تھا۔ نام مسیلمہ ابن ثمامہ بن حبیب تھا، اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جناب نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان کی پیروی میں میں بھی اللہ کا رسول ہوں کہ مجھے حضور ﷺ کے ساتھ نبوت میں حصے دار بنایا گیا ہے۔ اِنِّیْ اُشْرِکْتُ مَعَهٗ فِی الأمر۔ ''میں حضور ﷺ کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کو جو اس نے خط لکھا اسمیں بھی لکھا گیا تھا۔ اُشْرِکْتُ مَعَکَ فِی الأمر۔ ''مجھے آپ کے ساتھ نبوت کے معاملہ میں شریک کیا گیا ہے''۔

یہ اس کا تعارف تھا اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، جناب نبی کریم ﷺ کو پیشکش کی، ایک دفعہ خود بھی آیا۔ پھر ایک وقت اس نے خط بھیجا، یہ خط امام بیہقیؒ نے نقل کیا ہے، مستدرک حاکمؒ میں بھی ہے اور اس کا کچھ اشارہ صحیحین میں بھی ہے۔ اس کا خط جناب نبی کریم ﷺ کی طرف دو آدمی لے کر آئے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کے دعوے پر حضور ﷺ کا ردعمل کیا تھا۔ باقی دلائل اپنے موقع پر آئیں گے، ایک آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور حضور ﷺ کی پیروی میں دعویٰ کیا ہے تو اس پر رسول اللہ ﷺ کا ردعمل کیا ہے؟ ہمارے لیے تو اسوہ یہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ دو آدمی خط لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ خط کا عنوان تھا۔ ''من مسیلمة رسول اللہ الی محمد رسول اللہ'' یہ عنوان تھا۔

اِنِّیْ اُشْرِکْتُ مَعَکَ فِی الأمر مسیلمہ کی طرف سے محمد ﷺ کے نام: مجھے آپ کے ساتھ نبوت کے معاملہ میں شریک کیا گیا ہے اور میں آپ کو پیشکش کرتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ دو باتوں میں سے ایک بات طے کریں یا تو آپ اپنا جانشین مجھے نامزد کر دیں، آپ اپنی زندگی میں نبوت کرتے رہیں، آپ کے بعد میں سنبھال لوں گا

اور اگر یہ نہیں ہے تو......... پھر شہر آپ کے دیہات میرے، پکی اینٹیں آپ کی اور کچی اینٹیں میری، یہ تقسیم کر لیں۔ یعنی شہروں کے نبی آپ ہوں اور دیہات کی نبوت میرے سپرد کر دیں۔

محمدی جواب

نبی کریم ﷺ نے دو جواب دیے۔ فرمایا کہ: "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ"۔ "خلافت دینا، شہر دیہات تقسیم کرنا میرا کام نہیں یہ کام کس کا ہے (اللہ کا) وہ جسے چاہے گا خلافت دے گا، جسے چاہے گا شہر دے گا، جسے چاہے گا دیہات دے گا، اللہ کا کام ہے اس میں مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ جو دو نمائندے آئے تھے ان سے کہا کہ "اَتَشْھَدَان اِنی رَسُوْلُ اللّٰہِ" تم گواہی دیتے ہو میرے بارے میں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ 'نَشْھَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہ۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "اَتَشْھَدَانِ أن مُسَیْلَمَۃَ رَسُوْلُ اللّٰہ" کیا تم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا: نَعَمْ! نَشْھَدُ اَنِ مسیلمۃ رَسُوْلُ اللّٰہ" آپ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہیں اور مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہیں۔

حضور ﷺ نے ان کے جواب میں ایک جملہ ارشاد فرمایا، وہی ہمارے دینی ردِ عمل اور دینی فیصلے کی بنیاد ہے..... فرمایا! "لو لا ان الرسل لا تقتل لضربت أعناقکما" کہ اگر یہ قاعدہ قانون نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا (کیونکہ ضابطہ ہے کہ سفیروں کو قتل کرنا، کسی قوم کے نمائندے کو قتل کرنا یہ اس قوم سے اعلان جنگ ہوتا ہے) تو تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا کہ مجھے اللہ کا رسول ماننے کے بعد کسی اور کو اللہ کا رسول ماننا یہ ارتداد ہے اور ارتداد کی سزا کیا ہے؟ قتل!۔

صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

اس پر ایک لطیفے کی بات یہ ہے کہ وہ نمائندے تو چلے گئے، ان میں سے ایک ابن نواحہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر تھے۔ ایک دن بازار جا رہے تھے کہ آپ کی ایک شخص پر نظر پڑی۔ شک پڑنے پر اسے بلوایا

اور فرمایا کہ تجھے کہیں دیکھا ہے...... میرا خیال ہے کہ مسیلمہ کا خط لے کر جو دو آدمی آئے تھے ان میں سے ایک تم تھے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے ان دو میں سے ایک میں تھا۔ حضرت نے پوچھا کہ کیا اب بھی مسیلمہ کو رسول مانتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی! مانتا ہوں۔ تو حضرت نے فرمایا کہ اب تم کسی قوم کے سفیر تو نہیں ہو؟ اس نے کہا کہ جی نہیں۔ تشریف لاؤ! گرفتار کر لیا۔ اب ضابطے کے مطابق تین دن کی مہلت دی۔ تین دن کی مہلت میں بھی یہ آدمی پکا رہا اور توبہ نہ کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے تین دن کے بعد قتل کر دیا اور اس کی لاش کوفہ کے بازار میں لٹکا دی۔ زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ایک آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ان کی خلافت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمان فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے وحشی بن حربؓ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔ ان لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ کا، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ طرز عمل تھا۔

طلیحہ بن خویلد

ایک اور شخص طلیحہ بن خویلد اسدی بنو اسد قبیلے کا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ جھاڑ دیا کہ جی میں نبی ہوں اور خاصے آدمی اکٹھے کر لیے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے اس کی سرکوبی کے لیے حضرت ضرار بن ازورؓ معروف کمانڈر کو بھیجا۔ انہوں نے اس پر حملہ کیا۔ اسی جنگ میں حضرت عکاشہ بن محصن فزاری رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، وہ بھی بنو اسد قبیلے کے تھے۔ طلیحہ بھاگ گیا لیکن قابو نہ آیا۔ جب حضور ﷺ کا وصال ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ قبائل مرتد اور باغی ہوئے تو یہ بھی واپس آیا، اپنے قبیلے کو اکٹھا کیا اور پھر سے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اب کی بار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کی سرکوبی کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ مسیلمہ کی سرکوبی کے بعد واپسی پر اس کی بھی ذرا خبر لینا۔ خالد بن ولیدؓ نے واپسی پر اس کا سامنا کیا وہ پھر شکست کھا کر بھاگ گیا اور شام کے علاقے میں روپوش رہا اور ادھر ادھر گھومتا رہا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پھر ظاہر ہوا لیکن نبوت کے نام پر نہیں بلکہ نبوت سے توبہ کر لی۔ اب یہ اس تلاش میں تھا کہ کوئی آدمی حضرت عمرؓ کے سامنے

سفارشی بن کر میرے ساتھ چلے تو میں توبہ کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ کسی نے کہا حضرت خالد بن ولیدؓ بھی اسی علاقے میں آئے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں نہیں! اس کے پاس نہیں جانا، وہ تو مجھے مار دے گا۔ کوئی اور آدمی بتاؤ۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عمرو بن عاصؓ ہیں اس نے کہا کہ ہاں وہ ٹھیک ہیں۔ لہٰذا وہ حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس گیا، وہ جرنیل بھی تھے اور سفارت کار بھی تھے، بہت ذہین آدمی تھے۔ وہ ان کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، پھر مدینہ منورہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا، اس نے اپنا تعارف کرایا کہ میں طلیحہ ہوں، انہوں نے فرمایا کہ میں نے پہچان لیا ہے! کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ ایمان قبول کرنے آیا ہوں، توبہ کرتا ہوں۔ فرمایا کہ توبہ تو تم کرلو گے لیکن میں عکاشہ کا کیا کروں گا، مجھے تو وہ بھولتا نہیں جو تمہارے ہاتھوں جنگ میں مارا گیا۔ کہنے لگا کہ حضرت کیا اس بات پر آپ خوش نہیں ہیں۔ (دیکھیں ذہین آدمی ذہین ہوتا ہے) کہ اللہ رب العزت نے اسے میرے ہاتھوں جنت میں پہنچا دیا اور مجھے اس کے ہاتھوں جہنم میں جانے سے روک لیا، اگر میں مارا جاتا تو کہاں جاتا (جہنم میں) اور وہ مارا گیا ہے تو کہاں گیا ہے جنت میں۔ دوسری بات اس نے یہ کی کہ حضرت کیا کل قیامت کے دن یہ منظر آپ کو اچھا نہیں لگے گا کہ میں اور عکاشہ قاتل و مقتول دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جنت میں جائیں گے۔ اس کی یہ باتیں سن کر حضرت عمرؓ ہنس پڑے، فرمایا ٹھیک ہے۔ اس نے کلمہ پڑھا، توبہ کی اور ایمان قبول کیا اور اچھے صالح مسلمان کی حیثیت سے باقی زندگی گزاری۔ یہ طلیحہ کی داستان تھی۔

اسود عنسی

ایک تیسرا آدمی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اسود تھا عام طور پر اسے عیہلہ کہتے ہیں بعض نے عبہلہ یا اہلہ بھی پڑھا ہے، یہ یمن کا تھا۔ یمن کا پورا علاقہ جناب نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا، حضور ﷺ نے مختلف علاقوں میں حاکم مقرر کر دیے تھے۔ کہیں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں، کہیں حضرت علیؓ ہیں کہیں حضرت معاذ بن جبلؓ ہیں۔ اللہ کی قدرت کہ حضور ﷺ کی زندگی میں ہی یمن کا پورا علاقہ ہاتھوں سے نکل گیا، پھر واپس بھی آ گیا۔

یہ اسود ایک سردار تھا عنس قبیلے کا۔ اسی نسبت سے وہ عنسی کہلاتا ہے، اس کو رنگ کی وجہ سے اسود کہتے ہیں، کالا تھا لیکن نام اسود نہیں ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ایک جتھہ اکٹھا کیا اور صنعاء میں آ گیا۔ وہاں کے گورنر کو شہید کیا اور قلعے پر قبضہ کرلیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ ہمارا گورنر شہید ہوگیا ہے اور اسود نامی ایک سردار نے نبوت کے دعوے کے ساتھ قلعے پر قبضہ کرلیا ہے اور چند دنوں میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ پورا یمن کا علاقہ اس نے اکٹھا کرلیا اور رسول اللہ ﷺ کے عاملین حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت معاذ بن جبلؓ سمیت یمن چھوڑ آئے۔ چند دنوں تک یہی کیفیت رہی، یہ حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری ایام تھے۔ نبی کریم ﷺ کو جب پتا چلا تو فرمایا کہ کوئی ہے جو اس کو سنبھالے۔ تو یمن کے ہی حضرت فیروز دیلمیؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضور ﷺ کی اجازت سے دیلمیؓ نے وہاں جا کر جتھہ بنایا، انہوں نے آمنے سامنے جنگ نہیں کی بلکہ چھاپہ مار کارروائی کی۔ پہلے اہل خانہ سے ساز باز کر کے اس کو شراب پلائی جب اس کو نشہ آیا تو قتل کر دیا اور صبح ہوتے ہی جھنڈا لہرا دیا کہ اسود قتل ہوگیا ہے اور ہم نے قلعہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس طرح یمن پر دوبارہ مسلمانوں کا اقتدار بحال ہوگیا۔

اس وقت نبی کریم ﷺ کو وحی کے ذریعے اطلاع مل گئی تھی، حضور ﷺ بستر علالت پر ہیں اور فرما رہے ہیں۔ فاز فیروز! فاز فیروز! فاز فیروز۔ فیروز اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا ہے، فیروز نے اپنے ٹارگٹ کو پالیا ہے۔ حضور ﷺ یہ فرما رہے ہیں اور بہت سے لوگ سمجھ نہیں پا رہے ہے کہ کون فیروز کامیاب ہوا؟ اکثر لوگوں کو تو تب پتہ چلا کہ جب حضرت فیروز دیلمیؓ آپ ﷺ کی وفات کے چند دن بعد مدینہ پہنچے، پھر انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خبر پہنچائی، انہوں نے کہا کہ ہمیں خبر پہلے مل گئی ہے۔ تو یہ تیسرا مدعی نبوت اسود عنسی تھا۔

سجاح خاتون

ایک چوتھی مدعیہ بنو تغلب کی عورت سجاح تھی۔ اس نے بھی نبوت کا دعوی کیا، یہ بڑی خطیبہ ادیبہ تھی۔ اس نے جناب نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد نبوت کا دعوی کیا کہ میں

بھی نبیہ ہوں۔ اس کا خیال ہوگا کہ حضور ﷺ نے لا نبی بعدی کہا...... لا نبیۃ بعدی نہیں کہا۔ نبی کی نفی کی ہے نبیہ کی نفی تو نہیں کی اس لیے میں نبیہ ہوں۔ اس کی تفصیلات میں میں نہیں جاتا بہر حال یہ بھی مقابلے پر لشکر لے کر آئی تو راستے میں مسیلمہ کذاب کا لشکر تھا۔ دونوں اطراف کے اہم رہنماؤں نے کہا کہ ہمیں مختلف ہو کر لڑنے کی بجائے اکٹھے ہو کر مدینہ والوں سے لڑنا چاہیے اس سلسلہ میں دونوں گروپوں کے درمیان صلح کے لیے مذاکرات کا اہتمام کیا گیا۔ یہ نبیہ اتنی مضبوط تھی کہ مذاکرات کے لیے نبی صاحب کے خیمے میں گئی۔ اس میں سے تین دن کے بعد باہر نکلی اور کہا کہ ہماری صلح ہوگئی، ہم نے نکاح کرلیا ہے۔ قوم والوں نے کہا کہ مہر کیا مقرر کیا؟ کہنے لگی کہ وہ تو میں بھول گئی تھی۔ دوبارہ جا کے پوچھتی ہوں۔ اس نے کہا کہ مہر یہ ہے کہ تمہیں نمازیں معاف ہیں۔

مسیلمہ کذاب جب قتل ہوا اور اس کے لشکر کو شکست ہوئی تو یہ روپوش ہوگئی اور بھاگ گئی۔ یہ پھر حضرت معاویہؓ کے زمانے تک روپوش رہی۔ امیر المومنین حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس نے توبہ کی اور ایمان قبول کرلیا۔ حضرت معاویہؓ کے حکم سے کوفہ میں اس کو بسایا گیا۔ وہاں اس نے زندگی گزاری۔ کہتے ہیں کہ بڑی عابدہ، زاہدہ اور صالحہ خاتون تھی۔ وہیں فوت ہوئی اور حضرت سمرہ بن جندبؓ نے اس کا جنازہ پڑھایا۔ یہ تو میں نے تھوڑا سا تعارف کرایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانے میں جن لوگوں نے نبوت کے دعوے کیے تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، ان کے فیصلے کیا تھے۔ میں نے خلاصۃً یہ بات آپ پر واضح کردی ہے۔

موجودہ دور کے جھوٹے مدعیان نبوت

میرا خیال ہے کہ آج کے مدعیان نبوت کو سمجھنے کے لیے تھوڑا سا پس منظر سمجھنا بھی ضروری ہے۔ آج دنیا میں اسلام کے ساتھ نسبت رکھتے ہوئے نئی نبوت کے لیے میری معلومات کے مطابق پانچ گروہ کام کر رہے ہیں جن کے ساتھ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد وابستہ ہیں۔ ان کا اپنا ایک طریق کار ہے اور وہ متحرک ہیں۔

ذکری مذہب

تاریخی ترتیب کے حوالے سے ان کا ذکر کر رہا ہوں ان میں سب سے قدیمی گروہ ذکریوں کا ہے۔ ذکری پاکستان میں ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔

ان کا آغاز دسویں صدی ہجری میں ملا محمد مہدی کے ظہور سے ہوا۔ چار صدیوں سے یہ گروہ پاکستان کے ساحل مکران اور تربت کے علاقہ میں چلا آ رہا ہے۔

یہ محمد مہدی ملا محمد اٹکی کہلاتے تھے۔ اس کا پتہ نہیں کہ اٹک کا تھا یا کہیں اٹک گیا تھا، کیا مسئلہ تھا بہرحال اٹکی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اٹکی کی وجہ تسمیہ میں نے بہت تلاش کی لیکن مجھے نہ ملی۔ یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ ایران آج سے پانچ سو سال پہلے سنی اکثریت کا ملک تھا۔ صفوی بادشاہ حکمران ہوئے ہیں اور ان کا ایک لمبا دور گزرا ہے۔ دنیا کے اعتبار سے بڑے کامیاب حکمران تھے اور دین کے اعتبار سے بڑے جاہل حکمران تھے۔ صفویوں نے جب اقتدار سنبھالا تو اہل سنت پر جبر شروع کیا بہت سے لوگ جبر کا نشانہ بن کر بدل گئے، جنہوں نے ایمان بچایا وہ سرحدوں کی طرف بھاگے، چنانچہ آج بھی آپ ایران کی صورتحال دیکھیں تو وسطی ایران میں شیعہ اکثریت ہے جبکہ اہلسنت آپ کو باڈروں پر ملیں گے۔ افغانستان کے باڈر پر اور بلوچستان کے باڈر پر۔ انہوں نے جہاں اہلسنت کے خلاف کارروائی کی وہاں باطنیوں کے خلاف (باطنی ایک فرقہ ہے) بھی کارروائی کی۔ ان میں سے یعنی باطنیوں میں سے ایک آدمی محمد مہدی یہاں آ کے بس گیا۔ یہ ۹۷۷ھ کی بات ہے سرباز ایک علاقہ ہے جو تربت کے علاقے میں ہے، وہاں اس نے آ کے دعویٰ کیا کہ میں امام مہدی ہوں، کیونکہ امام مہدی کا انتظار مسلمانوں کو ہر دور میں رہا ہے، آج بھی ہے اور جب تک وہ نہیں آ جائیں گے تب تک انتظار رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی پیشگوئی ہے جو پوری ہو کر رہے گی، اگرچہ اس کا درجہ ایمانیات کا نہیں ہے لیکن ایک پیشگوئی ہے جو صحیح روایت سے ثابت ہے وہ تو پوری ہوگی۔ بہرحال اس نے دعویٰ کیا کہ میں امام مہدی ہوں، اس کے ساتھ ایک گروہ بن گیا۔ وہاں تربت میں مراد نامی ایک سردار مرید ہوا، اس نے کچھ شعبدے بھی دکھائے کہ میں کتاب لاتا ہوں۔ چنانچہ ایک درخت پر چڑھ گیا، واپسی پر کتاب لے آیا کہ

مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے۔ پانی کا چشمہ نکالتا ہوں، زمین پر نیزہ مارا تو کہتے ہیں کہ پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ یہ ایک دو کارروائیاں دکھائیں، اس کے گرد لوگ اکٹھے ہو گئے اور اس نے اپنے امام مہدی ہونے کے حوالے سے پورے علاقے میں اپنی پیری مریدی قائم کر دی۔ جب دیکھا کہ اب پیری مریدی چل پڑی ہے اور لوگوں کا اعتقاد ہو گیا ہے تو اس کے بعد اس نے دوسرا دعویٰ یہ کیا کہ مجھے نبوت بھی مل گئی ہے اور میں نبی ہوں اور خاتم الانبیاء اور افضل الانبیاء ہوں۔ ان کی ایک کتاب ہے "معراج نامہ" آپ ان کے عقائد کی ایک جھلک اس سے ملاحظہ کر لیں۔ اس میں جناب نبی کریم ﷺ کی معراج کا پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو جو معراج ہوا اس کا فلسفہ و پس منظر کیا تھا۔

معراج کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ایک دن بیٹھے بیٹھے فرمایا کہ میں تمام انبیاء کا سردار ہوں۔ اللہ رب العزت کو یہ بات پسند نہ آئی، اللہ پاک نے بلایا آیئے جی! بجائے اس کے کہ زبانی طور پر بتاتا، اللہ پاک نے عملاً بتایا۔ حضرت محمد ﷺ کو اللہ رب العزت نے عرش پر بلایا۔ جب حضور ﷺ عرش پر پہنچے تو وہاں اللہ رب العزت کے ساتھ ملا محمد اٹکی عرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ پاک نے بتانے کے لیے بلایا کہ انبیاء کے سردار آپ نہیں یہ ہیں۔ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد۔ بہرحال ملا محمد اٹکی کے دیدار کے لیے نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کو اللہ پاک نے بلایا کہ نبیوں کے سردار آپ نہیں بلکہ نبیوں کا سردار تو میرے پاس عرش پر بیٹھا ہے۔ یہ معراج نامہ میں معراج کا فلسفہ ہے۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ ان کے عقائد کی نوعیت کیا تھی۔

ذکری احکام یا عبادات

انہوں نے احکام کی منسوخی کا دعویٰ کیا۔ پہلا حکم نماز کا منسوخ کیا۔ اس نے کہا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر شریعت نازل ہوئی ہے اور نماز منسوخ ہے۔ آج کے بہت سے لوگوں کو بڑا اچھا لگے گا کہ یہ بہت لوگوں کا مسئلہ حل ہو گا کہ کوئی جو نماز کو منسوخ کر دے۔ نماز منسوخ کر دی اور نماز کے بدلے میں صبح اور شام کے چند اذکار مقرر کر دیے، یہی ان کی پہچان ہے۔ اس علاقے میں آپ جائیں تو مسلمان نمازی کہلاتے ہیں اور یہ ذکری کہلاتے ہیں۔ مسلمان پانچ

وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور یہ نماز نہیں پڑھتے ذکر کرتے ہیں۔ صبح شام کبھی اکٹھے تو کبھی انفرادی۔ تو یہ کیا کہلاتے ہیں؟ ذکری!

ذکری کہلانے کا پس منظر یہی ہے۔ ایک تو انہوں نے نماز منسوخ کر دی اور رمضان کے روزے منسوخ، رمضان کے انتیس یا تیس روزوں کے عوض ذوالحجہ کے دس روزے، زکوٰۃ منسوخ لیکن زکوٰۃ کے عوض دسواں حصہ (عشر) مذہبی پیشواؤں کا حق مقرر کرا دیا۔ حج منسوخ ہے، حج کی بجائے ان کا الگ حج ہوتا ہے، آج بھی پاکستان میں ہوتا ہے کہ ستائیس رمضان کو پاکستان بھر سے تربت میں ہزاروں کی تعداد میں ذکری اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہاں کوہ مراد ہے۔ مراد محمد مہدی کا پہلا خلیفہ تھا، اس کے نام سے اب اس علاقے کو کوہ مراد کہتے ہیں۔ اس کا نام محمد مراد تھا۔ اس کو بیت اللہ کی حیثیت حاصل ہے اور اس کا طواف کرتے ہیں۔ وہاں باقاعدہ حرم ہے جس کی حدود طے ہیں۔ وہاں ایک مقام محمود کے نام سے جگہ بھی ہے۔ ایک پانی کا چشمہ ہے جس کو زم زم کہتے ہیں۔ گلڈن نامی ایک میدان ہے جس کو عرفات کے میدان کے طور پر وقوف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دائرے کی شکل میں مرد اور عورت مل کر گھومتے ہیں، رقص کرتے ہیں اور ذکر کرتے ہیں۔ یہ ان کی عبادت ہے۔ اس علاقے کے کوئی صاحب بیٹھے ہوں تو ان سے تفصیل پوچھیے کہ رمضان کے آخری دنوں میں وہاں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ متعدد علماء کرام کو نظر بند کیا جاتا ہے، کوئی ضلع بدر ہوتا ہے، کسی کی جواب طلبی ہوتی ہے کہ یہ ان کے حج میں رکاوٹ نہ بنیں اور سرکاری حفاظت میں یہ مصنوعی حج ہر سال ستائیس رمضان کو کوہ مراد میں منایا جاتا ہے۔ وہاں ایک بلیدی خاندان گزرا ہے۔ ہمارے جمعیت علماء اسلام کے سینیٹر اسماعیل بلیدی اسی خاندان سے ہیں لیکن یہ مسلمان ہیں۔ بلیدی خاندان جو ذکری تھا اس کی تقریباً ایک سو سال اس علاقے پر حکومت رہی ہے۔

تعارف کے لیے کتابیں

اس کی تفصیلات اگر پڑھنی ہوں تو کتاب کا حوالہ میں بتا دیتا ہوں۔ آپ وہ کتابیں منگوائیں اور پڑھیں کہ ہمارے ملک میں منکرین ختم نبوت کا سب سے قدیمی گروہ کون سا ہے، اور کیا کام کر رہا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں مفتی احتشام الحق آسیا آبادی، ان کی دو

کتابیں ہیں۔ ''ذکری مذہب کے عقائد و اعمال'' اور ''ذکری مذہب کی حقیقت'' یہ ان کے دو کتابچے ہیں اور اس میں پوری تفصیل بیان کی ہے۔ جامعہ عربیہ رشیدیہ آسیہ آباد تربت ضلع مکران بلوچستان سے آپ کو مل جائیں گی۔ میں نے مختصر خلاصہ بتلا دیا۔ تفصیل معلوم کرنا چاہیں تو وہاں سے معلوم کرلیں، ہاں ایک بات میں بھول گیا کہ ان کا کلمہ کیا ہے۔ یہ کلمہ بھی مستقل پڑھتے ہیں۔ ان کا کلمہ یہ ہے۔ "لا الہ الا اللہ نور پاک نور محمد مھدی رسول اللہ" یہ ان کا مخصوص کلمہ ہے۔ کراچی کے قبرستانوں میں بھی بہت سی ذکریوں کی قبروں پر یہ کلمہ لکھا ہوتا ہے اور یہ ان کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ وہ یہی کلمہ پڑھتے ہیں۔

بابی اور بہائی

دوسرا بہائیوں کا گروپ ہے۔ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے ذکریوں کے بعد ان کا نمبر آتا ہے۔ ان کا لقب بہائی اور بابی ہے۔ یہ مرزائیوں کے بڑے بھائی ہیں۔ بہائی واقعی بھائی ہیں، لیکن ہمارے نہیں بلکہ قادیانیوں کے بڑے بھائی ہیں۔ یعنی قادیانیوں سے کچھ عمر میں بڑے ہیں۔

اہل تشیع کا عقیدہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بارہ اماموں کے قائل ہیں اور بارھواں امام ان کے عقیدے کے مطابق غائب ہے اور قیامت سے پہلے آئے گا۔ ایک شخص گزرا ہے مرزا علی محمد باب ۱۸۱۹ء کو یہ شیراز میں پیدا ہوا۔ شیراز ایران کا ایک شہر ہے۔ شیخ سعدیؒ کو بھی اسی لیے شیرازی کہتے ہیں۔ آج سے کوئی ۱۹۰ سال پہلے کی بات ہے یہ پیدا ہوا اور بڑا ہوا اور پڑھنا لکھنا سیکھا۔ تو کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں جس طرح ہمارے ہاں انگریزوں کو ضرورت تھی یہاں مذہب کے نام پر تبدیلیاں کرنے کے لیے کسی نبی کی تو وہاں روس کے اثرات زیادہ تھے۔ روس میں عیسائی حکومت تھی تو یہ روس کے زیر اثر پیدا کیا گیا اور روسی حکومت نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ بہر حال میں اسکے مذہبی پہلو پر بات کروں گا۔ جب مرزا محمد علی ۲۵۔ ۳۰ سال کی عمر کو پہنچے تو دعویٰ کیا کہ میرا امام غائب سے رابطہ ہو گیا ہے اور امام غائب نے مجھے اپنا نمائندہ بنا دیا ہے اور میں امت اور امام غائب کے درمیان باب ہوں۔ یہ باب کا پس منظر ہے، اسی لیے اس کا نام محمد علی الباب رکھ دیا گیا۔ باب کا مطلب

آپ سمجھتے ہیں کہ میری امام مہدی سے ملاقات ہوگئی اور مجھے انہوں نے نمائندہ مقرر کیا ہے۔ لہٰذا اب جس نے امام سے بات کرنی ہے وہ مجھ سے کرے اور جس نے امام کی منشاء معلوم کرنی ہے وہ مجھ سے پوچھے۔ میں اس کے درمیان واسطہ بن گیا ہوں۔ یہ اس نے دعویٰ کیا اور بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں کیں۔ جیسے اس قسم کے شعبدہ بازوں کی عادت ہوتی ہے۔ بہرحال یہ کام ذہین لوگ ہی کرتے ہیں، بے وقوف آدمی کیا کرے گا۔ یہ تو طلیحہ جیسے لوگ کر سکتے ہیں۔ بیوقوف آدمی تو اپنا گھر نہیں سنبھال سکتا، دوسروں کو کیا سنبھالے گا۔ بہرحال وہ ذہین آدمی تھا، آہستہ آہستہ اس کا حلقہ بنا۔ اب اس نے کہا کہ مجھ پر وحی آتی ہے! یہ دوسرا سٹیپ تھا...... اس نے براہ راست مہدی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہاں کا حاکم اس کے ہاتھ پر بیعت کر گیا...... حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ وہاں اثنا عشری علماء کا زور تھا،...... انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ جب مخالفت بڑھی تو اس کو گرفتار کیا گیا اور گرفتار کرنے کے بعد ۹ جولائی ۱۸۵۰ء کو ایک عدالت کے حکم پر گولی مار کر موت کی سزا سنائی گئی۔

مرزا بہاؤ اللہ شیرازی

اس کے بعد اس کا جانشین بنا ہے ملا محمد علی بارفروشی جو دین فروش تھا لیکن بارفروشی کہلایا۔ اس نے بات کو آگے بڑھایا۔ اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ رجعت تھی کہ رسول اللہ دوبارہ واپس آگئے شیعہ عقیدہ رجعت کے قائل ہیں کہ حضرت علیؓ دوبارہ آئینگے اور یہ ہوگا اور وہ ہوگا، اس نے رجعت رسول اللہ کا دعویٰ پیش کیا...... لیکن وہ زیادہ نہیں چل سکا۔ اس کا ایک بڑا ذہین شاگرد تھا بہاؤ اللہ شیرازی۔ اس نے خلافت کا منصب سنبھال لیا اور جانشینی قابو کر لی۔ اس نے کہا کہ محمد علی جو تشریف لائے تھے اصل وہ نہیں تھے بلکہ اصل میں ہوں، وہ تو میری بشارت دینے کے لیے آئے تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ امام غائب اور تمہارے درمیان باب نہیں تھا۔ یہ تو میرے اور تمہارے درمیان تھا وہ تو قتل ہو چکا...... اس نے تو بولنا نہیں تھا۔ اب اس نے کہا کہ یہ جو میرے اور تمہارے درمیان باب تھا اصل میں ہوں، وہ میرے لیے راہ ہموار کرنے اور بشارت دینے کے لیے آئے کہ دنیا کا نجات دہندہ آنے والا ہے اور وہ دنیا کا نجات دہندہ میں آگیا ہوں اور اب دنیا

کی نجات میرے ہاتھ میں ہے۔

بہاؤ اللہ کی تعلیمات

ان صاحب کا نام ہے مرزا بہاؤ اللہ شیرازی، بہاؤ اللہ نوری بھی کہتے ہیں۔ اس نے الواحِ مقدسہ کے نام سے ایک کتاب وحی کا دعویٰ کیا۔ "الواح مقدسہ" کے نام سے ان کی ایک کتاب چھپتی ہے اور تقسیم ہوتی ہے۔ اس میں با قاعدۃ سورہ الملک کی طرح سورۃ الملوک ہے، اسی طرح اور بھی مختلف سورتیں ہیں۔ اسی طرز پر انہوں نے کچھ جملے جوڑے ہیں۔

اس نے کہا کہ قرآن منسوخ ہے (العیاذ باللہ)۔ اب میری الواح دنیا کی نجات دہندہ ہیں اور قیامت تک میری پیروی میں نجات ہے، یہ لوگ ذہین تھے اور ذہین ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایران میں حکومت متعصب شیعہ کی تھی۔ ترکی میں خلافت عثمانیہ والے سنی تھے، شیعہ سنی کشمکش چلتی رہتی تھی۔ بہاؤ الدین شیرازی نے دیکھا کہ اب شیعہ مجھے تنگ کرر ہے ہیں تو اس وقت کی فضا سے فائدہ اٹھا کر وہ قسطنطنیہ چلا گیا۔ ان کی آپس کی کشمکش سے کچھ فائدہ اٹھایا، قسطنطنیہ میں حلقہ بنا لیا۔ پھر ترک حکمرانوں کو پتہ چلا کہ اصل قصہ یہ ہے، تو انہوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا یہ پھر عراق آگیا اور عراق کے بعد چلا گیا فلسطین...... وہاں قرآن پاک کی منسوخی کا اعلان کیا، نماز کی منسوخی کا اعلان کیا، شریعت کے احکام کی منسوخی کا اعلان کیا۔ پھر فلسطین کا اعلان کیا۔ پھر فلسطین میں ایک شہر کا نام ہے عکہ، وہاں پر اس نے ڈیرہ لگا لیا اور کہا کہ یہ میرا مرکز ہے۔ چنانچہ بہائیوں کا قبلہ عکہ ہے انہوں نے کعبہ بھی منسوخ کر دیا۔ مرزائیوں نے ہوشیاری سے کام لیا کہ کعبہ وہی رہنے دیا قرآن بھی وہی رہنے دیا باقی اپنی خرافات بھر دیں۔ لیکن انہوں نے قرآن بھی منسوخ کر دیا اور اپنی الواحِ مقدسہ لے آئے۔ تو اب ان کا کعبہ کون سا ہے؟ عکہ۔ وحدت ادیان کا تصور انہوں نے پیش کیا کہ دنیا کا ہر مذہب سچا ہے، ہر مذہب میں سچائیاں موجود ہیں لہٰذا سب کو اکٹھا کر کے ایک ہی دین بنایا جائے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیاء سچے ہیں اور تمام انبیاء کی سچائیاں مرزا بہاؤ اللہ میں ضم ہوگئیں ہیں اسی طرح جس طرح پہاڑی ندی نالے دریا میں آکر ضم ہو جاتے ہیں۔ مرزا بہاؤ اللہ شیرازی ان کے عقیدے کے مطابق تمام انبیاء کے کمالات کا اجتماعی طور پر مظہر اتم ہے۔ قیامت تک ان کا

کلمہ چلے گا اور ان کا قبلہ عکہ ہے۔

لمحہ فکریہ

اس وقت میں دو باتیں آپ کو بتانا چاہوں گا۔ ایک تو یہ کہ ایران میں جو خمینی صاحب کا انقلاب آیا۔ ان کی لڑائیاں بہائیوں سے اس طرح چلتی رہتی ہیں کہ جس طرح ہماری لڑائیاں قادیانیوں سے چلتی ہیں۔ وہاں شاہ ایران کے دور میں یہ اعلیٰ مناصب پر تھے۔ خمینی نے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد سب سے زیادہ صفائی بہائیوں کی کی۔ پھر یہ ایران سے بھاگے اور اکثر نے آ کر پناہ پاکستان میں لی۔ اس وقت پاکستان میں صورتحال یہ ہے کہ آپ کے بڑے بڑے شہروں میں ان کے مراکز موجود ہیں۔ لاہور، سیالکوٹ، حیدر آباد، پنڈی، پشاور، کراچی، کوئٹہ، ملتان تمام بڑے بڑے شہروں میں مراکز قائم ہیں۔ ان کا باقاعدہ پرچہ نکلتا ہے ''ماہنامہ نفحات'' پہلے لاہور سے نکلتا تھا اب پشاور سے نکلتا ہے۔ میرے پاس آتا ہے میں پڑھتا ہوں۔ آپ اس پرچے کو دیکھ کر بالکل یہ تصور نہیں کر سکتے کہ یہ کسی غیر مسلم کا پرچہ ہے۔ اس کی ڈیزائننگ، نام اور ترتیب سے ایسا لگتا ہے کہ تصوف کے کسی خاص حلقے کا پرچہ ہو۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے کوئی فارورڈ قسم کی صوفیت تھی اور اس صوفیانہ انداز میں کسی خانقاہ کا پرچہ ہے اور خانقاہی انداز میں وہ کام کر رہے ہیں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ ہمارے اردگرد ان کے مراکز موجود ہیں اور یہ کام کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ایک ذہن میں آئی۔ یہ بات متعلقہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ جو بیت المقدس کا جھگڑا چل رہا ہے۔ بیت المقدس کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ ہمارا قبلہ اوّل ہے یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہمارا قبلہ ہے اور عیسائیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ہمارا قبلہ ہے بیت اللحم کے حوالے سے اب میں نے بتایا کہ عکہ جو بہائیوں کا قبلہ ہے وہ کہاں ہے۔ فلسطین میں اس وقت فلسطین کے یاسر عرفات کے بعد صدر کون ہے۔ محمود عباس اور بتایا جاتا ہے کہ یہ بہائی ہیں۔ اس وقت جو فلسطین کا منتخب صدر ہے وہ یاسر عرفات کا جانشین ہے جس کے ہاتھوں فلسطین کا مسئلہ حل ہونے جا رہا ہے۔ یہ صاحب کون ہیں؟ اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ بہائی اس وقت کس پوزیشن میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

وحدت ادیان کا تصور

میں نے ان کا مرکز دیکھا ہے۔ میری ایک عادت ہے پتہ نہیں اچھی ہے یا بری ہے کہ جہاں بھی کوئی مذہبی طبقہ ہو وہاں میں ضرور جاتا ہوں۔ عیسائیوں کا مرکز ہو، یہودیوں کا مرکز ہو، میں وہاں جا کر گپ شپ کرتا ہوں، پوچھتا ہوں اور معلومات حاصل کرتا ہوں۔

حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور میں شکاگو میں تھے آج سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں بہائیوں کا مرکز بہت بڑا سنا ہے چلیں ذرا دیکھیں تو انہوں نے کہا ''کون وڑن دیسی'' (کون جانے دے گا) میں نے کہا کہ چلیں چل کر دیکھیں تو سہی ان کے مرکز میں ہم نے دیکھا کہ اس کے اندر مسجد بھی ہے، مندر بھی ہے، گوردوارہ بھی ہے، یہودیوں کا عبادت خانہ بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمام مذاہب کو اکٹھا کر رہے ہیں وحدت ادیان کا یہ مصنوعی مشاہدہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کیا ہے۔

انیس کے عدد کا فریب

ایک اور بات بھی ہے۔ ان کا ایک بڑا عجیب فلسفہ ہے ''انیس کا فلسفہ'' انہوں نے اپنا کیلنڈر تبدیل کیا ہے۔ ان کے ہاں انیس دن کا مہینہ اور انیس مہینوں کا سال ہے۔ انیس کو بڑا مقدس سمجھتے ہیں۔ دلیل یہ دی کہ قرآن کریم میں ہے، "علیها تسعة عشر" کہ جہنم پر انیس فرشتے ہیں۔ یہ فرشتے کہاں کے ہیں (جہنم کے) انہوں نے عدد کو متبرک بنا دیا ہے۔ اللہ پاک نے یہ آیت کس کے حوالے سے بیان کی ہے لیکن ان کے ہاں انیس کا عدد متبرک ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں یہ فلسفہ چلا تھا کہ انیس کے عدد کے حوالے سے قرآن پاک کا اعجاز ثابت کریں گے۔ پرانے لوگوں کو یاد ہوگا بڑے مضامین اور بڑی کتابیں لکھی گئیں اس وقت ہمیں ایک بات کھٹکی تھی کہ یار یہ کوئی نئی بات ہے لیکن لوگ کہہ رہے تھے کہ قرآن کا اعجاز ثابت ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ بھئی ٹھیک ہے۔ قرآن کا اعجاز ثابت ہوگا۔

کچھ عرصہ قبل امریکا کے خلیفہ رشاد نے (اسکا تعارف آخر میں کراؤں گا) یہ چکر شروع کیا تھا یہ مصری تھا امریکہ میں رہتا تھا۔ انیس کے عدد کے حوالے سے بہت سے مسلمانوں کا ذہن بنایا کہ قرآن پاک کے اعجاز کا ایک نیا فارمولہ سامنے آیا ہے اور وجوہ اعجاز میں سے ایک

نئی وجہ ہم نے دریافت کی ہے۔

جب لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی، پھر آہستہ آہستہ یہ بات کہنا شروع کی کہ قرآن پاک تو انیس کے عدد پر پورا اترتا ہے، لیکن حدیثیں ہم نے اکثر چیک کی ہیں وہ انیس کے عدد پر پوری نہیں ہوتیں۔ وہاں سے یہ بات علماء کو کھٹکی کہ گڑبڑ ہے۔ پھر تیسرا مرحلہ شروع کیا کہ قرآن پاک کی بعض روایات بھی انیس کے عدد پر پوری نہیں اترتیں۔ الحاقی لگتی ہیں۔

اصل میں نظریہ یہ تھا کہ احادیث کے بارے میں قرآن پاک میں شک کی فضا پیدا کی جائے۔

پھر علماء اس پر متوجہ ہوئے اور ان کی کوششوں سے یہ فتنہ دب گیا۔ بہرحال انیس کا فلسفہ بہائیوں کا پیدا کردہ فتنہ ہے۔ یہ ہیں بہائی جو آج کے زمانے میں ہیں باقاعدہ نبوت اور وحی کے نام پر کام کر رہے ہیں اور مسلمان ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی

تیسرا گروہ ترتیب کے اعتبار سے قادیانوں کا ہے۔ ان کے حوالے سے حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب نے آپ کو بہت سی باتیں بتائی ہونگی۔ میں صرف تاریخی پس منظر تھوڑا سا عرض کرونگا۔ یہ بہائیوں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۸۵۰ء کو محمد علی باب کو سزائے موت ہوگئی تھی اور یہ فتنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پیدا ہوا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی مذہبی پیشوا ہونا چاہیے جس کے پاس منسوخی احکامات کے اختیارات ہوں۔ یہ بات درمیان میں سمجھ لیں، ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے متجد دین کی اور باہر کے حلقوں کی کہ مسلمانوں میں کوئی اتھارٹی ایسی ہو جو دین کے احکام کو منسوخ کر سکے آج بھی یہ مطالبہ ہے۔ یہ مطالبہ مختلف روپ میں رہا ہے۔ کبھی اجتہاد کے حوالے سے کبھی کسی حوالے سے۔ ان کے نزدیک مقصد یہ نہیں ہے کہ شرعی اصولوں کے مطابق اجتہاد کریں بلکہ ان کے نزدیک اجتہاد یہ ہے کہ احکامات کو کیسے بدلنا ہے۔ یہ آج بھی اور ہر زمانے میں پریشانی رہی ہے کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن پاک کے احکام آخری ہیں اور قیامت تک ان کے اندر کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔ نبی کریم ﷺ کے صریح

ارشادات بھی غیر متبدل ہیں۔ یہ نصوص صریح ہیں۔ قرآن کی ہوں یا احادیث کی تو ان میں کوئی ردو بدل نہیں کرسکتا۔

احکام میں تبدیلی کی اتھارٹی

پچھلے دنوں ایک جگہ گفتگو ہو رہی تھی ایک صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب آج کی دنیا میں اگر آپ کوڑے مارنے کی بات کریں گے، ہاتھ کاٹنے کی بات کریں گے، سنگسار کرنے کی بات کریں گے، پاؤں کاٹنے کی بات کریں گے، آج کی مہذب دنیا میں یہ بات مشکل ہے۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو ردو بدل کرنا ہی پڑے گا۔

میں نے جواب دیا میں تیار ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں ایک مسئلہ تم حل کردو دوسرے میں میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ ہاتھ کاٹنے والی بات، پاؤں کاٹنے والی بات، کوڑے مارنے والی بات، سنگسار کرنے والی بات یا عورتوں کی آدھی شہادت والی بات، یہ کس نے کہی ہے؟ مولانا قاسم نانوتوی کا فتویٰ یا رشید احمد گنگوہیؒ کا فتویٰ ہے؟ یہ باتیں کہاں ہیں؟ قرآن میں ہیں۔ ہاتھ کاٹنے والی بات کہاں ہے؟ پاؤں کاٹنے والی بات کہاں ہے؟ کوڑے مارنے والی بات کہاں ہے؟ آدھی شہادت اور طلاق کی گرہ کس کے ہاتھ میں ہے؟ یہ مسئلے کہاں ہیں؟

اگر ان میں ردو بدل کریں گے تو کہاں کرنا پڑے گا؟ قرآن کریم میں۔

میں نے کہا یار تم ایک کام کردو۔ بتا دو کہ کونسے دفتر میں درخواست دیں تو اس دفتر کو اختیار ہے کہ یہ کام کردے گا۔ آئین میں ترمیم کرنی ہو تو کہاں درخواست دیتے ہیں؟ پارلیمنٹ میں۔

صوبے کے قانون میں تبدیلی کرنی ہو تو کہاں درخواست دیں گے؟ صوبائی اسمبلی میں کیونکہ اس کی وہی اتھارٹی ہے میں نے کہا اتھارٹی تم بتا دو درخواست کہاں دینی ہے۔ اقوام متحدہ کو دینی ہے؟ O.I.C کو دینی ہے؟ جدہ سیکرٹریٹ کو دینی ہے؟ سپریم کورٹ کو دینی ہے؟ ہائی کورٹ کو دینی ہے؟ کس کو دینی ہے؟ آخر کہیں پتہ چلے کہ درخواست فلاں دفتر میں دینی ہے۔

یہ دفتر تم بتا دو درخواست پر میں تمہارے ساتھ دستخط کرونگا۔ کیوں جی کوئی اتھارٹی ہے؟

اس اتھارٹی کی تلاش میں دنیا پاگل ہوگئی ہے کہ کوئی اتھارٹی ایسی ہو کہ قرآن پاک میں ردو بدل کروے۔آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے۔

یہ اتھارٹی کس کے پاس ہے؟ اگر اللہ کے بعد کسی کے پاس ہوتی تو کس کے پاس ہوتی ؟ اس کا حقدار کون تھا؟ حضور اکرم ﷺ۔اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں جناب نبی کریم ﷺ سے اس کا دوٹوک انداز میں صاف اعلان کروا دیا۔کوئی ابہام نہیں چھوڑا۔ کفار نے مطالبہ کیا تھا۔" ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ ہٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡہُ" (یونس ۱۰:۱۵) مطالبہ کیا تھا یا قرآن کوئی اور لے آئیں یا اس میں تبدیلی کر دیں۔اس کا جواب کیا دیا؟" قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ" (یونس ۱۰:۱۵) فرمایا کہہ دیجیے کہ مجھے سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں کہ قرآن حکیم کے کسی حکم میں کوئی ردو بدل کرسکوں اس لیے اگر رسول اللہ ﷺ کو اس کا اختیار نہیں تو پھر قیامت تک کوئی مائی کالال قرآن کریم میں ردو بدل نہیں کر سکتا۔

جھوٹی نبوتوں کا اصل مقصد

میں نے یہ بات درمیان میں اس لیے عرض کی ہے کہ نئی نبوتوں کا ڈھونگ رچانے کے پیچھے جو فلسفہ ہے وہ آپ کو سمجھ آئے کہ نئی نبوتیں آخر استعماری لوگ کیوں کھڑی کرتے ہیں کہ کوئی اتھارٹی ایسی پیدا کی جائے جو کہہ سکے کہ میں نے فلاں حکم منسوخ کر دیا ہے اور فلاں حکم منسوخ کردیا ہے۔یہ منسوخ کرنے کی اتھارٹی پیش کرنے کے لیے ان نبوتوں کے کھڑاگ رچائے جاتے ہیں۔محمد علی باب بھی یہی تھا۔بہاؤ اللہ شیرازی بھی یہی تھا۔محمد مہدی اٹکی بھی یہی تھا اور مرزا غلام احمد قادیانی بھی یہی تھا۔مرزا قادیانی کو انگریزوں نے کھڑا کیا اس کے پس منظر میں میں نے نئی نبوتوں کے قیام کا فلسفہ سمجھایا، لیکن جس نے قرآن پاک کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہے کیا وہ ان ہتھکنڈوں کو نہیں جانتا؟ جانتا ہے اس کو پتہ ہے کون کیا کر رہا ہے۔نہ آج تک کبھی کسی کا ہتھکنڈا چلا ہے نہ قیامت تک چلے گا۔مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا کھڑاگ کیوں رچایا؟ جہاد کی منسوخی کے لیے۔

وہ کہتا ہے کہ میری نبوت کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو بتاؤ کہ جہاد منسوخ ہوگیا ہے لیکن مرزا غلام احمد کے کہنے سے منسوخ نہیں ہوا ہے اور نہ ہی آج کسی کے کہنے سے منسوخی کا حکم جاری

ہوگا۔ کوئی نبوت کے نام پہ کہے یا اور کسی اور نام سے، نہ پہلے کبھی منسوخ ہوا ہے نہ اب ہورہا ہے۔ حکم تو رہے گا۔ بہرحال قادیانی گروہ کو کھڑا کیا گیا۔ علماء کرام نے لڑائی لڑی۔ میں اس کی تفصیلات کو اس لیے چھوڑتا ہوں کہ اس کی بہت سی باتیں آپ کو معلوم ہیں۔ بہت سی باتوں سے آپ واقف ہیں اور اس کی بہت سی باتیں آپ کو ملتی رہتی ہیں۔

امریکی نبی ایلیج محمد

میں ایک اور گروہ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں اس کے بعد پھر ایک اور صاحب پیدا ہوگئے۔ یہ تاریخ کے اعتبار سے سب سے مؤخر گروہ ہے۔ یہ فتنہ گزشتہ یعنی بیسویں صدی کا ہے۔ اس کا تھوڑا سا پس منظر عرض کروں گا کیونکہ یہ امریکی نبی ہے اور امریکہ کے ساتھ ہماری ''دوستی'' بھی ہے۔ اس لیے ذرا دلچسپی سے بات کرونگا۔ امریکہ آج کل جمہوریت کا اور انسانی حقوق کا بہت بڑا ٹھیکیدار ہے اور بڑا نمبردار ہے۔ آج سے صرف ایک صدی پہلے تک اس نمبردار کا حال یہ تھا کہ دنیا جہاں سے آزاد لوگ غلام بنا کر لائے جاتے تھے، بیچے خریدے جاتے تھے۔ انسانوں کا کاروبار ہوتا تھا اور آج سے ایک صدی پہلے کا قصہ ہے کہ امریکہ میں یہ جو کالے بیچارے ہیں (امریکہ میں کالوں کی بڑی تعداد ہے) یہ افریقہ سے جہاز بھر بھر کر لائے جاتے تھے۔ لا کر انہیں بیچ دیتے تھے اور جانوروں کی طرح ان سے کام لیتے تھے۔ کالوں کے محلے الگ تھے۔ گوروں کے محلے الگ تھے۔ گوروں کے ہسپتال الگ تھے، کالوں کے ہسپتال الگ تھے۔ یہ کالے بیچارے تین صدیاں ان گوروں کے مظالم کا شکار رہے۔ ایک لمبی داستان ہے۔ اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

لیکن اس کے ردعمل میں کالوں میں تحریکیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں ایک تحریک تھی ''نیشن آف اسلام'' (Nation of Islam)۔ یہ چونکہ اسلام کے نام سے تھی اس لیے اس کا تعارف کرا رہا ہوں۔ ایک صاحب نوبیل ڈریو علی ۱۹۱۳ء میں نیویارک گئے۔ ایک نیویارک ہے اور ایک نیوارک ارگ ہے۔ یہ نیویارک سے تھوڑے سے فاصلے پر ہے، زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں کھڑے ہوئے اس نے اپنے آپ کو مسلمان شو کیا۔

اس نے کہا کہ مجھے کالوں کی اصلاح اور کالوں کو منظم کرنے کے لیے ان کی آزادی کے

لیے، ان کے حقوق کے لیے، اللہ پاک نے بھیجا ہے۔ The Holy Quran کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ زیادہ تر اس میں سیاسی باتیں تھی۔ وہاں نیوارگ میں اس نے ایک مرکز بنایا۔ ۱۹۲۹ء میں اس کی وفات ہوئی۔

خیر یہ آغاز تھا۔ امریکہ کا ایک بڑا شہر ڈیٹرائیٹ ہے۔ وہاں ایک صاحب حجاز کے علاقے سے گئے۔ فرد محمد اس کا نام تھا ''ویلس دی فارڈ'' کے نام سے مشہور تھا، اور کالا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ڈیٹرائیٹ میں اس نے کہا کہ میں مکہ سے آیا ہوں اور کالوں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے۔ کالے سارے نسلاً مسلمان ہیں۔ کالے امریکہ میں سیاہ فام کہلاتے ہیں۔ ان کو زبردستی عیسائی بنایا گیا ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے میں آیا ہوں۔ ان کو منظم کرنے کے لیے ٹیمپل آف اسلام کے نام سے ایک عبادت گاہ بنائی۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسہ بنایا اور کالج بنایا۔ وہاں وہ یہ کہتا تھا کہ تم نسلاً مسلمان ہو۔ زبردستی انہوں نے تمہیں عیسائی بنایا ہے۔ اپنے اسلام کی طرف واپس لوٹو۔ اس نے ایک تحریک شروع کی اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا تھا کہ مجھے وحی آئی ہے اور مجھے اللہ کی طرف سے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ میں لوگوں کو منظم کرنے آیا ہوں۔ گوروں کے خلاف تحریک چلانے آیا ہوں اور کالوں کو منظم کر کے اس قسم کی ملی جلی سیاسی و مذہبی باتیں کرتا تھا۔ ان کو ایک صاحب معاون مل گئے۔ ایلیج محمد ایک پادری کا بیٹا تھا۔ اس کے ہاتھ مسلمان ہوا۔ جیسا بھی اس کا اسلام تھا اردو ترجمہ کرنے والے اسے علیجا محمد لکھتے ہیں۔ یہ عالی جاہ نہیں ہے۔ یہ الیاس کا انگلش تلفظ ہے اس علاقے کا۔ بعض علاقوں کے تلفظ اپنے ہوتے ہیں جیسے یوسف کو انگریزی میں جوزف کہتے ہیں عربی میں آئے تو کیا ہوتا ہے۔ یوسف۔ اسی طرح عربی میں ہو یعقوب اور انگلش میں ہو تو کیا ہوگا۔ جیکب ہو جاتا ہے۔ اردو میں آدم ہو تو انگریزی میں ایڈم بہرحال ایلیج تلفظ ہے الیاس کا۔ امریکی انگلش میں یہ الیاس ہے۔ یہ پادری کا بیٹا تھا۔ اس کا پہلے نام ایلیج پول تھا۔ فرد محمد کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اس نے الیاس محمد نام رکھا۔ پول کی بجائے محمد نام رکھا۔ مسلمان ہونے کے بعد تین سال تک استاد کے پاس رہا۔ تین سال بعد فرد صاحب غائب ہو گئے۔ پتہ نہیں ہوئے یا غائب کیے گئے۔ بہرحال ہو گئے۔ ۱۹۳۴ء کے بعد مسٹر فرد محمد کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ان کے عقائد میں یہ ہے کہ فارد محمد اصل میں خدا تھا جو اس شکل میں آیا اور تین سال کے بعد ایلیج محمد کو

جانشین بنا کر واپس چلا گیا۔ اس کا جانشین ایلیج محمد بنا اور کہا کہ میں جانشین ہوں۔

امریکی نبی کی تعلیمات

اس نے دنیا کو تصور دیا کہ ماسٹر فارد محمد اصل میں خدا تھا اور اللہ تعالیٰ انسانی شکل میں آیا تھا۔ ہمیں راستہ دکھانے کے لیے وہ ہمارے درمیان چار سال رہا اور پھر مجھے اپنا جانشین بنا کے واپس چلا گیا۔ یہ ان کا عقیدہ ہے۔ اس نے کہا کہ اب میں ہوں جو کچھ ہوں۔ اس نے دعویٰ کیا مجھ پر وحی آتی ہے اور میں اللہ کا نمائندہ ہوں اور دنیا کی نجات میری پیروی پر منحصر ہوگی۔ قرآن کی منسوخی کا اعلان نہیں کیا لیکن یہ اعلان کیا کہ قرآن کی جو تشریح میں کرونگا وہی معتبر ہوگی۔

اس نے ''محمد بولتا ہے'' کے عنوان سے پرچہ نکالا اور اسلام کی تبلیغ پر امریکہ میں تحریک شروع کی۔ اصلاً یہ تحریک گوروں کے خلاف ردعمل کی تھی۔ گوروں کے صدیوں کے مظالم کے خلاف ردعمل کا اظہار تھا۔

چنانچہ ان کے ابتدائی عقائد یہ ہیں جو باقاعدہ کتابوں میں ہیں کہ گورے سارے شیطان کی نسل ہیں۔ میں نے ان کی عربی کتاب میں پڑھا ہے کہ آدم کان اسود، نوح کان اسود، ابراہیم کان اسود، عیسیٰ کان اسود، محمد کان اسود یہ سارے کالے ہیں، گورے شیطان کی نسل ہیں۔ میں نے جب پڑھا تو بڑا ہنسا۔ میں نے کہا کہ سیاسی گالی کے طور پر تو شاید میں بھی گوروں کو شیطان کی نسل کہہ دوں کیونکہ انہوں نے ہمیں بھی بڑا تنگ کیا ہے لیکن عقیدے کے طور پر نہیں مگر ان کا عقیدہ ہے کہ گورے شیطان کی نسل ہیں اور کالے کیا ہیں؟ آدم کی نسل سے ہیں۔ ابتدا میں ان کا مذہب تھا کہ ہر سفید چیز حرام ہے۔ مچھلی حرام ہے، انڈا حرام ہے، سفید کپڑا حرام ہے۔

اس تحریک نے اس قدر تقویت پکڑی کہ ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک ایلیج محمد نے امریکہ میں کالوں کے ایک بڑے حصے پر عملاً حکومت کی۔

امریکہ کے سیاہ فاموں میں سب سے منظم تحریک اس کی ہے اور اسلام کے نام پر ہے۔ اس عقیدے کے نام پر کہ ماسٹر فارد محمد خدا تھا آیا تھا۔ مجھے اپنا نمائندہ بنا کر چلا گیا

ہے اب دنیا کا نجات دہندہ میں ہوں۔میری تعلیمات پر دنیا کی نجات ہوگی۔ایک بات عقیدے کی ان کی اور بھی بتا دوں۔کہتے ہیں کہ قیامت کا تصور یہ نہیں کہ مرنے کے بعد کوئی نئی زندگی ہوگی اور سزا و جزا ہوگی۔سزا و جزا، قیامت، جہنم، جنت کا تصور یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام بدلنے والا ہے۔گوروں کی حکومت کا دور ختم ہوگا اور کالوں کی حکومت کا دور شروع ہونے والا ہے اور وہ شروع ہوگا۔تو کالے دنیا میں جنتی ہوں گے اور ان گوروں کو جہنم میں بھیجیں گے اور وہی ان کی جزا و سزا ہوگی...... اور یہ ان کی جہنم ہوگی اور ہماری جنت ہوگی یہ گوروں کے مظالم کا ری ایکشن تھا کہ بڑے بڑے لوگ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں۔

ڈھول کا پول کھل گیا

محمد علی کلے کا نام سنا ہے۔دنیا کا عالمی مکے باز پہلے اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔امام سراج وہاج نیویارک میں سیاہ فام مسلمانوں کے بڑے امام ہیں۔وہ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔لوئس فرحان جو اس وقت نیشن آف اسلام کا بڑا لیڈر رہے، یہ اور بڑے بڑے لوگ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور اس والا اسلام لائے۔اس کا ایک بہت بڑا قریبی ساتھی تھا مالکم ایکس۔اس کا سب سے پہلے پول مالکم ایکس نے ہی کھولا ہے۔۱۹۵۷ء میں وہ اس کا ساتھی بنا بڑا پرجوش مبلغ تھا...... اس کا منسٹر کہلاتا تھا اور بڑا اورکر آدمی تھا۔مالکم ایکس کو ۱۹۵۷ء میں سب سے پہلے یہ شک ہوا کہ یار کوئی گڑ بڑ ہے اور شک کب ہوا...... اتفاقاً وہ کہیں دنیا کے دورے پر نکلا اور حج کے موقع پر مکہ چلا گیا۔خود اس کی سوانح اور یادداشتیں چھپ چکی ہیں۔ عربی میں بھی انگلش میں بھی، اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ شک ہوا کہ جب میں مکہ مکرمہ گیا تو وہاں دیکھا کہ بیت اللہ کا طواف کالے بھی کر رہے ہیں اور گورے بھی کر رہے ہیں۔میرے ذہن میں آیا کہ یہ گورے یہاں کیا کر رہے ہیں...... یہ ترک گورے اور لبنانی گورے ہیں...... وہاں تو گورے بہت آتے ہیں کہ ان کے عقیدے میں کالے آدم کی اولاد ہیں اور سفید شیطان کی نسل سے ہیں۔ہم ایشیائی نہ کالے ہیں نہ گورے ہیں۔پتہ نہیں کہ ہمارے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟

مالکم ایکس کہتا ہے کہ جب میں ۱۹۵۷ء میں حج پر گیا تو مجھے یہ منظر دیکھ کر شک پیدا ہوا اپنے عقیدے پر کہ اگر گورے سارے کے سارے شیطان کی نسل ہیں تو یہاں بیت اللہ کے طواف میں اور یہاں مسجد نبوی اور مسجد حرام میں تو بے شمار گورے ہیں یہ کیا کر رہے ہیں...... شیطان کی نسل بیت اللہ میں عبادت کیسے کر رہی ہے؟ یہاں سے میرے ذہن میں شک پیدا ہوا۔ پھر میں نے علماء سے پوچھا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ تو سارا ہی ڈرامہ ہے۔ اب مجھے پتہ چل گیا کہ اصل اسلام کیا ہے اور یہ ایلیج محمد والا اسلام کیا ہے۔ یہ جب یہاں سے دو تین مہینے بعد واپس گیا تو صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ یہ شافعی مذہب اور اہلسنت پر پکا ہو کر گیا۔ واپس اس نے نیویارک میں جا کر اعلان کر دیا کہ ایلیج محمد جھوٹا ہے اصل اسلام وہ ہے جو مکہ والوں کا ہے۔ یہ سب فراڈ ہے اور یہ جھوٹ بولتا ہے، اس سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔

اس بغاوت میں محمد علی کلے بھی اس کے ساتھ تھا محمد علی کلے اب صحیح العقیدہ شافعی المذہب مسلمان ہے۔ امام سراج وہاج اس کے ساتھ آیا۔ امام سراج ہمارے دوست ہیں، نیویارک میں سیاہ فام مسلمانوں کے امام ہیں، وہ بھی اس کے ساتھ آیا اور بہت سے لوگ جن کو یہ پتہ چلا وہ ایلیج محمد سے باغی ہو گئے۔ وہاں نیویارک میں مین ہٹن کے علاقے میں جہاں یہ آنجہانی ورلڈ ٹریڈ سنٹر تھا، اسی میں اس کا مرکز ہے۔ "مالکم شہباز شہید مسجد" کے نام سے اس نے صحیح العقیدہ مسلمانوں کا مرکز بنایا۔ مسجد بنائی اور اہلسنت کے عقائد کا پرچار شروع کیا یہ مرکز میں نے دیکھا ہے لیکن صرف ایک سال بعد ۱۹۵۸ء میں ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اس کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ اس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا لیکن امریکہ کے مسلمانوں کو صحیح بات بتا دی۔ اللہ پاک اس کے درجات بلند سے بلند فرمائے۔ آمین

میں سمجھتا ہوں کہ اس نے بڑی قربانی دی اور اس نے ایک راستہ بتا دیا عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ ایلیج محمد نے مروایا ہے۔ اس کی بغاوت اس کے خلاف تھی، اس کے خلاف کھڑا ہوا تھا لیکن بہرحال شہید کر دیا گیا...... لیکن راستہ کھل گیا...... اب جو لوگ سمجھدار تھے انہوں نے راستے تلاش کیے اور ایک طرف ہوتے گئے۔ ۱۹۷۰ میں ایلیج محمد مرا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ایک تبدیلی اور آئی۔ اس کا بیٹا ولیس دین محمد جو اس کا جانشین

بھی تھا۔ اللہ پاک نے اسے توفیق دی، باپ کے مرنے کے بعد اس نے بھی باپ کے عقائد سے توبہ کا اعلان کردیا۔ اب وہ اہلسنت والجماعت شافعی مذہب ہے۔ میری اس سے ملاقات ہوئی ہے۔

لوئس فرحان کی چالبازی

لوئس فرحان اب امریکہ میں سیاہ فام مسلمانوں کا سب سے بڑا لیڈر سمجھا جاتا ہے، اس نے دعویٰ کرکے مرکز پر قبضہ کرلیا اور ایلیج محمد کے بیٹے کو مرکز سے نکلوادیا۔ عدالت میں جاکر مرکز پر قبضہ کرلیا، کہا کہ میں اس کا جانشین ہوں اور ہمارا دین باقی ہے، مذہب باقی ہے اور اب تک باقی ہے۔ اب ان کا پرچہ نکلتا ہے ''The Final Call'' دی فائنل کال اس میں ایک پورا صفحہ عقائد کا ہوتا ہے، اس میں چوتھے نمبر پر عقیدہ درج ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ ''ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ ماسٹر فارد محمد جو ۱۹۳۰ء میں ڈیٹرائیٹ ظاہر ہوئے تھے، اصل میں اللہ تبارک وتعالیٰ تھے جو انسانی شکل میں آئے تھے اور ہماری تربیت کرکے واپس عرش پر چلے گئے، یہ وہی موسیٰ ہے جس کا یہودیوں کو انتظار تھا، اور یہ وہی عیسیٰ ہے کہ جس کا عیسائیوں کو انتظار تھا، اور وہی مہدی ہے کہ جس کا مسلمانوں کو انتظار تھا''، تینوں قومیں انتظار کررہی ہیں۔ یہودی موسیٰ کا اور عیسائی عیسیٰ کا اور ہم عیسیٰ اور مہدی دونوں کا انتظار کررہے ہیں۔ یہ عقیدہ ان کا لکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ عقائد بھی درج ہیں۔ جنت دوزخ قیامت کا تصور حکومت کی شکل میں پیش کرتے ہیں...... اور بھی بہت سے عقائد خلط ملط ہیں، جواب بھی چھپتے ہیں۔ اس حوالہ سے آخر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ لوئس فرحان اتنا ہوشیار آدمی ہے کہ دنیا کی بہت سی مسلمان حکومتوں سے اس نام پر پیسے بٹورتا ہے کہ میں امریکہ میں اسلام کی خدمت کررہا ہوں۔

آپ اندازہ کرسکیں گے کہ سن ۱۹۹۰ء میں آج سے کوئی پندرہ سال پہلے جب میں شکاگو گیا۔ وہاں ہمارے مسلمانوں کی تنظیمیں ہیں۔ ایک مسلمانوں کا مرکز مسلم کمیونٹی سنٹر ہے، وہاں چنیوٹ کے ہمارے دوست ریاض وڑائچ صاحب اور دوسرے حضرات بھی ہیں، وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ کمیونٹی سنٹر میں میرا ایک بیان ہوا، بعد میں مل کے بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا

کہ مولوی صاحب! خدا کے لیے ہمارے ساتھ کچھ تعاون کرو۔ اس نے (لوئس فرحان نے) نیشن آف اسلام کی ان دنوں تازہ تازہ شکاگو میں کانفرنس کی تھی۔ کانفرنس کے مہمان خصوصی امام کعبہ تھے۔ اب ان کی چالبازی کا اندازہ کیجیے کہ وہ تو بیچارے اس لیے گئے کہ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم سعودی عرب سفارت کار سے چیخ چیخ کر مر گئے کہ خدا کے لیے سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو؟ اتفاق سے مجھے واپس عمرہ کرتے ہوئے آنا تھا۔

عالم اسلام سے اپیل

انہوں نے مجھے فائل دی، اس میں با قاعدہ کانفرنس کی تصویریں تھیں۔ شیخ حذیفی اس کے گلے لگ رہے ہیں، اس میں شیخ حذیفی مہمان خصوصی ہیں، لوئس فرحان تقریر کر رہا ہے۔ سن ۱۹۹۰ء کی ہی بات ہے کہ جب میں مکہ مکرمہ میں آیا۔ حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی صاحب اور ایک دو اور علماء کو ساتھ لیا۔ ہم رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل صاحب سے ملے اس وقت رابطہ کے سیکرٹری ڈاکٹر عبداللہ نصیف تھے انہوں نے ہماری بات سنی اور فائل وصول کی۔ اس کے بعد الحمد للہ رابطہ نے ان کے ساتھ تعلق توڑ دیا۔ لیکن اس کے بعد لوئس فرحان نے دوسرے ملکوں سے بڑے پیسے لیے، عراق سے بڑے پیسے لیے، ایرانیوں سے بڑے پیسے لیے اور قذافی تو اب تک دے رہا ہے۔ وہی فائل مکمل کی مکمل میں نے لیبیا کی حکومت کو بھجوائی۔ ان کے عقائد کے بارے میں پوری مکمل فائل تھی۔ لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گزشتہ سال ربیع الاول ۱۴۲۵ھ لیبیا میں جو قومی سطح پر سیرت کانفرنس ہوئی ہے جو حکومت کرواتی ہے، اس کا چیف گیسٹ لوئس فرحان تھا۔ چند سال قبل امریکہ میں ایک بہت بڑی ریلی نکلی تھی، واشنگٹن میں ملین مارچ ہوا، وہیں سے ملین مارچ کی اصطلاح بھی چلی ہے۔ مسلمانوں نے اس میں بھرپور شرکت کی اس کا انتظام لوئس فرحان نے کیا تھا...... ہمارے مسلمان بھی اس مغالطے میں ہیں۔ بہرحال یہ مسلمان کہلاتے ہیں لیکن امریکہ کے قادیانی ہیں، اس لیے میں نے اس کا تعارف کرانا آپ کو ضروری سمجھا ہے۔ آج کے دور میں نبوت کے نام پر ختم نبوت کے انکار پر جو گروہ مذہبی میدان میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں چار

گروہوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ذکری، بہائی، قادیانی، نیشن آف اسلام۔

پانچواں سوار

اب ایک پانچویں سوار کا تھوڑا سا ذکر کرتے ہیں۔ پانچویں سوار کا محاورہ آپ نے سنا ہوگا کہ یہ پانچواں سوار ہے۔ اس بارے میں لطیفہ یہ ہے کہ چار آدمی گھوڑوں پر سوار دہلی جارہے تھے۔ پرانے زمانے میں گھوڑا بڑی سواری ہوتی تھی۔ کوئی اور مسافر بیچارہ لنگڑی گدھی پر سوار تھا اور وہ بھی دہلی جا رہا تھا۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ سوار کہاں جا رہے ہیں؟ یہ تو بولے نہیں وہ پیچھے والا بولا کہ ہم پانچوں سوار دہلی جا رہے ہیں، یہ بھی ایک پانچواں سوار تھا۔ خلیفہ ارشاد یہ صاحب مصری تھے، امریکہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے پہلے انیس کے عدد کا کھڑاگ رچایا۔ پھر آہستہ آہستہ نبوت کا دعویٰ کیا۔ ۱۹۸۹ء میں نبوت کا دعویٰ کیا اور اچھا خاصا گروہ اکٹھا کرلیا۔ لیکن یہ ایک سال ہی نبوت کرسکا۔ ۱۹۹۰ء میں رات کو کسی مرید نے اس کا کام صاف کردیا۔ لیکن سنا ہے کہ ایک خاتون اس کی جانشین ہے اور وہاں ایک چھوٹا سا گروہ اسکے عقائد پر کام کررہا ہے۔ آج کے دور میں جو لوگ نبوت کے نام پر کام کررہے ہیں، نبوت کے انکار کے حوالے سے ان میں سے چار ساڑھے چار یا سوا چار کا تعارف میں نے آپ سے کرا دیا ہے۔ ہلکا پھلکا تعارف یہ بتانے کے لیے کہ آج کون کون اس پر کام کررہے ہیں۔ یہ گفتگو میں یہیں سمیٹتا ہوں۔ عصر کی نماز کے بعد یہیں دوبارہ ایک آدھ گھنٹہ بات ہوگی۔ وہ میں بات کرنا چاہوں گا قادیانیوں کے حوالے سے لیکن مذہبی حوالے سے نہیں بلکہ اس حوالے سے کہ قادیانی دنیا میں کس انداز سے کام کررہے ہیں، ان کا طریقہ واردات کیا ہے اور ہمیں اس کے بارے میں کیا کرنا چاہیے۔

دوسری نشست سے خطاب

میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ قادیانیوں کے حوالے سے آپ وقتاً فوقتاً معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب نے آپ کو بہت سی باتیں بتائی ہوں گی اور ان کے بارے میں معلومات کے امکانات خاصے موجود ہیں، اس لیے میں نے ان کے بارے میں تفصیل سے بات نہیں کی بلکہ میں نے صرف سرسری تذکرہ کیا ہے۔

لیکن ایک بات میں آپ کو اس حوالے سے ضرور کہتا ہوں تھوڑے سے وقت میں! اس وقت قادیانیوں کا اور ہمارا ایک تنازع عالمی فورم پر چل رہا ہے، اقوام متحدہ بھی اس کا فریق ہے، امریکہ بھی فریق ہے، ایمنسٹی انٹرنیشنل بھی فریق ہے اور قادیانی بھی فریق ہیں۔ قادیانیوں کا ایک مؤقف ہے، جس پر دنیا کے عالمی ادارے قادیانیوں کی حمایت کر رہے ہیں اور ہم پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ دباؤ دو باتوں کا ہے۔ سن ۱۹۷۴ء میں ہماری قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو دستوری طور پر غیر مسلم قرار دیا تھا، یہ آپ کے علم میں ہے۔ ۱۹۸۴ء میں جنرل ضیاء الحق مرحوم نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں پر پابندی لگادی تھی کہ وہ اسلام کا نام استعمال نہیں کر سکتے۔ اسے امتناع قادیانیت کا آرڈیننس کہتے ہیں، یہ اسلام کی اصطلاحات استعمال نہیں کر سکتے۔ جو ہمارے مخصوص شعائر ہیں مسجد، کلمہ، ام المومنین، امیر المومنین وغیرہ یہ ہماری اصطلاحات ہیں۔ وہ یہ استعمال نہیں کر سکتے۔

یہ دو فیصلے ایک دستوری فیصلہ ہے کہ ہمارے ہاں پاکستان میں کہ قادیانی مسلمان تصور نہیں ہوں گے، بلکہ اقلیتوں میں شمار ہوں گے اور ایک قانونی فیصلہ کہ قادیانی اگر اسلام کا نام استعمال کریں گے، اسلام کی مخصوص اصطلاحات استعمال کریں گے، شعائر اسلام استعمال کریں گے تو یہ قابل تعزیر جرم ہوگا...... مقدمہ درج ہوگا...... گرفتار ہوں گے...... سزا ہوگی۔ یہ دو فیصلے ہمارے قومی فیصلے ہیں، ان فیصلوں کے خلاف قادیانی جماعت ایک کمپین کر رہی ہے جس میں امر واقع یہ ہے کہ دنیا کے عالمی ادارے قادیانیوں کی سپورٹ میں ہیں ہماری سپورٹ میں نہیں ہیں۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ قادیانیوں کا مؤقف کیا ہے، ہمارا مؤقف کیا ہے، جھگڑے کی بنیاد اور اساس کیا ہے؟ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے یا ان کے ساتھ؟

قادیانیوں کا مؤقف

قادیانیوں کا مؤقف یہ ہے کہ دنیا میں انسانی حقوق کے تحت مذہبی آزادی تسلیم شدہ ہے ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ کوئی مذہب اختیار کرے، مذہب کی تبلیغ کرے، اپنے مذہب کا پرچار کرے، اپنے مذہب کا کوئی نام رکھے تو کوئی دوسرا آدمی اس کے مذہب میں

مداخلت نہیں کرسکتا۔ یہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں ہے اور اسے غلط کہیں یا صحیح، وہ تو اپنی جگہ پر...... لیکن اس وقت بین الاقوامی قانون کا درجہ رکھتا ہے، اس کو مذہبی آزادی کا قانون کہتے ہیں کہ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے کہ جو چاہے مذہب اختیار کرے، جہاں چاہے تبلیغ کرے، جس کا بھی دل چاہے مذہب تبدیل کرے یا نہ کرے۔ دوسرے شخص کو بالخصوص حکومتوں کو کسی شخص کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر میں بھی ہے اور اس وقت دنیا کے مسلمات میں بھی یہ بات شامل ہے۔ قادیانیوں کا کہنا ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، اسلام پر یقین رکھتے ہیں، قرآن پر یقین رکھتے ہیں، حضرت محمد ﷺ پر یقین رکھتے ہیں بیت اللہ کو بیت اللہ مانتے ہیں، قبلے کو قبلہ مانتے ہیں، اور قیامت کو مانتے ہیں تو پھر ہمیں مسلمان کیوں نہیں کہا جاتا؟ آپ ایمان کی جو تفصیل بیان کرتے ہیں۔ ایمان مجمل میں بھی ہے اور ایمان مفصل بھی۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ یہ ایمان مفصل، کہتے ہیں کہ ساری باتیں ہم مانتے ہیں، پھر ہمیں کافر کیوں کہتے ہیں؟ آپ ہمیں مذہب کی تبلیغ کا حق کیوں نہیں دیتے؟ ہمیں اسلامی اصطلاحات استعمال کرنے سے کیوں روکتے ہو؟ ہماری مذہبی آزادی سلب کرلی گئی ہے، پاکستان میں ہم پر جبر ہو رہا ہے۔ پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے علماء مذہبی آزادی کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور ختم کر دیا ہے۔ انہیں اس بارے میں دنیا کی عالمی لابیوں کی حمایت حاصل ہے۔ آپ اس سے اندازہ کرلیں۔ اس سال ابھی چند مہینے پہلے امریکہ کی وزارت خارجہ نے جو رپورٹ جاری کی ہے۔ اس میں بھی ذکر ہے کہ احمدیوں کے خلاف ناانصافی اور ظلم کی صورتحال جوں کی توں ہے۔ اس جملہ کا مطلب آپ سمجھے ہیں؟ اس سال کی رپورٹ میں کہتے ہیں کہ صورتحال جوں کی توں ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل بھی یہی کہتی ہے، اقوام متحدہ کی رپورٹوں میں بھی یہی ہوتا ہے اور بھی بہت سے حوالوں سے ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا مؤقف

اس پر ایک یہودی جرنلسٹ سے پندرہ سولہ سال پہلے ایک مکالمہ ہوا تھا۔ وہ مکالمہ اگر میں سنادوں تو کچھ تھوڑی سی بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔ ان شاء اللہ!

میرے ایک دوست ہیں نیویارک میں، انہوں نے میری ایک یہودی جرنلسٹ سے ملاقات کرادی۔ (درمیان میں ترجمان بھی وہی تھا) اس نے کہا کہ آپ قادیانیوں پر ظلم کیوں کرتے ہیں؟ میں نے کہا جی کیا ظلم کرتے ہیں؟ اس نے کہا کہ جب قادیانی خود کو مسلمان کہتے ہیں تو آپ ان کو مسلمان تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن کو مانتے ہیں، حضرت محمد ﷺ کو بھی مانتے ہیں تو تم انہیں مسلمان کیوں نہیں کہتے۔ تم ان پر زیادتی وظلم کرتے ہو۔ ان کی حق تلفی کرتے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ بات سنو۔ وہ غیر مسلم تھا اس سے تو میں نے مرزا کی کتابوں سے دلائل نہیں دینے تھے بلکہ "کامن سینس" (Common sence) میں بات کرنی تھی۔ میں نے اس سے یہ کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہودی ہو؟ کہنے لگا کہ ہاں۔ موسیٰ علیہ اسلام کو مانتے ہیں؟ کہا مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تورات کو؟ کہنے لگا کہ مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کوئی عیسائی یہ کہے کہ میں یہودی ہوں مان لوگے؟ کہنے لگا کہ نہیں۔ عیسائی موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، تورات کو بھی مانتے ہیں، اگر کوئی عیسائی کھڑا ہو کر یہ کہہ دے کہ میں موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں (اس کی زبان میں بات کررہا ہوں) موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں تورات کو مانتا ہوں اس لیے میں یہودی ہوں۔ تم کسی عیسائی کا یہ دعویٰ تسلیم کرلو گے؟ کہتا ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور تورات کو ماننے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو بھی مانتا ہے۔ اس لیے اس کا مذہب الگ ہے۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں موسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتا ہوں تورات کو بھی مانتا ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتا ہوں، انجیل کو بھی مانتا ہوں، میں اگر دعویٰ کروں (خدا نہ کرے) کہ یہودی ہوں تو مان لوگے؟ کہتا ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا وجہ؟ اس نے کہا کہ آپ موسیٰ علیہ السلام اور تورات کے بعد اور بھی کچھ مانتے ہو۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور تورات کو ماننا یہودی ہونے کے لیے کافی نہیں

ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کے بعد کسی اور کو بھی مانتا ہے تو وہ یہودی نہیں ہے۔ عیسائی اور مسیحی کہلانے کے لیے صرف انجیل کو ماننا کافی نہیں ہے، اگر اس کے بعد کسی اور کو بھی مانتا ہے تو وہ مسیحی نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے قرآن کو ماننا اور محمد ﷺ کو ماننا کافی نہیں ہے۔ اگر اس کے بعد کسی اور کو بھی مانتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بات سمجھے ہیں؟ کہنے لگا کہ جی ہاں لیکن وہ کس کو مانتے ہیں؟ میں نے کہا کہ مرزا غلام احمد کو مانتے ہیں، نبی بھی مانتے ہیں، اس کی وحی بھی مانتے ہیں۔ ان کی وحی چھپی ہوئی ہے تذکرہ کے نام سے ہے اور اس کی وحی ایسی معجون مرکب ہے کہ انگریزی میں بھی ہے، پنجابی میں بھی ہے، عربی میں بھی ہے، اردو میں بھی ہے پتہ نہیں کہ کس کس زبان میں ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اصول قائم ہوگیا کہ صرف موسیٰ علیہ السلام اور تورات کو ماننے والا یہودی نہیں۔ یہودی وہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور تورات کو مانے اور اس کے بعد کسی اور کو نہ مانے۔ اسی طرح مسلمان وہ ہے کہ محمد ﷺ اور قرآن کو مانے اور اس کے بعد کسی کو نہ مانے۔ میں نے کہا کہ جس دلیل سے تم مجھے یہودی ماننے کے لیے تیار نہیں ہو اسی دلیل سے میں قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانتا۔ کہنے لگا کہ اب بات سمجھ آ گئی ہے۔

’’ٹریڈ مارک‘‘ کا استعمال

میں نے کہا اگلی بات؟ کہنے لگا کہ تم قادیانیوں کے ہیومن رائٹس کیوں غصب کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ بات سنو! ایک فرم ہے ایک کمپنی ہے، سو سال سے ایک نام پر کام کر رہی ہے۔ اس کا ایک نام ہے ایک ساکھ ہے مارکیٹ میں اس کا ٹریڈ مارک ہے۔ کاروبار دو ہی حوالوں سے ہوتا ہے، نام سے اور ٹریڈ مارک سے۔ ٹریڈ مارک سمجھتے ہیں؟ ایک نشان ہوتا ہے جو خاص پہچان ہوتی ہے کہ یہ شیر مارکہ ہے یہ گائے مارکہ ہے، ٹریڈ مارک دیکھ کر لوگ چیز خریدتے ہیں کہ یہ فلاں کمپنی کی ہے وہ تفصیل میں نہیں جاتے۔ ایک کمپنی ہے سو سال سے ایک نام سے کام کر رہی ہے۔ اس کا ایک نام اور پہچان ہے، اس میں دو چار آدمی الگ ہو کر ایک نئی فرم بنا لیتے ہیں۔ تو کیا وہ پہلی والی فرم کا نام استعمال کر سکتے ہیں؟ کہنے لگا کہ نہیں۔

میں نے پوچھا کہ ٹریڈ مارک؟ کہتا ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ اگر فرم نئی ہے نام پہلے کا استعمال کر رہے ہیں، کمپنی نئی ہے اور ٹریڈ مارک پہلے کا استعمال کر رہے ہیں۔ کیا یہ ان کو حق ہے؟ کہتا ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ بتاؤ ایک کمپنی سو سال سے اس کے نام پر کام کر رہی ہے اور دوسری اب وجود میں آئی ہے، تو اس کے نام اور ٹریڈ مارک پر حق پہلی کا ہے کہ دوسری کا؟ کہنے لگا کہ پہلے نام پر پہلی کمپنی کا ہی حق ہے۔

میں نے کہا کہ اگر وہ استعمال کرے تو تم کیا کہو گے؟ کہنے لگا کہ یہ فراڈ ہے۔ میں نے کہا کہ یہی جھگڑا ہے فرم نئی ہے اسلام کا نام ہمارا ہے چودہ سو سال سے۔ ہماری عمر چودہ سو سال ہے ان کی عمر ایک سو سال ہے، اسلام کے نام پر ہمارا حق ہے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ نام بھی الگ رکھو۔ امیر المومنین، ام المومنین، مسجد، کلمہ یہ سب ہمارا ٹریڈ مارک ہیں دنیا میں جہاں کہیں گرجے کی عمارت پر نظر پڑے گی تو وہ کس کی سمجھی جائے گی؟ پوچھنے کی ضرورت پڑے گی؟ مندر کی شکل پر نظر پڑے تو وہ کس کی سمجھی جائے گی؟ گوردوارے کی شکل کی عمارت ہوگی تو وہ کس کی سمجھی جائے گی؟ اور اگر مسجد کی شکل کی عمارت ہو تو وہ کس کی سمجھی جائے گی؟

یہ ہمارا ٹریڈ مارک ہے، دور سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی عمارت ہے، ہمارا ٹریڈ مارک ہے امیر المومنین، ام المومنین، صحابی یہ ہمارا ٹریڈ مارک ہے، دور سے پہچانا جاتا ہے...... ہماری شناخت ہے...... ہمارا قادیانیوں سے مطالبہ ہے کہ اپنا ٹریڈ مارک الگ بناؤ، دو نمبر مال ہمارے نام سے کیوں بیچتے ہو...... اپنے نام پر بیچو۔ اپنا نام الگ رکھو...... میں نے کہا کہ بات سمجھ میں آئی؟ کہنے لگا کہ سمجھ میں آ گئی ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا ان سے مطالبہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ کہتا ہے کہ جو تم کہہ رہے ہو کہ وہ الگ نبی مانتے ہیں تو تمہارا مطالبہ جائز ہے کہ اپنا نام الگ رکھو اور اپنی شناخت الگ رکھو۔

ہماری شناخت پر حملہ

میں نے گزارش کی کہ اپنی شناخت کی حفاظت ہمارا حق ہے یا نہیں ہے؟ میری ایک پہچان ہے اس کی حفاظت میرا حق ہے یا نہیں؟ کوئی دوسرا آدمی میرے نام سے کام کر کے میری پہچان خراب کر سکتا ہے۔ اپنی شناخت کا تحفظ دنیا کے مسلمات میں میرا حق ہے۔

دنیا میں نام کے اور رجسٹریشن کے معاملات کیا ہیں؟ میرا ایک ادارہ ہے میرے نام کا دوسرا ادارہ نہیں ہونا چاہیے...... شناخت خراب ہوگی۔ وہ لطیفہ یاد ہوگا، بہت سوں کو یاد ہوگا بہت سوں کو یاد نہیں ہوگا۔ میں تو اس مرحلے سے گزر چکا ہوں۔

کچھ عرصہ پہلے ایک نوجوان جھنگ کا تھا۔ اس کا نام زاہد تھا، اس نے راشدی کہلوانا شروع کر دیا۔ اب میں زاہد الراشدی ہوں اور سن پیدائش ۶۷ھ کی ہے اور وہ راشدی ہے نوجوان ہے۔ چلو اتنا تو ٹھیک ہے لیکن اس نے اچانک پریس کانفرنس میں شیعہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اخبارات میں آیا کہ علامہ زاہد الراشدی شیعہ ہوگیا ہے، میں لندن میں تھا یہاں تھا ہی نہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ یہاں کہرام مچا ہوا ہے، ہمارے محلے کے نوجوانوں نے پروگرام بنالیا کہ مولوی صاحب کا سامان مسجد والے گھر سے اٹھا کر باہر پھینکتے ہیں۔ اب زاہد الرشدی کے نام سے میں متعارف ہوں شیعہ ہونے کا اعلان اس نے کیا، نقصان کس کا ہوا؟ میری شناخت مجروح ہوئی یا نہیں؟ مجھے وہاں کسی نے بتایا۔ میں نے کہا کہ خدا کے بندے میں تو یہاں بیٹھا ہوں، میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔

ایک لطیفے کی بات اور ہے کہ ایک نوجوان لاہور میں قرآن پاک حفظ کر رہا ہے اس کا نام بھی یہی ہے۔ اس نے بھی زاہد الراشدی کہلانا شروع کر دیا، دو تین سال پہلے کی بات ہے کہ میں ایک دن وہاں گیا۔ تو مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر کہنے لگے کہ آپ کو ایک مزے کی بات بتاتے ہیں۔ پھر اس لڑکے کو بلوایا اور پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ کہنے لگا کہ علامہ زاہد الراشدی۔ میں نے یوں ہاتھ باندھ لیے۔ میں نے کہا کہ ایک تو شیعہ ہوگیا ہے تمہارا کیا پروگرام ہے؟

ہمارا مؤقف

میں نے اسے (یہودی کو) کہا کہ اسلام ہمارا ہے، لہٰذا اس کی اصطلاحات ہم ہی استعمال کریں گے۔ اگر وہ استعمال کریں تو شناخت خراب ہوگی آپ دیکھ لیں کہ کس کی شناخت خراب ہو رہی ہے؟ ظلم ہم پر ہو رہا ہے یا ہم ظلم کر رہے ہیں؟ ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی ہماری ہو رہی ہے یا ان کی ہو رہی ہے؟ آپ کی سمجھ میں بھی مقدمہ آیا ہے یا نہیں؟

بھئی ہم تو سیدھے سادھے ہیں...... ہم کوئی جھگڑا نہیں کرتے کوئی تنازع نہیں کرتے، بلکہ ہم تو اپنے اصل مؤقف میں پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ میں نے آپ کو پہلی مجلس میں بتایا ہے کہ مسیلمہ کے بارے میں مسلمانوں کا فیصلہ کیا تھا، اسود عنسی کے بارے اور طلیحہ کے بارے فیصلہ کیا ہوا تھا؟ وہ تو بھاگ کے بچ گیا ورنہ؟ شکر ادا کرتا تھا کہ میں عکاشہ کے ہاتھوں جہنم میں نہیں گیا، عکاشہؓ کا داؤ چلتا تو کیا وہ بچتا؟ لیکن ہم نے یہ مؤقف اختیار نہیں کیا...... ہم نے تو علامہ اقبال کا مؤقف اختیار کیا ہے کہ زندہ رہنے کا حق دو، غیر مسلم اقلیت قرار دے دو اور ایک اقلیت کے طور پر رہنے دو، جیسے عیسائی رہتے ہیں یہ بھی رہیں۔ غیر مسلم اقلیت قرار دے دو دوسری اقلیتوں کے طور پر رہیں...... لیکن وہ تسلیم نہیں کر رہے...... ڈھیل دینے کا نقصان یہ ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ ہیومن رائٹس ہمارے متاثر ہو رہے ہیں یا ان کے ہو رہے ہیں۔ میں آپ کو یہ مقدمہ سنانا چاہتا تھا۔

آج دنیا میں اصل بات یہ بھی ہے کہ ہماری بات کی کوئی اہمیت اس لیے بھی نہیں ہے کہ وہ عالمی سطح پر صحیح انداز میں نہیں پیش کی جارہی اس کے ساتھ اور دوسرے مغربی ملکوں کا مفاد بھی ہے...... ہمارے خلاف جو بھی گروہ استعمال ہوا اس کو وہ استعمال کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ تو سرپرستی کرتے ہیں۔

آج کا محاذ جنگ

دوسری بات میں آپ کو یہ عرض کروں گا کہ قادیانیوں کا طریق کار کیا ہے؟ آج کا محاذ جنگ کیا ہے؟ اصل مورچے کہاں ہیں اور ان کا طریقہ جنگ کیا ہے؟

سن ۱۹۸۵ء میں جب ہم نے تحریک چلائی اور جنرل ضیاء الحق نے یہاں قادیانیوں کے خلاف امتناع قادیانیت آرڈیننس نافذ کیا اور ان کو اسلام کا نام استعمال کرنے سے روک دیا...... اسے جرم قرار دے دیا۔ تو قادیانی مرزا طاہر احمد یہاں سے فرار ہو کر لندن چلا گیا، لندن میں ہیڈ کوارٹر بنایا، اب اس نے یہ مقدمہ کیسے لڑا۔ وہ چلا گیا سیدھا جنیوا۔ جنیوا میں اقوام متحدہ کے تحت انسانی حقوق کا کمیشن ہے جو دنیا بھر کے حالات کی خبر رکھتا ہے، اگر کہیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہو اور وہاں درخواست دی جائے تو وہ انکوائری کرتا ہے۔

یہ سن ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء کی بات کر رہا ہوں، مرزا طاہر نے وہاں درخواست دے دی کہ جناب پاکستان میں ہمارے حقوق مجروح ہو رہے ہیں...... ہماری مذہبی آزادی سلب ہوگئی ہے......ہم پر زیادتی کی جارہی ہے...... گرفتار کیا جارہا ہے......مقدمے بنائے جارہے ہیں جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن انکوائری کرے۔

ہماری بے بسی

اسے ستم ظریفی سمجھئے کہ جب یہ درخواست جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن کے سامنے پیش ہوئی تو درخواست دہندہ کون تھا؟ مرزا طاہر احمد قادیانی۔ وہاں پاکستان کے سفیر ہیں جس ملک کے خلاف درخواست ہو تو ملک کی وکالت سفیر کرتا ہے۔ اس وقت پاکستان کا سفیر مسٹر منصور احمد جنیوا میں قادیانی تھا۔ اب درخواست کن کی ہے......اور صفائی کس نے دینی ہے اور اس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا؟

یہ ہے طریقہ واردات درخواست قادیانیوں کی اور جواب میں کس نے آنا ہے...... اس وقت اتفاق تھا یا اتفاق کرلیا گیا تھا، یا کوئی سازش تھی...... میں اس پر بات نہیں کرتا لیکن اس وقت جنیوا میں پاکستان کا سفیر مسٹر منصور احمد تھا۔ معروف پرانا ڈپلومیٹ قادیانی تھا۔ ہمیں یہاں پتہ چلا۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی اور میں اسلام آباد بھاگے...... حکام بالا سے کہا: خدا کے بندو یہ کیا ہو رہا ہے؟ درخواست تمہارے خلاف ہے اور ہماری نمائندگی قادیانی کر رہا ہے یہاں سے کوئی وفد بھیجو...... کوئی وکیل کرو...... کوئی بات کرو۔

لیکن آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے دفتری کام کتنے چست ہوتے ہیں، ابھی ہم یہ کر ہی رہے تھے کہ جنیوا سے ہیومن رائٹس کا فیصلہ آ گیا کہ پاکستان میں فی الواقع قادیانیوں کے انسانی حقوق غصب ہو رہے ہیں...... ان پر ظلم ہو رہا ہے...... زیادتی ہو رہی ہے اور حکومت پاکستان بھی اس میں شریک ہے۔ یہ قرارداد اور فیصلہ امریکہ گیا۔ اس کی بنیاد پر جیسے میں نے کہا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل ہمیں ہر سال کہتی ہے اور امریکہ بھی ہمیں ہر سال کہتا ہے، اقوام متحدہ بھی ہمیں ہر سال کہتی ہے، بلکہ امریکہ نے پاکستان کی امداد کی بحالی کے لیے اس وقت جو شرطیں لگائی تھیں ان میں ایک صاف شرط تھی کہ احمدیوں کے خلاف کیے گئے یہ اقدامات

واپس لیے جائیں۔اس کی بنیاد کیا تھی، جنیوا انسانی حقوق کمیشن کی وہ قرارداد۔اس پر لوگوں کا ذہن بن گیا اور ہم اپنا مؤقف اس سطح پر پیش نہیں کر سکے، ہم اپنے مؤقف کی وضاحت نہیں کر سکے، جس کی وجہ سے دنیا کی فضا یہ ہے کہ فی الواقع پاکستان میں قادیانی مظلوم ہیں اور مسلمان ظالم ہیں۔ جبکہ اصل صورتحال کیا ہے کہ قادیانی ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ ہماری شناخت خراب کر رہے ہیں، ہماری پہچان مجروح کر رہے ہیں اور ہمارے انسانی حقوق پامال کر رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اکثریت میں ہیں اور انہیں اکثریت پر اثر انداز نہیں ہونے دے رہے۔ لیکن ان کا مؤقف و پلان یہی ہے کہ وہ اسلام کے نام پر اجارہ داری قائم کریں، وہ خود کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور ہم سب کو کافر کہتے ہیں۔

ہماری ذمہ داری

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج دنیا میں جنگ کے مورچے یہ ہیں۔آپ کی جتنی نظریاتی جنگ ہے صرف قادیانیت کے حوالے سے نہیں بلکہ توہین رسالت کے قانون کے حوالے سے، حدود آرڈیننس کے حوالے سے، شہادت کے قانون کے حوالے سے، خاندانی نظام کے حوالے سے، نکاح، طلاق و وراثت کے قوانین کے حوالے سے، عورت اور مرد کے درمیان مساوات یا فرق کے حوالے سے اور بین الاقوامی قوانین کے حوالے سے ہے اور یہ جتنی جنگ بھی لڑی جا رہی ہے، بین الاقوامی فورموں پر لڑی جا رہی ہے، اقوام متحدہ میں لڑی جا رہی ہے۔ایمنسٹی انٹرنیشنل میں لڑی جا رہی ہے۔ ہماری تنظیمیں اور ادارے یہ جو کام کر رہے ہیں میں اس سے انکاری نہیں ہوں...... اپنے حلقے کا ذہن باقی رکھنے کے لیے یہ کام ضروری ہے اور فائدہ مند ہے۔لیکن جہاں جنگ لڑی جا رہی ہے وہاں ہماری نمائندگی نہیں ہے۔اس لیے اس فورم پر جس سطح پر جن ہتھیاروں کے ساتھ اور جس انداز سے لڑی جا رہی ہے اس کے لیے تیاری کر لیں...... یہ ہمارے علماء کے کرنے کے کام ہیں کیونکہ علماء ہی اسلام کی صحیح نمائندگی کریں گے۔ دوسرا آدمی تو نہیں کر سکے گا...... لہٰذا ہمیں اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا چاہیے...... اس کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں...... وہ زبان سمجھنی چاہیے اور وہ طریقہ جنگ سمجھنا چاہیے...... وہ اسلوب سمجھنا چاہیے اور اس کے لیے تیاری کرنی چاہیے، کیونکہ بہرحال یہ

کام ہم نے کرنا ہے...... صحیح طریقے سے کریں گے تو صحیح نتائج سامنے آئیں گے۔ اگر صحیح طریقے سے نہیں کریں گے تو اسی طرح دباؤ میں رہیں گے اور اسی طرح دنیا ہمارے خلاف باتیں بناتی رہے گی۔ باقی باتیں پھر کبھی موقع ملا تو ہوں گی۔ ان شاء اللہ۔

اس وقت اسی پر اکتفاء کرتا ہوں، حق تعالیٰ قبولیت ونافعیت سے نوازیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ۔

مغرب سے مکالمہ کی ضرورت، ترجیحات اور تقاضے

ماہ رواں کے آغاز میں کراچی حاضری کے موقع پر جامعۃ الرشید میں اساتذہء کرام کی ایک نشست میں ''مغرب سے مکالمہ کی ضرورت، ترجیحات اور تقاضے'' کے عنوان سے تفصیلی گفتگو کا موقع ملا، اس کے علاوہ جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی میں درجہء تخصص کے طلبہ کے سامنے دونشستوں میں اس عنوان پر اظہار خیال کیا اور بعض دیگر اجتماعات میں بھی اس حوالے سے معروضات پیش کیں۔ موضوع کی اہمیت کی مناسبت سے اس متفرق گفتگو کا خلاصہ نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ

مغرب سے مکالمہ کے بارے میں اس وقت بہت کچھ کہا جا رہا ہے اور مختلف سطحوں پر اس مکالمہ کی اہمیت وضرورت پر زور دیا جا رہا ہے، ہمیں اس مکالمہ کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں ہے بلکہ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان دن بدن تیز ہونے والی فکری اور تہذیبی کشمکش کے پس منظر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس مکالمے کو اس کے صحیح فریقوں کے درمیان اور اس کے حقیقی ایجنڈے کے مطابق آگے بڑھایا جا سکے تو اس سے ہمیں اپنا موقف زیادہ بہتر طور پر دنیا کے سامنے واضح کرنے کا موقع ملے گا اور بہت سی غلط فہمیاں جو اس حوالے سے پائی جاتی ہیں دور ہو سکیں گی لیکن اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ مکالمہ اصل فریقوں کے درمیان ہو اور اصل ایجنڈے کے مطابق ہو۔ مثلاً اس وقت مغرب اور مسلمانوں کے درمیان جو تہذیبی وفکری کشمکش ہے وہ مغرب کے مذہب سے منحرف سیکولر حلقوں اور

مذہب پر پختہ یقین رکھنے والے مسلمانوں کے درمیان ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ مکالمہ کے لیے مغرب اپنے مذہبی رہنماؤں کو آگے کر رہا ہے، جو اس کشمکش میں سرے سے فریق ہی نہیں ہیں۔ مغرب کی کوشش یہ نظر آتی ہے کہ مکالمہ کو ''مذاہب کے درمیان بحث ومباحثہ'' کے عنوان سے چلنے دیا جائے اور اس آڑ میں مذہب سے منحرف گروہ اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرتا رہے۔ یہ بات مغالطہ آفرینی اور فریب کاری کے سوا کچھ نہیں ہے جس سے باخبر اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مغرب کے ساتھ مکالمے کی ترجیحات اور اس کے ضروری ایجنڈے پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ مغرب کو ہم اس حوالے سے تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر طبقہ کے ساتھ گفتگو کے لیے الگ الگ ایجنڈے اور تقاضوں کو ایک ترتیب کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اصل منظر اور ماحول گفتگو کے لیے سامنے رہے۔ جہاں تک مغرب کے مذہبی حلقے کا تعلق ہے اس کے ساتھ گفتگو اور مکالمہ کی ضرورت کو ہم تسلیم کرتے ہیں مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ موجودہ کشمکش میں وہ ہمارے خلاف فریق نہیں ہیں کیونکہ وہ صرف مذہب کی نمایندگی کرتے ہیں جس کا مغرب کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور نہ ہی مغرب کے مذہبی راہنما موجودہ مغربی ثقافت اور فلسفہ کے نمایندہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجھے مذاہب کے درمیان ایک مکالمہ میں شرکت کے لیے کہا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میں مغرب کے مذہبی راہنماؤں کو مغرب اور مسلمانوں کی موجودہ کشمکش میں فریق ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اس لیے اس حوالے سے ان کے ساتھ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور ایسا کرنا صرف وقت گزاری کے مترادف ہوگا فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے حوالہ سے ہماری کشمکش مغرب کے ان عناصر سے ہے جو مذہب کے معاشرتی کردار سے کلیتہً دست بردار ہو چکے ہیں اور اب وہ مسلمانوں سے اسی طرح کی دست برداری کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ کشمکش مذاہب کے درمیان نہیں بلکہ مذہب اور لامذہبیت کے درمیان ہے اور اسے اسی تناظر میں دیکھنا حقیقت پسندی ہوگا۔

مغرب کے مذہبی راہنماؤں سے جب ہم بات کریں گے تو اس میں گفتگو کا ایجنڈا موجودہ کشمکش نہیں ہوگا بلکہ اس مکالمہ کا موضوع اور ایجنڈا یہ ہوگا کہ

۱۔ مغرب کے مذہبی راہنما اپنے معاشرے کو مذہب کی طرف واپس لانے کے لیے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

۲۔ اس وقت پوری انسانی سوسائٹی میں آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی طرف واپسی کی جدوجہد صرف اور صرف مسلمان کر رہے ہیں مغرب کے مذہبی راہنما اس جدوجہد میں مسلمانوں کے مذہبی حلقوں کا کیا تعاون کر سکتے ہیں؟

۳۔ انسانی سوسائٹی کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپس لانے کی صورت میں آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کے اوریجنل ذخیرہ اور مستند و محفوظ مواد کے تعین کے لیے مغرب کے مذہبی راہنماؤں کے ساتھ گفتگو کی ضرورت ہوگی لیکن اس کا مرحلہ بعد میں آئے گا، اس سے قبل پہلے دو نکات پر گفتگو ضروری ہے۔

۴۔ مغرب کے مذہبی راہنماؤں کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ واقعی وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور انسانی سوسائٹی پر ان کی عملداری کے خواہاں ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہب بیزار سیکولر فلسفہ کی حمایت کرنے کی بجائے انسانی معاشرہ میں آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کی بحالی کے لیے محنت کریں، اس کے بعد موجودہ مغربی فلسفہ و ثقافت کے نمایندوں کی باری آتی ہے کیونکہ ہمارے خلاف اصل فریق وہی ہیں اور ان کے ساتھ دو مسئلوں پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ مغرب نے جب مذہب کے معاشرتی کردار سے لاتعلقی اختیار کی تھی تو اس کا ایک خاص پس منظر تھا جس کی وجہ سے مغرب کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ معاشرتی ارتقاء کے سفر میں مذہب کو ساتھ لے کر چل سکے۔ اس پس منظر کا ایک پہلو یہ کہ مغرب میں صدیوں تک جاری رہنے والے تاریک دور میں جب مغرب پر بادشاہ اور جاگیرداروں کی حکمرانی تھی، ظلم و جبر کا دور تھا اور عام شہری جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ اس ظلم و جبر میں مذہب بھی ایک ادارے کے طور پر بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھی تھا اور ان کے مظالم کا پشت پناہ تھا۔ اس لیے جب بادشاہت اور جاگیرداروں کے خلاف عوامی بغاوت نے کامیابی حاصل کی تو ان کے پشت پناہ مذہب کو بھی ان کے ساتھ ہی معاشرتی زندگی سے بے دخل کر

دیا گیا جبکہ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب مغرب میں سائنسی ارتقاء کا دور شروع ہوا اور سائنسی مطالعہ اور ایجادات نے پیش رفت کی تو مذہب اس کے خلاف فریق بن گیا اور سائنسدانوں کے خلاف الحاد و کفر کے فتوے اور ان کے قتل کے احکام جاری کر کے ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے آکسفورڈ میں وہ مقام خود دیکھا ہے جہاں اس دور میں مذہبی عدالت لگتی تھی اور سائنس و ٹیکنالوجی اور جغرافیہ کے علوم میں تحقیق کرنے والوں کو ملحد اور زندیق قرار دے کر ان کے قتل کے احکام جاری کیے جاتے تھے۔ اس لیے سائنس کے آگے بڑھنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والے مذہب سے پیچھا چھڑا لیا جائے اور ایسا ہی کیا گیا۔

ہمارا مغرب کے دانش وروں سے سوال یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کے معاشرتی کردار کو مسترد کیا تو اس کا ایک مخصوص پس منظر تھا، اس کے اسباب تھے اور وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مغرب کی مذہب سے دست برداری سمجھ میں آتی ہے لیکن مغرب اپنا پس منظر ہم مسلمانوں پر کیوں مسلط کرنا چاہتا ہے؟ ہمارا پس منظر یہ نہیں ہے اور ہمارے چودہ سو سالہ ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مذہب دلیل حق اور اصول کی بجائے جبر اور طاقت کا ساتھی بن گیا ہو۔

اسلام بحیثیت مذہب ہر دور میں اصول، حق اور دلیل کا ساتھی رہا ہے، مظلوم کا حمایتی رہا ہے اور اس نے کبھی بطور ادارہ جبر و ظلم اور طاقت کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارے علماء کی تاریخ جیلوں، شہادتوں اور قربانیوں سے پر ہے کہ انہوں نے جانوں کی قربانی دے دی، جیلوں کی تنہائیاں قبول کر لیں مگر ظالم اور جابر کے سامنے گردن نہیں جھکائی، ہمارے مذہبی راہنماؤں کا کردار اس حوالہ سے ہمیشہ شاندار رہا ہے۔ اسی طرح اسلام کبھی سائنس کی راہ میں حائل نہیں ہوا اور ٹیکنالوجی کے ارتقاء میں کبھی رکاوٹ نہیں بنا بلکہ مغرب کی تمام تر سائنسی ترقی مسلم اسپین کے ان تعلیمی اداروں کی رہین منت ہے، جنہوں نے سائنس و ٹیکنالوجی میں ان کی سوسائٹی کے ارتقاء کی راہ ہموار کی مگر ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ مسلم اسپین میدان جنگ میں شکست کھا کر اس میدان میں خود پیش رفت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا اور اس کی تحقیقات کی بنیاد پر مغرب نے سائنس میں ارتقاء کا سفر شروع کر دیا۔

اس پس منظر میں مغرب سے ہماری شکایت یہ ہے کہ وہ اپنا مخصوص پس منظر پوری دنیا پر بالخصوص مسلمانوں پر مسلط کرنے کی ناروا کوشش کر رہا ہے اور اپنا تاریک ماضی دکھا کر ہمیں اپنے روشن ماضی سے دست بردار ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔

اس حوالے سے مغرب کے ساتھ کرنے کی دوسری بات یہ ہے کہ ان کی سوسائٹی پر مغرب کے اس مذہب بیزار فلسفہ وثقافت کے اثرات اور نتائج کا جائزہ لیا جائے، جس کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوا تھا۔ اس مذہب بیزار فلسفہ نے سائنس وٹیکنالوجی کی سپورٹ اور پشت پناہی کے باوجود انسانی معاشرت کے ارتقاء میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ اس مذہب بیزاری کے نتیجے میں مغرب کا خاندانی نظام تتر، بتر ہو کر رہ گیا ہے، رشتوں کا تقدس پامال ہو گیا بلکہ سرے سے رشتوں کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہا۔ ''انڈویجول ازم'' کے اس مغربی فلسفہ نے انسانی سوسائٹی میں باہمی اشتراک وتعاون کے نظام کی چولیں ہلا دی ہیں۔ روحانی واخلاقی اقدار کا جنازہ نکال دیا ہے اور آج خود مغرب کا دانش ور بھی مذہب بیزار فلسفہ کے نتائج سے پریشان ہو کر واپسی کے راستے تلاش کر رہا ہے۔ مغرب کے دانش وروں سے ہمیں اس نکتہ پر بات کرنی چاہئے کہ مذہب بیزار سیکولر فلسفہ کے منفی نتائج دیکھ کر بھی وہ ہم مسلمانوں سے یہ تقاضا کیوں کر رہے ہیں کہ ہم بھی ان کی طرح مذہب کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہو کر اپنے محفوظ خاندانی نظام سے محروم ہو جائیں۔ باہمی رشتوں اور معاشرتی تعلقات کو خیر باد کہہ دیں اور روحانی واخلاقی قدروں سے کنارہ کش ہو کر ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے نشہ اور ماہرین نفسیات کے گرد طواف شروع کر دیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ مغرب میں مذہب کا جو کردار قرون مظلمہ میں رہا ہے اور جس کا تصور کر کے آج بھی اہل مغرب کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جس سے مغرب اس قدر خوفزدہ ہے کہ آج بھی دنیا کے کسی خطے میں مذہب کے معاشرتی کردار کی بات ہوتی ہے تو مغرب خود کو اس کے خلاف فریق تصور کرنے لگتا ہے، اس کا بھی ایک خاص پس منظر ہے اور اس کی وجوہ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مسیحیت کے پاس تو رات اور انجیل کا محفوظ اور مستند ذخیرہ موجود نہیں تھا اور نہ اب موجود ہے جس کی وجہ سے مذہب کی تشریح کا حتمی اختیار پوپ اور چرچ کو حاصل ہو گیا تھا اور دلیل کی بجائے فرد یا افراد

مذہب کی تعبیر وتشریح میں فائنل اتھارٹی کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ یہی وجہ ان کے مطلق العنان ہونے کی تھی مگر اسلام میں ہمیشہ دلیل اور استدلال کو فوقیت حاصل رہی ہے، قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات محفوظ اور مستند صورت میں موجود ہیں اس لیے اسلام میں نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کے بعد کسی فرد یا طبقہ کو مذہب کی تعبیر وتشریح کا حتمی اختیار نہیں ہے، ہر ایک کو دلیل سے بات کرنا پڑتی ہے اور اپنے موقف اور رائے کے حق میں قرآن وسنت سے استدلال کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ خلفاء راشدین اور ائمہ مجتہدین کے احوال وآراء سے بھی دلیل کی بنیاد پر سینکڑوں امور پر اختلاف کیا گیا ہے، اس لیے اسلام میں دلیل اور استدلال سے ہٹ کر کسی فرد یا طبقہ کے لیے مذہب کی تعبیر وتشریح میں فائنل اتھارٹی کا مقام حاصل کرنے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے، چنانچہ مغرب کے اہل دانش سے جب بات کی جائے گی تو یہ نکتہ بھی زیر بحث آئے گا کہ وہ مسیحیت اور اسلام کو ان کے علمی اور معاشرتی کردار میں اس قدر واضح فرق کے باوجود ایک ہی پلڑے میں کیوں رکھ رہے ہیں اور اس معاملے میں بھی مغرب کا مخصوص پس منظر مسلمانوں پر مسلط کرنے کی تگ ودو میں کیوں مصروف ہیں؟

گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ گواہ ہے کہ اسلام اور مسیحیت کا علمی کردار ایک دوسرے سے مختلف رہا ہے اور ان کا معاشرتی کردار بھی جداگانہ اور ایک دوسرے سے قطعی طور پر الگ رہا ہے اس لیے اگر اہل مغرب کو ان کا مذہب اپنے مخصوص پس منظر اور کردار کی وجہ سے راس نہیں آیا تو اس کی بنیاد پر انہیں اس بات کا حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ دوسرے مذاہب کو بھی مسترد کر دیں اور ساری دنیا کے پیچھے اس دست برداری کو منوانے کے لیے لٹھ لے کر گھومتے پھریں۔ اگر کسی شخص کو اس کے عوارض اور بیماری کی وجہ سے گوشت راس نہیں آتا تو وہ نہ کھائے لیکن اسے یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ باقی لوگوں کے ہاتھوں سے بھی یہ کہہ کر گوشت چھیننا شروع کر دے کہ چونکہ مجھے گوشت موافق نہیں ہے اس لیے تم سب بھی گوشت کھانا چھوڑ دو۔ اسے اپنی بیماری کا علاج کرانا چاہیے تاکہ وہ بھی اس نعمت سے کبھی مستفید ہو سکے نہ یہ کہ وہ دوسروں کو بھی اس نعمت سے محروم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔ اب رہی بات مغرب کے اہل سیاست کی تو ان سے گفتگو کا ایجنڈا الگ ہے اور ان

سے مکالمہ میں جن امور پر بات کرنے کی ضرورت ہے ان میں زیادہ اہم امور یہ ہیں۔

مغرب کے اہل اقتدار نے یکطرفہ طاقت اور جبر کے زور پر سائنس و ٹیکنالوجی، معیشت و تجارت، عسکری قوت اور سیاست و اقتدار پر جو عالمی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے وہ اصولی اور انصاف کے کسی بھی مسلمہ معیار پر پوری نہیں اترتی۔

مغرب دنیائے اسلام میں سیاسی مداخلت کر کے اپنی مرضی کی حکومتیں اور اپنی مرضی کے نظام قائم رکھنے پر مصر ہے، اس کے نزدیک جمہوریت، عوامی رائے اور وہاں کے لوگوں کی مرضی کوئی حیثیت نہیں رکھتی، جس مسلمان ملک میں جس قسم کی حکومت اور جس قسم کا نظام مغرب کی اجارہ داری اور تسلط قائم رکھنے کے لیے فائدہ مند ہے وہ اسی کو وہاں مسلط رکھنے پر مصر ہے اور اس کے لیے اعلانیہ اور خفیہ ہر قسم کے حربے اختیار کیے ہوئے ہے۔

مغرب نے اپنے مذہب بیزار فلسفے کی بنیاد پر اقوام متحدہ کے فورم سے انسانی حقوق کا جو چارٹر طے کیا تھا اسے وہ پوری دنیا پر بین الاقوامی قانون کے طور پر مسلط کیے ہوئے ہے حالانکہ مسلمان اپنے عقائد اور ثقافت کے حوالے سے اس چارٹر کے بارے میں واضح تحفظات رکھتے ہیں اور چارٹر کو من و عن قبول کرنے کی صورت میں انہیں قرآن و سنت کے متعدد احکام سے جس طرح دست بردار ہونا پڑتا ہے وہ ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے لیکن مغرب اس چارٹر کو حرف آخر قرار دے کر مسلمانوں کے عقائد اور شرعی احکام کی نفی کر رہا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی بالخصوص عسکری ٹیکنالوجی اور ایٹمی توانائی میں مغرب نے اپنی اجارہ داری کو بین الاقوامی قانون کا درجہ دے رکھا ہے اور وہ خاص طور پر کسی بھی مسلمان ملک کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ جدید ترین ٹیکنالوجی میں مغرب کے قائم کردہ اجارہ داری کے سرخ دائرے کو پار کر سکے اور عسکری قوت میں مغرب کی قائم کردہ حدود سے آگے بڑھ سکے۔ یہ سراسر ناانصافی اور ظلم کا قانون ہے اور اقوام عالم کے درمیان برابری اور مساوات کے اصول کے منافی ہے۔

اقوام متحدہ میں جسے بین الاقوامی حکومت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے فیصلوں کی قوت کا توازن یکطرفہ اور اجارہ دارانہ ہے، سلامتی کونسل کے مستقل ارکان اور ویٹو پاور میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جس کی وجہ سے مسلمان اقوام متحدہ کا ایک معطل حصہ ہیں

اور ان کے لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی لندن کے ہائیڈ پارک کارنر سے زیادہ کوئی افادیت نہیں رکھتی ۔ عسکری قوت اور جدید ترین ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کی پیش رفت کا راستہ روک کر یکطرفہ عسکری اور معاشی قوت کے بل بوتے پر مغرب نے مسلمانوں کے معدنی وسائل اور تیل پر قبضہ جما رکھا ہے اور مسلم حکومتوں کو آلہ کار بنا کر وہ مسلمانوں کا مسلسل استحصال کر رہا ہے۔

ہمارے نزدیک مغرب کے اہل سیاست و اقتدار سے مسلمانوں کے مکالمہ کے اہم نکات یہ ہونے چاہئیں۔ ہمیں مکالمہ کے لیے مغرب کے پیش کردہ نکات پر بات چیت کرنے سے بھی انکار نہیں ہے لیکن بات یکطرفہ ایجنڈے پر نہیں ہونی چاہئے، مکالمہ ایجنڈا ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے، مغرب اس معاملے میں بھی اجارہ داری کے یکطرفہ طرز عمل پر قائم ہے اور مسلمانوں سے ان کے مسائل اور شکایات پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس حوالے سے ہم ملک کے دینی اداروں اور علمی مراکز سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس صورتحال سے خود واقف ہونے اور اپنے اساتذہ، طلبہ اور دانشوروں کو واقف کرانے کی ضرورت ہے۔ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے اور اس احساس کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ مکالمہ جس مسئلہ پر بھی ہو اس کے اصل فریق سے اور حقیقی ایجنڈے پر ہوگا تو فائدہ مند ہوگا ورنہ وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔

دور جدید کے فکری تقاضے اور علماء کرام

لندن میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے چند نوجوان علماء کرام نے "موطا ٹرسٹ" کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کر رکھی ہے جو موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں دینی و علمی خدمات سرانجام دینے کا جذبہ رکھتے ہیں اور دعوت و تعلیم کے حوالے سے ایک قابل عمل پروگرام کی تشکیل کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند ماہ قبل ندوۃ العلماء لکھنو سے حضرت مولانا سید سلمان ندوی لندن تشریف لائے تو موطا ٹرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے نوجوان علماء کرام کی ایک جماعت کو، آج کے تقاضوں اور دینی دعوت و تعلیم سے تعلق رکھنے والے چند اہم عنوانات پر مسلسل پانچ روز تک لیکچر دیے۔ میری لندن حاضری کے موقع پر انہوں نے ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی وساطت سے مجھ سے بھی فرمائش کی کہ اس سلسلے میں کچھ گزارشات ان کی خدمت میں پیش کروں چنانچہ ۲۳۔ اکتوبر سے ۲۶۔ اکتوبر تک مسلسل چار روز عشا کے بعد مجھے ان سے گفتگو کا موقع ملا۔ گفتگو میں شریک بعض دوستوں کی خواہش تھی کہ ان معروضات کو قلم بند کر کے تحریری صورت میں سامنے لایا جائے۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ یہ ابتدائی موقع تھا اس لیے گفتگو اس انداز سے مرتب طور پر نہیں کی گئی کہ اسے مقالہ کی صورت میں تحریر کیا جا سکے۔ پھر کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ البتہ اس دوران پیش کی جانے والی چند اہم گزارشات کا خلاصہ قارئین کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔

آج کے دور میں دینی کام کے لیے سب سے پہلے آج کی دنیا کے مجموعی تناظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، اقوام عالم میں ہماری حیثیت کیا ہے اور ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اس لیے علماء

کرام اور بالخصوص نوجوان علماء کرام کو چاہیے کہ وہ دنیا کے حالات سے باخبر رہیں، معاصر اقوام و مذاہب سے واقفیت حاصل کریں اور اس عالمی تہذیبی کشمکش کا شعور حاصل کریں جو اس وقت اسلام اور مغرب کے درمیان تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے بغیر کوئی نوجوان عالم دین دینی و علمی خدمات سرانجام دینا چاہتا ہے تو وہ اپنے مخصوص اور محدود ماحول کے دائرے میں تھوڑا بہت کام ضرور کر لے گا لیکن اسلام کی دعوت اور ملت اسلامیہ کے مسائل و مشکلات کے حوالے سے کچھ نہیں کر پائے گا۔

اسلام اور مغرب کی کشمکش کے پس منظر میں اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ مغرب کا موقف کیا ہے اور اس موقف کا پس منظر کیا ہے؟ ہم مغرب کے موقف کو اصولی طور پر دو حوالوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ایک تو یہ تاریخی پس منظر ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ مغرب نے قرون وسطیٰ یا قرون مظلمہ میں مذہب کے جس کردار کا مشاہدہ کیا ہے بلکہ مذہب کے جس کردار کو بھگتا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے مغرب کی مذہب دشمنی کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ مغرب نے صدیوں تک اس صورت حال میں وقت گزارا ہے کہ عام آبادی بادشاہت اور جاگیردارانہ نظام کے مظالم کی چکی میں پستی رہی ہے۔ عام آدمی اس دور میں غلام سے بدتر حیثیت اختیار کر چکا تھا اور انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ مذہب نے اس دوران عام آدمی کا ساتھ دینے کے بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا اور اپنا پورا وزن مظلوم کے بجائے ظالم کے پلڑے میں ڈال دیا حتیٰ کہ بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف عوامی بغاوت کے موقع پر بھی مذہب کا پرچم تھامے ہوئے اس دور کے اہل مذہب نے غریب عوام کے بجائے بادشاہت اور جاگیرداری کی حمایت و تعاون کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں شدید ردعمل کی طوفانی لہروں نے بادشاہت اور جاگیرداری کے ساتھ مذہب کا بیڑا بھی گہرے سمندر میں غرق کر دیا۔

اس لیے آج جب مغرب والوں کے سامنے مذہب کا نام آتا ہے تو ان کی نظروں کے سامنے قرون وسطیٰ کا منظر گھوم جاتا ہے اور ان کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مذہب اور اہل مذہب کا اس کے سوا بھی کوئی کردار ہو سکتا ہے لہٰذا ہمیں مغرب کے سامنے مذہب کی بات کرتے ہوئے مذہب سے اس کی شدید نفرت کے اس بڑے سبب کا لحاظ کرنا ہوگا اور

دلیل، منطق اور کردار کے ساتھ واضح کرنا ہوگا کہ اسلام اور قرونِ وسطیٰ کی مسیحیت کے معاشرتی کردار میں کیا فرق ہے اور عام اہلِ مغرب کو باور کرانا ہوگا کہ اسلام بادشاہت کا نہیں بلکہ عوام کا ساتھی ہے اور جاگیردار کا نہیں بلکہ مظلوم کا حمایتی ہے۔

مذہب سے اہلِ مغرب کی شدید نفرت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ مذہب نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں اہلِ مغرب کی پیش رفت اور ترقی کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کا ساتھ دینے کے بجائے اس کی مخالفت کی ہے۔ مذہب نے کائنات کے مطالعہ اور زمین و آسمان کے نظام کی سائنسی تعبیرات کو کفر و الحاد قرار دے کر سائنس دانوں پر فتوے عائد کیے ہیں اور مذہبی عدالتوں نے انہیں خوف ناک سزائیں دی ہیں۔ یہ ایک مستقل باب ہے جس کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور اس سے بھی مذہب کے ساتھ اہلِ مغرب کی نفرت کی شدت اور نوعیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ آج کی عالمی کشمکش کے تناظر میں ایک اور بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ مغرب کا کہنا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد اقوامِ متحدہ کے نام سے ایک بین الاقوامی ادارہ تشکیل پایا تھا اور اس نے ممالک اقوام کے نظام کو چلانے کے لیے انسانی حقوق کے چارٹر کے نام سے راہ نما اصول وضع کیے تھے جس پر دنیا بھر کے تمام ممالک کے نمائندوں نے دستخط کر کے اس چارٹر کو اپنی حکومتوں اور نظاموں کے لیے راہ نما اصول کے طور پر تسلیم کر رکھا ہے اس چارٹر کی دفعات کی تشریح و تعبیر کا بھی ایک نظام ہے جس میں تمام ممالک شریک ہیں اور اقوامِ متحدہ کے مختلف ادارے بوقتِ ضرورت اس چارٹر کی دفعات کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے جن ممالک نے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں اور جو ممالک اقوامِ متحدہ کے نظام میں باقاعدہ شریک ہیں، انہیں اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے اور اپنی شرکت اور دستخطوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے قانونی نظاموں اور حکومتی ڈھانچوں کو اقوامِ متحدہ کے منشور اور قراردادوں کے دائرے میں لانا چاہیے۔

ہم مسلمانوں کی اس سلسلے میں دو بڑی الجھنیں ہیں۔ ایک یہ کہ اقوامِ متحدہ کے منشور کو من و عن، قبول کرنے کی صورت میں ہمیں قرآن و سنت کے بہت سے صریح احکام سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور خاندانی نظام یعنی نکاح و طلاق اور وراثت کے علاوہ حدود

تعزیرات کے باب میں بھی قرآن کریم اور سنت نبوی کے متعدد صریح قوانین و احکام پر عمل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اور دوسری الجھن یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے نظام پر مغرب کی اجارہ داری ہے اور خود اقوام متحدہ کے فیصلوں اور قراردادوں پر عمل درآمد میں بھی مغرب کی ترجیحات کا غلبہ رہتا ہے لیکن ان دو الجھنوں اور رکاوٹوں کے باوجود مغرب کے اس موقف کو اصولی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جن ممالک نے اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں اور جن ممالک کے نمائندے اقوام متحدہ کے نظام میں شریک ہیں، ان کو اقوام متحدہ کے منشور اور فیصلوں کی پابندی کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ آج کے نوجوان علماء کرام کے لیے اس بات کو سمجھنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور اور اس کے مختلف اداروں کے فیصلوں اور قراردادوں کا اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ کہاں کہاں ٹکراؤ ہے اور اقوام متحدہ یا دوسرے لفظوں میں آج کے بین الاقوامی قوانین کا کون سا حصہ اور کون سا قانون قرآن و سنت کے کون سے قانون اور ضابطے سے متصادم ہے؟ اس کا ادراک حاصل کیے بغیر ہم آج کی عالمی تہذیبی کشمکش اور مسلمانوں کے ساتھ اہل مغرب کی کشیدگی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

اس کشمکش سے ہٹ کر مثبت انداز میں اہل مغرب کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرنے اور مغربی ماحول میں اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے بھی ہمیں اپنے روایتی طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ کسی بھی شخص، گروہ یا سوسائٹی کے سامنے اسلام کی دعوت رکھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ بات اس کی زبان میں ہو اور صرف زبان کافی نہیں بلکہ اسلوب اور انداز بھی اس سوسائٹی کے لیے متعارف ہو ورنہ صرف اچھی انگریزی بول کر اپنے روایتی مشرقی اسلوب میں اسلام کی دعوت و تعلیم کا فریضہ مغرب میں سرانجام دینے کا نتیجہ بھی مختلف نہیں ہوگا جبکہ زبان و اسلوب کے ساتھ تیسرے نمبر پر اس قوم اور سوسائٹی کی نفسیات اور ذہنی سطح کا ادراک حاصل کرنا بھی دعوت و تعلیم کا ناگزیر تقاضا ہے۔

میں عام طور پر اس سلسلے میں ایک روایت پیش کیا کرتا ہوں جو سیرت نبوی کی بیشتر کتابوں میں موجود ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک بار قریش کے چند سردار آئے اور پوچھا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے

سامنے ایک کلمہ پیش کر رہا ہوں جسے اگر تم قبول کرلو تو عرب پر تمہاری بادشاہت قائم ہو جائے گی اور عجم بھی تمہارے تابع ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ان سرداروں کی نفسیات کے پس منظر میں تھا کہ یہ سردار لوگ ہیں اور چودھراہٹ ہی کی زبان سمجھتے ہیں اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ایمان اور کلمہ طیبہ کے بے شمار فوائد میں سے پہلے مرحلہ میں وہی فائدہ ان کے سامنے رکھا جو فوری طور پر ان کی سمجھ میں آسکتا تھا۔ ہمیں اس سنت نبوی سے راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے اور لوگوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس کے مطابق ان کے سامنے اسلام کی دعوت و تعلیم کو رکھنا چاہیے۔

علماء کرام بالخصوص نوجوان علماء کو تاریخ کے مطالعہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ عالمی تاریخ، مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ اور بالخصوص عالم اسلام کی تاریخ کے اہم مراحل سے ان کا واقف ہونا ضروری ہے۔ پھر ان تحریکات سے بھی انہیں باخبر ہونا چاہیے جو مختلف ادوار میں اہل حق اور علماء دین نے ملت کی آزادی اور دین کے تحفظ کے لیے بپا کی ہیں۔ جنوبی ایشیا میں ہمارے اکابر حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادہ کی خدمات، علماء دیوبند کی جدوجہد اور برطانوی استعمار سے آزادی کی تحریکات سے آگاہی کے بغیر تو ہم اپنے مشن اور اہداف کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہمارے بزرگوں نے حالات اور موقع محل کی مناسبت سے جدوجہد کے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔

☆ حضرت مجدد الف ثانی نے اکبر بادشاہ کے ریاستی الحاد اور خود ساختہ دین الٰہی کے خلاف جدوجہد میں ارباب اختیار کی ذہن سازی، بریفنگ اور لابنگ کا طریقہ آزمایا ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔

☆ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دہلی کی طرف جنوبی ہندوستان کے جنونی مرہٹوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لیے مقامی مزاحمتی قوتوں کو کمزور سمجھتے ہوئے افغانستان کے فرماں روا احمد شاہ ابدالیؒ سے مدد مانگی اور اسے حملہ کی دعوت دی۔ ان کی یہ تکنیک بھی کامیاب رہی۔

☆ برطانوی استعمار کے خلاف شہدائے بالاکوٹ اور ۱۸۵۷ء کے حریت پسند علماء اور ان سے قبل سراج الدولہؒ اور ٹیپو سلطانؒ نے عسکری مزاحمت کا راستہ

اختیار کیا جس میں اگرچہ وقتی طور پر ناکامی ہوئی لیکن اس سے مستقبل میں حریت پسندوں کو راہ نمائی اور حوصلہ ملا اور انہی کا مقدس خون تحریک آزادی کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔

☆ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے آزادی کی جدوجہد کے لیے عالمی سطح پر انگریز مخالف قوتوں سے رابطے قائم کیے اور جرمنی، جاپان اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے تحریک آزادی کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی مگر خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہو گئی البتہ حریت پسندوں کو جدوجہد کا ایک نیا راستہ اور اسلوب ملا۔

☆ کانگریس جمعیت علماء ہند، مجلس احرار اسلام اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں نے آزادی کے لیے دستوری اور سیاسی جدوجہد کا طریق کار اختیار کیا۔ ان میں جمیعۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام دینی جماعتیں تھیں۔ جمعیت علماء ہند کی قیادت مسلکی حوالے سے خالص دیوبندی قیادت تھی جبکہ مجلس احرار اسلام میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام پر مشتمل قیادت نے ٹیم ورک کی صورت میں مشترکہ دینی قیادت کا عملی نمونہ پیش کیا۔

یہ سب اہداف نہیں بلکہ طریقہ ہائے کار تھے۔ ان میں سے کوئی بھی حتمی اور قطعی نہیں تھا بلکہ یہ بات حالات پر منحصر تھی کہ کس وقت کون سا طریق کار دینی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

نوجوان علماء کو اس بات سے بھی باخبر ہونا چاہیے کہ جب یونان، ایران اور ہندوستان کے فلسفوں نے مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں دراندازی شروع کی، ان کے اثرات ہمارے ہاں پھیلنے لگے اور ان فلسفوں نے ہمارے عقائد کو متاثر کرنا چاہا تو اس وقت کے باشعور علماء اسلام نے ان فلسفوں سے آگاہی حاصل کی، ان پر عبور حاصل کیا اور ان فلسفوں کی زبان اور اصطلاحات استعمال کر کے انہی کے دلائل سے اسلام کی حقانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جبکہ آج دنیا پر مغرب کے سیکولر فلسفے کی حکمرانی ہے جس کی بنیاد مذہب سے

لاتعلقی پر ہے، جس کی زبان انسانی حقوق کی زبان ہے اور جس کی نفسیات میں آزادی اور اباحت مطلقہ رچ بس گئی ہے۔ آج کی اصطلاحات سے، اس کے اسلوب سے اور اس طرز سے مکمل واقفیت حاصل کرنا ہوگی جس طرح امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابومنصور ماتریدیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ، امام ابن رشدؒ اور دوسرے اہل علم نے یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفوں پر عبور حاصل کر کے انہی کی زبان اور دلائل سے ان کا رد کیا تھا۔

یہ آج کے دور کی چند اہم ضروریات اور چند ناگزیر تقاضے ہیں جن کی طرف مناسب توجہ نہ دینے کا ہمیں نقصان ہو رہا ہے اور ہم علمی، فکری اور تہذیبی محاذ پر کھلا میدان سامنے ہونے کے باوجود پیش رفت نہیں کر پا رہے۔ ان کی طرف دینی مدارس کو توجہ دینی چاہیے، دینی مدارس کا نصاب و نظام تشکیل دینے والوں کو متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ اصل ذمہ داری ان کی ہے لیکن اگر ان سے ہٹ کر بھی کچھ علمی ادارے اور فکری سوسائٹیاں ان ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کی کوشش شروع کر دیں تو کچھ نہ کچھ پیش رفت ضرور ہوگی اور شاید انہی کی کوششوں سے جمود کی اس دیوار میں کوئی روشن دان نمودار ہو جائے۔

موجودہ عالمی صورتحال
میں
علماء کرام کی ذمہ داریاں

برطانیہ کے جن دینی و تعلیمی اداروں کا کام دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اور کچھ امید قائم ہوتی ہے ان میں لیسٹر کی اسلامک دعوہ اکیڈمی سرفہرست ہے جو مولانا محمد سلیم دھورات کی سربراہی میں کام کر رہی ہے اور جس کا تذکرہ پہلے بھی ان کالموں میں ہو چکا ہے۔ اس سال اسلامک دعوہ اکیڈمی اور اس کے ساتھ منسلک جامعہ ریاض العلوم اور مدرسہ ریاض القرآن کا سالانہ جلسہ ۱۰ نومبر ۲۰۰۱ء کو تھا جس میں شرکت کا موقع ملا اور کچھ گزارشات بھی پیش کیں، جلسہ میں مدرسہ ریاض القرآن میں حفظ قرآن کریم مکمل کرنے والے نو حفاظ نے آخری سبق سنایا اور جامعہ ریاض العلوم کے سالانہ امتحانات میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات دیے گئے جبکہ دارالعلوم بری کے استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی محمد شبیر نے بھی خطاب کیا۔

حفاظ کا آخری سبق سننے سے قبل جلسہ میں اس اعلان سے میں چونک گیا کہ حفظ قرآن کریم مکمل کرنے والے ان طلبہ کا آج صرف آخری سبق سنا جائے گا اور ان کی دستار بندی نہیں ہوگی اس لیے کہ ہمارے ہاں معمول یہ ہے کہ آخری سبق سننے کے ساتھ ہی حافظ صاحب کو کسی بزرگ کے ہاتھوں دستار بندھوا کر حافظ کا خطاب دے دیا جاتا ہے اور اس کے بعد قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لیے اسے دہرانا اور بار بار سنا کر اسے پختہ کرنا اس حافظ کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے حفاظ بے پروائی کی وجہ سے قرآن کریم بھول جاتے ہیں اور ثواب و اجر کی بجائے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس لیے جلسہ میں مدرسہ ریاض القرآن کے مہتمم مولانا محمد سلیم دھورات کی

طرف سے کیا گیا یہ اعلان مجھے بہت اچھا لگا کہ آج ان حفاظ کا صرف آخری سبق سنا جائے گا اور ان کی دستار بندی اس وقت ہوگی جب یہ بیس مرتبہ قرآن کریم دھرا لیں گے۔ کم از کم پانچ پارے ایک نشست میں سنانے کے قابل ہو جائیں گے اور پورے قرآن کریم کا تفصیلی امتحان دے کر اسے پاس کر لیں گے اور ان مراحل سے گزر کر جب یہ دستار فضیلت کے مستحق ہو جائیں گے تو دستار بندی اور سند کے ساتھ ساتھ انہیں عمرہ کا ٹکٹ بھی دیا جائے گا۔

جلسہ سے قبل مولانا محمد سلیم دھورات نے علماء کرام کے ساتھ ایک مخصوص نشست کا بھی اہتمام کر رکھا تھا جس میں مختلف شعبوں سے علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور مجھے کہا گیا کہ میں ان علماء کرام سے موجودہ عالمی صورتحال اور علماء کرام کی ذمہ داریوں کے حوالہ سے گفتگو کروں چنانچہ جو گزارشات اس وقت اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے پیش کی جا سکیں ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

علماء کرام میری برادری ہے اس لیے ان سے گفتگو کرنے اور بہت سی گزارشات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ڈر بھی لگتا ہے کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جائے جو ان کے شایان شان نہ ہو اور یہ خوف بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ کوئی بات کسی نازک مزاج پر گراں گزر گئی تو پھر وہی کچھ نہ ہو جائے جو ایسے مواقع پر ہو جایا کرتا ہے اس لیے پیشگی معذرت خواہی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں جو موجودہ عالمی صورتحال میں علماء کرام کی ذمہ داریوں کے حوالہ سے ہوں گی اور جن میں تین امور کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ موجودہ حالات میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے حوالہ سے ضروریات کیا ہیں اور ہم اس سلسلہ میں کیا کر رہے ہیں؟

۲۔ عالمی استعمار کی فکری اور ثقافتی یلغار اس کی علمی و فکری گمراہیوں اور مغالطوں کی نشاندہی اور انہیں بے نقاب کرنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

۳۔ مغرب کے ذرائع ابلاغ جس طرح اسلام کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کر رہے ہیں اس کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے ہم کیا

کر رہے ہیں؟

جہاں تک دعوت اسلام کا تعلق ہے اسلام عالمگیر مذہب ہے اور دعوت کا مذہب ہے اس لیے دنیا کے ہر شخص تک اسلام کی دعوت پہنچانا اور پوری نسل انسانی کو اسلام کی تعلیمات سے متعارف کرا کے اسے اسلام کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرنا ملت اسلامیہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے جس میں سب سے اہم کردار علماء کرام کا ہو سکتا ہے اور ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحہ کے بعد دنیا کے حالات میں عالمگیر تبدیلی کے ماحول میں دعوت اسلام کی اس ذمہ داری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس کے دو پہلوؤں پر بطور خاص نظر رکھنی چاہیے ایک یہ کہ ۱۱ ستمبر کے بعد مغربی ممالک کے کتب خانوں میں اسلام اور قرآن کریم کے بارے میں موجود کتابیں بعض اخباری اطلاعات کے مطابق ہاتھوں ہاتھ بک گئی ہیں اور ان کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں جاننے اور باخبر ہونے کی خواہش بڑھ رہی ہے اور اسلام کو سمجھنے کے خواہاں لوگوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے ہمیں اس مانگ اور طلب کو محسوس کرنا چاہیے اور اسے پورا کرنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے ورنہ مارکیٹ کی مانگ تو پوری ہو جایا کرتی ہے لیکن جو لوگ اس خلاء کو پر کریں گے ان کے بارے میں آپ ہی کو شکایت ہوگی کہ یہ اسلام کے نام پر کیا پیش کیا جا رہا ہے؟ دوسرا پہلو یہ کہ اس وقت مغربی ممالک میں صورتحال یہ ہے کہ اسلام کی بات اگر سلیقے اور دانش مندی سے کی جائے تو سننے والے اور اس پر غور کرنے والے موجود ہیں اور ابھی اس بات کی گنجائش دکھائی دے رہی ہے کہ آپ حکمت و دانش کے ساتھ اسلام کی بات کریں تو آپ کی بات کو سنا جائے اور اس پر غور بھی کیا جائے لیکن صورتحال میں تبدیلی بھی آرہی ہے اور مغرب اور اسلام کے درمیان کشمکش اور فاصلے میں جس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ یہ فضا زیادہ دیر تک قائم رہے گی اور شاید کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اسلام کی دعوت کے حوالہ سے اپنی بات کہنے اور لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے آج کی طرح کا سازگار ماحول نہ ملے اس لیے میری رائے میں مغرب میں اسلام کی دعوت و تعارف کا یہ چانس خدانخواستہ آخری ہے اور ہمیں اس کو کسی حال میں ضائع نہیں کرنا چاہیے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کے دینی اور تعلیمی ادارے

اس سلسلہ میں زیادہ کردار ادا کر سکتے ہیں اور ان کی ذمہ داری بھی زیادہ بنتی ہے اس کے لیے میری تجویز یہ ہے کہ یہاں کی ضروریات، نفسیات اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کی بنیادی تعلیمات کا سادہ سا تعارف اور اس کے ساتھ اسلام کی دعوت کو اس ملک کے ہر فرد تک پہنچانے کے لیے ہمیں منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ہم اس کام کا سنجیدگی کے ساتھ ارادہ کر لیں اور اس کی صحیح طریقہ سے منصوبہ بندی کر لیں تو اس کے لیے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ درکار ہو۔ ہم ایک سال یا زیادہ سے زیادہ دو سال میں یہ کام کر سکتے ہیں اور میں یہاں کے علماء کرام، تعلیمی اداروں اور دینی مراکز سے اس پر سنجیدہ توجہ کی درخواست کر رہا ہوں۔

دوسرا مسئلہ عالمی استعمار کی فکری اور ثقافتی یلغار میں اس کی پیدا کردہ گمراہیوں اور مغالطّوں کا ہے جن کی نشاندہی علماء کرام کی ذمہ داری ہے لیکن ہمیں سرے سے اس کا ادراک ہی نہیں ہے۔ ہم صرف یہ واویلا کرنے اور شور کرنے پر قناعت کیے ہوئے ہیں کہ مغرب ہماری ثقافت کو برباد کر رہا ہے ہمارے دین وعقیدہ کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے اور وہ کون سے مسائل ہیں جو گمراہی کا عنوان ہیں ان کی طرف سرے سے ہماری توجہ نہیں ہے اور ہم صرف مغرب کی ثقافتی یلغار کا شور مچا کر خوش ہیں کہ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں جو میرے نزدیک انتہائی سادہ لوحی کی بات ہے۔

ایک علمی مسئلہ کے حوالہ سے اپنی بات واضح کرنا چاہوں گا مثلاً گلوبلائزیشن کا مسئلہ ہے جو اس وقت دنیا کا سب سے اہم موضوع ہے اور دنیا کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ نسل انسانی اور انسانی معاشرہ قومیت اور علاقائیت کے دائروں سے نکل کر اور زبان ونسل کے فرق سے بالاتر ہو کر عالمگیریت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک مشترک عالمی معاشرہ تشکیل پا رہا ہے۔ جی ایٹ کے نام سے آٹھ سرمایہ دار ملکوں نے اس کی قیادت سنبھال رکھی ہے وہ عالمگیریت اور بین الاقوامیت کے اس رجحان کو اپنی خواہشات اور پروگرام کے مطابق ڈھال کر پوری دنیا پر اپنی تہذیبی، تجارتی اور سیاسی بالادستی مسلط کرنے کے درپے ہیں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو قوت وطاقت کے ساتھ بلڈوز کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں بظاہر یہ عالمی معاشرہ قائم کرنے اور انسانوں کو قومیتوں اور علاقائیت کے دائروں سے نکال کر بین الاقوامیت کے

وسیع دائرہ میں لانے کا ہے لیکن دراصل آٹھ سرمایہ دار اور طاقت ور ملکوں کے مشترکہ پروگرام اور قیادت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کی منصوبہ بندی ہے جسے گلوبلائزیشن کے نام سے آگے بڑھایا جارہا ہے میں اس حوالہ سے دو پہلوؤں کا بطور خاص تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں ایک یہ کہ یہ بات سراسر گمراہی اور مغالطہ آفرینی ہے کہ گلوبلائزیشن کا آغاز اب ہورہا ہے اور جی ایٹ میں شامل ممالک دنیا کو اس سے متعارف کرر ہے ہیں۔ اس لیے کہ عالمگیریت اور گلوبلائزیشن کا آغاز اس زمین پر اس وقت ہو گیا تھا جب جناب نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے پوری نسل انسانی کے لیے بطور نبی مبعوث ہونے کا اعلان فرمایا تھا اور رنگ، نسل، زبان اور قومیت کے تمام دائروں کو توڑتے ہوئے پوری نسل انسانی کو ایک دین، نظام حیات اور فلسفہ زندگی کی لڑی میں پرو دیا تھا اور یہ صرف نظری بات نہیں تھی بلکہ عملی طور پر خلفاء راشدینؓ کے دور سے ایک ایسی ریاست وجود میں آگئی تھی جس میں عرب، افریقہ اور ایشیا کے علاقے اور اقوام رنگ ونسل کے کسی امتیاز کے بغیر ایک نظام حیات اور ایک ہی نظام حکومت میں بھائیوں کی طرح شریک تھے اور خلافت کا یہ تسلسل تیرہ صدیوں تک دنیا کے نقشے پر عملاً موجود رہا ہے ۱۹۲۴ء میں ختم ہونے والی ترکی کی خلافت عثمانیہ کو ہی دیکھ لیجیے اس کی تمام تر کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود اس میں آخر تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اور اقوام شامل رہی ہیں جو ایک ہی نظام حیات کے علمبردار تھے اور ایک ہی ریاستی سسٹم کے تحت زندگی بسر کرر ہے تھے مغرب نے سازشوں کے ذریعہ اس کا خاتمہ کیا اور اب ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک دنیا کے نقشے پر موجود رہنے والی عالمگیریت کی نفی کر کے دنیا کو عالمگیریت کے آغاز کی نوید دی جارہی ہے جو سراسر دھوکہ ہے اور فراڈ ہے کیونکہ عالمگیریت اور گلوبلائزیشن تو پہلے سے موجود ہے، چودہ سو سال سے عملاً چلتی آرہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اسلام کی عالمگیریت کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر تھی اور آج مغرب کی طرف سے مسلط کی جانے والی عالمگیریت کی بنیاد انسانی خواہشات پر ہے کہ سوسائٹی کی اکثریت جو چاہے وہی قانون ہے اور وہی حلال وحرام کی بنیاد ہے، انسانی سوسائٹی کی اکثریت جسے چاہے جائز قرار دے اور جسے چاہے ناجائز قرار دے ڈالے اس میں انسانی خواہشات کے سوا اور کسی بات کا دخل نہیں ہے اور نہ ہی وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کا اس سے

کوئی تعلق ہے۔

بلکہ یہاں تو بات اس سے بھی مختلف ہے اور جی ایٹ کی قیادت میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے فورم سے جو عالمگیریت دنیا پر زبردستی مسلط کی جارہی ہے۔ اس کی بنیاد نسل انسانی کی اجتماعی خواہشات پر بھی نہیں بلکہ آٹھ ممالک کی بالادستی پر ہے اور غریب ممالک و اقوام پر سرمایہ دار اور طاقت ور ملکوں کی اجارہ داری قائم کرنے پر ہے مگر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس گلوبلائزیشن اور عالمگیریت کو مسلسل فروغ دیا جارہا ہے۔

(روزنامہ اوصاف ہفتہ ۱۷ نومبر ۲۰۰۱ء)

عالم اسلام پر مغربی فکر کی یلغار
اور
علماء کرام کی ذمہ داری

۲ اگست ۱۹۹۲ء کو ہڈرسفیلڈ (انگلینڈ) میں جمعیت علماء برطانیہ کی ساتویں سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں امام کعبہ سماحۃ الشیخ محمد بن عبداللہ السبیل حفظہ اللہ تعالیٰ اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا خان محمد مدظلہ العالی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے جبکہ مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد موسیٰ پانڈور، مولانا عبدالرشید ربانی، مولانا قاری تصور الحق، مولانا مفتی محمد اسلم، مولانا سید محمد سلیم شاہ، مولانا قاری محمد عمران جہانگیری، مولانا محمد اکرم طوفانی اور دیگر علماء کرام کے علاوہ مدیر الشریعہ مولانا زاہد الراشدی نے بھی کانفرنس سے خطاب کیا ان کا فکر انگیز خطاب درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

حضرت الامیر، قابل صد احترام علماء کرام اور محترم بزرگو اور ساتھیو!

سب سے پہلے جمعیت علماء برطانیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس کانفرنس میں حاضری اور آپ حضرات سے گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ جمعیت کے راہنماؤں کو جزائے خیر دیں اور کچھ مقصد کی باتیں عرض کرنے کی توفیق سے نوازیں آمین۔ میری گفتگو کا عنوان ہے ”عالم اسلام پر مغربی فکر کی یلغار اور علماء کرام کی ذمہ داری“ یہ عنوان خود میرا تجویز کردہ ہے اور آج کی اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عنوان کے تحت کچھ تلخ گزارشات آپ

حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور اسی لیے غالب مرحوم کا شعر بطور معذرت ابتدا میں آپ کی نذر کیا ہے۔ حضرات محترم! اس عنوان کے تحت بنیادی طور پر چار امور غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ مغربی فکر کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ مغربی فکر کے عالم اسلام پر اثرات کیا ہیں؟ تیسرا یہ کہ اس کے مقابلہ میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ کہاں تک موثر ہے؟ اور چوتھا یہ کہ مسلمانوں کو اس مغربی فکر کے حصار سے نکالنے کے لیے علماء کرام پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ جہاں تک مغربی فکر اور فلسفہ کا تعلق ہے اس کا مختصر تعارف یہ ہے کہ یورپ میں بادشاہت اور کلیسا کے مظالم کے خلاف یہاں کے عوام کی بغاوت اور صنعتی انقلاب کے ساتھ اس فکر کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انقلاب فرانس اس کا نقطہ آغاز ہے جو بادشاہت کے خلاف تھا اور اس انقلاب سے ہی یورپ میں جمہوری دور شروع ہوا۔ کلیسا نے اس کشمکش میں بادشاہ کا ساتھ دیا اور صنعت وسائنس کی ایجادات وانکشافات سے انکار کی راہ اختیار کی۔ اس لیے بادشاہت کے ساتھ ساتھ پورے یورپ میں کلیسا کے اقتدار کا بوریا بستر بھی لپیٹ دیا گیا، مذہب کو اجتماعی زندگی سے لاتعلق کر دیا گیا، پادری کا کردار چرچ کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گیا، بائبل کی صرف وہ باتیں قابل توجہ قرار پائیں جن کا تعلق اعتقادات، عبادات اور شخصی اخلاق سے ہے اور سیاست، معاشرت، معیشت قانون اور نظم ونسق سمیت انسانی زندگی کے تمام اجتماعی شعبوں سے مذہب، کلیسا اور پادری کو کلیتاً بے دخل کر دیا گیا۔ یہ ہے مغربی فکر اور فلسفہ جس کی بنیاد پر انسانی زندگی کے اجتماعی شعبوں سے مذہب کی مکمل لاتعلقی پر ہے اور اسے سیاسی زبان میں سیکولرازم کہا جاتا ہے جو آج عالم اسلام میں بھی دین اور دینی قوتوں کے خلاف صف آراء ہے۔

آپ حضرات برطانیہ میں رہتے ہیں اور اجتماعی زندگی کی مذہب سے لاتعلقی کے نتائج وثمرات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ابھی مولانا عبدالرشید ربانی نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ برطانیہ میں جو چرچ خرید کر مساجد میں تبدیل کیے گئے ہیں ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ یہاں کے عام آدمی کا مذہب کے ساتھ کوئی عملی تعلق باقی نہیں رہا، چرچ فروخت ہو رہے ہیں اور پادری کا کردار دن بدن محدود ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ جس مذہب کا انسان کی عملی اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق باقی نہ

رہے وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

اب آیئے ان اثرات کا جائزہ لیں جو گزشتہ دوسو سالہ استعماری تسلط کے دوران اس فکر و فلسفہ کے حوالہ سے عالم اسلام پر مرتب ہوئے ہیں۔ عالم اسلام کے بیشتر ممالک ایک عرصہ تک مغربی ممالک کے زیر تسلط رہے ہیں۔ کچھ پر برطانیہ کا قبضہ رہا ہے، کچھ فرانس کے زیرنگیں تھے اور کچھ پر ولندیزیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اس دوران ان قوتوں نے ہماری پوری طرح برین واشنگ کی ہے اور ہمیں ہمارے ماضی سے کاٹنے کے لیے پورے ذرائع استعمال کیے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی جیسے فتنے کھڑے کیے گئے، جہاد اور خلافت کے تصور کو مسلمانوں کے ذہنوں سے محو کرنے کے لیے منظّم محنت کی گئی، علماء اسلام نے ان فتنوں کا مقابلہ کیا، ان کو ناکام بنانے کے پورے جتن کیے لیکن آج نتائج کے اعتبار سے جب دیکھتے ہیں تو اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ استعماری قوتیں اپنے مقاصد میں کامیاب رہی ہیں۔ ہم نے مرزا غلام احمد کے فتنہ کا مقابلہ کیا، اسے کافر قرار دیا، اس کے گمراہ کن عقائد کی تردید کی اور اس گرہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے میں کامیابی حاصل کی لیکن اس کی جھوٹی نبوت کا بنیادی مقصد جہاد کی مخالفت تھا اس لحاظ سے دیکھیں تو اس کا مشن کامیاب نظر آتا ہے۔ آج ہماری اجتماعی زندگی میں جہاد کا تصور نہیں ہے وہ تو افغان مجاہدین کو دعائیں دیں کہ انہوں نے لاکھوں جانوں کی قربانی سے جہاد کے عمل کو عالم اسلام میں دوبارہ زندہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جہاد کے احیا کا ذریعہ بنا دیا ورنہ جہاد اور خلافت کے تصور کو ہمارے ذہنوں اور اجتماعی زندگی سے نکالنے میں استعماری قوتیں کامیاب رہی ہیں۔ ہمارے سیاسی نظام کی بنیاد خلافت پر ہے لیکن ہم میں سے کوئی آج خلافت کے حوالہ سے بات نہیں کرتا حتیٰ کہ علماء کرام کی زبان پر بھی جمہوری نظام کی باتیں ہیں اور خلافت و جہاد کا ذکر تک متروک ہوگیا ہے۔ ہم اسلامی نظام کے نعرے لگاتے ہیں لیکن اجتماعی زندگی میں مذہب کی عملداری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایک مسلمان ملک کی پارلیمنٹ قرآن وسنت کو بالاتر قانون تسلیم کرنے کا بل منظور کرتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس سے سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہیں ہوگا۔ سیکولرازم اسی کا نام ہے اور مغرب کا فکر و فلسفہ یہی

ہے جو آج ہماری اجتماعی زندگی کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

حضرات گرامی قدر! اگر علماء کرام مجھے اس گستاخی پر معاف فرمائیں تو یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہماری دینی درسگاہوں میں بھی اسلام کے اجتماعی پہلوؤں پر بات نہیں ہوتی۔ دینی تعلیم کے حوالہ سے ہماری گفتگو اعتقادات، عبادات، اخلاقیات یا زیادہ سے زیادہ خاندانی معاشرت کے مسائل تک محدود رہتی ہے۔ ہم بخاری شریف پڑھاتے ہیں تو ہمارا سارا زور کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ کے مباحث میں صرف ہو جاتا ہے۔ بخاری میں کتاب البیوع بھی ہے، کتاب الجہاد بھی ہے، کتاب الامارہ بھی ہے، کتاب الاجارہ بھی ہے، کتاب المزارعۃ بھی ہے اور زندگی کے اجتماعی شعبوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے ابواب بھی ہیں لیکن ہم ان ابواب سے یوں گزر جاتے ہیں جیسے یہ سب منسوخ ہو گئے ہیں۔ ہم آج کے نظاموں سے ان ابواب کا تقابل نہیں کرتے اور اپنے تلامذہ کو یہ نہیں بتاتے کہ آج کی تجارت میں اور اسلامی تجارت میں کیا فرق ہے، آج کے سیاسی نظاموں اور خلافت میں کیا فرق ہے، سود اور مضاربت میں کیا فرق ہے اور آج کے جنگی اصولوں اور جہاد میں کیا فرق ہے۔ مجھے اس دکھ کا اظہار کرنے کی اجازت دیجیے کہ ہم بخاری اور ترمذی پڑھاتے ہوئے ایک مسئلہ پر چھ چھ دن بحث کرتے ہیں اور دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں آخر میں نتیجہ کیا نکلتا ہے یہی کہ یہ اولیٰ ہے اور وہ غیر اولیٰ ہے جبکہ سیکولر دانشور ہمیں سود کا متبادل پیش کرنے کا چیلنج کر رہے ہیں، اسلامی قوانین کو وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دے رہے ہیں اور انسانی حقوق کے حوالے سے اسلامی نظام کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ہمیں سرے سے ان مسائل کا ادراک ہی نہیں ہے، ان کی کوئی اہمیت ہمارے نزدیک نہیں ہے اور ہم ان مسائل کو علمی مباحث کا موضوع بنانے کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ آخر یہ ذہن ہمیں کہاں سے ملا ہے؟ کہیں ہم بھی غیر شعوری طور پر مغربی فلسفہ اور فکر کو قبول تو نہیں کر چکے؟ میرے محترم بزرگو اور دوستو! ہم تسلیم کریں یا نہ کریں یہ حقیقت ہے کہ مغرب کا لادینی فلسفہ ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا ہے اور ہم اس کے دائرہ سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں پاتے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ مغرب اس پر بھی مطمئن نہیں ہے وہ عالم اسلام کو اسلامی نظام سے دور رکھنے کے لیے نئی صف بندی کے ساتھ سامنے آگیا ہے، انسانی حقوق اور بنیاد پرستی کے عنوان سے ایک نئی

فکری جنگ کا آغاز کر چکا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے کسی خطہ میں اگر اسلامی نظام صحیح طور پر عملاً نافذ ہو گیا تو مغربی فلسفہ کے لیے اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا اور روسی کمیونزم کی طرح مغربی سیکولرازم بھی ریت کی دیوار کی طرح بکھر کر رہ جائے گا۔ اسی لیے مغرب اور صرف مغرب ہی نہیں چین و جاپان اور تمام غیر اسلامی قوتیں اس نکتہ پر متفق ہو چکی ہیں کہ انسانی حقوق کا واویلا کر کے اور بنیاد پرستی کا ہوّا کھڑا کر کے اسلامی نظام کے خلاف نفرت کا ایک طوفان بپا کر دیا جائے اور دنیا کے کسی خطہ میں اسلامی نظام کو کسی قیمت پر نافذ نہ ہونے دیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کے کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام مکمل طور پر نافذ نہیں ہے، صرف سعودی عرب کا عدالتی نظام قرآن و سنت کے مطابق ہے اور فقہ حنبلی کے مطابق لوگوں کے مقدمات کے فیصلہ ہوتے ہیں سیاسی اور معاشی شعبوں میں وہاں بھی اسلامی نظام نہیں ہے صرف عدالتی نظام اسلام کے مطابق ہے اور قرآن و سنت کے قوانین نہ صرف نافذ ہیں بلکہ ان پر بلاامتیاز عمل بھی ہوتا ہے۔ اس کی برکات یہ ہیں کہ دنیا میں جرائم کی سب سے کم شرح سعودی عرب میں ہے۔ گزشتہ سال کی سروے رپورٹوں کے مطابق نیویارک میں ایک سال کے دوران ڈکیتی کی ترانوے ہزار وارداتیں ہوئیں اور لندن میں چوری کی پونے دو لاکھ وارداتوں کو ریکارڈ پر لایا گیا مگر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں سروے کر کے دیکھ لیں کہ گزشتہ سال کے دوران چوری اور ڈکیتی کے کتنے واقعات ہوئے ہیں۔ یہ اسلام کی برکات ہیں اسلام کے نظام قانون کے ثمرات ہیں اور آپ خود اندازہ کریں کہ اگر صرف ایک شعبہ میں اسلام نافذ کرنے کے نتائج و ثمرات یہ ہیں تو مکمل اسلامی نظام کی برکات کا کیا عالم ہوگا؟ مغرب اس سے بے خبر نہیں ہے مغربی دانشور ناسمجھ نہیں ہیں بے حد دانا اور عقلمند ہیں انہیں اپنے فلسفہ و نظام کا کھوکھلا پن اور اسلامی نظام کی برکات و ثمرات نظر آرہے ہیں اور وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ دنیا کے کسی ملک میں صحیح اور مکمل اسلامی نظام نافذ ہونے کی صورت میں مغربی فلسفہ کا حشر کیا ہوگا وہ اس لیے اسلامی نظام کا راستہ روکنے اور اس کے سامنے نفرت کی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں، الجزائر، مصر، تیونس، مراکش، انڈونیشیا اور ملائیشیا سمیت دنیا کے بیشتر مسلم ممالک میں یہی جنگ جاری ہے، افغانستان کی خانہ جنگی کے پیچھے یہی سازش کارفرما ہے کہ کہیں افغان مجاہدین مکمل اسلامی

نظام نافذ کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

حضرات محترم! آج امریکہ کا ''نیو ورلڈ آرڈر'' سامنے ہے۔ اس حوالہ سے امریکہ عالم اسلام پر اپنا شکنجہ مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ایک بات آپ کے نوٹس میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امریکہ نے پاکستان کی جو امداد بند کر رکھی ہے اس کی بحالی کی شرائط میں صرف ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ نہیں بلکہ اسلامی قوانین اور قادیانیت کے مسائل بھی ان شرائط میں شامل ہیں۔ آج ان شرائط کے حوالہ سے صرف ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ عوام کے سامنے ہے۔ اس پر پاکستان کی قوم کا ایک ہی موقف ہے اور ہم اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں بلکہ ہمارا موقف تو اس سے آگے ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم بنانا مسلمان ملکوں کا حق ہے اور اس کے بارے میں مسلم حکومتوں کو معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ بات آپ کے علم میں ہونی چاہیے کہ امریکی شرائط میں صرف ایٹمی تنصیبات کا سوال نہیں بلکہ یہ بات بھی شامل ہے کہ حکومت پاکستان قادیانیوں کے خلاف کیے گئے آئینی و قانونی اقدامات واپس لے اور یہ بھی ان شرائط میں ہے کہ پاکستان میں انسانی حقوق کے منافی کوئی قانون نافذ نہ کرنے کی ضمانت دی جائے۔ بظاہر یہ ایک خوبصورت سا جملہ ہے لیکن اس کی تہ میں جو زہر چھپا ہوا ہے اس سے آپ حضرات کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔ انسانی حقوق کا مغربی تصور یہ ہے کہ قرآن کریم نے چوری، زنا، ڈکیتی اور قتل کی جو سزائیں مقرر کی ہیں۔ مغربی دانشور انہیں انسانی حقوق کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہاتھ کاٹنا، کوڑے مارنا، سنگسار کرنا اور قاتل کو قصاص میں قتل کرنا تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ ان سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں اور انسانی حقوق کے منافی تصور کرتے ہیں جبکہ ہماری مرعوبیت کا حال یہ ہے کہ اس وقت بھی پاکستان کی عدالت عظمیٰ میں اس نکتہ پر بحث جاری ہے کہ مجرم کو عام لوگوں کے سامنے سزا دینا انسانی حقوق کے منافی ہے یا نہیں۔ وہاں یہ دلائل دیے جا رہے ہیں کہ مجرم کو برسر عام سزا دینا اس کی عزت نفس کے خلاف ہے عزت نفس انسانی حقوق میں شامل ہے اور ہم انسانی حقوق کی پاسداری کا وعدہ کر چکے ہیں اس لیے پاکستان میں کسی مجرم کو برسر عام پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ مجرم کو عام لوگوں کے سامنے سزا دو تا کہ وہ عبرت پکڑیں لیکن ہماری عدالت عظمیٰ اس بحث میں الجھی ہوئی ہے کہ کہیں یہ انسا

حقوق کے منافی تو نہیں اس سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مغرب کا انسانی حقوق کا تصور کیا ہے اور جب مغربی ممالک اور لابیاں ہم سے انسانی حقوق کی پاسداری کا تقاضا کرتی ہیں تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔

علماء کرام! آیئے تھوڑی دیر کے لیے ''بنیاد پرستی'' کے طعنے کا بھی جائزہ لے لیں۔ آج ہمیں مغرب کی طرف سے بنیاد پرستی کا طعنہ دیا جاتا ہے اور ہم جذبات میں آ کر خود جوش کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہم بنیاد پرست ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ہمیں اس طعنہ اور الزام کے پس منظر کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کی وجہ سمجھنا چاہیے کہ آخر اس طعنہ کا مقصد کیا ہے؟ اور بنیاد پرستی سے مغرب کی مراد کیا ہے؟ کسی لفظ یا جملہ کا لفظی معنی کچھ بھی ہو لیکن جب تاریخ اسے کسی خاص مفہوم اور مصداق کے لیے متعین کر دیتی ہے تو وہ جب بھی بولا جاتا ہے اس سے وہی اصطلاحی معنی مراد ہوتا ہے اس لیے ہمیں بنیاد پرستی کے اصطلاحی معنی تلاش کرنا ہوں گے۔ تاریخ یہ کہتی ہے کہ بنیاد پرست سب سے پہلے ان پادریوں کو کہا گیا تھا جو یورپ میں بادشاہت اور کلیسا کے مظالم کے خلاف جمہوری انقلاب میں بادشاہ کے ساتھ تھے اور عوام پر بادشاہ اور جاگیردار کے مظالم کی حمایت کرتے تھے۔ وہ پادری جدید سائنس، ترقی اور عوامی حقوق کے خلاف فریق بن گئے انہیں تاریخ میں بنیاد پرست کا خطاب ملا اور بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر ان پادریوں کے اقتدار کا سورج بھی ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ آج جب مغربی لابیاں عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات پر بنیاد پرستی کی پھبتی کستی ہیں تو اس سے ان کا مقصد اپنی رائے عامہ کو یہ باور کرانا ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے یہ علماء اور دینی راہنما دراصل اسی پادری کی طرح ہیں جسے مغربی رائے عامہ نے تین سو سال قبل مسترد کر کے گرجوں میں محصور کر دیا تھا۔ مغربی لابیاں ہمیں بنیاد پرست قرار دے کر اپنے ممالک کی رائے عامہ پر خوف مسلط کرنا چاہتی ہیں کہ عوام کو حقوق سے محروم کرنے والا اور سائنسی انکشافات اور ایجادات سے انکار کرنے والا پادری دوبارہ زندہ ہو رہا ہے اس سے بچو، اس کو روکو اور اس کو کسی ملک پر مسلط نہ ہونے دو ورنہ تمہارا وہ ظلم اور تاریکی کا دور واپس آ جائے گا۔ یہ ہے پس منظر بنیاد

پرستی کے طعنے کا اور اب آپ فیصلہ کریں کہ آپ اس الزام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ میں تو اس سے انکار کرتا ہوں اور اس پادری کا کردار قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جو عوام کے مقابلہ میں بادشاہ کا ساتھی تھا اور علم و ترقی کے مقابلہ میں جہالت کا طرفدار تھا۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ کا خاصا وقت لے لیا ہے اور گستاخیوں کا مرتکب بھی ہوا ہوں لیکن اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوں اور آپ سے دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ صورت حال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں، مغرب کے عزائم اور چیلنج کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس بات کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ تجزیہ کریں کہ اس چیلنج کے مقابلہ میں ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہماری دینی تحریکات کیا کر رہی ہیں؟ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم میں سے بیشتر کو تو ان مسائل کا ادراک و احساس ہی نہیں ہے اور اگر کسی حلقہ میں ادراک و احساس ہے تو ہماری ترجیحات درست نہیں ہیں اور ہم مسائل کے تجزیہ و تحلیل اور ان کے حل کے لیے گہری سوچ اور منصوبہ بندی کے عادی نہیں رہے۔ آپ حضرات مغرب میں رہتے ہیں آپ نے مغربی معاشرہ سے بہت سی باتیں سیکھی ہیں لیکن ان کی یہ عادت اپنانے کی ہم نے کوشش نہیں کی، ان کی یہ عادت اچھی ہے کہ مسائل کا تجزیہ جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کرتے ہیں اور پوری سنجیدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ ہمیں بھی جذبات سے ہٹ کر عالم اسلام کی صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے، مغرب کے چیلنج کو سمجھنا چاہیے، اس کے طریق واردات کو سمجھنا چاہیے اور پورے شعور، دانش اور جرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مغرب کی رائے عامہ تک رسائی حاصل کریں، مغربی میڈیا اور سائنٹفک طریق کار تک رسائی حاصل کریں اور اسلام کے احکام و قوانین کو آج کی زبان میں آج کی دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو ہمارا جرم نہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں معافی کے قابل ہوگا اور نہ تاریخ ہمیں معاف کرے گی۔ میں ایک بار پھر جمعیت علماء برطانیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تلخ و ترش گزارشات پر آپ سب بزرگوں اور دوستوں سے معذرت خواہ ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ

رب العزت ہم سب کو صحیح سمت پر دین اسلام کی مثبت اور مؤثر خدمت کی توفیق سے نوازیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

(مطبوعہ ماہنامہ الشریعہ)

نفاذ شریعت کی جدوجہد اور مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں

"مدیر" الشریعہ" مولانا زاہد الراشدی ۱۹۹۰ء میں شمالی امریکہ کے دورہ کے موقع پر شکاگو بھی گئے جہاں انہوں نے ۲ دسمبر کو مسلم کمیونٹی سنٹر کے ہفتہ وار اجتماع سے "شریعت بل اور پاکستان" کے موضوع پر مندرجہ ذیل خطاب کیا"۔

بعد الحمد والصلوٰۃ:

محترم بزرگو! دوستو اور قابل صد احترام بہنو!

ابھی تھوڑی دیر قبل شکاگو پہنچا ہوں اور مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ آپ حضرات کے سامنے پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی جدوجہد کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں۔ اس عزت افزائی پر ایم۔سی۔سی کے ذمہ دار حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ سب احباب سے اس دعا کا خواستگار ہوں کہ اللہ رب العزت کچھ مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق دیں اور حق کی جو بات بھی علم اور سمجھ میں آئے اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا الہ العالمین۔

حضرات محترم! پاکستان کا قیام ہی اس مقصد کے لیے عمل میں آیا تھا اور قیام پاکستان کی بنیاد اس امر کو ٹھہرایا گیا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے مذہب، اقدار، روایات اور نظریات و عقائد پر عمل درآمد کے لیے مسلمانوں کو الگ خطہ وطن کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرہ کے ساتھ پاکستان قائم کیا گیا تھا لیکن قیام پاکستان کو تینتالیس (اب ساٹھ) سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک ہم اپنے ملک کے نظام اور اجتماعی ڈھانچے کو اسلامی عقائد و

احکام کے سانچے میں ڈھالنے کی منزل حاصل نہیں کر سکے اور شریعت اسلامیہ کی بالا دستی اور نفاذ کا جو خواب پاکستان کے قیام سے پہلے اس خطہ کے مسلم عوام نے دیکھا تھا وہ ابھی تک تشنہ تعبیر ہے۔

اس سے پہلے کہ میں ان رکاوٹوں کا ذکر کروں جو پاکستان میں اسلام کے نفاذ اور شریعت کی بالا دستی کی راہ میں حائل ہیں، نفاذ شریعت کے حوالے سے اس تدریجی پیش رفت سے آپ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کی رفتار اگرچہ بہت سست ہے لیکن بہرحال ایک پیش رفت موجود ہے اور اس سلسلہ میں عملی کام ہوا ہے جسے آگے بڑھانے کی کوشش مسلسل جاری ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور بنیادی کام ''قرارداد مقاصد'' کی منظوری ہے جو ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کے رکن حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد کے نتیجہ میں متفقہ طور پر پاس ہوئی۔ اس قرارداد میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے یہ طے کیا گیا ہے کہ عوام کے منتخب نمائندے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ملک کا نظام چلائیں گے۔ یہ ایک اصولی فیصلہ تھا جس سے ملک کی نظریاتی بنیاد متعین ہوگئی اور اس امر کا فیصلہ ہوگیا کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست نہیں بلکہ نظریاتی اسلامی مملکت ہے۔

قرارداد مقاصد پاکستان میں اب تک نافذ ہونے والے ہر دستور میں شامل رہی ہے اور موجودہ آئین میں بھی جو ۱۹۷۳ء کا دستور کہلاتا ہے شامل ہے لیکن اس قرارداد کی روشنی میں جو عملی اقدامات ہونا چاہیے تھے ان کی رفتار سست رہی بلکہ ایک لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھی۔

دوسرا مرحلہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تشکیل کا تھا اس وقت دستور ساز اسمبلی میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ، حضرت مولانا عبد الحق صاحبؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، پروفیسر غفور احمد اور ان کے رفقا کی جدوجہد سے ایک اور اہم دستوری فیصلہ ہوگیا کہ اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا اور ملک میں نافذ قوانین کو اسلامی احکام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کے ساتھ اس کام کے لیے وقت کی ایک حد طے کر دی گئی۔

تیسرے مرحلہ میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور اقتدار میں ہونے والے وہ اقدامات شامل ہیں جن کے تحت بعض شرعی قوانین کے نفاذ کے علاوہ وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ وفاقی شرعی عدالت ممتاز علماء کرام اور جسٹس صاحبان پر مشتمل ہے اور اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ملک کے کسی بھی قانون کو قرآن وسنت کے منافی قرار دے کر حکومت کو قانون کی تبدیلی کا نوٹس دے سکتی ہے۔ اگرچہ دستوری دفعات، عدالتی نظام، مالیاتی قوانین اور عائلی قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود بہت سے امور شرعی عدالت کی دسترس میں تھے اور اس نے اس ضمن میں متعدد اہم فیصلے بھی کیے ہیں۔

چوتھا مرحلہ ''شریعت بل'' کے نفاذ کی جدوجہد کا ہے۔ ''شریعت بل'' سینٹ آف پاکستان کے دو ارکان مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف نے ۱۹۸۵ء میں پیش کیا تھا جس کے لیے گذشتہ پانچ سال سے جدوجہد اور بحث وتمحیص ہر سطح پر ہوئی ہے۔ مختلف ایوانوں کے علاوہ قومی اخبارات اور عوامی حلقوں میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل سینٹ نے شریعت بل کو متفقہ طور پر منظور بھی کر لیا تھا لیکن قومی اسمبلی ٹوٹ جانے کے باعث یہ بل اس میں پیش نہ ہوسکا اور اب پھر سینٹ میں دوبارہ منظوری کے لیے زیر بحث ہے۔

حضرات گرامی قدر! اس وقت ''شریعت بل'' کی تمام دفعات کی وضاحت کرنے کی تو گنجائش نہیں ہے کیونکہ وقت بہت مختصر ہے مگر بعض اہم دفعات کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ آپ حضرات یہ سمجھ سکیں کہ اس بل کا بنیادی مقصد کیا ہے۔

شریعت بل کی سب سے اہم اور بنیادی دفعہ وہ ہے جس میں شریعت اسلامیہ کو ملک کا ''سپریم لاء'' قرار دیا گیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں مختلف قسم کے قوانین رائج ہیں۔ ان میں برطانوی دور غلامی کے قوانین بھی ہیں جو حصول آزادی کے باوجود بدستور چلے آ رہے ہیں اور بعض شرعی قوانین بھی ہیں۔ اس کے علاوہ رواجات بھی بعض دائروں میں قانون کے طور پر مؤثر ہیں مگر ان سب پر بالادستی موجودہ قانونی نظام کو حاصل ہے جو برطانوی استعمار کی یادگار ہے۔ شریعت بل میں شریعت کو ملک کا سپریم لاء قرار دے کر اس

امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ تمام غیر شرعی قوانین کو غیر مؤثر بنایا جائے۔

بل کی ایک دفعہ میں شریعت کی قانونی تعریف متعین کی گئی ہے کیونکہ مختلف حلقے شریعت کے بارے میں ابہام پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے ''شریعت بل'' میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ شریعت سے مراد اسلام کے وہ احکام ہیں جو قرآن وسنت سے ثابت ہوں۔

ایک اور اہم دفعہ میں ملک کی تمام عدالتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کریں۔ اس سے ملک کے عدالتی نظام میں انقلابی تبدیلی کی راہ ہموار ہوگی اور اس دفعہ کے نفاذ کی صورت میں لوگوں کے مقدمات کے فیصلے انگریزی قانون کے بجائے شرعی قوانین کے تحت ہونے لگیں گے۔

ایک دفعہ کے تحت قانون کے نفاذ اور عدالتی احتساب کے دائرہ میں صدر، وزیر اعظم، گورنر اور وزیر اعلیٰ سمیت ان تمام شخصیات کو شامل کیا گیا ہے جو اس وقت مروجہ قانون کے تحت عدالتی احتساب سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے معاشی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک نظام کار وضع کیا گیا ہے اور تعلیمی نظام کو اسلامی تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے طریق کار طے کیا گیا ہے۔

برادران محترم! اس مختصر تعارف سے آپ کے ذہن میں یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ ''شریعت بل'' کے نفاذ سے اصل مقصد کیا ہے۔ یہ دراصل نظام کی تبدیلی کی جدوجہد ہے اور خاص طور پر ملک کے عدالتی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی جنگ ہے جس میں اس وقت ہم مصروف ہیں اور آپ حضرات سے کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ تعاون اور حوصلہ افزائی کے بھی طلب گار ہیں۔

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں جو آپ کے ذہنوں میں ضرور اٹھ رہا ہوگا کہ آخر اسلام کے نام پر بننے والے ملک اور مسلم اکثریت کے معاشرہ میں اس وقت شریعت بل پر آخر پانچ سال سے صرف بحث وتمحیص کیوں ہو رہی ہے اور یہ نافذ کیوں نہیں ہو جاتا؟ پھر یہ سوال بھی آپ حضرات کے ذہنوں کو پریشان کر رہا ہوگا کہ نفاذ اسلام کے جن تدریجی اقدامات کا میں نے ذکر کیا ہے ان سب کے باوجود حالات میں تبدیلی کیوں نہیں آ رہی اور

عملاً اسلامی احکام وقوانین اور کارفرمائی کیوں دکھائی نہیں دے رہی؟

ان سوالات کے جواب میں مناسب تو یہ تھا کہ ان رکاوٹوں کو تفصیل سے ذکر اور تجزیہ کیا جاتا جو نفاذ شریعت کی راہ میں حائل ہیں لیکن وقت مختصر ہے اس لیے میں اس سلسلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کا حوالہ دینے پر اکتفا کروں گا جو تمام رکاوٹوں کا سرچشمہ ہے اور جس رکاوٹ کو راستہ سے ہٹانے کے لیے ہم گزشتہ تینتالیس سال سے اس کے ساتھ سر پھوڑ رہے ہیں۔ وہ رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اجتماعی قیادت کی باگ ڈور جن عناصر کے ہاتھ میں ہے وہ نہ صرف مغربی تعلیم گاہوں کے تربیت یافتہ اور مغربی تہذیب وثقافت سے مرعوب ہیں بلکہ اپنے معاشرہ میں مغربی نظریات واقتدار کی فکری اور تہذیبی نمائندگی کو مقصد زندگی سمجھے ہوئے ہیں۔ ویسٹرن میڈیا اسلام کے بارے میں جو شوشہ چھوڑتا ہے وہ ان کا منشور بن جاتا ہے۔ مغرب والے اگر نفاذ اسلام کی جدوجہد پر بنیاد پرستی کی پھبتی کستے ہیں تو ہمارے یہ بھائی بھی بنیاد پرستوں سے لاتعلقی کے اظہار کو ضروری سمجھ لیتے ہیں اور مغرب میں اگر اسلامی قوانین کو فرسودہ، وحشیانہ اور ظالمانہ کہا جاتا ہے تو ان لوگوں کی زبانیں بھی ان ہی الفاظ کا ورد کرنے لگتی ہیں۔

میرے محترم دوستو! آپ حضرات تو خود مغرب میں رہتے ہیں، یہاں کی قیادت اور میڈیا کا مزاج آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟ آپ کے سامنے سب کچھ ہوتا ہے۔ عالم اسلام کے خلاف یہاں سے جو سازشیں ہوتی ہیں آپ ان سے بے خبر نہیں ہیں اور آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پاکستان بلکہ تمام مسلم ممالک میں نفاذ شریعت کی تحریکات کو جن عناصر سے مقابلہ درپیش ہے ان کی پشت پر مغرب خود کھڑا ہے۔ یہ صرف پاکستان کی بات نہیں دوسرے مسلم ممالک میں بھی اسلام کی بالادستی اور شریعت کے نفاذ کی جدوجہد ہو رہی ہے۔ مصر میں، مراکش میں، انڈونیشیا میں، ملائیشیا میں، الجزائر میں، تیونس میں اور دوسرے مسلم ممالک میں دینی بیداری کی تحریکات کام کر رہی ہیں، نفاذ اسلام کی جدوجہد ہو رہی ہے اور ان سب کا مقابلہ ایک ہی قسم کے طبقے سے ہے، جو مغرب سے مرعوب ہے اور مغرب پوری طرح اس طبقہ کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ آپ حضرات یقیناً اس امر سے باخبر ہوں گے کہ امریکہ میں ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوٹ کام کر رہا ہے جس کا مقصد عالم اسلام میں دینی

بیداری کی تحریکات کا کھوج لگانا، ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور انہیں ناکام بنانے کے منصوبے تیار کرنا ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی سربراہی امریکہ کے سابق صدر نکسن کے ہاتھ میں ہے، جنہوں نے مسلم بنیاد پرستی کی تحریکات کے تعاقب کو اپنا مشن بنایا ہوا ہے۔

ہمارا مقابلہ ان قوتوں کے ساتھ ہے۔ ہماری رفتار اگرچہ بہت سست ہے لیکن قدم بہرحال آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم آپ سے دعا کے خواستگار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کام کی صحیح رفتار نصیب فرمائیں اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں کامیابی سے ہمکنار کریں۔ آمین یا الہ العالمین۔

حضرات محترم! ان گذارشات کے بعد ایک بات اور بھی آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ حضرات جو مغربی ممالک بالخصوص امریکہ میں آباد ہیں، عالم اسلام اور پاکستان میں نفاذ شریعت کی تحریکات کے حوالے سے آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ کون سے عملی کام ہیں جو اس سلسلہ میں آپ کر سکتے ہیں؟ آپ کا کام صرف دعا کرنا یا نیک خواہشات کا اظہار کرنا نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آپ کو عملی جدوجہد میں بھی شریک ہونا چاہیے اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ نفاذ شریعت کی جدوجہد کرنے والی تحریکات کو آپ مالی طور پر مضبوط بنائیں اور انہیں فنڈز مہیا کریں تاکہ وہ اپنی جدوجہد کے لیے مزید وسائل فراہم کر سکیں اور زیادہ منظم طریقہ سے کام کر سکیں۔ اس طریقہ سے آپ اس کام میں عملی طور پر شریک ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں اس سے بھی زیادہ مؤثر اور ضروری پہلو کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جو لابیاں یہاں بیٹھ کر مسلم ممالک میں اسلام بیزار عناصر کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ان کا مقابلہ آپ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ آپ ان لابیوں کو جانتے ہیں، ان کے مزاج اور طریق کار کو سمجھتے ہیں اور ایک آزاد سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، آپ کے پاس وسائل ہیں، سوچ ہے، استعداد ہے اور آپ ان تمام ذرائع تک پہنچ سکتے ہیں جو اسلام اور عالم اسلام کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ صرف اس کا احساس بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور کام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے سامنے کوئی منصوبہ پیش نہیں کر رہا، ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلا رہا ہوں اور اس کے حل کی ضرورت کا احساس بیدار

گزر رہا ہوں۔ اگر آپ اس کو مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کوئی کردار ادا کرنے پر اپنے دل و دماغ کو تیار پاتے ہیں تو اس کا عملی طریقہ خود سوچیے اگر یہودی یہاں بیٹھ کر صیہونیت اور اسرائیل کے لیے کام کر سکتا ہے تو مسلمان اسلام کے لیے کیوں نہیں کر سکتا؟ اور اگر یہودی یہاں کے وسائل اور سوسائٹی کی سہولتوں کو اپنے مذہب اور مرکز کے لیے استعمال میں لاتا ہے تو مسلمان کو بھی اس میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ بہرحال میری آپ حضرات سے اور امریکہ میں رہنے والے تمام مسلمانوں سے گذارش ہے کہ وہ اسلام دشمن لابیوں کے مقابلہ کے لیے خود کو منظم کریں اور مسلم ممالک میں نفاذ شریعت کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے عناصر کی سرپرست لابیوں کو ناکام بنانے کے لیے جو کچھ آپ کے بس میں ہے، کر گزریں۔

محترم دوستو اور بھائیو! آخر میں ایک اور ضروری بات آپ کی خدمت میں عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ شریعت کے سارے احکام حکومت اور اقتدار سے متعلقہ نہیں ہیں بلکہ بیشتر احکام ایسے ہیں جن پر عمل کے لیے ہمیں کسی حکومتی مشینری یا اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہے ہم اپنے وجود پر، اپنے خاندان پر اور اپنے ماحول پر آزادی کے ساتھ ان احکام وقوانین کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ ایسے قوانین کا نفاذ تو ہمیں بہرحال کرنا چاہیے اور قرآن وسنت کے جن احکام پر بھی ہم عمل کر سکتے ہیں ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس حوالہ سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین میں یہ گنجائش موجود ہے کہ آپ حضرات پرسنل لاء اور بزنس لاء میں اپنی مرضی کے قوانین پر عمل کر سکتے ہیں، اس مقصد کے لیے اپنی عدالتیں بنا سکتے ہیں اور ایک بورڈ آف آربیٹریسن سپریم کورٹ سے منظور کرا کے یہ آئینی تحفظ بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے فیصلے پرسنل لاء اور بزنس لاء میں ان کی تسلیم کردہ عدالتوں میں ان کی مرضی کے قوانین کے تحت کیے جائیں اور ان فیصلوں کو آئینی طور پر حتمی حیثیت حاصل ہو۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہودیوں نے یہاں پر تحفظات اور سہولتیں حاصل کر رکھی ہیں اور ان کی اپنی عدالتیں ان کے مقدمات کے فیصلے کر رہی ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر آپ حضرات کو اس سہولت سے محروم نہیں رہنا چاہیے اگر ایک معاملہ میں ہمیں شریعت کے قوانین پر عمل کرنے کا حق اور اختیار ملتا ہے اور ہم اسے استعمال نہیں کرتے تو اس میں حکومت کا کوئی قصور نہیں بلکہ ایسے معاملات میں شریعت پر عمل نہ کرنے میں ہم مجرم ہوں

گے۔ اس لیے آپ حضرات سے میری درخواست ہے کہ اس پہلو پر ضرور سوچیں اور اگر اسے اجتماعی طور پر عملی شکل دی جا سکتی ہو تو اس میں سستی اور کوتاہی سے کام نہ لیں۔ پھر اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عناصر جو امریکی معاشرہ سے مرعوب ہو کر نفاذ اسلام میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں ان کے سامنے جب یہ صورت آئے گی کہ خود امریکی معاشرہ میں مسلمان بہت سے معاملات میں اسلامی احکام وقوانین پر عمل کر رہے ہیں اور کچھ شعبوں میں یہاں اسلام عملاً نافذ ہے تو شاید انہیں بھی کچھ عقل آجائے اور وہ امریکی معاشرہ کی تقلید کے شوق میں ہی اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ کی طرف پیش رفت پر آمادہ ہو جائیں۔

بہر حال میں نے مسلم ممالک میں نفاذ شریعت کی تحریکات کے ساتھ مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو عملی وابستگی کی تین صورتیں عرض کی ہیں:

۱۔ آپ حضرات ان تحریکات کی زیادہ سے زیادہ مالی امداد کریں۔

۲۔ مغربی ممالک میں اسلام کے خلاف کام کرنے والی منظّم لابیوں کے منظم مقابلہ کا اہتمام کریں۔

۳۔ اس معاشرہ میں آپ کو جن شرعی قوانین پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے ان کے نفاذ اور عملدرآمد کی کوئی عملی صورت ضرور نکالیں۔

اللہ رب العزت مجھے اور آپ سب کو شریعت اسلامیہ کی بالادستی اور نفاذ کی جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی توفیق دیں اور عالم اسلام کو شریعت کے نفاذ کی منزل سے جلد ہمکنار فرمائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

محرم الحرام
اور
شہداء کی یاد

> نئے ہجری سال کے آغاز پر پاکستان شریعت کونسل پنجاب نے جامع مسجد امن جی ٹی روڈ باغبانپورہ لاہور میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں کونسل کے مرکزی سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے خطاب کیا۔ ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ:

آج یکم محرم الحرام ہے جو نئے ہجری سال کا پہلا دن ہے۔ ہجری سن کا آغاز جناب نبی اکرم ﷺ کی ہجرت سے ہوتا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے جس سال مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تھی، وہاں سے ہجری سن شروع ہوتا ہے اور سن چودہ سو بیس کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی اس ہجرت کو چودہ سو انیس سال پورے ہو چکے ہیں اور بیسواں سال شروع ہے۔ ہجرت نبوی ﷺ سے اسلامی سن کے آغاز کا حکم سب سے پہلے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے دیا تھا اور اس کے بعد سے ہماری اسلامی تاریخ اسی حساب سے چلی آ رہی ہے۔

ہجری سن قمری حساب سے ہے۔ دنیا میں سورج اور چاند کی گردش کے حساب سے دو قسم کے سن رائج ہیں۔ سورج کی گردش کے لحاظ سے جو سن رائج ہے، وہ شمسی کہلاتا ہے اور جنوری، فروری، مارچ وغیرہ مہینے اسی سن کے مہینے ہیں جبکہ چاند کی گردش کے حساب سے جو سن مروج ہے، وہ قمری کہلاتا ہے اور محرم، صفر، ربیع الاول وغیرہ اس سن کے مہینے ہیں۔

مروجہ شمسی سن ۱۹۹۹ عیسوی اور میلادی سن کہلاتا ہے، اس کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ہوتا ہے اور انیس سو ننانوے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو اتنے سال گزر چکے ہیں اور ان کی عمر اب دو ہزار سال کے لگ بھگ ہوگئی ہے۔ دنیا میں اوقات اور ایام کے تعین کے لیے سورج اور چاند دونوں کی گردش کا حساب چلتا ہے۔ البتہ سورج کی گردش والا سال چاند کی گردش والے سال سے دس دن بڑا ہوتا ہے اور گرمی سردی کے موسم بھی اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ اس لیے چاند کی گردش والا سال موسم کے حساب سے بدلتا رہتا ہے۔

اسلام میں سورج اور چاند دونوں کی گردش کا اعتبار ہے اور شرعی احکام اور عبادات میں دونوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ دنوں اور مہینوں کا تعین چاند کے حساب سے ہوتا ہے جبکہ اوقات کا تعین سورج کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ پانچ وقت کی نماز کے اوقات سورج کی گردش کے ساتھ طے پاتے ہیں۔ فجر کی نماز طلوع شمس سے پہلے، ظہر کی نماز زوال کے بعد، عصر کی غروب سے پہلے، مغرب کی غروب آفتاب کے بعد اور عشاء کی نماز شفق کے خاتمہ پر پڑھی جاتی ہے اور ان سب اوقات کا تعین سورج کی گردش کے ساتھ ہے۔ البتہ رمضان المبارک، عیدین، عاشورہ محرم، حج کے ایام اور دیگر دنوں کا تعین چاند کے حساب سے ہوتا ہے۔ اب روزے میں دیکھ لیجیے، روزہ کے دنوں کا تعین چاند کے حساب سے کریں گے مگر روزے کے اوقات کا حساب سورج کے ساتھ لگائیں گے۔ سحری کا وقت سورج طلوع ہونے سے تھوڑا وقت پہلے تک ہے اور افطاری کا وقت سورج غروب ہونے پر ہوتا ہے، اس طرح حج کے دنوں کا تعین تو قمری اعتبار سے ہوگا مگر حج کے ارکان و افعال کا وقت سورج کے حساب سے طے پائے گا کہ عرفات کب جانا ہے، مزدلفہ کب جانا ہے، رمی کب کرنی ہے، یہ سب معاملات سورج کی گردش کے ساتھ طے ہوں گے۔ الغرض شرعی احکام و معاملات میں سورج اور چاند دونوں کی گردش کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ دنوں کی تعیین چاند کے ساتھ اور اوقات کی تعیین سورج کے ساتھ ہوگی اور ہماری تمام عبادات و احکام اس حساب سے چلتے ہیں۔ اس فرق میں کیا حکمت ہے؟ اس کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً رمضان کا تعین اگر سورج کی گردش کے حساب سے طے کیا جائے تو وہ جو

مہینہ بھی طے پائے گا، وہ ایک ہی موسم میں ہمیشہ آئے گا اور مختلف موسموں کے روزوں کا لطف نصیب نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر اکتوبر کا مہینہ روزوں کے لیے مخصوص ہوتا تو وہ ہر سال اسی موسم میں آتا جبکہ قمری حساب سے رمضان المبارک کے تعین سے یہ تنوع حاصل ہوتا ہے کہ مختلف موسموں کے روزے مل جاتے ہیں اور ایک مسلمان بالغ ہونے کے بعد پچاس برس کی عمر تک سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے۔ ٹھنڈے بھی، درمیانے بھی اور گرم بھی اور اس طرح تنوع قائم رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن دنوں ہمارے ہاں جولائی اور اگست کے روزے تھے، قومی اخبارات میں ایک صاحب کی طرف سے تجویز چھپی کہ جون، جولائی کے روزے بھٹی پر کام کرنے والے مزدور اور کھیتی میں محنت کرنے والے کاشتکار کے لیے بہت مشکل ہیں اس لیے علماء کرام کو چاہیے کہ وہ ''اجتہاد'' کر کے رمضان المبارک کو کسی مناسب موسم کے ساتھ مخصوص کر دیں۔ ان صاحب کی تجویز یہ تھی کہ فروری کے مہینہ کو رمضان المبارک قرار دے دیا جائے اور یکم مارچ کو عید الفطر کے لیے مقرر کر دیا جائے اس طرح نہ صرف روزے مناسب موسم میں مخصوص ہو جائیں گے بلکہ عید کا جھگڑا بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں نے اس زمانے میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس غریب کو اپنی تجویز کا تیسرا فائدہ یاد نہیں رہا کہ تیسویں روزے سے ہمیشہ کے لیے چھٹی مل جائے گی اور ۲۹ واں روزہ بھی چار سال کے بعد آئے گا۔ ہمارے ہاں اس بات کو لوگوں نے اجتہاد سمجھ رکھا ہے کہ دین کے جس مسئلہ پر عمل میں کچھ مشکل محسوس ہو، اس میں اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق ردو بدل کر لیا جائے۔ حالانکہ یہ اجتہاد نہیں، خالص الحاد ہے اور پہلی اُمتوں نے اسی طرح آسمانی مذاہب کا حلیہ بگاڑا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں روایات نقل کی ہیں کہ بنی اسرائیل میں بھی رمضان المبارک ہی کے روزے فرض تھے جو قمری سن کا مہینہ ہے اور موسم کے حساب سے مختلف موسموں میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اس زمانے میں بھی جون اور جولائی کے روزے لوگوں کو گراں گزرے تھے اور انہوں نے اپنے علماء کرام سے گزارش کی تھی کہ وہ انہیں شدید گرمی کے روزوں سے نجات دلائیں، بنی اسرائیل کے علماء کرام ہماری طرح کے ''ضدی'' اور ''ہٹ دھرم'' نہیں تھے بلکہ ''عوام دوست'' اور ''روشن خیال'' تھے۔ اس لیے

انہوں نے اپنی عوام کی بات مان لی اور رمضان المبارک کے روزوں کو سردی کے موسم میں مخصوص کردیا البتہ تھوڑی سی شرم وحیاء موجود تھی اس لیے تیس روزوں کے اٹھائیس نہیں کیے بلکہ یہ طے کیا کہ تیس روزے تو پورے رکھیں گے اور یہ جو گڑبڑ ہم کر رہے ہیں، اس کے کفارے کے طور پر دس روزے مزید بھی رکھا کریں گے۔ چنانچہ مذہبی عیسائیوں کو دیکھ لیں کہ وہ سردیوں میں روزے رکھتے ہیں اور چالیس روزے رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے بنی اسرائیل کی روایات کے حوالہ سے اس کا یہ پس منظر بیان کیا ہے۔

الغرض بات یہ عرض کر رہا تھا کہ اسلام میں حسابات و معاملات طے کرنے اور عبادات کی ادائیگی کے لیے سورج اور چاند دونوں کی گردش کا اعتبار کیا گیا ہے اور اس فرق کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مہینوں اور دنوں کا تعین چاند کے حساب سے ہوگا اور اوقات سورج کی گردش کے ساتھ طے پائیں گے اور اس میں حکمت بھی ہے کہ روزہ اور حج میں مختلف موسموں کا تنوع قائم رہتا ہے۔

یہاں دو مسئلے بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ چاند کی گردش میں چونکہ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لیے چاند کے طلوع وغیرہ کا حساب رکھنا فرض کفایہ ہے اور ہر علاقہ کے کچھ لوگوں کو اس کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ جس طرح ہمارے ہاں رؤیت ہلال کمیٹی ہے جس میں سرکردہ علماء کرام اس کا حساب رکھتے ہیں اور چاند دیکھ کر اس کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر اس کا کوئی اہتمام بھی کسی علاقہ میں نہ ہو تو وہاں کے سب مسلمان گنہگار ہوں گے۔ دوسرا مسئلہ زکوٰۃ کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے عام طور پر کاروبار وغیرہ کے حسابات جنوری فروری کے شمسی سال کے مطابق رکھے جاتے ہیں اور چونکہ سرکاری محکموں کے ساتھ سابقہ درپیش ہوتا ہے اس لیے حسابات میں شمسی سال کا لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے مگر زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے ادا کرنا ضروری ہے اور اگر کوئی شخص شمسی سن یعنی جنوری فروری کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا تو تیس پینتیس سال کے عرصہ میں اس کی ایک سال کی زکوٰۃ بھی ماری جائے گی کیونکہ اتنے عرصہ میں قمری سال کی گنتی شمسی سالوں سے ایک سال بڑھ جاتی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے ادا کی جائے۔

حضرات محترم! یہ چند گزارشات ہجری سن کے آغاز کی مناسبت سے عرض کی ہیں۔ اس

کے علاوہ محرم الحرام کے ساتھ ہماری کچھ تاریخی یادیں بھی وابستہ ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنہوں نے ہجرت سے اسلامی سن کے آغاز کا حکم دیا تھا، ان کی شہادت یکم محرم کو ہوئی ہے اور بخاری شریف کی روایت کے مطابق فرعون کے ظلم سے بنی اسرائیل کو نجات دس محرم کو حاصل ہوئی تھی جب فرعون اپنے لشکر سمیت بحیرہ قلزم میں غرق ہو گیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ہمراہ سمندر عبور کر گئے تھے۔ اس مناسبت سے مدینہ منورہ کے یہودی دس محرم کو شکرانے کا روزہ رکھا کرتے تھے اور جناب نبی اکرم ﷺ بھی اس دن روزہ رکھتے تھے۔ البتہ آخری سال یعنی ۱۰ ہجری کو فرمایا کہ یہودیوں کے ساتھ اس روزے میں فرق رکھنا چاہیے، اس لیے آئندہ سال دس محرم کے ساتھ ایک اور روزہ ملاؤں گا۔ چنانچہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اس دن روزہ رکھنا مسنون ہے مگر تنہا اس دن کا روزہ رکھنے کی بجائے اس کے ساتھ نو یا گیارہ محرم کا روزہ بھی ملا لینا چاہیے۔

عاشوراء کے بارے میں بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ۱۰ محرم کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کنارے لگی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ ٹھنڈی ہوئی تھی، حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نے اپنے پیٹ سے اگل کر پانی سے باہر ڈال دیا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی وغیر ذلک۔ اگر یہ روایات درست ہوں تو کوئی انکار نہیں ہے اور درست نہ ہوں تو کوئی اصرار بھی نہیں ہے مگر بنی اسرائیل والی روایت تو بخاری شریف میں ہے، اس کے علاوہ دس محرم کو جناب نبی اکرم ﷺ کے جگر گوشہ اور نواسے امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا، جنہیں خاندان نبوت کے دیگر معصوم افراد سمیت اس روز کربلا کے میدان میں مظلومیت کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ امام حسینؓ سمیت خانوادۂ نبوت کے افراد کی یہ مظلومانہ شہادت ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہے اور مختلف گروہ اس کی یاد اپنے اپنے انداز سے مناتے ہیں۔

ہمارے نزدیک دن منانے اور اس طرح کی دیگر رسموں کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے البتہ بزرگوں کو یاد کرنا، ان کی خدمات کا تذکرہ کرنا اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں سے سبق حاصل کرنا، ان بزرگوں کا ہم پر حق ہے جو ہمیں ہر وقت ادا کرتے رہنا چاہیے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت امام

حسین رضی اللہ عنہ ہوں، ان کی اصل یاد یہ ہے کہ ان کی قربانیوں اور خدمات کو یاد کیا جائے، ان کے مشن اور جدوجہد کا ادراک حاصل کیا جائے، ان کے نقش قدم پر چلنے کے عزم کو دہرایا جائے اور ان کے اسوہ وسیرت پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

خطبۂ حجۃ الوداع

حضرت مولانا زاہد الراشدی دامت فیوضہم نے ۲۰۰۷ء کی سالانہ تعطیلات کے دوران امریکہ کے ایک ماہ کے سفر کے موقع پر دارالہدیٰ سپرنگ فیلڈ واشنگٹن میں ۳ ستمبر سے ۷ ستمبر تک روزانہ نماز مغرب کے بعد مسلسل پانچ روز تک جناب نبی اکرم ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع کے حوالہ سے گفتگو فرمائی جسے حضرت کے چھوٹے بیٹے حافظ ناصر الدین خان عامر نے جو چند برس سے امریکہ میں قیام پذیر ہیں ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے قلمبند کر لیا، مکررات حذف کر کے اسے مندرجہ ذیل صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، دعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ اس چھوٹی سے محنت کو قبولیت سے نوازیں اور عزیزم عامر خان سلمہ کے اس ذوق کو قبولیت، ترقیات اور برکات عطاء فرمائیں۔

آمین یارب العالمین!

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ و ازواجہ وبناتہ واتباعہ اجمعین۔ اما بعد

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر ایک ارشاد، ہر جملہ اور ہر لفظ میں ہمارے لیے ہدایت اور راہنمائی کے بہت سے پہلو ہیں۔ لیکن حضورؐ کے ہزاروں ارشادات عالیہ میں سے چند ارشادات ایسے ہیں جن کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، ان میں حجۃ الوداع کا خطبہ بھی شامل ہے۔ حضورؐ نے جو آخری حج کیا اسے دو حوالوں سے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ ایک اس حوالہ سے کہ آپؐ نے آخری حج وہی کیا ہے۔ اور اس حوالے سے بھی کہ آپؐ نے خود اس خطبہ میں ارشاد فرمایا **لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا**، یہ میری تم سے آخری اجتماعی ملاقات ہے، شاید اس مقام پر اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو۔ آپؐ نے بطور خاص فرمایا کہ

مجھ سے باتیں پوچھ لو، سیکھ لو، جو سوال کرنا ہے سوال کرلو، شاید اس سال کے بعد میں تم لوگوں سے اس طرح کی ملاقات نہ کرسکوں۔

نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا اور وہ حج یہی تھا۔ ہجرت سے پہلے جب مکہ مکرمہ میں حضور ﷺ کا قیام تھا، ترپن (۵۳) سال کی عمر تک، آپ حج کرتے رہے۔ تعداد ذکر نہیں ہے۔ محدثین یہ فرماتے ہیں کہ جب سے حضورؐ نے ہوش سنبھالا، مکہ میں رہے تو ظاہر ہے کہ ہر سال حج میں شریک ہوتے رہے ہوں گے۔ روایات میں یہ ذکر آتا ہے کہ حج کے موقع پر جو اجتماع ہوتا تھا، منیٰ میں، عرفات میں، لوگ دنیا کے مختلف حصوں سے حج کے لیے آتے تھے، تو نبی کریم ﷺ اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ آپؐ مختلف خیموں میں جاتے تھے، لوگوں سے ملتے تھے اور دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ انصار مدینہ کے دونوں گروہوں اوس اور خزرج کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا جو رابطہ ہوا تو وہ حج ہی کے موقع پر ہوا۔ ان دونوں قبائل کے لوگ حج کے لیے آئے ہوئے تھے، حضورؐ مختلف خیموں میں جا کر دعوت دے رہے تھے تو انہوں نے آپؐ کی بات توجہ سے سنی اور قبولیت کا اظہار کیا۔

حجۃ الوداع کی پیشگی تیاری

سن آٹھ ہجری (۸ھ)، رمضان المبارک میں مکہ فتح ہوا۔ نو ہجری (۹ھ) میں مسلمانوں نے اجتماعی طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت میں پہلا حج ادا کیا۔ حضورؐ اس حج میں خود تشریف نہیں لے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مدینہ سے امیر حج بنا کر بھیجا اور ان کے ذریعے حج کے موقع پر کچھ اعلانات کروائے، ان کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھیجا، کچھ اعلانات ان کے ذریعے کروائے اور آئندہ سال اپنے حج کے لیے تیاری کی۔ اس تیاری میں دو تین باتیں اہم تھیں۔ مختلف عرب قبائل کے ساتھ معاہدات تھے، کچھ کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرنا تھا، کچھ کو ختم کرنے کا۔ اور ایک بات یہ تھی کہ آئندہ سال اپنے حج سے پہلے حضورؐ مکہ کے ماحول میں کچھ صفائی چاہتے تھے۔ مثلاً پہلے ہر قسم کے لوگ حج کے لیے آجاتے تھے۔ آپؐ نے اعلان کروا دیا کہ آج کے بعد کوئی غیر مسلم یہاں نہیں آئے گا، یہ بیت اللہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے، آج کے بعد مسلمانوں کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں

آئے گا۔ یہ بیت اللہ ابراہیمی ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے لیے مخصوص ہے۔ دوسری بات یہ کہ پہلے بہت سے لوگ حج کے لیے آتے تو ننگے طواف کرتے، مرد بھی اور عورتیں بھی۔ عورتوں نے معمولی سا، لنگوٹی طرز کا کوئی کپڑا پہن رکھا ہوتا تھا، اور کہتے تھے کہ یہ نیچر ہے، کہ ہم دنیا میں بھی ننگے آئے تھے اس لیے ہم اللہ کے دربار میں ننگے ہی پیش ہوں گے۔ بعض روایات میں ذکر ہے کہ مرد تو تلبیہ پڑھتے تھے لیکن عورتیں کچھ اشعار پڑھتی تھیں، مثلاً

؎ اليوم يبدو بعضه أو كله فالذی يبدو فلا أحله

جن کا مطلب یہ تھا کہ ہم اللہ کے دربار میں اس کیفیت (ننگی حالت) میں پیش ہیں۔ ہم اپنے آپ کو کسی پر حلال نہیں کرتیں کہ وہ ہماری طرف دیکھے۔ تو حضورؐ نے یہ اعلان بھی کروا دیا کہ آج کے بعد کوئی شخص ننگا طواف نہیں کرے گا۔ عورتیں تو مکمل لباس میں ہوں گی اور مرد بھی اپنا جسم مکمل طور پر ڈھانپیں گے لیکن دو چادروں سے۔ مردوں کے لیے دو چادریں مخصوص ہوں گی جبکہ عورتیں پورے لباس میں باحیا اور باوقار طریقہ سے آکر طواف کریں گی۔

اس کے علاوہ اور بھی متفرق اعلانات کروائے کہ آج کے بعد حج میں یہ ہوگا اور یہ نہیں ہوگا۔ پھر اس اہتمام کے ساتھ حضورؐ نے پورا سال مختلف قبائل میں پیغامات بھیجے کہ آئندہ سال رسول اللہ ﷺ حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں اس لیے جو مسلمان بھی اس موقع پر پہنچ سکتا ہے، پہنچے۔ چنانچہ پورا سال یہ اعلانات ہوتے رہے، لوگوں تک یہ پیغام پہنچتا رہا کہ جس مسلمان نے حضورؐ کی رفاقت حاصل کرنی ہے، معیت حاصل کرنی ہے، جس نے آپؐ سے کوئی بات پوچھنی ہے تو وہ حج پر پہنچے۔ چنانچہ پورے اہتمام کے ساتھ جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں سے لوگ حج کے لیے آئے۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حجۃ الوداع کے موقع پر جمع ہوئے۔ یہ جناب نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ میں صحابہؓ کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ حضورؐ کی حیات میں اس سے بڑا صحابہؓ کا اجتماع نہیں ہوا۔ صحابہ کرامؓ مختلف علاقوں سے آئے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج ادا کیا۔

حجۃ الوداع کے خطبات

اس موقع پر حضور ﷺ نے بہت سی ہدایات فرمائیں۔ خطبہ حجۃ الوداع جسے کہتے ہیں یہ حضورؐ کی مختلف ہدایات کا مجموعہ ہے۔ ان میں دو تو بڑے خطبے ہیں۔ ایک خطبہ حضورؐ نے عرفات میں ارشاد فرمایا۔ یہی خطبہ سنت رسولؐ کے طور پر اب بھی ۹ ذی الحج کی دوپہر کو عرفات کے میدان میں پڑھا جاتا ہے۔ ایک خطبہ ہے جو حضورؐ نے منیٰ میں ارشاد فرمایا۔ یہ دو تو باقاعدہ خطبے ہیں جبکہ امام قسطلانیؒ نے ''المواھب اللدنیۃ'' میں حضرت امام شافعیؒ کے حوالہ سے چار خطبات کا ذکر کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے خطبات سنے، جس کو جو بات یاد رہی اس نے وہ آگے نقل کر دی۔ اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ سے بہت سے سوالات پوچھے گئے، حضورؐ نے ان کے جوابات دیے۔ حضورؐ نے حج کے مختلف مسائل کے بارے میں بھی ہدایات دیں۔ صحابہ کرامؓ کو عرفات اور منیٰ میں نبی کریم ﷺ نے جو کچھ فرمایا، صحابہ کرامؓ نے جو جو بات یاد رکھی اور وہ آگے منتقل کی، اس کو محدثین نے محفوظ کیا۔ ان سب کا مجموعہ محدثین کی اصطلاح میں حجۃ الوداع کا خطبہ کہلاتا ہے۔ اس میں عرفات و منیٰ کے دو خطبے بھی شامل ہیں اور مختلف مواقع پر نبی اکرم ﷺ کے دیگر عمومی خطابات بھی شامل ہیں۔ یہ حجۃ الوداع کا خطبہ بیسیوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سینکڑوں روایات میں ہے۔ وہ زمانہ لکھنے پڑھنے کا زمانہ نہیں تھا، یادداشت کا زمانہ تھا۔ یادداشت پر لوگ اعتماد کرتے تھے۔ اس حجۃ الوداع کے خطبہ پر محدثین نے مختلف ادوار میں کام کیا ہے۔ حجۃ الوداع کی اہمیت کی بات تو یہ ہے کہ یہ حضورؐ کی حیات مبارکہ میں صحابہؓ کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ اور پھر یہ کہ حضورؐ نے خود اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ شاید یہ میری تمہاری آخری اجتماعی ملاقات ہو۔ پھر ایک بہت اہمیت والی بات یہ ہے کہ اس موقع پر ہی آیت تکمیل دین نازل ہوئی۔

دین کی تکمیل کا تاریخی اعلان

بخاری شریف کی روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ سے ان کے دور خلافت میں ایک یہودی عالم نے کہا، یا حضرت! آپ کے قرآن میں ایک آیت ایسی ہے، وہ آیت اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم آیت کے نازل ہونے کے دن کو عید بنا لیتے۔ ہم باقاعدہ

ڈے مناتے اس پر کہ فلاں دن یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا، کونسی آیت؟ اس نے کہا" اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے دین مکمل کر دیا ہے، اپنی نعمت تمام کر دی ہے۔ تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے وحی کا نزول شروع ہوا تھا، اس کے بعد مختلف پیغمبروں کے ذریعے ہدایات و احکام نازل ہوتے رہے، جناب نبی کریم ﷺ تک وحی کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ احکام آتے بھی رہے، منسوخ بھی ہوتے رہے، ان میں ترامیم بھی ہوتی رہیں۔ یہ ایک ارتقاء کا اور تدریج کا عمل تھا۔ نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے وحی کا کام مکمل کر دیا۔ اب قیامت تک کوئی وحی نہیں ہوگی اور نہ احکام میں ردو بدل ہوگا اور نہ ہی کوئی نیا حکم آئے گا۔ تو تکمیل کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ وحی جو آدم علیہ السلام پر نازل ہونا شروع ہوئی تھی وہ تدریج اور ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ پر مکمل ہوئی ہے۔ چنانچہ جب غلبہ دین مکمل ہوا تو حجۃ الوداع اس کا سب سے بڑا مظہر تھا، کہ اتنی شان و شوکت اس سے پہلے مسلمانوں کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اعلان فرمایا، " اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ " آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ " وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ " اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ " وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا " اور میں تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں۔ آج کے بعد میں کسی انسان سے اسلام ہی کا دین قبول کروں گا اور کوئی دین قبول نہیں کروں گا۔ تو اس یہودی عالم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ یا امیر المؤمنین یہ آیت اگر ہم پر تورات میں نازل ہوئی ہوتی تو ہم آیت کے نزول والے دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ کی قدرت ہے کہ ہم پر یہ آیت نازل ہی عید والے دن ہوئی ہے۔ تم تو عید بنا لیتے، ہماری پہلے سے عید ہے۔ فرمایا یوم النحر کو منیٰ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور میں اس موقع پر موجود تھا۔ یوم النحر یعنی عید الاضحیٰ اور قربانی کا دن۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہماری تو دو عیدیں تھیں۔ سالانہ عید بھی تھی اور ہفتہ وار عید بھی تھی یعنی وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔

دورِ جاہلیت کا خاتمہ

نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر بہت اہم اعلانات فرمائے۔ مثلاً آپؐ نے ایک بڑی

اہم اور تاریخی بات یہ فرمائی، کہ یاد رکھو، جاہلیت کا دور ختم ہو گیا ہے اور اسلام کا دور شروع ہو گیا ہے۔ فرمایا "کل امر الجاهلية موضوع تحت قدمی" آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ ایک مسئلہ آج کل دنیا میں چلتا ہے روشن خیالی اور تاریک خیالی کا۔ دورِ علم کا اور دورِ جاہلیت کا۔ ہمیں تلقین ہوتی ہے کہ دورِ علم اختیار کریں اور دورِ جاہلیت چھوڑیں۔ جاہلیت کی بات چھوڑیں اور علم کا راستہ اختیار کریں۔ اب روشن خیالی سے کون انکار کرے گا؟ کوئی عقل مند اور دانش ور آدمی روشن خیالی اور علم کی بات سے انکار نہیں کر سکتا اور جاہلیت کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن اصطلاحات کا فرق ہے۔ روشن خیالی کسے کہتے ہیں، تاریک خیالی کسے کہتے ہیں، جاہلیت کا دور کونسا ہے اور علم کا دور کونسا ہے، اپنی اپنی اصطلاحات اور تعریفات ہیں۔ دو تین بنیادی فرق ہیں جن کو اس کشمکش میں سمجھنا ضروری ہے۔ اور اس میں بنیادی کردار رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ادا کرتا ہے کہ آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے ان پاؤں کے نیچے ہیں۔

مغرب کی روشن خیالی اور اسلام

مغرب کی روشن خیالی میں اور ہماری روشن خیال میں تین بنیادی فرق ہیں۔

پہلا بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب کی روشن خیال کی عمر تقریباً دو یا سوا دو سو سال ہے جبکہ ہماری روشن خیالی کی عمر تقریباً چودہ سو سال ہے۔ مغرب کی روشن خیالی کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوتا ہے۔ جب بھی مغرب میں روشن اور تاریک دور کی بات ہوتی ہے تو حدِّ فاصل انقلاب فرانس قرار پاتی ہے۔ مغرب کے ہاں اس سے پہلے کا دور جاہلیت اور جبر کا دور کہلاتا ہے اور اس کے بعد کا دور ترقی اور روشن خیالی کا دور کہلاتا ہے۔ ان سے آپ پوچھ لیں کہ یہ قرونِ وسطیٰ قرونِ مظلمہ، ڈارک دور کسے کہتے ہیں تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ یہ انقلاب فرانس سے پہلے کی دو چار صدیاں ہیں۔ اور انقلاب فرانس اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہوا۔ جس طرح مغرب کے علقوں میں یہ بات معروف ہے کہ فلاں بات تاریک دور کی بات ہے اور فلاں بات روشن دور کی بات ہے، اسی طرح ہمارے ہاں بھی ایک اصطلاح معروف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کا کوئی واقعہ ذکر کرنا مقصود ہو تو کہا جاتا ہے کہ جی یہ دورِ

جاہلیت کی بات ہے۔تو یہ ٹرمینالوجی ہمارے ہاں بھی ہے کہ جی حضورؐ سے پہلے کا دور جاہلیت کا دور تھا اور حضورؐ کے آنے سے علم کا، روشنی کا دور شروع ہوا۔

دوسرا بنیادی فرق مغرب کی اور ہماری روشن خیالی میں یہ ہے کہ مغرب نے روشن خیالی کے نام پر جاگیرداری سے نجات حاصل کی، بادشاہت سے نجات حاصل کی اور ساتھ ہی ساتھ بائبل اور چرچ سے بھی نجات حاصل کی۔یعنی وحی کی بالادستی سے دستبردار ہو گئے۔اور کہا کہ ہم کسی کی ڈکٹیشن نہیں مانتے، ہم آزاد ذہن سے فیصلے کرتے ہیں۔مغرب نے اپنے تمام تر فلسفے، عقائد اور فیصلوں کی بنیاد انسانی سوسائٹی کی خواہشات پر رکھی ہے۔ہر چیز کی بنیاد اس پر ہے کہ سوسائٹی کیا چاہتی ہے۔جمہوریت تو سوسائٹی کی خواہش معلوم کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن اصل بنیاد سوسائٹی کی خواہشات پر ہے۔سوسائٹی کیا سوچتی ہے اور سوسائٹی کیا چاہتی ہے، یہی حلال و حرام کی بنیاد ہے، یہی جائز ناجائز کی بنیاد ہے اور یہی قانون لاقانونیت کی بات ہے۔تو میں نے عرض کیا کہ مغرب نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری اختیار کی اور انسانی سوسائٹی کی خواہشات کو اپنے تمام تر معاملات کی بنیاد بنا لیا اور کہا کہ یہ روشن خیالی ہے۔قرآن کریم نے روشن خیالی کا اور معنی کیا ہے۔قرآن کریم نے بیسیوں مقامات پر اس کے متعلق بیان فرمایا ہے، لیکن ایک آیت ذکر کرتا ہوں۔فرمایا "وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ" جناب نبی کریم ﷺ کو قرآن پاک نے حکم دیا کہ لوگوں کے معاملات کو وحی کے مطابق طے کیجیے اور وحی کے مقابلے میں ان کی خواہشات کی طرف مت دیکھیے۔مطلق خواہشات کی نفی نہیں ہے۔ایسی خواہشات کی نفی ہے جو وحی یعنی اللہ کے نازل کردہ احکامات و ہدایات کے مقابلے پر آئیں۔اگر سوسائٹی کوئی جائز بات چاہتی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں لیکن بالادستی وحی کی ہے۔فرمایا جہاں "بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ" اللہ کی ہدایات کا مسئلہ آئے وہاں "وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ" ان کی خواہشات کی طرف مت دیکھیں۔صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی فرمایا کہ "وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ" اس بات سے آپ ڈرتے رہیں کہ سوسائٹی کی خواہشات کے پیچھے آپ چلیں گے تو یہ اللہ کے احکام کے بارے میں آپ کو فتنے میں ڈال دیں گے۔تو ہمارے نزدیک روشن خیالی نام ہے سوسائٹی کی خواہشات سے نکل کر وحی کی پیروی کا۔اور مغرب کے نزدیک روشن خیالی

نام ہے وحی کے دائرہ سے نکل کر انسانی خواہشات کی پیروی کا۔ چنانچہ جو چیز ہمارے نزدیک علم ہے، مغرب کے نزدیک جہالت ہے اور جو چیز ہمارے نزدیک تاریکی اور جہالت ہے، مغرب کے نزدیک روشن خیالی ہے۔ یہ ایک جوہری فرق ہے مغرب کی اور ہماری اصطلاح میں۔ اور اس بات کا ہم نے بیسیوں بار تجربہ کیا ہے کہ کسی بھی مسلم ملک میں قرآن کریم کے کسی حکم یا نبی کریم ﷺ کے کسی ارشاد کے بطور قانون نفاذ کا مطالبہ کیا جائے کہ یہ قرآن پاک کا حکم ہے اس لیے اسے ملک کا قانون بنایا جائے تو مغرب اور مغرب زدہ حلقوں سے ہمیں ایک بات مشترکہ طور پر جواب میں ملتی ہے کہ یہ لوگ تاریکی کے دور کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ یہ قرون مظلمہ کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔

ایک فرق مغرب اور ہماری روشن خیالی میں یہ ہے کہ جب جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ جس کا میں نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ "کل امر الجاہلیۃ موضوع تحت قدمی" جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ گویا نبی کریم ﷺ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ جاہلیت کا دور ختم ہوا اور میں جاہلیت کی ساری قدریں اپنے پاؤں کے نیچے روند کر نسل انسانی کو علم کے دور کی طرف لے کر آگے بڑھ رہا ہوں۔ اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے مبارک قدموں کے نیچے کون کون سی قدریں پامال ہوئیں۔ حضورؐ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر پہلا اعلان کیا تھا کہ "یا ایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحون" اور پھر اس سے اکیس بائیس سال کے بعد صفا کے قریب ہی منیٰ کے مقام پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے اپنی دعوت کے نتیجے کا اعلان کیا کہ "فزت ورب الکعبۃ" یا اللہ جو کام آپ نے دے کر بھیجا تھا، میں اس میں کامیاب ہو کر جا رہا ہوں۔ تاریخ میں اور کوئی شخصیت شاید آپ کو ایسی نہ ملے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں اپنا کام، اپنا مشن مکمل کر کے جا رہا ہوں۔ تاریخ انسانی میں حضورؐ وہ واحد شخصیت ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے اپنا مشن پورا کیا۔ نہ صرف پورا کیا بلکہ تکمیل پر اپنے صحابہؓ کو اس پر گواہ بنایا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا "وانتم تسئلون عنی" قیامت کے روز تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جب قیامت کا دن ہوگا، اللہ کی عدالت ہو گی تو اللہ تم لوگوں سے پوچھے گا کہ تمہاری طرف ایک پیغمبر کو مشن دے کر، پیغام دے کر بھیجا

تھا، اس نے اپنا فرض ادا کیا یا نہیں۔ تو تم لوگ کیا جواب دو گے؟ اس پر صحابہؓ نے اجتماعی آواز سے کہا "بلغت و ادیت و وفیت" آپ نے پیغام پہنچا دیا، آپ نے حق ادا کر دیا اور آپ نے وفا کی۔ حضورؐ نے اس پر آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "اللھم اشھد" یا اللہ تو بھی گواہ رہنا۔

جاہلی قدروں کی طرف واپسی

میں عرض کر رہا تھا کہ وہ کون سی جاہلی قدریں تھیں جنہیں حضورؐ نے اکیس بائیس سال کے عرصے میں اپنے پاؤں تلے روندا۔ ہمیں اس کا ذرا تجزیہ کر لینا چاہیے کہ وہ کونسی قدریں تھیں جو حضورؐ کے اعلان نبوت سے پہلے عرب معاشرہ میں موجود تھیں لیکن اعلان تکمیل دین تک مٹ چکی تھیں۔ چنانچہ ان قدروں میں ایک قدر تھی شرک۔ یہ بیس سال پہلے پورے عروج پر تھا، لیکن اب جزیرۃ العرب میں کوئی بت خانہ باقی نہیں تھا۔ ایک قدر تھی، نسل پرستی۔ عرب معاشرے میں عرب اور عجم، کالے اور گورے کا فرق تھا۔ حضورؐ نے ختم کیا۔ شراب تھی، لاٹری اور جوا تھا، سود تھا، بے حیائی اور زنا تھا، ہم جنس پرستی تھی۔ یہ ساری قدریں بیس سال پہلے اپنے پورے عروج پر تھیں۔ جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں تو ان قدروں کا عرب معاشرے میں کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا۔ اور جو سوسائٹی حضورؐ نے متعارف کروائی وہ حقیقی انسانی قدروں سے مالا مال تھی۔ چنانچہ حضورؐ نے صرف ان جاہلی قدروں کو ختم کرنے کا اعلان ہی نہیں کیا بلکہ دنیا کو ایک ایسی سوسائٹی بنا کر دکھا دی جس میں شرک، زنا، شراب، سود، ناچ گانا، فحاشی، جوا، نجوم پرستی اور نسل پرستی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ آج جب ہم روشن خیالی اور تاریک خیالی کی بحث میں پڑتے ہیں تو میں ایک سوال کیا کرتا ہوں کہ مغرب نے روشن خیالی کے نام پر ان قدروں میں کون سی قدر کا اضافہ کیا ہے؟ یہ تو وہی پامال قدریں ہیں جنہیں آج سے چودہ سو سال پہلے رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ تو میں کہتا ہوں کہ مغرب ایک بہت اچھا بیوٹی پارلر ہے جس نے پرانی اور گھسی پٹی قدروں کو بیوٹی پارلر سے گزار کر نئے میک اپ کے ساتھ دنیا کے سامنے نئی تہذیب بنا کر پیش کر دیا ہے۔ جبکہ حقیقت میں وہی جاہلیت قدیمہ ہے جو ابوجہل کے حوالے سے منسوب ہو تو وہ جاہلی قدر کہلاتی ہے اور آج مغرب کے حوالے سے منسوب ہو تو

اسے آرٹ اور کلچر کا نام دیا جاتا ہے۔

سوسائٹی کی خواہشات یا آسمانی تعلیمات؟

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ ایک تاریخی اعلان فرمایا کہ جاہلیت کا دور ختم ہو گیا ہے اور علم کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اور حضورؐ نے علم کس چیز کو قرار دیا؟ وحی کو، آسمانی تعلیمات کو، انبیاء کو، کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کو۔ آج بھی دنیا میں جھگڑا اسی بات کا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کلچرل وار ہے، سولائزیشن کی جنگ ہے اور تہذیب و ثقافت کی جنگ ہے۔ اصل میں بنیادی اختلاف اسی پر ہے کہ ہم نے اپنی خواہشات پر چلنا ہے یا آسمانی تعلیمات کی بالادستی قبول کرنی ہے۔ اس کو عنوان آپ کچھ بھی دے دیں، جھگڑا دراصل یہی ہے۔ یہ کچھ عرصہ قبل کارٹونوں کا مسئلہ چلا تھا۔ ڈنمارک کے صحافی فلیمنگ روز نے جناب نبی اکرم ﷺ کی توہین کے کارٹون چھاپے تھے، اس پر بڑی بحث چلی تھی اور خود فلیمنگ روز کا ایک بڑا لمبا مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون میں چند ایک باتیں اس گفتگو سے متعلق ہیں۔ میں وہ عرض کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہم میں اور مسلمانوں میں فکری، ثقافتی یا تہذیبی طور پر کیا فرق ہے۔ اس نے کہا کہ ہم نے تو خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ اپنے ذہنوں سے اتار دیا ہے۔ ہم کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ بائبل میں کیا لکھا ہے۔ کوئی قانون طے کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے۔ کوئی بات کہتے وقت عیسیٰ کا حوالہ نہیں دیتے کہ انہوں نے اس بارے میں کیا کہا تھا۔ ہم آزاد ذہن سے فیصلے کرتے ہیں۔ پھر کہا کہ مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ اپنے ذہنوں پر مسلط رکھا ہوا ہے۔ یہ فرق ہے کہ ہم میں اور مسلمانوں میں ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو رہی۔ اس کی یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان کتنے ہی بے عمل، بدعمل کیوں نہ ہوں لیکن آج کے زمینی حقائق میں یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ ہماری کمٹمنٹ آج بھی قائم ہے۔ خدا اور رسول کا حوالہ ہمارے ذہنوں سے اترا نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے لیے تو خوشی کا باعث ہے لیکن دنیا کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ اور یہ حوالہ اتنا مضبوط ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں بھی بدعمل سے بدعمل اور بے عمل سے بے عمل مسلمان کو بھی اگر آپ نے خطاب کرنا ہے تو آپ کو خدا اور

رسول کے حوالے سے بات کرنا ہوگی، ورنہ آپ کی بات نہیں سنی جائے گی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی وہ لوگ جو سراسر قرآن وسنت کے خلاف بات کرتے ہیں، وہ حوالہ خدا اور رسول ہی کا دیں گے۔ وہیں سے کوئی بات تاویل کر کے نکالیں گے، اگر یہ حوالہ نہیں دیں گے تو اس معاملہ میں ان کی بات نہیں سنی جائے گی۔ تو مغربی صحافی نے یہ تشویش ظاہر کی کہ ہم نے تو یہ حوالہ چھوڑ دیا لیکن مسلمان یہ حوالہ کیوں نہیں چھوڑ رہے۔

آسمانی تعلیمات کس کے پاس ہیں؟

میں بھی لکھنے پڑھنے کا آدمی ہوں، کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ تو اس پر میں نے فلیمنگ روز سے ایک مضمون میں سوال کیا کہ تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا ہے؟ تم کس بات کا رعب جماتے ہو ہم پر؟ تمہاری انجیل دنیا میں اس وقت ہے کہیں؟ تورات کا وجود ہے کہیں دنیا میں؟ چھوڑا کیا ہے تم نے؟ لیکن ہمارے پاس تو کتاب اللہ موجود ہے۔ یہ بہت بڑا بنیادی فرق ہے۔ اور میں ایسے ہی گپ شپ نہیں لگا رہا، زمینی حقائق کی بنیاد پر بات کر رہا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ دنیا کا کوئی یہودی، دنیا کے کسی حصے میں، تورات کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہے کہ یہ وہ تورات ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ اور دنیا کا کوئی عیسائی، دنیا کے کسی حصے میں، انجیل کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہے کہ یہ وہ انجیل ہے جو عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ کوئی یہودی، کوئی عیسائی یہ ہمت نہیں کر سکتا۔ اور دنیا کا ہر مسلمان، دنیا کے کسے بھی خطے میں، قرآن کریم کے کسی بھی نسخے پر ہاتھ رکھ کر پوری تسلی کے ساتھ یہ کہہ دے گا کہ یہ وہ قرآن ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ میں نے کہا ہمارے پاس تو یہ موجود ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی حیات مبارکہ

اسی طرح آج کل ایک فلم حضرت عیسیٰؑ پر بن رہی ہے۔ ایک فلم اس سے پہلے بھی بن چکی ہے۔ اس فلم کے حوالے سے ایک بحث چلی دنیا میں۔ ایک مغربی دانشور نے سوال کیا کہ بھئی عیسیٰؑ پر فلم تو تم نے بنالی، مواد کہاں سے لیا؟ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس عیسیٰؑ کی حیات پر دو تین واقعات سے زیادہ کوئی مستند مواد نہیں ہے۔ اور انسائیکلوپیڈیا

برٹانیکا ایک مستند حوالہ تصور کیا جاتا ہے۔ تو اس مغربی دانشور نے یہ حوالہ دے کر سوال اٹھایا کہ تم نے فلم تو بنالی لیکن مواد کہاں سے لائے ہو؟ الحمدللہ ہمارے پاس حضرت عیسیٰؑ پر اس سے کہیں زیادہ مواد موجود ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا خاندانی پس منظر ہم جانتے ہیں، ان کی والدہ کب اور کیسے پیدا ہوئیں، پرورش کہاں ہوئی، ہم جانتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کہاں ہوئی، کیسے ہوئی، بچپن میں کیا کرتے تھے، جوانی میں کیا کرتے تھے بلکہ یہاں تک جانتے ہیں کہ اب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اور جب دنیا میں ان کا دوبارہ نزول ہوگا تو تب وہ یہاں آ کر کیا کریں گے۔ ہم تو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ فلاں مسجد کے مینارہ پر نازل ہوں گے، فلاں شہر میں آئیں گے اور آ کر اس دنیا میں کتنا عرصہ رہیں گے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی شادی کہاں ہوگی، کس قبیلے میں شادی ہوگی، بچے کتنے ہوں گے، بچے پیدا نہیں ہوئے لیکن نام ہمیں معلوم ہیں، ان کی وفات کہاں ہوگی اور پھر وہ کہاں دفن ہوں گے۔ ان کی قبر مبارک کی جگہ ہم نے محفوظ رکھی ہوئی ہے اور اس کے اوپر اب بھی درج ہے کہ "ھذا موضع قبر النبی عیسیٰ ابن مریم غلیھما الصلوٰۃ والسلام" چنانچہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان سے کہیں زیادہ جانتے ہیں اور مستند مواد کے ساتھ۔

چنانچہ میں عرض کر رہا تھا کہ فلیمنگ روز نے جب یہ کہا کہ ہم نے خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ ذہنوں سے اتار دیا ہے، تو میں نے جواب میں کہا کہ میرے محترم، ہم پر رعب کس بات کا جماتے ہو، تمہارے پاس چھوڑنے کو تھا کیا؟ لیکن ہمارے پاس تو یہ سب موجود ہے۔ قرآن کریم بھی مکمل، کسی اشتباہ کے بغیر، کسی ابہام کے بغیر اور جناب نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ، آپ کے ارشادات عالیہ، آپ کے فرمودات، آپ کی تعلیمات اصل حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ہم حضورؐ کی حیات مبارکہ کے کسی حصے کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں، ہمیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ میں ایک بات آپ کے علم کے لیے عرض کر دوں کہ جن دنوں یہ بات چل رہی تھی تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا حضورؐ کی حیات مبارکہ کے بارے میں سال بہ سال تفصیلات ہمارے پاس ریکارڈ پر موجود ہے، کہ پہلے سال کیا ہوا تھا، دوسرے سال کیا ہوا تھا، تیسرے سال کیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کوئی اللہ کا بندہ ہمت کر کے کوشش کرے تو

ماہ بہ ماہ تفصیلات بھی مرتب ہو سکتی ہیں۔ مواد تو ہمارے پاس ہے بس محنت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک اشتہار آ گیا۔ ہمارے لاہور میں سید قاسم محمود ہیں شاہکار انسائیکلو پیڈیا والے۔ بڑا کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ اشتہار یہ تھا کہ ہم نے جناب نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ پر ماہ بہ ماہ تفصیلات مرتب کر لی ہیں۔ یہ تین ہزار صفحہ کی کتاب ہے جو دو مہینوں میں مارکیٹ میں آ جائے گی۔ تو میں نے فلیمنگ روز کے جواب میں لکھا کہ تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا جبکہ ہمارے پاس تو یہ موجود ہے۔

مغرب کی ایک فضول خواہش

اس پر میں نے ایک لطیفہ لکھا کہ دو دوست آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اللہ تمہیں اگر دو گاڑیاں دے دے تو تم کیا کرو گے؟ دوسرے نے کہا، ایک تمہیں دے دوں گا۔ پہلے نے پھر کہا، تمہیں اللہ دو مکان دے دے تو کیا کرو گے؟ دوسرے نے کہا، ایک تمہیں دے دوں گا۔ پہلے نے کہا، اگر اللہ تمہیں دو گائے دے دے تو کیا کرو گے۔ دوسرے نے جواب دیا، وہ میرے پاس پہلے سے موجود ہیں بھائی صاحب، ان پر نظر مت رکھو۔

تو بھئی ہمارے پاس وحی بھی ہے، قرآن کریم بھی ہے، حضورؐ کی تعلیمات بھی ہیں، بالکل اصل حالت میں ہیں، کسی شبہ کے بغیر ہیں۔ اگر دنیا کا کوئی آدمی ہم سے یہ توقع رکھتا ہے کہ ہم چھوڑ دیں گے، تو بہت بڑا بے وقوف ہے۔ اسے اپنی عقل کا علاج کروانا چاہیے۔ ذرا سوچیے کہ جو لوگ واشنگٹن میں، ماسکو میں، لندن میں بیٹھ کر سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں قرآن کریم پڑھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے ایک ایک جزو کو بیان کرتے اور سنتے سناتے ہیں، حضورؐ کا ایک ایک ارشاد نقل کرتے ہیں، ان سے کوئی یہ توقع رکھے کہ وہ یہ سب کچھ چھوڑ دیں گے، تو اس سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔

بات میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے اعلانات میں ایک بہت بڑا اعلان کیا کہ "کل امر الجاهلية موضوع تحت قدمی" جاہلیت کی ہر قدر آج میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تہذیبی کشمکش میں، ثقافتوں کی جنگ

میں، اور دورِ جاہلیت و دورِ علم کی نشاندہی میں حضورؐ کا یہ ارشاد بہت بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے لیے راہ نما ہے۔ اسی سے ہم رہنمائی حاصل کریں گے۔

یہی بات جسے نبی کریم ﷺ نے حدِ فاصل قرار دیا، حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے اسی حوالے سے ہمیں ایک تنبیہ فرمائی۔ بظاہر ہم سنتے سناتے رہتے ہیں لیکن جب اس کے پس منظر میں یہ بات دیکھیں گے تو بات ٹھیک طور پر سمجھ میں آئے گی۔ فرمایا "لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض، لا ترجعوا بعدی ضلالاً یضرب بعضکم رقاب بعض" گویا فرما رہے ہیں کہ تمہیں دورِ جاہلیت سے نکالنے کے لیے میں نے بڑی محنت کی ہے، بڑے مقابلے کیے ہیں، بڑی تکالیف اٹھائی ہیں۔ وہ کفر، ضلالت اور گمراہی کا دور تھا، اس دور کی طرف کہیں واپس نہ چلے جانا۔ اس کی سب سے بڑی علامت کیا ہو گی؟ دورِ جاہلیت کی اقدار میں سب سے مکروہ قدر کی نشاندہی کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا "یضرب بعضکم رقاب بعض" ایک دوسرے کی گردنیں مارنا نہ شروع کر دینا۔ فرمایا کہ ایسا کرنا جاہلیت کے دور کی طرف واپس جانا ہو گا اور اس امت پر اس کیفیت کو امت پر خدا کے عذاب کی سب سے خوفناک شکل قرار دیا۔ قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے "قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ" آپ ان سے کہہ دیجیے، میں کئی قسم کے عذاب نازل کیا کرتا ہوں۔ اوپر آسمان سے بھی اور نیچے زمین سے بھی۔ پہلی امتوں پر یہ عذاب آتے رہے ہیں۔ آسمان سے پتھر برسے ہیں اور زمین پر زلزلے اور سیلاب آئے ہیں۔ عذاب کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل اس آیت میں یہ بیان فرمائی کہ تمہارے لیے یہ عذاب بھی ہو سکتا ہے کہ خود تمہیں ایک دوسرے کے لیے عذاب بنا دوں۔ عذاب کی سب سے خوفناک صورت یہ ہے کہ نہ اوپر سے عذاب آئے نہ نیچے سے بلکہ "أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا" تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے، "وَّيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ" اس کے محاورے کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے کہ "تمہیں ایک دوسرے کے لیے عذاب بنا دے۔ خانہ جنگی، باہمی قتل اور خونریزی، فرمایا یہ جاہلیت کے دور کی طرف واپس جانا ہو گا۔

ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت پر

خدا کا عذاب نازل ہوگا تو عذاب کی وہ صورتیں نہیں ہوگی جو پہلی امتوں پر تھیں۔ نجی طور پر ہوں گی لیکن اجتماعی طور پر پہلی امتوں جیسا عذاب نہیں آئے گا۔ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یا اللہ! میری امت مجموعی طور پر ساری کی ساری کہیں گمراہ نہ ہو جائے۔ اللہ نے کہا، نہیں ہوگی۔ پھر درخواست کی، یا اللہ! میری امت ساری کی ساری یکبارگی تباہ نہ ہو جائے۔ اللہ نے کہا، نہیں ہوگی۔ پھر درخواست کی، یا اللہ! میری امت آپس میں نہ لڑے۔ اللہ نے کہا، ایسا تو ہوگا۔ اس امت کی بداعمالیوں کا عذاب یہی ہوگا۔ یہ لڑیں گے اور دنیا تماشا دیکھے گی۔

خدائی عذاب کی عملی صورتیں

طبرانی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت پر جب خدا کا عذاب آئے گا تو تین شکلوں میں ہوگا۔ پہلی شکل "کان الباس بینھم" آپس میں خانہ جنگی ہوگی۔ آپس مین خون بہائیں گے، نسل پر، رنگ پر، پیسے پر، علاقہ پر، زبان پر، پتہ نہیں کس کس چیز پر لڑیں گے۔ دوسری وجہ فرمائی "سلط اللہ علیکم شرارکم" سوسائٹی پر خدا کے عذاب کی عملی شکل یہ ہوگی کہ امت کے شریر لوگ چن چن کر امت پر مسلط کر دیے جائیں گے۔ یعنی امت کی قیادت شرفاء کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ اور تیسری شکل بیان فرمائی "ثم یدعوا خیارکم فلایستجاب لھم" تمہارے نیک لوگ دعائیں کریں گے، ان کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔ فرمایا میری امت پر جب خدا کا عذاب ہوگا آپس کی خانہ جنگی ہوگی۔

چنانچہ جہاں نبی کریم ﷺ نے دور جاہلیت کے خاتمے کا اور دور علم کے آغاز کا اعلان فرمایا، وہاں یہ بھی فرمایا کہ دیکھنا کہیں میرے بعد کفر کے دور کی طرف واپس نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنا شروع کر دو۔ اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہنا، یہ تمہارے لیے روشنی کا راستہ ہے، علم کا راستہ ہے اور انسانیت کا راستہ ہے۔

ختم نبوت کا اعلان

نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر ایک اعلان یہ فرمایا:

لانبی بعدی ولا امۃ بعدکم فاتقوا اللہ واعبدوا ربکم وصلوا

خمسكم وصوموا شهركم وادوا زكوٰة اموالكم طيبة بها
انفسكم وتحجون بيت ربكم واطيعوا امرائكم تدخلوا جنة
ربكم او كما قال صلى الله عليه وسلم۔

ترجمہ: ”میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور پانچ نمازیں پڑھو اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جائے گے۔“

فرمایا ”ایھا الناس“ اے لوگو! ”انه لانبی بعدی ولا امة بعدکم“ یاد رکھو میں آخری نبی ہوں، میں آخری پیغمبر ہوں، میرے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور تم انبیاء کی امت میں سے آخری امت ہو، تمہارے بعد اب کوئی امت نہیں ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بنیادی عقیدہ قرار دیا۔ عقیدہ ختم نبوت کہ نبی کریم ﷺ کے بعد قیامت تک کسی پر نئی وحی، اور نبوت نہیں آئے گی۔ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی اعلان فرمایا اور دیگر بہت سے ارشادات میں نبی کریم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ میرے بعد قیامت تک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ تکمیل دین کا معنی ہی یہ ہے۔ جب یہ فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہارے لیے دین مکمل کر دیا۔ اور تمہارے لئے نعمت تمام کر دی۔ اس کے بعد اب کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی، اور وہی وحی قیامت تک حجت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مثال سے اس کو واضح کیا۔ فرمایا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی اور میری مثال یہ ہے کہ جیسے ایک عمارت بن رہی ہے، ایک ایک اینٹ رکھی جا رہی ہے، اور عمارت مکمل ہو گئی ہے، لیکن آخر میں ایک اینٹ کی جگہ باقی ہے، فرمایا وہ آخری اینٹ میں ہوں۔ انا آخر اللبنة۔ گویا جس اینٹ کے ساتھ نبوت کی عمارت مکمل ہوئی ہے، وہ آخری اینٹ میں ہوں، میرے بعد اب اس میں کسی نئی اینٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ فرمایا کہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا آخری رسول ہوں، آخری پیغمبر ہوں اور تم امتوں میں سے آخری امت ہو۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ؒ کا اس پر مستقل رسالہ ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے عقیدہ ختم نبوت کا جن ارشادات میں ذکر کیا ہے، وہ روایات انہوں نے اس رسالہ میں جمع کی ہیں۔ اور مجموعی طور پر یہ ایک سو سے زیادہ روایات ہیں جن میں نبی

کریم ﷺ نے اپنے آخری نبی ہونے کا اور اس عقیدہ کا ذکر فرمایا کہ میرے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی۔ آپ حضرات اس حوالہ سے اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ کر لیں، کہ کہیں تھوڑا سا اشتباہ بھی اگر ہوا ہے، کہیں ابہام پیدا ہونے کا کوئی امکان ظاہر ہوا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فوراً وہاں وضاحت کی ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایات ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر جناب نبی کریم ﷺ نے عام حکم دیا کہ میرے ساتھ چلو، اور نہ جانے والوں پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ لیکن اس موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ آپ پیچھے رہیں گے۔ حضرت علیؓ کے لیے حکم تھا کہ ساتھ نہیں جانا۔ حضرت علیؓ بڑے پریشان کہ عرب کی حدود سے باہر یہ پہلا معرکہ ہے اور میں اس میں شریک نہیں ہوں گا۔ عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے آپ چھوڑ کے جا رہے ہیں؟ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہم نے زیادہ دیر باہر رہنا ہے، اور پیچھے کے معاملات ایسے ہیں کہ میرے گھر کا بھی کوئی آدمی رہنا چاہیے معاملات سنبھالنے کے لیے۔ ویسے حضورؐ نے امیر بنایا تھا عبداللہ بن عمرو بن ام مکتومؓ کو۔ اس غزوہ میں مہینہ جانے میں لگا، مہینہ وہاں رہے اور مہینہ واپسی میں لگا۔ تو حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ پیچھے رہیں۔ اور حضرت علیؓ درخواست کر رہے ہیں کہ یا رسول اللہ خود آپ جہاد پر جا رہے ہیں اور مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ تو حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا "اما ترضی ان تکون منی بمنزلة ہارون من موسیٰ" علی! اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تیرا میرا وہی تعلق ہو جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا تھا۔ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے۔ موسیٰؑ جب کوہ طور پر جاتے تھے تو پیچھے اپنا قائم مقام ہارون علیہ السلام کو بنا کر جاتے تھے۔ اب یہاں سے ایک ہلکا سا خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ ہارون علیہ السلام تو پیغمبر تھے۔ حضورؐ نے فوراً ساتھ ہی کہہ دیا الا انه ليس نبي بعدي۔ نبوت نہیں ملے گی بھائی، نبوت میرے بعد کوئی نہیں ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اس مسئلے کی حساسیت دیکھیے، ذرا سا شبہ آیا ذہن میں کہ ہارون علیہ السلام تو پیغمبر تھے اور جناب نبی کریمؐ حضرت علیؓ کو ہارونؑ سے تشبیہ دے رہے ہیں، تو شبہ دور کرنے کے لیے ساتھ ہی فرما دیا کہ الا انه لا نبي بعدي۔ میرے بعد نبی کوئی نہیں آئے گا۔ تو نبی کریم ﷺ نے بے شمار ارشادات میں اس بات کی وضاحت کی اور یہاں بھی اعلان فرمایا کہ لا نبي بعدي ولا امة بعدکم۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت

نہیں، یہی امت قیامت تک چلے گی۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کو ایک اور انداز سے تعبیر کیا۔ فرمایا میں قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی ہوں۔ یعنی آخری نبی میں ہوں اور اس کے بعد قیامت ہے، درمیان میں کوئی اور نبی نہیں۔ اور ایک موقع پر ہاتھ کی دو انگلیوں کو جوڑتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا انا والساعة کھاتین۔ میں اور قیامت یوں ہیں، درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں، میرے بعد بس قیامت ہے، میرا دور جب ختم ہوگا تو کسی اور کا دور اب نہیں آئے گا، بس قیامت آئے گی۔

آج کل کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ End of the history ہم ہیں، ہم پر تہذیب مکمل ہو رہی ہے، ہم آخری دور ہیں تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ نہیں بھئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ End of the history میں ہوں۔ أنا والساعة کھاتین۔ تاریخ کا آخری دور میں ہوں، آخری مرحلہ میں ہوں۔ جناب نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں، میں عرض کیا کرتا ہوں کہ مغرب کا آخری تہذیب ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ آخری تہذیب ہم ہیں۔

اس ارشاد کے ساتھ پھر حضورؐ نے یہ فرمایا الا خبردار! فاتقوا الله، اللہ سے ڈرتے رہو۔ واعبدوا ربکم، اپنے رب کی عبادت کرو۔ صلوا خمسکم، پانچ نمازیں پابندی سے پڑھو۔ صوموا شهر کم، ایک مہینے کے روزے رکھو۔ ادوا زکوٰۃ اموالکم، اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔ آگے پھر ایک جملے کا اضافہ فرمایا طیبة بها انفسکم، جب تم اپنے مال کی زکوٰۃ دو تو تمہارا دل اس کے دینے پر خوش ہو، میں اللہ کی بارگاہ میں اپنے مال سے زکوٰۃ کا حصہ پیش کر رہا ہوں۔ اسے بوجھ سمجھ کر مت دو کہ جیسے یہ ذمے پڑ گئی ہے اور مجبوری سے دے رہے ہیں۔ تحجون بيت ربکم، اپنے رب کے گھر کا حج ادا کرو۔ تو اس میں اسلام کے پانچوں ارکان آگئے۔ توحید بھی، نماز بھی، روزہ بھی، حج بھی اور زکوٰۃ بھی۔ پھر فرمایا، اطیعوا ولات امر کم، جو تمہارے اولوالامر ہیں، اسلام کی رو سے جو تمہارے حاکم ہیں، ان کی اطاعت کرو۔ تدخلوا جنة ربکم، یہ کام اگر تم کرو گے تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

گویا اسلام کا خلاصہ حضورؐ نے ان جملوں میں ارشاد فرمایا۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اللہ کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نماز کی پابندی کرو، اس مہینے کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی

زکوٰۃ ادا کرو، بیت اللہ کا حج کرو اور دین کے مطابق حکومت کرنے والے اپنے مسلمان حکمرانوں کی اطاعت کرو، تو یہ اعمال تمہارے جنت میں داخلے کا سبب بن جائیں گے۔

نسلی اور لسانی تفاخر کا خاتمہ

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے جو اہم اعلانات فرمائے اس میں ایک اعلان یہ بھی تھا، کہ جاہلیت کے دور میں عرب معاشرہ، نسل، زبان اور رنگ کے تفاخر کا معاشرہ تھا۔ قریشی غیر قریشیوں کو برابر نہیں سمجھتے تھے۔ عرب غیر عربوں کو برابر نہیں سمجھتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی ہے۔ بے شک اس پر جتنی مرضی لیپا پوتی کی جائے، لیکن رنگ اور نسل کی بنیاد پر تفاخر اور برتری کا یہ جذبہ آج بھی صاف جھلکتا ہے، نظر آتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی ہے، باقی دنیا میں بھی ہے۔ علاقائی سطح پر بھی ہے، عالمی سطح پر بھی ہے۔ یہ بات اس زمانے میں عروج پر تھی۔ آپ اس سے اندازہ کیجیے کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ فتح کرنے کے بعد جب کعبہ کا کنٹرول سنبھالا، چابیاں منگوائیں، کعبہ کو بتوں سے پاک کیا، تو حضورؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بیت اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دو۔ یہ اعلان ایک طوفان تھا اس معاشرہ میں، کہ کیا یہ بھی ہو سکتا ہے! بلالؓ ایک تو آزاد کردہ غلام ہیں، ایک کالے رنگ کے ہیں، عربی نہیں ہیں، حبشی ہیں، یہ بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہو کر اذان دے گا! وہاں طوفان مچ گیا۔ لیکن اعلان چونکہ نبی اکرم ﷺ نے کیا تھا تو کس کی مجال ہے کہ کچھ کہے۔ لیکن ایک قریشی سردار نے یہ منظر دیکھا تو کہتے ہیں کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور اپنے باپ کا نام لے کر کہا کہ میرے باپ تو بڑا خوش قسمت ہے، اس منظر کو دیکھنے سے پہلے دنیا سے چلا گیا۔ تو یہ منظر دیکھنے کے لیے زندہ نہیں ہے، کہ ایک کالے رنگ کا آدمی، غیر عرب، حبشی بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہے اور اللہ کا نام بلند کر رہا ہے۔ عام رواج یہ تھا کہ قریش اور غیر قریش کا خون برابر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ قریشی اگر کسی غیر قریشی کو قتل کر دیتا تو جواب میں قریشی قتل نہیں ہوتا تھا۔ اور غیر قریشی اگر قریشی کو قتل کرتا تو بدلے میں دو آدمی قتل ہوتے۔ اور پھر عرب و غیر عرب کا بھی فرق تھا۔ عربوں کو اپنی زبان پر بڑا فخر تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان واقعی فخر کی چیز ہے۔ لیکن اتنا بھی فخر کیا کہ دوسروں کو گونگا ہی کہنا

شروع کر دیں۔ عجمی کا معنی گونگا ہے۔ ہمیں عجمی کہتے تھے کہ یہ گونگے ہیں، ان کو زبان نہیں آتی۔ عرب فصیح کو کہتے ہیں۔ عرب کا لفظی معنی فصیح، بلیغ، عمدہ گفتگو کرنے والا۔ اور عجمی کا معنی گونگا کہ جس کے منہ میں زبان نہ ہو، جو بول نہ سکتا ہو، تو باقی ساری دنیا کو وہ عجمی کہتے تھے، کہ زبان اگر ہے تو ہمارے پاس ہے۔ چنانچہ یہ تفاخر تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ پر اس رسم کو توڑا، سب کو برابر کھڑا کیا۔ اور حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی تاکید فرمائی۔ فرمایا، یاد رکھو! ان ربکم واحد وان أباکم واحد کلکم من آدم وآدم من تراب، لا فضل لعربی علی عجمی، ولا لاحمر علی اسود او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔

فرمایا، میں آج تمام قسم کے نسلی ولسانی تفاخرات کا خاتمہ کرنے کا اعلان کر رہا ہوں، تم میں سے کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، اور کسی سرخ کو کالے پر فضیلت نہیں ہے۔ صرف یہ اعلان نہیں فرمایا بلکہ ایک ایسی سوسائٹی قائم کی کہ واقعتاً لوگوں نے دیکھا کہ یہ سارے امتیازات ختم ہو گئے تھے۔

اہل علم کا ادب واحترام

(۱) تابعین میں ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں عطاء ابن ابی رباحؒ، بڑے محدث ہیں، بڑے فقیہ ہیں، بڑے امام ہیں۔ وہ غلاموں کے خاندان سے تھے اور آزاد کردہ غلام تھے، سیاہ رنگ کے تھے۔ کہتے ہیں کہ شکل زیادہ مناسب نہ تھی اور یہ کہ ناک ایسے تھی جیسے لوبیہ ہوتا ہے۔ سلیمان ابن عبدالملک، اس زمانے میں خلیفہ تھے آدھی دنیا کے حکمران، حج پر آئے۔ عطاء ابن ابی رباحؒ مکہ کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ بڑے بڑے علماء بھی مسئلہ پوچھتے تو ان سے پوچھتے تھے کہ جی حضرت یہ مسئلہ کیا ہے۔ فقہاء بھی مسئلہ پوچھتے تو ان سے پوچھتے۔ ایک موقع پر عطاء ابن ابی رباحؒ نماز پڑھ کر بیٹھے تھے، اور سلیمان ابن عبدالملک کو دو تین مسئلے پوچھنے تھے، امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین کو حج کے مسئلے پر دو چار باتیں پوچھنی تھیں۔ اپنے بیٹوں کو لے کر آیا، آ کے بیٹھا۔ حضرت عطاء ابن ابی ریاحؒ نماز سے فارغ ہوئے اور ایسے ہی بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر پوچھا، جی فرمایئے! امیر المومنین صاحب نے مؤدب بیٹھے ایک مسئلہ پوچھا، دوسرا پوچھا۔ جب مطلوبہ مسئلے پوچھ لیے اور اٹھ کر جانے لگے تو اپنے بیٹوں

سے کہا، بیٹو! علم حاصل کرو، یہ علم ہی ہے جس کی وجہ سے مجھے اس کالے کے سامنے ذلیل ہونا پڑا۔ یہ علم ہی ہے جس نے اس کو یہ مقام بخشا کہ میں امیر المومنین ہو کر اس کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھنا پڑا۔ تو بیٹوں سے کہا علم حاصل کرو، علم انسان کے عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جناب نبی کریم ﷺ نے عملاً ایسی سوسائٹی دنیا میں قائم کی کہ جہاں عطاء ابن ابی رباحؒ کے سامنے امیر المومنین سلیمان ابن عبد الملک کو بھی مؤدب ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔

(۲) اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ امام مالکؒ بڑے لوگوں میں سے تھے، بہت بڑے امام تھے۔ ہارون الرشید کا زمانہ تھا، اس نے امام مالکؒ کو پیغام بھیجا کہ میں آپ سے شاگردی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں، تو کبھی آپ تشریف لائیں اور مجھے کچھ پڑھا دیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا، نہیں بھائی! آپ امیر المومنینؒ ہیں قابل احترام ہیں، لیکن میں کسی کے ہاں پڑھانے نہیں جاتا۔ فرمایا، پڑھنا ہے تو یہاں آجائیے۔ پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا پڑے گا اور کلاس میں بیٹھنا پڑے گا۔ دوسرا پیغام بھیجا کہ حضرت ٹھیک ہے میں حاضر ہوتا ہوں، لیکن بہر حال کچھ پروٹوکول تو چاہیے، امیر المومنین ہوں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا، جب آؤ گے، جہاں جگہ ہو گی وہیں بیٹھنا پڑے گا۔ روایات میں آتا ہے کہ ہارون الرشید اپنے بیٹے مامون اور امین کے ساتھ آیا تو مجلس میں پیچھے جگہ ملی، وہاں بیٹھا، حدیثیں سنیں، اور پھر یہ کہا کہ میں خود کو اس بات کا اہل نہیں سمجھتا کہ روایت حدیث میں اپنے آپ کو راوی شمار کروں، لیکن اس عظیم المرتبت شخصیت کا شاگرد ہونے کے لیے میں نے یہ کیا ہے۔ بہر حال بڑے لوگ تھے، وہ اچھے لوگ تھے۔ یہ صرف اس لیے کیا کہ مجھے شاگردی کا شرف حاصل ہو جائے کہ حدیث کی کسی سند میں، کسی کونے میں میرا نام بھی لکھا جائے کہ یہ فلاں محدث کا شاگرد ہے اور فلاں حدیث روایت کرتا ہے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے جاہلیت کے جتنے امتیازات تھے وہ ختم کیے، اور حجۃ الوداع کے موقع پر خاص اعلان فرمایا، قرآن پاک میں بھی ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝

(الحجرات:۴۹-۱۳)

ترجمہ: "اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قبائل اور برادریوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

قرآن پاک نے بنیادی اصول بیان فرمایا کہ دیکھو ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا، آدم وحوا سے۔ ہاں قبائل اور برادریاں ہم نے بنائی ہیں تعارف کے لیے، پہچان کے لیے۔ قبائل کا، ان کی شاخوں کا، خاندانوں کا وجود بھی ہے، قوموں کا وجود بھی ہے، لیکن تفاخر کے لیے نہیں، تعارف کے لیے ہے۔ اگر یہ فطری تقسیم نہ ہو تو مشکل ہو جائے۔ اگر یہ پتہ نہ ہو کہ یہ امریکی ہے، یہ افریقی ہے، یہ فلاں نسل کا ہے، یہ فلاں قوم کا ہے، تو پھر نمبرنگ کرنی پڑے گی، جو کہ مشکل ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ایسا کیا ہے، قبائل بھی درست ہیں، برادریاں بھی درست ہیں لیکن ان کا مقصد صرف باہمی تعارف ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یہ عزت اور تفاخر کی بنیاد نہیں ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ کہ اللہ کے ہاں عزت کس کی ہے؟ تقویٰ کی۔ تقویٰ کو یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ کے ہاں عزت کریکٹر کی ہے، کردار کی ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی ہے۔ اسلام عزت کی بنیاد رنگ، نسل، علاقے اور زبان کو قرار نہیں دیتا۔ آدمی ذرا توجہ سے پڑھے تو قرآن پاک کی ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ آپ صرف ایک بات سے اندازہ کر لیجیے کہ حضرت لقمانؒ سوڈانی تھے اور جھونپڑی میں رہنے والے غریب آدمی تھے، سیاہ رنگ کے تھے۔ کوئی بڑے سردار نہیں تھے، لیکن قرآن پاک میں پوری سورت ان کے نام پر اتاری گئی اور قرآن کریم نے بڑے مزے مزے سے ان کے واقعات ذکر کیے ہیں۔ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ ۔ اور فرمایا وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ ۔ اسی طرح اور جگہوں پر حضرت لقمانؒ کا ذکر کیا۔ اور دوسری طرف دیکھیں کہ ابولہب جو خاندان اور رشتہ کے لحاظ سے حضورؐ کا چچا ہے۔ اس سے بڑا خاندان کیا ہو گا دنیا میں۔ کائنات میں اس سے زیادہ معزز خاندان کون سا ہو گا، کہ جناب نبی کریم ﷺ کا چچا ہے۔ اور مال کا ذکر بھی قرآن پاک نے کیا، مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ ۔ بڑا مال تھا اس کے پاس، کسی کام نہیں آیا۔ روایات میں آتا ہے کہ اس کی بیوی ام جمیل جب زیورات پہن کر بیٹھتی تھی تو زیورات کے بوجھ سے اٹھ نہیں سکتی

تھی۔ عورتیں سہارا دے کر اٹھایا کرتی تھیں۔ اور حسن کا اندازہ کیجیے کہ ابولہب اس کی کنیت تھی۔ نام عبد الشمس تھا، ابولہب نہیں تھا۔ لہب شعلے کو کہتے ہیں۔ اس کے رخسار شعلے کی طرح چمکتے تھے جس کی وجہ سے ابولہب کا لقب ملا۔ شعلے جیسے رخساروں والا۔ خوبصورت بھی ہے، مال بھی ہے، مکہ میں رہتا ہے، مکہ کے مجاوروں میں سے ہے، خاندان بھی بڑا ہے، لیکن قرآن پاک نے کیسے ذکر کیا تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّ تَبَّ۝۱۔ قرآن کریم نے معیار بتا دیا کہ حضرت لقمانؒ اگر تقویٰ کے معیار پر پورا اترتے ہیں تو وہ حکمت والے ہیں۔ اور ابولہب اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو یہ لعنت کا مستحق ہے، اور اللہ کی طرف سے غضب کا مستحق ہے۔ تو جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس اصول کی بطور خاص وضاحت فرمائی، فرمایا ایھا الناس! ان ربکم واحد، اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے۔ وأبا کم واحد، اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، آدم کی اولاد ہو سارے۔ الا لا فضل لعربی علی عجمی، کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے۔ ولا لعجمی علی عربی، اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں ہے۔ ولا لاسود علی احمر، کسی کالے کو سرخ پر فضیلت نہیں ہے۔ ولا لاحمر علی اسود، کسی سرخ کو کالے پر فضیلت نہیں ہے۔ ہاں الا بالتقویٰ۔ مگر تقویٰ کے ساتھ۔ وہی جو قرآن پاک نے بتایا اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ ؕ کہ ایمان، تقویٰ، کردار، عمل صالح اس بنیاد پر فضیلت ہے۔ ایک اور جگہ پر قرآن کریم یہ ذکر کرتا ہے کہ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ۝۴ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ۝۵۔ کہ احسن تقویم بھی یہی ہے اور اسفل سافلین بھی یہی ہے۔ سب سے اوپر کا نمبر بھی اسی کا ہے اور سب سے نیچے کا نمبر بھی اسی کا ہے۔ لیکن یہ کس بنیاد پر؟ یہ ایمان، تقویٰ، کردار اور عمل صالح کی بنیاد پر۔

انتقام در انتقام کی قبائلی رسم کا خاتمہ

پھر جناب نبی کریم ﷺ نے جہاں جاہلیت کے دور کے خاتمے کا اعلان فرمایا کہ جاہلیت کی رسمیں میں نے ختم کر دی ہیں۔ ایک عمومی اعلان تھا کہ کل أمر الجاہلیۃ موضوع تحت قدمی۔ جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ لیکن دو کا آپؐ نے بطور خاص ذکر کیا۔ فرمایا، دماء الجاہلیۃ موضوعۃ، جاہلیت کے دور

میں جو بدلے اور خون کا رواج تھا، وہ میں نے ختم کر دیا ہے۔ قبائل میں بدلہ در بدلہ کا رواج تھا۔ قبائل میں یوں ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ کا آدمی قتل ہوا، تو قاتل قبیلہ کا آدمی قتل ہوگا، اور ضروری نہیں کہ قاتل ہی قتل ہو، بس اس قبیلہ کا کوئی آدمی مارا جائے گا۔ وہ مرا ہے تو اب پھر اس پہلے قبیلہ کا آدمی مرے گا۔ اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ حرب بعاث دو قبیلوں کی ایک مشہور جنگ تھی جو ایک سو بیس سال چلتی رہی۔ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی؟ کہتے ہیں، بات یہاں سے شروع ہوئی کہ ایک آدمی کا درخت تھا جس پر کبوتری نے گھونسلہ بنا رکھا تھا، انڈے دے رکھے تھے، تو کسی نے اسے پتھر مار کر گھونسلہ اور انڈے توڑ دیے۔ تو پہلے آدمی نے کہا کہ اچھا! میری زمین پر، میرے درخت پر اس نے یہ کر دیا، یہ تو میری توہین ہوئی ہے، کبوتری کا انڈا نہیں ٹوٹا یہ تو میری ناک کٹ گئی ہے۔ یہ "ناک بڑی خطرناک شے ہے"۔ بس اس نے پتھر مارنے والے کو قتل کر دیا۔ بس پھر دونوں کے قبائل کے درمیان ایک سو بیس سال جنگ رہی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک بڑی عجیب بات فرماتی ہیں کہ اوس اور خزرج کے درمیان کئی نسلوں تک جنگ رہی ہے۔ یہ دونوں انصار کے قبیلے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کے جوان قتل کر دیے، بہت بربادی ہوئی، تو پھر تنگ آ کر بوڑھے بوڑھے اکٹھے ہوئے کہ بھائی کوئی راستہ نکالو، کب تک لڑیں گے ہم۔ اب جب اس طرح کی جنگ ہو تو اس جنگ میں تو پھر آپس میں ایک دوسرے پر اتفاق نہیں ہوتا۔ طے ہوا کہ بھئی کوئی تیسرا آدمی تلاش کیا جائے جس پر ہم دونوں اکٹھے ہو جائیں۔ جناب نبی کریم ﷺ جب اوس اور خزرج کے لوگوں کو حج کے موقع پر منیٰ میں ان کے خیموں میں دعوت دینے آئے ہیں، تو انہوں نے آپس میں کھسر پھسر کی اور انہوں نے کہا کہ بھئی آدمی یہ ٹھیک ہے۔ ان کو جگہ کی ضرورت ہے، ہمیں آدمی کی ضرورت ہے۔ تو یہ تھی شروعات۔ حضورؐ طائف کے واقعہ کے بعد اس تلاش میں تھے کہ مجھے کوئی ٹھکانہ ملے تو میں وہاں اپنا مرکز بناؤں۔ یعنی کوئی قبیلہ حامی بھرے تو میں وہاں جاؤں اور دعوت دے رہے تھے خیموں میں جا کر۔ اور یہ اوس اور خزرج تلاش میں تھے کہ کوئی ایسا آدمی ملے کہ جس پر ہم اکٹھے ہو جائیں۔ یہ تھا آغاز۔ تو یہ دو باتیں اکٹھی ہو گئیں اور ان قبائل نے کہا کہ ہم تیار ہیں، آپ ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ پھر آگے ایک سال، پھر اگلے سال بیت عقبہ اولیٰ پھر بیت عقبہ ثانیہ، پھر سارے معاہدات ہوئے،

پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ ہجرت کر جائیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ ان واقعات کی حکمت اور اس کے فلسفہ پر ایک خوبصورت تبصرہ کرتی ہیں۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع ہے، علم اسرار دین۔ وہ انصار مدینہ سے خطاب کر کے یہ فرمایا کرتی تھیں کہ بظاہر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری ان سات آٹھ نسلوں کی جنگ سے تمہیں بہت نقصان ہوا، لیکن میں کہتی ہوں کہ تمہاری وہ جنگ نتیجہ بن گئی کہ حضور ﷺ تمہارے پاس تشریف لے آئے۔ اس لحاظ سے یہ جنگ تو تمہارے لیے باعث رحمت بن گئی۔ اگر یہ جنگ نہ ہوتی، یہ اسباب پیدا نہ ہوتے، تم حضورؐ کو دعوت نہ دیتے اور یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے حالات اس جنگ کے ذریعے سے پیدا کیے کہ حضورؐ یہاں تشریف لائے ہیں، اب دیکھو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتنی بڑی نعمت عطا کی ہے، دنیا کی قیادت اور امامت عطا فرما دی ہے۔ تو یہ حکمت کی بات ہے کہ بظاہر ایک واقعہ بڑا ہی خوفناک ہوتا ہے لیکن اللہ رب العزت اس کے درمیان سے کوئی خیر نکال لیتے ہیں۔

میں اس پر بات کر رہا تھا کہ جاہلیت کے زمانہ میں بدلہ در بدلہ کا رواج تھا۔ یہاں تک کہ مائیں اپنے بچوں کو لوریاں دے دے کر سبق پڑھایا کرتی تھیں کہ تمہارے باپ کا قاتل فلاں ہے، تم نے بڑے ہو کر اس کا بدلہ لینا ہے۔ یعنی لوریوں میں یہ انہیں بتایا کرتی تھیں کہ تمہارے باپ کو فلاں نے قتل کیا، تمہارے دادا کو فلاں نے قتل کیا، تمہارے چچا کو فلاں نے قتل کیا، اس لیے فلاں کا بدلہ بھی تمہارے ذمہ ہے، فلاں کا بدلہ بھی تمہارے ذمہ ہے۔ اور ہمارے ہاں آج بھی دیہات اور قبائل میں یہ رواج موجود ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا دماء الجاہلیۃ موضوعۃ، جاہلیت کے سارے خون، بدلے آج میں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ آج کے بعد پرانے کسی قتل پر کوئی کسی سے بدلہ نہیں لے گا۔ کہیں تو آخر بریک لگنی تھی، معاملہ تبھی صاف ہونا تھا۔ فرمایا، پچھلے جتنے بدلے تمہارے آپس میں تھے، سب ختم۔ اور فرمایا، میں اپنے گھر سے شروع کر رہا ہوں۔ ربیعہ ابن حارثؓ کا بیٹا بچپن میں کسی خاندان میں دودھ پینے کے لیے بھیجا ہوا تھا تو وہاں کسی نے قتل کر دیا۔ اور قبائلی روایت کے مطابق ان کے ذمہ تھا بدلہ لینا۔ فرمایا میرے گھر کا بچہ قتل ہوا تھا، ابن ربیعہ ابن حارث۔ اور قبائلی روایات کے مطابق ہمارے ذمہ اس کا بدلہ بنتا ہے، لیکن میں اس کو ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ چنانچہ میں پہلے اپنے گھر کا خون معاف کرتا ہوں اور پھر تمام خونوں کے ختم کرنے کا اعلان کرتا

ہوں۔ آج کے بعد پچھلے کسی قتل کے حوالے سے کوئی کسی سے بدلہ نہیں لے گا۔ فرمایا جاہلیت کی یہ قدریں میں توڑنے کا اعلان کرتا ہوں۔

سود کا خاتمہ

دوسری جاہلی قدر جس کا حضورؐ نے بطور خاص ذکر کیا۔ فرمایا، وربا الجاہلیة موضوعة۔ جاہلیت میں تم سود کا لین دین کرتے تھے، میں اس کے خاتمے کا اعلان کر رہا ہوں۔ فرمایا، جس کے ذمے کسی کی کوئی رقم ہے، اس کو اصل رقم ملے گی، سود نہیں ملے گا۔ قرآن نے بھی اس کی حرمت کا اعلان فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ آج بھی دنیا میں یہ بڑی بحث ہے۔ قرآن کریم نے اس وقت جب اس کی حرمت کا اعلان کیا تو اس وقت بھی اس پر بڑا مباحثہ ہوا۔ کہا گیا کہ جناب یہ تو بزنس ہے۔ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ سود میں اور تجارت میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی بزنس ہے، کاروبار کی ایک شکل ہے، کہ چیزیں نہ بیچیں، پیسہ بیچا۔ اس قت بھی یہی دلیل پیش ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، نہیں بھئی۔ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ۔ بزنس حلال ہے، سود حرام ہے۔ دلیل ذکر کر کے قرآن کریم نے پھر دوٹوک کہا کہ نہیں، یہ بزنس نہیں ہے، یہ بزنس سے الگ چیز ہے۔ تو اس وقت بھی یہ بحث چلی تھی۔

طائف والوں کی شرطیں

ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے جو سیرت کی تقریباً تمام کتب میں موجود ہے کہ طائف والے جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے آئے تو اس پس منظر میں آئے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی لڑائی میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی، اور پھر طائف کا معرکہ پیش آیا۔ طائف کا حضورؐ نے سترہ دن تک محاصرہ کیا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تو محاصرہ اٹھا کر واپس آنا پڑا۔ طائف والے بڑے خوش کہ یہ ہمیں فتح نہیں کر سکے۔ اور یہ بات درست بھی تھی۔ طائف والوں کا اپنا وفد مدینہ منورہ گیا، کہ جناب آپ تو ہمیں فتح نہیں کر سکے، ہم خود کلمہ پڑھنے آگئے ہیں۔ لیکن ہماری کچھ شرطیں ہیں۔ گھمنڈ پیچھے یہ تھا کہ ہم فتح نہیں ہو سکے، اس لیے ہم برابر کی سطح پر شرطوں پہ بات کریں گے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اور دیگر

سیرت نگاروں نے یہ واقعہ لکھا ہے۔ طائف والوں نے کہا کہ ہم کلمہ تو پڑھیں گے لیکن ہماری کچھ شرطیں ہیں۔ ان شرطوں میں چار بڑی شرطیں تھیں۔ ایک شرط یہ تھی کہ جناب آپ شراب کو حرام کہتے ہیں، ہم شراب نہیں چھوڑ سکتے اور دلیل دی کہ ہماری معیشت کا مسئلہ ہے۔ آج بھی طائف کی بڑی پیداوار انگور ہے۔ کہا کہ ہمارے ہاں انگور پیدا ہوتا ہے، انگور کچا مارکیٹ میں پھینکیں تو کچھ خاص معاوضہ نہیں ملتا، نچوڑ کر، پکا کر دیتے ہیں تو چار پیسے نکل آتے ہیں۔ دلیل دی کہ یہ ہمارا کاروبار ہے، اس کے بغیر ہمارا سال نہیں گزرتا۔ کچا انگور کتنے پیسے کمائے گا؟ پھر آپ کہتے ہیں کہ سود حرام ہے۔ ہمارا تو سارا کاروبار سود پر چلتا ہے، سود نہیں چھوڑ سکیں گے۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ کہتے ہیں زنا حرام ہے۔ یہ بھی ہم سے نہیں چھوٹے گا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہمارا کلچرل مسئلہ ہے، ہم میں شادیاں بہت دیر سے کرنے کا رواج ہے، گزارا نہیں ہوتا تو اس لیے زنا بھی نہیں چھوڑیں گے ہم۔ پھر ایک بات اور کہ ہم نماز پڑھیں گے تو سہی لیکن اتنے ٹائٹ شیڈول کے ساتھ نہیں۔ اوقات اور تعداد ہم اپنی مرضی سے منتخب کریں گے۔ نماز سے انکار نہیں لیکن یہ پانچ وقت کی اور یہ اوقات کی پابندی ہم سے نہیں ہو سکتی۔ ہم خود اپنی سہولت سے اس کا انتخاب کرلیں گے، کہ کب پڑھنی ہے اور کتنی پڑھنی ہے۔ تو یہ شرطیں ہیں ہماری۔ اگر آپ ان شرطوں کو قبول کرتے ہیں تو ہم اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ کلمہ پڑھا دیجیے۔ پانچ وقت کی نماز کی پابندی نہیں ہوگی، شراب نہیں چھوڑیں گے، زنا نہیں چھوڑیں گے اور سود نہیں چھوڑیں گے۔ باقی ہمیں آپ کلمہ پڑھا دیجیے جو پڑھانا ہے آپ نے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ تو طائف والوں کی شرطیں تھیں، ذرا دیکھئے کہ ہماری آج کی شرطیں کیا ہیں۔ اسلام کو بحیثیت سسٹم قبول کرنے میں ہماری آج کی شرطیں بھی یہی ہیں۔ نماز میں زبردستی نہ کرو، باقی معاملات میں بھی دنیا کے ساتھ چلو، تو باقی کا اسلام ہمیں قبول ہے۔ تو جناب نبی کریم ﷺ نے انکار فرما دیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مکہ میں اسلام مختلف، اور ستر میل کے فاصلے پر طائف میں اسلام بالکل مختلف، کہ مکہ میں تو سود حرام اور طائف میں حلال ہو۔ اور یہ کہ مکہ میں پانچ نمازیں ہوں اور طائف میں تین ہوں۔ مکہ میں شراب حرام ہو اور طائف میں حلال۔ فرمایا، نہیں بھئی کوئی شرط قبول نہیں ہے، باقی رہی یہ بات کہ ہم تمہیں فتح نہیں کر سکے، تو یہ درست ہے لیکن پھر کسی اور موقع پر سہی۔ تو یہ معاملات جو آج

چل رہے ہیں یہ حضورؐ کے زمانے میں بھی ایسے ہی چلتے رہے ہیں۔ شرطوں والے بھی اور دلیلوں والے بھی اور بزنس والے بھی سارے معاملات چلتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے یہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں صاف اعلان فرمایا ربا الجاہلیۃ موضوعۃ، جاہلیت کے تمام سود ختم۔ آج کے بعد جو بھی اس معاملہ میں ہے، صرف اصل رقم کا حقدار ہے، سود کی رقم ختم۔ یہاں بھی فرمایا کہ میں اپنے گھر سے آغاز کر رہا ہوں۔ حضرت عباسؓ سود کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا کاروبار ہی یہ تھا کہ سود پر لوگوں کو رقمیں دیتے تھے۔ بہت سے لوگوں کے ذمے ان کی رقمیں تھیں۔ فرمایا، میں عباسؓ کی سود کی ساری رقمیں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ میرے چچا عباس جو مکہ میں سود کا کاروبار کرتے تھے، ان کی رقمیں جن کے ذمے ہیں، ان کے ذمہ سود نہیں ہوگا، صرف اصل رقم واپس ہوگی۔

باقی جاہلیت کی باتیں تو حضورؐ نے عمومی اعلان سے ختم کیں، لیکن یہ دو تین باتیں بطور خاص نامزد کر کے ختم کرنے کا اعلان فرمایا۔

شیطان کا مورچہ

نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر ایک اعلان یہ بھی فرمایا کہ الا وان الشیطان قد ایس ان یعبد فی بلادکم ھذہ ابدا۔ شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ ان شہروں میں یعنی جزیرۃ العرب میں اب کبھی بھی اس کی عبادت کی جائے، اس کا حکم مانا جائے۔ جزیرۃ العرب ہمیشہ توحید کے دائرہ میں رہے گا۔ شیطان نے یہ سارا کھیل رچا رکھا تھا، مکہ کے گرد اور بیت اللہ میں یہ بتوں کی موجودگی اور یہ ساری جاہلی قدریں شیطان ہی کا کاروبار تھا۔ لیکن فرمایا وہ بالکل بے دخل نہیں ہوگا، عبادت اس کی نہیں ہوگی، یہ جزیرۃ العرب توحید پر قائم رہے گا، لیکن شیطان بالکل بے دخل نہیں ہوگا۔ دو باتوں میں گڑبڑ کرے گا۔ ولکن ستکون لہ طاعۃ فیما تحقرون من اعمالکم وسیرضیٰ، شیطان اپنی باتیں منوائے گا بظاہر چھوٹے چھوٹے کاموں میں جن کو تم بہت حقیر سمجھو گے۔ اور شیطان تم سے وہ کام کروا کر خوش ہوگا۔ توحید اور عقیدے کی بات میں تم اس کے پیچھے نہیں چلو گے لیکن چھوٹے چھوٹے کاموں میں شیطان تم سے اپنی بات منوائے گا۔ یہ تو ہے ترمذی کی روایت

میں، اور مسند احمد کی روایت میں ہے لکن فی التحریش بینکم، شیطان ایک بات میں تو ضرور کامیاب ہوگا، کہ وہ تمہیں آپس میں لڑائے گا، ایک دوسرے پر ابھارے گا۔ عقیدہ تمہارا نہیں بگاڑ سکے گا، فی التحریش بینکم، ایک کو دوسرے پر ابھارے گا، برانگیختہ کرے گا، ایک دوسرے کے ساتھ لڑائے گا، خانہ جنگی ہوگی، خون بہایا جائے گا۔ یہ شیطان کے میدان ہوں گے۔ فرمایا، شیطان شکست کھا چکا ہے لیکن آرام سے نہیں بیٹھے گا۔ تو حضورؐ نے خبردار کیا کہ اس سے بچ کر رہنا۔

جان و مال کی حرمت

بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ منیٰ میں کھڑے تھے، قربانی کا دن تھا، یوم النحر تھا۔ آپ نے پوچھا، ایّ شھر ہذا، یہ کون سا مہینہ ہے؟ جریر ابن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا اللہ و رسولہ اعلم۔ پتہ تو ان کو تھا کہ مہینہ کون سا ہے۔ صحابہؓ کا معمول تھا کہ حضورؐ کوئی سوال کرتے تو پہلے مرحلے پر جواب یہی ہوتا تھا کہ اللہ ورسولہ اعلم۔ فرمایا، کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ کہا، یارسول اللہ! ہاں قربانی کا دن ہے۔ ای بلد ھذا، یہ شہر کون سا ہے؟ کہا، اللہ ورسولہ اعلم۔ فرمایا، لیس البلد، یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ کہا، یارسول اللہ! بلدۃ الحرام ہی ہے۔ تو آپ ﷺ نے تین حرمتوں کا حوالہ دیا۔ بسا اوقات بات کی اہمیت بیان کرنے کے لیے آدمی پہلے ذہنی طور پر تیار کرتا ہے۔ شہر محترم ہے، مہینہ حرمت والا ہے اور دن حرمت والا ہے۔ پھر فرمایا، ان دمائکم واموالکم و اعراضکم وابشارکم حرام علیکم کحرمت یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔ تمہارے خون، تمہارے مال تمہاری عزتیں اور تمہارے چمڑے ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح اس دن کی، اس شہر کی اور اس مہینہ کی حرمت ہے۔ دمائکم، تمہارے خون ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ جس طرح تم اس دن کی، اس شہر کی اور اس مہینہ کی حرمت کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح ایک دوسرے کی جان کی حفاظت کرو۔ واموالکم، تمہارے اموال بھی ایک دوسرے پر محترم ہیں، تم کسی کے مال پر ہاتھ نہیں ڈالو گے۔ جس طرح جان کی

ایک دوسرے پر حرمت ہے اسی طرح مال کی حرمت بھی ہے۔ چوری، ڈکیتی، دھوکہ، یعنی کوئی بھی شکل مال کو ہڑپ کرنے کی اختیار نہیں کرو گے۔ واعراضکم، تمہاری عزتیں بھی ایک دوسرے پر محترم ہیں۔ جس طرح کسی دوسرے کی جان و مال پر دست درازی حرام ہے، اسی طرح کسی دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالنا بھی حرام ہے۔ اس کی لمبی تفصیل ہے، کہ کسی کی عزت پر حملہ نہیں کرو گے، کسی کو بے عزت نہیں کرو گے، کسی کا مذاق نہیں اڑاؤ گے، کسی کو گالی نہیں دو گے، کسی کی توہین نہیں کرو گے۔ یہ ساری باتیں اس میں شامل ہیں۔ تو فرمایا جس طرح، مکہ حج کے دن اور حج کے مہینہ کا احترام کرتے ہو اسی طرح ایک دوسرے کی عزت کا احترام کرو۔ وابشارکم، تمہارے چمڑے ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ یہ سارے جملے بخاری کی روایت میں ہیں۔ جس طرح کسی کی جان لینا جائز نہیں اس طرح کسی کو تھپڑ مارنا بھی جائز نہیں، بلا جواز کسی کو چھڑی مارنا بھی جائز نہیں، بلا جواز کسی پر ہاتھ اٹھانا بھی جائز نہیں۔ فرمایا یہ چاروں چیزیں تم پر حرام ہیں۔ ایک حدیث میں ذکر ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے بیت اللہ سے خطاب کیا۔ ایسی بات ہوتی ہے سمجھانے کے لیے۔ بیت اللہ کے سامنے آپؐ اور صحابہؓ کھڑے ہیں۔ فرمایا، اے اللہ کے گھر! تو اللہ کے ہاں بہت محترم ہے، لیکن ایک مسلمان کے خون کی حرمت تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ گویا بیت اللہ کا گرانا اور مسلمان کا خون بہانا برابر ہے۔

ایسے ہی ایک دفعہ حضرت عمرؓ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے، حجر اسود پر آئے، بوسہ دیا، اور سامنے کھڑے ہو کر کہا، او کالے پتھر! میں نے تجھے جو بوسہ دیا ہے، تیرے اندر نفع ونقصان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ خدا کی قسم! اگر رسول اللہ ﷺ کو میں تمہیں بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تمہیں کبھی نہ چومتا۔ پتھر کو کچھ کہنا مقصود نہیں تھا دراصل یہ بات سمجھانے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ مقصد ارد گرد کے لوگوں کو بات سنانا تھا کہ لوگوں کا عقیدہ درست رہے۔

تو یہ بھی حجۃ الوداع کے موقع پر ایک بہت اہم اعلان ہے کہ ایک دوسرے کی جان کی، مال کی، عزت کی اور ایک دوسرے کے چمڑے کی حفاظت کرو، کسی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، کسی کا مال ہضم نہ کرو، کسی کو قتل نہیں کرو، کسی کی عزت خراب نہیں کرو، فرمایا یہ تمہارے آپس کے حقوق ہیں۔

قیامت کے دن کی حاضری

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، وانتم تسئلون عنی، کہ کل قیامت کے روز تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اللہ پوچھے گا کہ میں نے پیغمبر بھیجا تھا، اس نے کیا کیا۔ تم لوگ کیا کہو گے؟ تو صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! بلغت وادیت ونصحت، آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے، حق ادا کیا ہے اور خیر خواہی کی ہے۔ کہا، اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا۔ پھر فرمایا کہ ایک سوال تمہیں خود تمہارے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ ستلقون ربکم ویسئلکم عن اعمالکم۔ رب کے سامنے پیش ہونا ہے بھئی، اللہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا، کہ تم کیا کر کے آئے ہو بھئی۔ پیغمبر نے کیا کیا تھا، یہ بھی سوال ہوگا اور تم امتی کیا کر کے آئے ہو دنیا میں، یہ بھی پوچھا جائے گا۔ اور امتی سے تو یہ سوال مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جائے گا۔ جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ انسان اللہ کے دربار میں پیش ہوگا، اس وقت تک قدم نہیں اٹھا سکے گا جب تک تین سوالوں کا جواب نہیں دے گا، عن عمرہ فی ما افناہ کہ میں نے تمہیں عمر دی تھی۔ میں نے تمہیں ساٹھ، ستر، پچھتر سال کی زندگی دی تھی، کیا کیا اس کا؟ وعن شبابہ، میں نے تمہیں جوانی دی تھی، جوانی کی صلاحیتیں کدھر خرچ کیں؟ وعن مالہ، اور میں نے تمہیں مال دیا تھا، رزق بھی دیا تھا، تھوڑا زیادہ جتنا بھی دیا تھا، لیکن دیا تھا۔ تو یہ تین سوال پوچھے جائیں گے۔ زندگی کے بارے میں پوچھا جائے گا اور جوانی کے بارے میں بالخصوص پوچھا جائے گا کہ جوانی کے ساتھ کیا کیا۔ فرمایا، انکم ستلقون ربکم، تم اپنے رب کے سامنے پیش ہو گے۔ کائنات کی ہر چیز ٹل سکتی ہے، لیکن رب کا سامنا نہیں ٹل سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو کوئی جھٹلائے، تب سامنا ہوگا اور نہ مانے تب سامنا ہوگا۔ وتسألون عن اعمالکم اور اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اپنے اعمال کو سیدھا رکھو تاکہ کل اللہ کا سامنا کر سکو، اور سوال کا جواب دے سکو، پیشی تمہاری صحیح ہو۔

سوسائٹی کے کمزور طبقوں کے بارے میں

یہ ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں دو کمزوروں، دو ضعیفوں کے بارے میں بطور خاص وصیت

کرتا ہوں کہ ان کے حقوق کا خیال کرنا کیونکہ وہ اپنا حق اپنے طور پر وصول کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ ایک یتیم اور دوسرا عورت۔ فرمایا، یہ دو کمزور ہیں، میں ان کے حقوق کے بارے میں تمہیں بطور خاص وصیت کرتا ہوں۔ فاتقوا اللّٰہ فی النساء، عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ عورتوں کے حوالے سے بھی اور یتیموں کے حوالے سے بھی۔ اور تیسرا طبقہ جس کے بارے میں فرمایا کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں غلاموں کے بارے میں، ماتحتوں کے بارے میں۔ اس زمانے میں غلام ہوتے تھے۔ آج بھی ہیں لیکن ذرا عنوان بدل گئے ہیں۔ فرمایا کہ میں غلاموں کے بارے میں بطور خاص وصیت کرتا ہوں کہ وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت جو معاشرہ تھا، اس میں یہ تینوں طبقے فی الواقع مظلوم تھے۔ اور یہ آج بھی مظلوم ہیں، ذرا پہلو بدل گئے ہیں، رخ بدل گئے ہیں، حوالے بدل گئے ہیں، لیکن ہیں سہی۔ قرآن کریم نے بھی یتیم اور عورت کا ذکر کیا ہے۔

یتیموں کی حالت زار

اس سوسائٹی کو سمجھنے کے لیے قرآن کے حوالے سے ایک بات میں ذرا تفصیل سے بیان کروں گا۔ حضرت عروہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت زبیرؓ کے بیٹے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے بھی تھے اور شاگرد بھی، بلکہ علمی جانشین تھے۔ میں نے پہلے بھی کسی جگہ ذکر کیا تھا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علوم کو امت تک منتقل کرنے والے تین بڑے آدمی ہیں۔ ایک ان کے بھتیجے، قاسم ابن محمدؒ۔ دوسرے ان کے بھانجے، عروہ ابن زبیرؒ۔ تیسری خاتون ہیں عمرہ بنت عبد الرحمٰنؒ جن کو حضرت عائشہؓ کی اصل جانشین سمجھا جاتا ہے۔ بڑی محدثہ اور فقیہہ تھیں۔ تو عروہؒ شاگرد بھی تھے اور بھانجے بھی۔ حضرت عائشہؓ کی گود میں پلے ہیں بیٹوں کی طرح۔ عروہؒ بہت سے حوالوں سے اپنے سوالات کا ذکر کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی کسی آیت کو سمجھنے میں کوئی اشکال ہوتا تو حضرت عائشہؓ سے پوچھتا کہ اماں جان! یہ آیت سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ان میں سے ایک آیت کا میں اس وقت تذکرہ کروں گا۔ عروہؒ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی ایک آیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی،

میں نے اماں جان سے پوچھا۔ یہ سورۃ النساء کی آیت ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ان کا ترجمہ یوں ہے وَاِنْ خِفْتُمْ، اگر تمہیں خوف ہو اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی، کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے فَانْکِحُوْا، پس نکاح کرو مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ، جو عورتیں تمہیں اچھی لگیں مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ، دو، تین، چار۔ عروہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اماں جان سے پوچھا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے کہ یتیموں سے اگر انصاف نہ کر سکو تو شادیاں کرو؟ اس بات کا آپس میں کیا جوڑ ہے؟ جبکہ آیت کی ترتیب یہی ہے کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو شادیاں کرو۔ دو شادیاں کرو، تین کرو، چار کرو۔ ان دونوں جملوں کا آپس میں ربط کیا ہے؟ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرنے کا شادیوں کے ساتھ کیا تعلق؟ عروہؓ کہتے ہیں کہ میں نے خالہ محترمہ، اماں جان کی خدمت میں یہ اشکال پیش کیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا بیٹا بات یہ ہے کہ جب تک اس معاملے کا تمہیں پس منظر پتہ نہ چل جائے، یہ آیت تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

گفتگو کا یہ اصول صرف قرآن کریم کے ساتھ خاص نہیں ہے، دنیا کی کسی بھی زبان میں گفتگو جب تک اس کے بیک گراؤنڈ میں نہ دیکھی جائے اس وقت تک اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی بات کہاں اور کس ماحول میں کہی گئی ہے۔ گفتگو کو اس کے اصل پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کا مطلب سمجھ میں آتا ہے ورنہ بسا اوقات بات سمجھ میں نہیں آتی اور آدمی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم دنیا کی اصطلاحات میں اسے پس منظر اور ماحول، بیک گراؤنڈ کہتے ہیں جبکہ قرآن کریم کی تفسیر کی اصطلاح میں اسے شان نزول کہتے ہیں۔ مثلاً یہ آیت کب نازل ہوئی تھی، کیوں نازل ہوئی تھی اور وہ مسئلہ کیا تھا جو اس آیت کے نزول کا سبب بنا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، چونکہ اس آیت کا پس منظر تمہارے سامنے نہیں ہے اس لیے تمہیں یہ آیت سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ پھر اس کے پس منظر کی وضاحت کی۔ فرمایا، قبائل کا سسٹم تھا۔ جیسا کہ قبائلی نظام میں ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ کا سردار اپنے قبیلہ کے تمام معاملات کا مختار اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ کوئی شخص فوت ہو جاتا اور اس کی بچی یتیم ہو جاتی تو اس کا فیصلہ بھی قبیلہ کا سردار ہی کرتا۔ بچی کا باپ اگر جائیداد وغیرہ چھوڑ جاتا یا یہ کہ بچی خوبصورت ہوتی تو سردار کے پاس ہوتی تھی۔ لڑکی کو حرم میں ڈال دیتے، جائیداد پر قبضہ کر

لیتے۔اب جہاں بیس پچیس لڑکیاں ہوں گی، آپ خود اندازہ کرلیں کہ ان کے حقوق کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ نہ تو اس یتیم بچی کو حقوق مل رہے ہیں اور نہ آزادی! وہ بس ایسے ہی اس کے حرم میں پڑی ہے۔ چنانچہ جائیداد کی لالچ میں یا بچی کی خوبصورتی دیکھ کر خاندانوں کے سردار ایسا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سورۃ النساء کی اس آیت میں قرآن کریم نے دراصل اس بات پر پابندی لگائی۔ فرمایا، یتیم بچی ہے، اگر تم انصاف کر سکتے ہو تو منع نہیں ہے، لیکن اگر انصاف نہیں کر سکتے تو ان بچیوں کو خواہ مخواہ اپنے حرم میں ڈال کر انہیں ان کے حقوق سے محروم نہ کرو۔ اور پابندی لگا دی کہ چار سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ چار کی حد اجازت کے لیے نہیں ہے بلکہ چار سے زیادہ کی ممانعت کے لیے ہے۔

چار سے زیادہ بیویاں

چنانچہ جب یہ حکم نازل ہوا تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دے دیا کہ جس کے پاس چار سے زیادہ ہیں وہ انہیں فارغ کر دے۔ ایک صحابیؓ کے پاس پانچ تھیں، اس نے ایک فارغ کر دی۔ ایک کے پاس دس تھیں، چھ فارغ کر دیں۔ اب خود نبی کریم ﷺ کے حوالے سے یہ مسئلہ پیش آ گیا کہ حضورؐ کے پاس نو تھیں۔ یہ بھی ایک بہت بڑا سوال ہے کہ باقیوں سے تو حضورؐ نے چار سے زیادہ چھڑوا لیں لیکن خود کیوں نہیں چھوڑیں۔ نو کی نو رکھیں اور کسی کو طلاق نہیں دی۔ جناب نبی کریم ﷺ کے لیے حکم مختلف تھا۔ حکم یہ تھا کہ جناب اس کے بعد آپ نیا نکاح نہیں کر سکتے لیکن ان کو نہیں چھوڑیں گے۔ لا یحل لك النساء من بعد، اس کے بعد آپ کوئی نکاح نہیں کر سکتے ولا ان تبدل بهن من ازواجهم ولو اعجبك حسنهن، اور گنتی برقرار رکھنے کے لیے کسی کو چھوڑیں گے بھی نہیں کہ ایک کو چھوڑ کر کسی اور سے نکاح کر لیا۔ یہ دو پابندیاں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر لگا دیں۔ اور اس بات کی وجہ قرآن کریم نے خود بیان کی ہے۔ باقی لوگوں نے جو چار سے زائد چھوڑیں، ان کا بعد میں کہیں نہ کہیں نکاح ہو گیا۔ لیکن جناب نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کا ٹائٹل کیا ہے؟ امهات المؤمنين۔ یہ مومنوں کی مائیں ہیں اور ان کے لیے حکم یہ ہے کہ ولا ان تنکحوا ازواجه من بعده ابداً، حضورؐ کے بعد کوئی اور ان سے نکاح نہیں کر سکتا۔ باقیوں کے لیے

تو چھوڑ دینا عزت افزائی تھی، ان کا نکاح کہیں اور ہو گیا۔ حضورؐ اگر پانچ کو چھوڑ دیتے تو وہ کدھر جاتیں؟ کوئی ان سے نکاح تو کر نہیں کرسکتا تھا کہ مائیں ہیں۔ تو حضورؐ کے لیے حکم تھا کہ ان ازواج مطہرات کو نہ چھوڑیں تاکہ ان کا اعزاز واحترام برقرار رہے۔

خیر، میں یتیم کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ یتیم اس زمانے میں بھی ایک مظلوم طبقہ تھا اور آج بھی ہے۔ یتیم اس حوالے سے بھی مظلوم طبقہ ہے کہ وہ بڑوں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا ولی دیانت دار ہے، ایمان دار ہے تو یتیم کو وراثت کا حصہ بھی پورا ملے گا جو کہ بہت کم ملتا ہے، اس کی جائیداد کی حفاظت بھی ہوگی، اس کی تعلیم وتربیت بھی ہو گی۔ لیکن اگر ولی کی نیت میں کھوٹ ہے تو سارے معاملات گڑبڑ ہو جائیں گے اور عام طور پر یہ گڑبڑ ہو جاتے ہیں۔

جاہلیت کے زمانے میں وراثت کے حصے متعین نہیں ہوتے تھے، مرنے والے کی مرضی ہوتی تھی کہ اپنی وصیت میں جس کو جتنا مرضی دے جاتا۔ اگر کسی کو نہ دے کر جاتا تو قبائل کا عام رواج یہ تھا کہ اس کا سارا مال بڑے بیٹے کے قبضہ میں آ جاتا۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہوتا تھا کہ باپ کی منکوحہ بھی بڑے بیٹے کے قبضہ میں آ جاتی تھی۔ یعنی باپ نے کہیں نکاح کیا، بعد میں فوت ہو گیا تو اس کی منکوحہ بڑے بیٹے کے نکاح میں خود بخود آ جاتی تھی کہ یہ وراثت میں ہے۔ اس لیے ایک تو قرآن کریم نے یہ کیا کہ وراثت کے حصے متعین کر دیے۔ بیوی کا بھی، بچوں کا بھی، ماں باپ کا بھی۔ قرآن کریم کا پہلا حکم بھی یہ تھا کہ مرنے والا مرنے سے پہلے وصیت کر جائے کہ کس کو کتنا حصہ دینا ہے۔ یعنی وراثت کی تقسیم میں اس کا اختیار تھا کہ کس کو کتنا حصہ دیتا ہے۔ لیکن بعد میں قرآن کریم نے حصے متعین کر دیے اور فرما دیا کہ یہ طے شدہ بات ہے، اس میں کسی کو ردوبدل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

وراثت کے احکام

وراثت کا مسئلہ اس زمانے میں بھی نازک تھا اور آج بھی ہے۔ ترمذی کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میاں بیوی کا ایک جوڑا، چالیس سال، پچاس سال، ساٹھ سال عبادت کرتے ہیں، اللہ کی بندگی میں گزارتے ہیں اور آخرت میں جائیداد کی تقسیم میں گڑبڑ کر

کے اپنے رشتہ داروں میں سے کچھ کو محروم کر دیتے ہیں اور سیدھا جہنم میں چلے جاتے ہیں۔ چالیس پچاس سال کی عبادت کے باوجود۔ کیونکہ اگر قرآن کریم کے مقرر کردہ حصوں سے ہٹ کر وصیت کریں گے تو کسی نہ کسی کا حق تو مارا ہی جائے گا۔ تو قرآن کریم نے یتیموں کو یہ تحفظ دیا، اور ساتھ ہی تلقین و تنبیہ بھی فرمائی اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا، جو لوگ ظلم و زیادتی سے یتیم کا مال کھاتے ہیں، اپنے پیٹ میں روٹی کا لقمہ نہیں ڈالتے بلکہ آگ کے انگارے ڈالتے ہیں۔ اس مسئلے کی حساسیت کا آپ اس واقعہ سے اندازہ کیجیے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک دفعہ اپنے ایک بیمار دوست کی بیمار پرسی کے لیے گئے۔ حال احوال پوچھ رہے تھے۔ ہوا یہ کہ وہ کافی زیادہ بیمار تھا، آپ کے بیٹھے بیٹھے ہی فوت ہو گیا۔ یہ اس کی بیمار پرسی کر رہے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ وہاں ایک دیا جل رہا تھا۔ امام صاحب نے پھونک مار کر بجھا دیا۔ اپنی جیب سے ایک آدمی کو پیسے دیے کہ جاؤ بازار سے دیا لے کر آؤ یہاں جلاؤ۔ کسی نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ کہنے لگے کہ بھئی بات یہ ہے کہ جب تک یہ زندہ تھا، ہم اس کے مہمان تھے اور یہ دیا اس کی ملکیت تھی۔ اس کے مرنے کے بعد یہ اس کی ملکیت نہیں رہا بلکہ ورثہ میں مشترک ہو گیا ہے۔ میں مشترک مال بغیر اجازت کے استعمال نہیں کرتا۔ جب تک اس کی سانس باقی تھی یہ دیا اس کی ملک میں تھا، جیسے ہی اس کی سانس اکھڑی، یہ اس کی ملک سے نکل گیا اور اب یہ تمام وارث رشتہ داروں کا حق ہے۔ اور مشترک مال کے لیے شرط ہے کہ سب کی اجازت ہو تو استعمال ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں اس دیے کی روشنی میں نہیں بیٹھنا چاہتا اور میں نے اپنا دیا الگ منگوایا ہے۔

یہ فتویٰ کی بات نہیں ہے بلکہ احتیاط کی بات ہے کہ جو لوگ اس معاملہ کی حساسیت سمجھتے تھے وہ کس قدر احتیاط سے کام لیتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ کوئی بیچارہ فوت ہو جائے تو ہم کتنا کتنا عرصہ وہاں سے اٹھتے ہی نہیں اور مشترک مال کو استعمال میں لاتے ہیں جو کہ مرنے والے کی ملکیت میں نہیں رہا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ بات خاص طور پر ارشاد فرمائی کہ میں تمہیں دو کمزوروں کے بارے میں بطور خاص وصیت کرتا ہوں، ایک یتیم کے بارے میں اور دوسرا عورت کے بارے میں۔

عورت کی مظلومیت

عورت کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اس زمانے میں بھی تھا اور آج بھی مختلف حوالوں سے ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور اس مسئلہ کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ عورت کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ آج دوطرفہ ظلم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں شاید دس فیصد عورتوں کو وراثت ملتی ہے جبکہ نوے فیصد کو سرے سے وراثت ملتی ہی نہیں۔ میں اپنے پاکستان کے معاشرے کی بات کر رہا ہوں۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ پشاور سے مجھے ایک خاتون کا فون آیا۔ شاید اخبارات میں میرے مضامین پڑھتی رہتی ہوگی، اس حوالہ سے جانتی ہوگی۔ کسی کالج کی لیکچرار تھی۔ کہنے لگی کہ میرے والد فوت ہو گئے ہیں اور ان کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سے میرا وراثت کا حصہ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک بازار میں کوئی سات آٹھ دکانیں میرے حصے میں آتی ہیں۔ میں نے اپنے بھائیوں سے اپنا حصہ مانگا ہے کہ یہ میرا حق ہے، مجھے ملنا چاہیے۔ تو بھائی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ہم دکانیں تو دے دیتے ہیں لیکن پھر زندگی بھر کے لیے تمہارے ساتھ ہمارا تعلق ختم۔ مرنا جینا ختم۔ یا دکانیں لے لو یا تعلق باقی رکھو۔ اب آپ بھی اس معاشرے کو جانتے ہیں، وہاں عورت جائیداد کی قربانی تو دے سکتی ہے، بھائیوں کی قربانی نہیں دے سکتی۔ پتہ نہیں زندگی میں کیا مراحل پیش آئیں گے۔ وہ مجھ سے مشورہ لے رہی تھی کہ میں دکانیں لوں یا بھائیوں کو رکھوں؟ میں نے کہا کہ بی بی یہ دونوں مسئلے نازک ہیں اور میں پشاور کے ماحول سے واقف نہیں ہوں اس لیے وہاں کے مقامی علماء سے مشورہ لیں، وہ زیادہ بہتر آپ کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں پچھلے سال اسمبلی میں عورتوں کے حقوق کے نام سے ایک معاملہ چل رہا تھا۔ حقوق نسواں ایکٹ۔ اس پر بحث ہوتی رہی۔ حکومت اور اپوزیشن نے علماء کی ایک کمیٹی بنائی، اس میں میں بھی تھا۔ اس کمیٹی کو غیر جانبدار کہا گیا۔ ہم اس دوران اسلام آباد میں بیٹھے رہے اور مذاکرات کرتے رہے۔ حدود آرڈیننس میں کچھ ترمیمات پر بھی بات چل رہی تھی، کافی لمبا مسئلہ تھا۔ ہم نے حکومت اور اپوزیشن والوں سے کہا کہ بھئی بات یہ ہے کہ بل کا عنوان رکھا گیا ہے ''تحفظ حقوق نسواں''۔ یعنی عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا بل۔ لیکن

ہمارے پاکستان کی سوسائٹی میں عورتوں کے جو حقوق عملاً متاثر ہو رہے ہیں ان میں سے کسی کا بھی اس بل میں ذکر نہیں ہے۔

ہم نے کہا کہ عورت کو یہاں وراثت نہیں ملتی، بل میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عورت کو طے کردہ مہر نہیں ملتا۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ نوے فیصد عورتوں کو وراثت نہیں ملتی اور تقریباً پچھتر فیصد عورتوں کو مہر نہیں ملتا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے ہم مہر ہڑپ کر جاتے ہیں۔ والد صاحب (شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ)، اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھیں، ان کے پاس ایک صاحب آئے، انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران ذکر کیا کہ میرا مہر تو بیوی نے مجھے معاف کر دیا۔ والد صاحب نے پوچھا، بھائی معاف کیسے کیا؟ اس کو دیا تھا اور پھر اس نے واپس کر دیا یا ویسے ہی زبانی معاف کر دیا۔

تو ہم نے حکومت اور اپوزیشن والوں کو بتایا کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی مظلومیت کے حوالے سے عملی مسائل کیا ہیں؟ عورت کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا۔ عورت کو مہر نہیں ملتا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی جبری شادی کر دی جاتی ہے۔ جوان بچی کی اس کا باپ اس کی مرضی کے بغیر شادی کر رہا ہے۔ وہ بیچاری بے بس ہے۔ اس بات کی شریعت قطعاً اجازت نہیں دیتی۔ ہم نے پوچھا کہ بھئی جبری شادی کے بارے میں آپ لوگوں نے کیا کیا؟

ہم نے کہا کہ ہمارے معاشرے میں عورت باقاعدہ بکتی ہے۔ بعض علاقوں میں باپ اپنی بیٹی کی قیمت وصول کرتا ہے۔ لیکن آپ کے بل میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لوگ لڑکی کے باپ کو پیسے دے کر خریدتے ہیں۔ ہمارے بعض جاگیردار علاقوں میں لڑکی کی قرآن سے شادی کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بات قرآن کریم کی توہین بھی ہے کہ قرآن کریم سے شادی کے مقدس عنوان پر اپنی بیٹی کے حصے کی جائیداد اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک جاگیردار اپنی بیٹی کی شادی اگر کرے گا تو قانونی و شرعی طور پر اسے اپنی جائیداد کا ایک حصہ اس کے نام کرنا پڑے گا۔ چنانچہ وہ اس کی شادی قرآن سے کر دیتا ہے۔ سندھ کے کچھ علاقوں میں اب بھی یہ رواج ہے۔ باقاعدہ تقریب ہوتی ہے، برات ہوتی ہے، اس کے لیے الگ ایک خوبصورت سا کوارٹر بنایا جاتا ہے اور باقاعدہ تقریب کر کے قرآن کریم اس کی جھولی میں رکھ دیتے ہیں کہ بیٹی ہم نے تمہاری قرآن کریم سے شادی کر دی ہے اب تم نے

ساری زندگی قرآن پڑھنا ہے۔تمہیں خرچہ ورچہ، کھانا وانا سب ملے گا، بس اب تمہارا باقی کی زندگی میں یہی کام ہے۔یعنی قرآن کریم کے مقدس نام کو عورت کو شادی سے محروم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس لیے کہ جائیداد تقسیم نہ ہو جائے، دو چار چھ مربع زمین نہ کسی کو دینی پڑ جائے۔ہم نے کہا کہ تمہارے بل میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

ہم نے کہا کہ عنوان تو اس بل کا حقوق نسواں ہے، لیکن عورتوں کی مظلومیت کا ایک عملی مسئلہ بھی اس میں ذکر نہیں کیا گیا۔خیر، وہ بل تو انہوں نے ایسے ہی منظور کر لیا لیکن بعد میں ایک الگ بل ہماری تجاویز کے مطابق لے کر آئے اور منظور کیا۔عورت کی مظلومیت ہمارے پاکستان کے حوالے سے تو یہ ہے۔

مغرب میں عورت کے ساتھ دھوکہ

اب یہاں (امریکہ/مغرب) کے حوالہ سے بھی عورت کی مظلومیت دیکھ لیں۔ایک سوال میں اکثر کیا کرتا ہوں، آپ بھی اس پر ذرا غور فرمالیں۔ ہماری بہنیں بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو ہم نے برابر کے حقوق دیے ہیں۔اس بات کا بھانڈا پھوڑا ہے روس کے ایک سابق وزیراعظم گورباچوف نے۔ اس نے پریسٹرائیکا میں اس کی پوری تفصیل لکھی ہے اس نے یورپ کی بات کرتے ہوئے کہا کہ اصل بات یہ ہوئی ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران قتل عام ہوا، لاکھوں کروڑوں افراد مارے گئے۔ افرادی قوت کا خلاء پیدا ہو گیا، فیکٹریاں بند ہو گئیں، دفتر خالی ہو گئے، سکول ویران ہو گئے، گورباچوف کے الفاظ ہیں کہ ہم نے اپنی افرادی قوت کے خلا کو پر کرنے کے لیے عورت سے یہ کہا کہ تمہیں ہم برابر کے حقوق دیتے ہیں، تم گھر سے باہر نکلو اور فیکٹری میں، دفتر اور سکولوں میں آؤ اور ہمارے لیے کام کرو۔یعنی گھر کا کام بھی کرو اور باہر کا بھی۔ہم عورت کو ورغلا کر گھر سے باہر لائے۔ہم نے یہ کام کر کے اپنی افرادی قوت کے خلا کو تو پر کر لیا لیکن ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا۔گورباچوف کہتا ہے کہ اب ہم چاہتے ہیں کہ وہ واپس گھر چلی جائے اور اپنے گھر کا نظام سنبھالے، لیکن ہمیں کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔

مغرب نے بیچاری عورت کے ساتھ کیا کیا؟ میرا ایک بہت سنجیدہ سوال ہے۔عورت

کے جو فطری فرائض ہیں، وہ تو اسی کے کھاتے میں ہیں۔ بچہ جننا بھی عورت نے ہے اور پالنا بھی اسی نے ہے۔ ایک خاص عمر تک بچے کی عورت نے ہی پرورش کرنی ہے۔ مرد یہ کام نہیں کرسکتا، یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ قدرت کی تقسیم تو بالکل فطری ہے کہ گھر کا نظام عورت کی ذمہ داری ہے اور گھر کے باہر کے معاملات کا انتظام مرد کے سپرد ہے۔ یہ قدرت کی تقسیم کار ہے، اس میں کوئی حقارت یا عظمت کا پہلو نہیں ہے۔ لیکن مغرب نے کیا کیا؟ عورت کو کارخانے اور دفتر میں لا کر اس کے حقوق میں اضافہ کیا یا فرائض میں؟ یعنی مغرب کے مرد نے عورت کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے کہ اس کی کسی ڈیوٹی میں شیئر کیے بغیر اسے اپنے ساتھ اپنی ڈیوٹی میں شامل کرلیا ہے۔ اس کی کسی نیچرل ڈیوٹی میں مرد نے شیئر کیا، اور نہ ہی وہ کرسکتا ہے لیکن اپنی ڈیوٹی میں اسے ساتھ ملالیا کہ ہمارے ساتھ مل کر کام بھی کرو۔ اور عورت بجائے اس بات کو سمجھنے کے کہ دونوں طرف کی ڈیوٹی میرے کھاتے میں پڑ گئی ہے، اس عنوان پر خوش ہے کہ ہمارے حقوق برابر ہوگئے ہیں۔

تو جناب نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے حوالے سے میں عرض کر رہا تھا کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں دو کمزوروں کے بارے میں خاص وصیت کرتا ہوں کہ وہ خود تو اپنا حق وصول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے اس لیے تم ان کا ضرور خیال رکھنا۔ ایک یتیم اور دوسرا عورت۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضورؐ کا یہ ارشاد جیسے اس سوسائٹی کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا، ہماری آج کی سوسائٹی کے لیے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یتیم اور عورت آج بھی مظلوم اور بے بس ہیں۔

ماتحتوں اور غلاموں کے حقوق

جناب نبی کریم ﷺ نے تیسرا طبقہ غلاموں کا بتلایا۔ اس زمانے میں غلام تھے، پھر آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔ آج دنیا میں غلامی کا وجود بھی نہیں ہے اور غلامی کے اسباب بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن آج کے بعد جب بھی دنیا میں کہیں ایسے حالات پیدا ہوں کہ غلامی دوبارہ وجود میں آئے تو اسلام کے احکام اس سلسلہ میں موجود ہیں۔ حضورؐ کے زمانہ میں غلام تھے، چنانچہ آپؐ نے ان کے حقوق اور معاشرتی مقام کے حوالے سے بڑی واضح باتیں ارشاد فرمائیں۔

حضورؐ نے غلاموں کے بارے میں بطور خاص یہ وصیت کی کہ تمہارے اور ان کے معیار زندگی میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اخوانکم خولکم، تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ یہ بھی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، یہ بھی انسان ہیں، ان کی بھی تمہاری طرح ضروریات ہیں، یہ بھی تمہاری طرح انسانی عزت وشرف کے مستحق ہیں۔ جعلهم الله تحت ایدیکم یہ تو بس اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ کے نیچے آ گئے ہیں۔ ان کو بھی وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور جیسا لباس تم خود پہنتے ہو، ان کو بھی ویسا ہی پہناؤ۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو۔ اگر کوئی ان کی ہمت سے زیادہ ہے تو فأعينوهم، ان کا ہاتھ بٹاؤ، خود ساتھ مل کر وہ کام کرو۔ (بخاری، رقم ۲۹)

حجۃ الوداع کے خطبے میں آپ نے فرمایا کہ وان جاؤ ابذنب لا تریدون ان تغفروا فبیعوا عباد الله ولا تعذبوهم، اگر ان سے کوئی غلطی ہو جائے اور تم انہیں معاف نہیں کرنا چاہتے تو انہیں بیچ دو لیکن سخت سزا مت دو۔ یعنی ایسی غلطی ہو گئی ہے کہ تم برداشت نہیں کر پا رہے تو کوئی نا قابل برداشت سزا مت دو بلیہ ان کو بیچ دو۔

ایک صحابی حضرت ابومسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں چھڑی سے اپنے غلام کی پٹائی کر رہا تھا کہ مجھے پیچھے سے آواز آئی، ابومسعود! جتنی قدرت تم اس پر رکھتے ہو، اس سے کہیں زیادہ قدرت والا تمہارے اوپر بھی موجود ہے۔ تم نے اپنے آپ کو مالک سمجھ کر تھپڑ مارا ہے نا، تو تمہارا بھی کوئی مالک ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! میں نے اللہ کی خاطر اسے آزاد کر دیا۔ فرمایا تم اسے آزاد نہیں کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں لپیٹ میں لے لیتی۔ (مسلم، رقم ۱۳۳۵، ۳۱۳۶)

نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں سوسائٹی کے تین مظلوم طبقات کا خاص طور سے ذکر کیا۔ یتیم، عورت، غلام اور ماتحت۔ آپؐ نے وصیت کی کہ ان کے حقوق کا بطور خاص تذکرہ کرو۔

دین کی بات دوسروں تک پہنچانا

جناب نبی کریم ﷺ نے ہمیں ہدایات دی ہیں، ہمیں اپنی معاشرتی انفرادی و اجتماعی

زندگیاں گزارنے کے طریقے بتائے ہیں، سلیقہ بتایا ہے، اصول بتائے ہیں۔ چنانچہ ایک بات یہ بتائی کہ جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں، یہ تم تک محدود نہیں رہنا چاہیے یبلغ الشاھد الغائب، جو شخص میری باتیں سن رہا ہے، وہ ان باتوں کو اپنے تک محدود نہ رکھے، وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اسلام دعوت اور اجتماعیت کا دین ہے۔ اسے دوسروں تک پہنچانا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ سب سے پہلا دائرہ تو گھر کا ہے۔ ایک دین کی بات علم اور سمجھ میں آئی ہے، اسے آگے پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ خود عمل کر کے مطمئن ہو جانا کافی نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس کا پہلا دائرہ یہ بیان فرمایا یَآ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَۃُ، فرمایا اپنے آپ کو بھی آگ سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی، اور یہ وہ آگ ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ انسانی زندگی میں حادثات پیش آتے ہیں۔ خدا نہ کرے، کسی مکان میں آگ لگ جائے اور گھر کا مالک موجود ہے۔ کیا وہ چھلانگ لگا کر باہر چلا جائے گا کہ جی میں تو بچ گیا ہوں، باقی خود جانیں اور ان کا کام جانے۔ نہیں، بلکہ وہ اپنی جان خطرے میں ڈالے گا اور گھر کے دوسرے افراد کو نکالنے کی کوشش کرے گا۔ جب تک وہ گھر کے سارے افراد کو آگ سے نکال کر باہر نہیں لے جائے گا۔ اس کا دل مطمئن نہیں ہوگا۔ اسی لیے قرآن کریم نے آگ کی مثال دی ہے کہ دنیا میں اگر آگ سے سابقہ پیش آجائے تو خود بچ کر خوش اور مطمئن نہیں ہو جاتا کہ میں تو بچ گیا ہوں۔ ویسے تو اگر کوئی صاحب ضمیر انسان ہے، وہ تو کوشش کرے گا کہ بلڈنگ میں جتنے لوگ ہیں بچ کر نکل آئیں، چاہے وہ اس کے گھر کے افراد نہ بھی ہوں۔ قرآن کریم نے کہا کہ جس طرح دنیا کی آگ سے گھر والوں کو بچاتے ہو اسی طرح آخرت کی آگ سے بھی انہیں بچاؤ۔ اس آگ کا تو ایندھن ہی انسان اور پتھر ہوں گے۔

تو سب سے پہلے گھر کے افراد، پھر محلّہ، پھر برادری، پھر سوسائٹی، پھر شہر، پھر قوم، پھر ملک اور پھر دنیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ جو باتیں میں تم سے کہہ رہا ہوں، انہیں اپنے آپ تک محدود نہ رکھنا بلکہ انہیں دنیا تک پہنچاؤ۔ یبلغ الشاھد الغائب، ایک تو یہ فریضہ بتلایا، دوسرا ایک حکمت بھی بیان کی جس کا مشاہدہ ہم پچھلے چودہ سو سال کے عرصہ میں کرتے آئے ہیں۔ فرمایا، بسا اوقات ایک آدمی کوئی بات سنتا ہے، اور اسے آگے کسی اور تک پہنچا دیتا ہے، ہوسکتا

ہے کہ وہ سننے والا اس بات پہنچانے والے سے زیادہ سمجھدار ہو، اور اس بات سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ اس آدمی کو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیادہ عقل دے رکھی ہو۔ پہلا آدمی گویا پائپ لائن کا کام دے رہا ہے۔ فرمایا رب حامل فقه غیر فقیه، بسا اوقات ایک بات سن کر آگے پہنچانے والا بات کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا، لیکن پہنچانے کا فریضہ اگر انجام دے گا تو کسی ایسے آدمی تک پہنچا دے گا جو اس سے بہت فائدے اٹھائے گا۔ اور تاریخ اسلام میں ایسا ہوا۔ حدیث کے راویوں اور حدیث کے بیان کرنے والوں نے حضورؐ کے ارشادات کو نقل کیا، اوروں تک پہنچایا، اور پھر آگے امت کے فقہاء نے ان ارشادات پر محنت کی، ان پر کام کیا، ان میں سے مسائل مستنبط کیے، ان میں سے نتیجے نکالے، راہنمائی کے اصول اخذ کیے، تو یہ ایک عظیم الشان کام ہے۔ اہل علم، اہل دانش نے حضورؐ کے ارشادات سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دنیا کو بھی فائدہ پہنچایا۔

محدثین اور فقہاء کی خدمات

محدثین کا کام ہے حدیث بیان کرنا۔ فقہاء کا کام ہے اس سے مسئلے نکالنا۔ ایک آدمی نے روایت بیان کی کہ حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ دوسرے نے اس کا تجزیہ کیا اور اس سے مسائل نکالے۔ علماء بتاتے ہیں کہ ایک ایک حدیث سے فقہاء نے بیس بیس مسائل مستنبط کیے۔

عورت ہی کے حوالے سے ایک روایت بخاری میں ہے، میں اس کا بھی یہاں ذکر کر دیتا ہوں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ اس بریرہؓ والی روایت سے فقہاء نے ایک سو سے زیادہ مسائل نکالے ہیں۔ واقعہ ایک ہے، لیکن اس میں سے وضع کیے جانے والے قوانین اور مسائل سو سے زیادہ ہیں۔ روایت یوں ہے کہ بریرہؓ ایک خاندان میں لونڈی تھیں۔ خاندان والوں سے بات کی کہ مجھ سے پیسے لے کر مجھے آزاد کر دو۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ طے ہوا کہ اتنی رقم ہوگی اور قسط وار نو سالوں میں ادا ہوگی۔ جب پیسے پورے ہو جائیں گے تو تم آزاد ہو جاؤ گی۔ بریرہؓ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آئیں، اماں جان! میں نے اپنے مالکوں سے اپنی آزادی کا سودا کر لیا ہے، اب نو سال تک قسطیں

دے کر آزاد ہو جاؤں گی، آپ میری اس معاملہ میں کچھ مدد کریں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ اپنے مالکوں سے پوچھو کہ اگر میں سارے پیسے دے دوں تو؟ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ ولا میری ہوگی۔ یہ ولا ایک مستقل مسئلہ ہے۔ یہ وراثت کا آخری درجہ ہے۔ کوئی آدمی فوت ہو جائے، اگر اس کا کوئی بھی رشتہ دار نہ ہو تو وراثت کسے ملے گی؟ یہ اب آزاد کرنے والے کو ملے گا۔ یہ وراثت کا آخری درجہ ہے۔ اس کو حق ولا کہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میں سارے پیسے دے دیتی ہوں لیکن حق ولا میرا ہوگا۔ بریرہؓ گئی اور جا کر اپنے مالکوں سے بات کی، لیکن وہ حق ولا دینے پر نہ مانے۔ جناب نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ خرید لو، الولاء لمن اعتق، جس نے آزاد کرایا ہے، ولا اس کی ہے۔ شرطیں لگانے سے ولا نہیں بدلتی۔ یہ شریعت کا قانون ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے خرید لیا۔ وہ لڑکی بریرہؓ آ تو گئی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں، لیکن ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس کی ایک نوجوان مغیثؓ سے شادی تھی۔ غلامی کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ تھا کہ اگر مالک نے اپنی لونڈی کی شادی کسی سے کر دی ہے تو آزاد ہونے پر اب اس کو حق حاصل ہے کہ آیا وہ خاوند کے نکاح میں رہنا چاہتی ہے یا نہیں رہنا چاہتی۔ وہ جو آزادی کے وقت ایک لڑکی کا نکاح کے وقت حق ہوتا ہے کہ وہ اسے تسلیم کرے یا نہیں، وہ اب بحال ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں عتق کا حق، خیارِ عتق۔ چنانچہ بریرہؓ جب آزاد ہو کر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ان کے گھر آ گئیں تو انہوں نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مغیث صاحب کی چھٹی کرا دی۔ مغیث پریشان ہو گیا۔ حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا، حضورؐ نے کہا کہ اس کا حق ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔ اب مغیث صاحب مختلف لوگوں سے سفارش کراتے پھر رہے ہیں کہ کوئی میری بریرہؓ سے صلح کرا دے۔ بخاری کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ ایک دن بازار میں جا رہے تھے، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ ساتھ تھے، دیکھا کہ مغیث گلیوں میں روتا پھر رہا ہے، آنسو بہہ رہے ہیں اور آوازیں دیتا پھر رہا ہے، کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا لے۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ اس کی محبت دیکھو کہ بیچارہ گلیوں میں روتا پھر رہا ہے اور وہ اس کا نام نہیں سننا چاہتی۔ یہ اللہ کی قدرت ہے۔ یہ منظر دیکھ کر حضورؐ نے خود بریرہؓ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بریرہؓ پھر ساری زندگی بطور خادمہ حضرت عائشہؓ کے پاس ہی رہیں۔ حضورؐ نے بریرہؓ سے

پوچھا کہ مغیثؓ کا کیا قصہ ہے؟ یارسول اللہ! میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا، وہ تو بیچارہ گلیوں میں روتا پھرتا ہے۔ کہا، یارسول اللہ! میں نے تو اپنا حق استعمال کیا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا، کیا تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتی ہو؟ حضورؐ نے مغیث کی سفارش کی۔ اب آپ خیال فرمایئے کہ سفارش کون کر رہا ہے؟ وہ لڑکی بھی بہت سمجھدار تھی، حدود سمجھتی تھی، معاملہ کو بھانپ گئی۔ آخر حضرت عائشہؓ کے گھر میں رہتی تھی۔ پوچھا، یارسول اللہ! حکم فرما رہے ہیں یا مشورہ دے رہے ہیں؟ مطلب یہ تھا کہ اگر تو یہ حکم ہے تو پھر کسی مسلمان کی مجال کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، حکم نہیں ہے بلکہ مشورہ ہے۔ تو فوراً کہتی ہے، لاحاجت لی به، پھر مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا، بس کرلیا۔ بات ختم ہوگئی۔

عورت کو رائے کا حق

آج دنیا میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اسلام عورت کو رائے کا حق دیتا ہے یا نہیں۔ میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ اسلام عورت کو رائے کا ایسا حق دیتا ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کے بعد بریرہؓ اسی گھر میں رہی ہیں، حضورؐ نے پھر کبھی بات دہرائی بھی نہیں کہ بریرہؓ تم نے میری بات نہیں مانی۔

خیر بات کافی دور نکل گئی، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اس بریرہؓ والی روایت سے ایک سو سے زیادہ مسئلے فقہاء نے نکالے ہیں۔ یہ قصہ بہت لمبا ہے، میں نے اس کا صرف ایک حصہ عرض کیا ہے۔ چنانچہ روایت کرنے والے نے تو بات آگے پہنچا دی، اور آگے فقہاء کو اللہ رب العزت نے اس عقل، دانش اور حکمت سے نوازا کہ انہوں نے اس بات کو زیادہ سمجھا، خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسرے لوگوں تک بھی اس کا فائدہ پہنچایا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جو مجھ سے سنتے ہو، اسے اپنے تک محدود نہ رکھو بلکہ آگے اور لوگوں تک پہنچاؤ۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ دین کی بات عام ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے تم سے وہ بات سننے والا تم سے زیادہ سمجھدار ہو اور وہ اس بات سے زیادہ فائدہ اٹھائے اور لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچائے۔ یہ پہنچانا، دعوت دینا اور دین کا مسئلہ لوگوں میں عام کرنا، یہ بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داریوں میں سے ہے۔

منہ بولے رشتوں کا خاتمہ

جاہلی قدروں میں سے ایک جاہلی قدر جس کے خاتمے کا جناب نبی اکرم ﷺ نے اعلان ان الفاظ کے ساتھ فرمایا، من ادعیٰ الیٰ غیر ابیه وانتمیٰ الیٰ غیر موالیه فعلیه لعنة الله التابعة الیٰ یوم القیامة اوکما قال صلی الله تعالیٰ علیه وسلم، ترجمہ بعد میں کروں گا، پہلے اس کا پس منظر عرض کرتا ہوں۔ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ زبان سے رشتے طے ہو جاتے تھے، کہ یہ میرا باپ ہے، یہ میرا بیٹا ہے۔ بس باپ بیٹا بن گئے۔ یعنی زبان سے معاہدہ کر کے رشتے طے ہو جاتے تھے۔ بھائی بھائی کہہ دیا تو بھائی ہو گئے۔ باپ بیٹا کہہ دیا تو بس یہ رشتہ بن گیا۔ کسی کو ماں کہہ دیا تو وہ ماں ہو گئی۔ کسی عورت نے کسی کو بیٹا بنا لیا تو بس یہ رشتہ قائم ہو گیا۔ یہ زبان سے اور معاہدے سے رشتہ دار بننا جاہلیت کے زمانے میں تھا اور اس کو معاشرہ میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج بھی بہت سے معاشروں میں اسے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں تو اب بھی ہے۔ ان میں کسی کو بیٹا بنا لیا جائے تو وہ بن جاتا ہے۔ یہاں (امریکہ میں) بھی میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی صورت ہے کہ اگر کسی کو اپنا وارث قرار دے دیا جائے تو اسے وارث تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یعنی مغرب میں کسی کو اگر بیٹا یا بھائی لکھ دیا جائے، وصیت کر دی جائے تو وہ بیٹا یا بھائی شمار ہو جاتا ہے۔ جاہلیت میں بھی ایسا تھا، اور اتنا عام تھا کہ خود نبی اکرم ﷺ نے ایک نوجوان کو بیٹا بنا لیا تھا۔ زید ابن حارثہؓ۔ یہ واحد صحابیؓ ہیں جن کا نام قرآن کریم میں ہے۔ قرآن کریم میں صحابہؓ کا ذکر تو ہے، بعض صحابہؓ کی خصوصیات کی طرف اشارے بھی ہیں لیکن کسی کا نام نہیں ہے۔ نام اگر کسی صحابیؓ کا قرآن کریم میں ہے تو وہ زید ابن حارثہؓ کا ہے۔ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور یہ غلاموں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے تھے۔ زید ابن حارثہؓ سے حضورؐ کو بڑی محبت تھی۔ کان حب رسول الله حضورؐ کو اس نوجوان سے بڑی محبت تھی۔ اور ان کے بیٹے اسامہ بن زیدؓ سے بھی، دونوں باپ بیٹوں سے محبت تھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو بیٹا بنا لیا۔ اور پھر صرف بیٹا نہیں بنایا بلکہ بڑا پروٹوکول دیا کہ اپنی پھوپھی زاد سے نکاح بھی کر دیا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ

عنہا سے اپنے خاندان میں رشتہ کروا کر ان کا یہ اسٹیٹس بھی قائم کیا کہ گویا قریش کے داماد ہیں۔ ہاشمیوں کے داماد ہیں۔ ان کا رشتہ بھی کروا دیا۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے جاہلیت کی یہ رسم توڑی اور حضورؐ سے تڑوائی۔ یہ اتنی بڑی رسم تھی کہ اس کو حضورؐ ہی توڑتے تو ٹوٹنی تھی ورنہ باقی دنیا میں اب تک نہیں ٹوٹی اور یہ رسم باقی ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے زیدؓ کو بیٹا بنایا، وہ زید ابن محمدؐ کہلانا شروع ہو گئے۔ حضورؐ کو ابو زید کہا جاتا تھا۔ حضورؐ کی کنیت ابو زید ہو گئی، کہ یہ زید کے باپ ہیں۔ اور زید ابن حارثہؓ کی بجائے زید ابن محمدؐ کہا جانے لگا۔ یہ عملاً ہوا۔ لیکن قرآن کریم نے واضح طور پر فرما دیا کہ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ، حقیقی ماں وہی ہے جس ماں نے جنا ہے، اور دوسری کوئی ماں نہیں۔ اور حقیقی باپ وہی ہے جس کے فراش پر پیدا ہوا ہے، دوسرا کوئی باپ نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ کو بھی منع فرما دیا گیا۔ حضورؐ نے کنیت ترک کر دی۔ زید ابن محمدؐ پھر زید ابن حارثہؓ کہلانا شروع ہو گئے۔ بلکہ اس سے اگلی بات کہ جب زید ابن حارثہؓ نے زینب بنت جحشؓ کو طلاق دے دی، بس نباہ نہیں ہوا، آپس میں مزاج نہیں ملے۔ تو اللہ تعالیٰ نے زینب بن جحشؓ کا نکاح حضورؐ سے کروا دیا۔ یہ اتنی بڑی بات تھی جاہلیت کے اس معاشرہ میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا کہ بہو سے نکاح کر لیا۔ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے فرمایا کہ میں نے یہ نکاح کروایا ہے، یہ نہیں کہا کہ میں نے آپ کو اجازت دی ہے کہ یہ نکاح کر لیں۔ ایک بہت پرانی رسم توڑنی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسی سطح پر یہ بات کی۔ قرآن کریم میں کہا کہ جب زیدؓ نے طلاق دے دی زینب کو تو زَوَّجْنٰكَهَا، ہم نے اس کا نکاح آپ سے کرا دیا۔ زینب بنت جحشؓ بڑے فخر سے یہ ذکر کیا کرتی تھیں۔ ازواج مطہرات میں آپس میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی، جیسا کہ سوکنوں میں عام طور پر ہوتا ہے۔ انسان تھیں، عورتیں تھیں۔ عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔ بلکہ بخاری کی روایت ہے کہ ازواج مطہرات کے دو گروپ تھے۔ ایک گروپ کی قیادت حضرت عائشہؓ کرتی تھیں اور دوسرے گروپ کی قیادت حضرت زینبؓ کرتی تھیں۔ اور آپس میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ اور یہ فطری بات ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میری جب بھی زینبؓ سے کوئی بات ہوئی ہے تو میں جیتی ہوں۔ دونوں اپنے اعزازوں کا ذکر کرتیں، ایک کہتی کہ میں یہ ہوں، دوسری کہتی کہ میرا یہ اعزاز ہے۔ لیکن جب زینبؓ یہ کہتی

تھی کہ تمہارے نکاح فرش پر ہوئے ہیں اور میرا نکاح عرش پر ہوا ہے تو میں لاجواب ہو جایا کرتی تھی۔ زینبؓ کی اس بات کا میرے پاس جواب نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک دفعہ یوں ہوا، بات درمیان میں یاد آ گئی، بخاری ہی کی روایت ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ میں حضورؐ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو زینب آ گئیں۔ انہوں نے کوئی شکایت کی جس سے بات شروع ہو گئی، وہ بولتی رہیں اور میرے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ میں حضورؐ کے چہرے کی طرف چپ کر کے دیکھتی رہی کہ حضورؐ کیا کہتے ہیں۔ پھر جب زینبؓ نے اپنا سارا غصہ نکال لیا، تو حضورؐ نے میری طرف دیکھا، تو پھر میں شروع ہو گئی۔ میں پھر ایسی شروع ہوئی کہ میں نے زینبؓ کو چپ کرا دیا۔ حضورؐ نے زینب کی باتیں بھی سنیں، اور میری بھی، میں نے جب بالکل لاجواب کر دیا تو حضورؐ نے اور کچھ نہیں کہا، بس آخر میں اتنا ہی تبصرہ کیا، آخر ابوبکرؓ کی بیٹی ہے۔ آپس میں اس درجے کی معاصرت تھی کہ دو گروپوں کی قیادت کرتی تھیں۔

حضرت زینبؓ کی دیانت

لیکن دیانت اور امانت کی یہ بات دیکھیں کہ جب حضرت عائشہؓ پر تہمت لگی ہے، الزام لگا ہے، تو حضورؐ نے گھر کی بیویوں سے بھی پوچھا ہے کہ عائشہ کے بارے میں تمہارا کیا راہے ہے۔ حضرت زینبؓ سے بھی پوچھا۔ اس سے بہتر کوئی موقع کسی سوکن کو نیچا دکھانے کا نہیں ہو سکتا۔ پوچھا کہ عائشہؓ کے بارے میں لوگ یہ باتیں کرتے ہیں، تمہارا کیا خیال ہے۔ تو زینبؓ کہنے لگیں، یارسول اللہ! اللہ کو جان دینی ہے، عائشہؓ میں کوئی خرابی نہیں، میں گواہی دیتی ہوں۔ یہ امانت اور دیانت کی بات ہے۔ جھگڑے آپس میں ہوتے رہتے تھے، وہ فطری بات ہے۔ حالانکہ زینب بنت جحشؓ کی اپنی بہن حمنہؓ بنت جحش اس پراپیگنڈے کا حصہ تھی، لیکن حضورؐ نے جب ازواج مطہرات سے پوچھا، تو کہا نہیں حضورؐ! عائشہ بالکل پاک ہے، اس بات کا عائشہؓ میں تصور بھی نہیں ہے۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ قرآن کریم نے کہا کہ ہم نے آپؐ کا زینبؓ سے نکاح کر دیا۔ اور سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے یہ ضابطے بیان فرمائے اور فرمایا کہ آج کے بعد اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ، جو شخص بھی جس باپ کا حقیقی بیٹا ہے، اس کے حوالے سے پہچانا جائے گا۔ نسب تبدیل کرنے کی

اجازت نہیں ہے۔ آج بھی یہ مسئلہ دنیا کی کچھ سوسائٹیوں میں ہے، اور ہمارے ہاں بھی ایک دو جزوی باتوں کے حوالے سے یہ موجود ہے۔ ہمارے ہاں یہ مسئلہ چلتا ہے جب کوئی بے اولاد جوڑا کسی بچے کو لے کر پالتا ہے۔ ہمارے پاس بھی ایسے بہت سے معاملے آتے ہیں۔ مثلاً ایک بے اولاد جوڑے نے ایک بچہ لے کر پالا ہے، یہ حقیقت میں اس کا نہیں ہے، تو وہ اس کا تعارف اپنے حوالے سے لکھواتے ہیں کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ حالانکہ وہ ان کا بیٹا نہیں ہے۔ جب نکاح نامے میں خانہ پر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ شناختی کارڈ میں تو ایسے ہی لکھا ہوا ہے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ بھئی یہ اس کا باپ نہیں ہے۔ ایک کیس میں تو اچھا خاصا مسئلہ بن گیا۔ میرے محلے کا خاندان تھا، اور میں واقف تھا ان سے۔ کہنے لگے کہ اس کا باپ وہ ہے، میں نے کہا کہ نہیں جی اس کا باپ وہ نہیں ہے، میرے سامنے انہوں نے بچہ گود لیا ہے۔ کہتے ہیں جی کہ کاغذات میں تو یہی باپ لکھا ہے، میں نے کہا کہ میں اب کیا کر سکتا ہوں؟ تو ایک مسئلہ تو یہ پیدا ہوتا ہے، اور شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ بچہ لے کر پالنا تو ٹھیک ہے لیکن وہ اپنے باپ کے حوالے سے ہی پہچانا جائے گا۔ قرآن کریم میں بھی نسبت تبدیل کرنے سے روکا گیا ہے اور خود نبی کریم ﷺ نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔

حج یا عمرہ کے لیے خودساختہ محرم

ہمارے ہاں اس حوالے سے ایک اور مسئلہ پیش آتا ہے، یہاں معلوم نہیں ہوتا ہے یا نہیں۔ حج پر جانے کے لیے شریعت کا بھی اور سعودیہ کا بھی قانون ہے کہ عورت محرم کے سوا نہیں جا سکتی۔ سعودی حکومت اس کی تصدیق مانگتی ہے۔ ہمارے پاس ایسے کئی معاملات آتے ہیں کہ مولوی صاحب! حج پر جانا ہے تو میں نے فلاں کو بھائی بنا لیا ہے، آپ تصدیق کر دیں۔ بھئی ہم کیسے تصدیق کر دیں؟ یہ تمہارا حقیقی بھائی نہیں ہے۔ فلاں کو میں نے بیٹا بنا لیا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ محرم بنا کر حج پر جانے والا معاملہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ آتے ہیں کہ مولوی صاحب تصدیق کر دیں۔ جہاں اس بات کا ہمیں علم ہو، ہم تصدیق نہیں کرتے۔ ایک بی بی تو یہاں تک کہنے لگی کہ مولوی صاحب! میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ میں نے کہا بی بی! یہ بیٹے بنانے سے نہیں بنتے، یہ تو اللہ کی طرف سے بنے بنائے آتے ہیں، یہ

خودکار سسٹم ہے۔ چنانچہ شریعت تین حوالوں سے رشتے تسلیم کرتی ہے۔ درمیان میں بات آ گئی ہے تو عرض کر دیتا ہوں۔

رشتوں کے شرعی اسباب

شریعت نسب کے حوالے سے، صھر کے حوالے سے اور رضاعت کے حوالے سے رشتہ تسلیم کرتی ہے۔ یہ تین اسباب ہیں شریعت میں رشتہ قائم ہونے کے۔ پہلا سبب نسب کا ہے کہ جس کے ہاں کوئی پیدا ہوا۔ اس حوالے سے باقی رشتے قائم ہوتے ہیں جیسے باپ، ماں، بھائی، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ وغیرہ۔ دوسرا سبب صھر کا ہے۔ صھر کہتے ہیں سسرال کو۔ یعنی سسرال کا رشتہ۔ اب جس عورت کے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے، تو اس عورت کی ماں اس کی ماں بن گئی ہے۔ وہ اس پر حرام ہے۔ اب وہ اس عورت کی ماں سے شادی نہیں کر سکتا، اس کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اسے صھر کا یعنی سسرالی رشتہ کہتے ہیں۔ تیسرا سبب رضاعت کا رشتہ ہے۔ جو ہمارے ہاں اکثر نظر انداز ہو رہا ہے۔ رضاعت کا رشتہ یہ ہے کہ ایک بچے نے دودھ کی عمر میں اپنی حقیقی ماں کے علاوہ کسی عورت کا دودھ پی لیا ہے تو بس اب وہ اس کی ماں بن گئی ہے۔ قرآن کریم نے اسے اس طرح ذکر کیا ہے اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ، جہاں قرآن کریم نے محرمات کا ذکر کیا ہے کہ فلاں فلاں عورت سے تمہاری شادی جائز نہیں ہے، وہاں یہ بھی ذکر کیا کہ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ، وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، اب وہ تمہاری ماں بن گئی ہے۔ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ، ان کی بیٹیاں تمہاری بہنیں بن گئی ہیں۔ ہمارے احناف کے ہاں دودھ کی عمر میں کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہے تو وہ ماں بیٹا بن گئے ہیں، اس کا خاوند اس کا باپ بن گیا ہے، اس کی بیٹیاں اس کی بہنیں بن گئی ہیں، اس کے بیٹے اس کے بھائی بن گئے ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب، جو رشتے نسب میں حرام ہیں، رضاعت میں بھی حرام ہیں۔ جس عورت کا دودھ پیا ہے، اس کی بہن اب اس کی خالہ بن گئی ہے۔ نسب کی خالہ سے شادی حرام ہے، تو رضاعت کی خالہ سے بھی حرام ہے۔ جس عورت کا دودھ پیا ہے، اس کا خاوند اس کا باپ ہے اور خاوند کا بھائی اس کا چچا ہے۔

چچا نسب میں بھی حرام ہے اور رضاعت میں بھی حرام ہے۔ اس باپ کی بہن اس کی پھوپھی لگی۔ پھوپھی نسب میں بھی حرام ہے، رضاعت میں بھی حرام ہے۔ تو جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب میں حرام ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اس سے اکثر لاپرواہی برتی جاتی ہے اور اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس سلسلہ میں بے شمار روایات ہیں۔ پردے کے احکام آنے سے پہلے رشتہ دار وغیرہ گھر میں آتے جاتے تھے۔ شریعت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی تو لوگ بھی ایسی کوئی پابندی نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب پردے کا حکم آیا کہ کوئی غیر محرم سامنے نہیں آئے گا، تو ایک صاحب آئے، حضرت عائشہؓ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خاندان کے آدمی تھے۔ بتایا میں افلح ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ نہیں بھئی! میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھوں گی کہ تمہیں اندر آنے کی اجازت دے سکتی ہوں کہ نہیں۔ چنانچہ بعد میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وہ افلح آئے تھے تو میں نے اجازت نہیں دی۔ آپؐ نے فرمایا، کہ آنے دیتے، وہ تمہارا چچا لگتا ہے۔ یارسول اللہ! وہ میرا چچا کدھر سے لگتا ہے؟ فرمایا اس کے بھائی کی بیوی کا تم نے دودھ نہیں پیا؟ یارسول اللہ! پیا ہے۔ فرمایا، تو بس وہ تمہارا چچا لگا۔ حضرت عائشہؓ مذاق سے کہتی ہیں، یارسول اللہ! دودھ تو میں نے عورت کا پیا ہے۔ فرمایا، ہاں عورت کا ہی پیا ہے، لیکن عورت کا خاوند تمہارا باپ ہے اور باپ کا بھائی تمہارا چچا ہے۔ تو جیسے دوسرا چچا گھر آ سکتا ہے یہ رضاعت کا چچا بھی آ سکتا ہے۔

انصار اور مہاجرین میں مؤاخاۃ

تو میں عرض کر رہا تھا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے جاہلیت کی جن رسموں کے خاتمے کا اعلان فرمایا، ان میں ایک رسم یہ تبنی اور تآخی کی بھی تھی۔ حضورؐ کے زمانے میں یہ رہی ہے۔ باپ بیٹا بننے کی رسم حضورؐ نے اپنائی ہے اور بھائی بھائی بننے کی رسم بھی، کہ انصار مدینہ کو حضورؐ نے مہاجرین کا بھائی بنایا۔ اسی پرانی رسم کے مطابق مواخات کروائی۔ اس وقت تک وراثت اور دیگر اس طرح کے تفصیلی احکامات نہیں آئے تھے۔ جب مہاجر مدینہ منورہ آئے ہیں تو سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ سینکڑوں کو سنبھالنا اجتماعی طور پر مشکل تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے آسان حل نکالا اور ایک ایک مہاجر ایک ایک انصاری خاندان کے حوالے کر دیا اور کہا کہ تم

بھائی بھائی ہو۔ اسے مواخات کہتے ہیں کہ سیرت کے واقعات میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ جب تک وراثت کے تفصیلی احکامات نہیں آئے، یہ ایک دوسرے کے وارث تھے۔ یعنی مہاجر فوت ہوتا تو اس کا انصاری بھائی وارث ہوتا، اسی طرح کوئی انصاری فوت ہوتا تو اس کا مہاجر بھائی اس کا وارث ہوتا۔ جناب نبی کریم ﷺ کا معمول مبارک یہ رہا ہے کہ جس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا، حکم آنے تک وہ پرانی روایات پر عمل کرتے تھے۔ ہاں اگر حکم آ گیا تو پہلی روایت ختم کر کے نئی بات نافذ کر دی جاتی۔ تو مواخات حضورؐ نے خود کروائی، لیکن بعد میں پھر منع فرما دیا۔ ایک تھا تبنی یعنی باپ بننا، اور ایک تھا تاخی یعنی بھائی بھائی بننا۔ پھر ایک تھی موالات۔ پہلی باتیں تو آج کے ماحول میں بھی سمجھ میں آتی ہیں لیکن موالات کی بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے گی۔ موالات یہ ہے کہ ایک خاندان نے ایک غلام آزاد کر دیا ہے۔ تو وہ غلام آزاد ہونے کے باوجود اسی خاندان کا مولیٰ کہلاتا ہے۔ مولیٰ کا معنی ہے آزاد کردہ غلام۔ آزاد تو وہ ہو گیا، لیکن پھر بھی اس کا کچھ تعلق اس خاندان سے باقی رہتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وراثت کا جو آخری درجہ ہے، کہ جب خاندان کا اور کوئی وارث نہ ہو، تو وراثت میں پھر مولیٰ وارث ہوتا ہے۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ نے جب آزاد کروانا چاہا تو آزاد کرنے والے خاندان نے ولا کی شرط لگائی کہ ولا ہماری ہو گی۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ مولیٰ تبدیل نہیں ہو سکتا، وہ جس خاندان کا مولیٰ ہے، اسی خاندان کا رہے گا۔ جاہلیت کے زمانے میں ہوتا تھا کہ کسی نے ناراض ہو کر مولیٰ تبدیل کر لیا، کہ یہ اب میرا مولیٰ نہیں ہے۔ غلام ناراض ہو کر چلے جاتے تھے کہ میں اب اس خاندان کا مولیٰ نہیں ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں بھئی۔ اس طرح حضرت بریرہؓ کے شخصی واقعہ میں حضورؐ نے اس کی اجازت نہیں دی۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ من ادعیٰ الیٰ غیر ابیہ، جو آدمی اپنے باپ سے ہٹ کر کسی اور کی طرف منسوب ہوا، معلوم ہونا شرط ہے، کوئی مغالطہ ہے، کسی افراتفری میں نسب تبدیل ہو گیا ہے، وہ بات الگ ہے۔ لیکن اگر معلوم ہے کہ یہ میرا باپ نہیں ہے اور پھر نسبت اس کی طرف کرتا ہے، وانتمیٰ الیٰ غیر موالیہ، اپنے موالی سے ہٹ کر کسی اور کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ فعلیہ لعنۃ اللہ التابعۃ الیٰ یوم القیامۃ، اس پر اللہ کی لعنت جو

قیامت تک چلتی رہے گی۔ یہ ملعونوں کا کام ہے، اس کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ یہ جاہلیت کی رسم حضورؐ نے ختم کر دی، کہ آج کے بعد رشتہ وہی ہو گا جو نسب سے ہو گا، صھر سے ہو گا یا رضاعت سے ہو گا۔ آسان لفظوں میں سمجھ لیجیے کہ منہ بولے رشتے حضورؐ نے ختم کر دیے۔

اسلام کا رشتہ

پھر نبی کریم ﷺ نے ایک بات کا اور اعلان فرمایا۔ اخوت کے پرانے رشتوں کی نفی کی اور فرمایا، اخوت کا رشتہ تمہارے درمیان اسلام کا رشتہ ہے۔ اس پر آپؐ نے کچھ ہدایات دیں۔ قرآن کریم نے کہا، انما المؤمنین اخوۃ، مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور آپس میں بھائیوں کے حقوق ہوتے ہیں۔ مثلاً آپؐ نے ایک حدیث میں فرمایا، ان المسلم اخوان المسلم، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ لا یغشہ، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ کھوٹ کا اور بد دیانتی کا معاملہ نہ کرے۔ غش کہتے ہیں ملاوٹ کرنے کو۔ اس کا مطلب چیزوں میں ملاوٹ بھی ہے اور معاملات اور تعلقات میں ملاوٹ بھی ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے دھوکے کا معاملہ نہ کرے۔ ولا یخونہ، مسلمان دوسرے مسلمان کے مال میں خیانت نہیں کرے۔ یہ خیانت کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے۔ خیانت صرف مال کی نہیں ہوتی۔ خیانت کا بڑا پہلو یہی ہے کہ مال میں، لین دین میں یا امانت میں خیانت کی جائے۔ لیکن خیانت کا دائرہ زندگی کے دوسرے بہت سارے معاملات تک پھیلتا ہے۔ صرف ایک بات سے سمجھ لیں کہ خیانت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ مثال کے طور پر جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، المستشار مؤتمن، ایک آدمی نے آپ سے مشورہ طلب کیا ہے، اور آپ دیانت داری سے مشورہ نہیں دے رہے، تو یہ خیانت ہے۔ کسی معاملہ میں ایک مسلمان نے آپ پر اعتماد کیا اور مشورہ مانگا۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس کے لیے مفید مشورہ تو کچھ اور ہے لیکن آپ اپنی کسی مصلحت سے، اپنے کسی مفاد کی وجہ سے غلط مشورہ دے رہے ہیں تو یہ غلط مشورہ دینا خیانت ہے۔ یا مثلاً اگر اس کو زیادہ وسیع دائرہ میں دیکھیں تو آپ ایک آدمی کو منتخب کر رہے ہیں، کسی کو آپ نے ووٹ دینا ہے، اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آدمی اس کا اہل نہیں ہے، آپ اپنے کسی مفاد کی وجہ سے اس کے حق میں رائے دے رہے ہیں تو یہ بالکل

خیانت ہے۔ ان اللہ یأمر کم ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا۔ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کرو۔ اس میں ہر امانت آ جاتی ہے، چاہے یہ علم کی امانت ہو، مال کی امانت ہو، ووٹ کی امانت ہو، مشورہ کی امانت ہو، کوئی بھی امانت ہو۔ یعنی آپ ایک جگہ ووٹ دے رہے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جس کو ووٹ دے رہا ہوں یہ اس بات کا اہل تو نہیں ہے لیکن برادری کا مسئلہ ہے، دھڑے کا مسئلہ ہے، یہ بالکل خیانت ہے۔ تو خیانت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میں نے چند مثالیں اس لیے دیں کہ خیانت صرف مال کی نہیں ہوتی۔ فرمایا، مسلمان دوسرے مسلمان سے ملاوٹ، خیانت اور دھوکہ نہیں کرتا۔ ولا یغتابہ، مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ اس کے عیب کا کسی دوسری جگہ بلاضرورت تذکرہ نہ کیا جائے۔ قرآن پاک نے غیبت کی وضاحت فرماتے ہوئے اس کی تشبیہ یوں دی ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ، بھائی کی لاش پڑی ہو، تو اس لاش سے گوشت نوچ کر کھاؤ گے؟ کہ غیبت کرنا ایسا ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کی لاش سے گوشت نوچ کر کھانا۔

غیبت کا گناہ

میں نے عرض کیا تھا کہ غیبت کہتے ہی اس بات کو ہیں کہ ایک شخص میں کوئی عیب موجود ہے اور آپ بلاضرورت اس بات کا کسی جگہ تذکرہ کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر غیبت اس کو سمجھا جاتا ہے کہ کسی کے خلاف کوئی جھوٹی بات کہہ دینا۔ نہیں، یہ غیبت نہیں ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے جب فرمایا کہ غیبت کبیرہ گناہ ہے، تو ایک صحابیؓ نے پوچھا، یارسول اللہ! کسی میں اگر وہ عیب ہو تو بھی غیبت ہے؟ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ اس شخص میں یہ عیب نہیں ہے اور ہم ذکر کر رہے ہیں۔ فرمایا، اسی کا نام غیبت ہے۔ اگر اس میں وہ خرابی نہیں ہے آپ کسی جگہ اس کا تذکرہ کر رہے ہیں، وہ تو بہتان ہے۔ فقد بھتہ، پھر تو تم نے بہتان باندھا ہے۔ ایک آدمی میں کوئی کمزوری یا عیب نہیں ہے اور آپ اس کا تذکرہ کر رہے ہیں تو یہ سیدھا سیدھا بہتان ہے۔ غیبت تو کہتے ہی اس بات کو ہیں کہ کسی شخص میں ایک عیب موجود ہے اور آپ اس کا بلاضروت تذکرہ کر رہے ہیں۔ میں نے ایک جملہ ساتھ کہا ہے، بلاضرورت۔ ضرورت کے مقام پر اس کا ذکر درست ہے۔ مثلاً آپ کو

عدالت کے کسی کیس میں کسی شخص پر گواہی دینی ہے، تو وہاں یہ غیبت شمار نہیں ہوگی۔ یعنی کسی کیس کا فیصلہ آپ کی گواہی پر موقوف ہے تو وہاں آپ کسی شخص کی کیس سے متعلقہ خرابی کا ذکر کر سکتے ہیں۔ غیر متعلقہ کا وہاں بھی ذکر نہیں کر سکتے۔ یا پھر مثال کے طور پر کسی شخص کی کسی بات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے، تو آپ اس کے خطرے سے دوسرے شخص کو آگاہ کر سکتے ہیں۔ یہ غیبت نہیں ہے۔ لیکن یہ بالکل آپ کی دیانت پر ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

غیبت تو ہمارے ہاں عام ہے۔ ہمارا تو کلچر ہی یہ ہے کہ جہاں دو آدمی بیٹھتے ہیں، وہاں کوئی تیسرا زیر بحث ہوتا ہے، اور اس کو پوری طرح بے نقاب کرنے میں ہم کوئی کسر چھوڑتے نہیں ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے حقوق کے خلاف ہے۔ فرمایا، ولا یغشه ولا یخونه ولا یغتابه۔

ایک اور روایت میں یہ بات اس طرح فرمائی المسلم اخوا المسلم لایظلمه ولا یخذله ولا یسلمه ولا یغتابه، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم نہیں کرتا۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو رسوا نہیں کرتا۔ ولا یسلمه، بڑا خطرناک جملہ ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر کے حوالے بھی نہیں کرتا کہ وہ اس پر ظلم کرے اور یہ بیٹھ کر تماشا دیکھتا رہے۔ اس کو دشمن کے سپرد بھی نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ جو مرضی کرے۔ یہ حضورؐ نے مسلمانوں کے آپس کے حقوق بیان فرمائے۔

اسلام و ایمان کا روحانی مفہوم

پھر ایک جملہ اور ارشاد فرمایا، سأخبر کم من المسلم من المؤمن من المهاجر؟ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مومن کون ہے، مسلم کون ہے اور مہاجر کون ہے۔ مسلم، مسلمان کو کہتے ہیں۔ مومن، ایمان والا شخص، اور مہاجر جو اللہ کی رضا کے لیے ہجرت کرے۔ اس کا اصطلاحی اور معروف معنی تو اور ہے، اور وہ معنی بھی تو خود حضورؐ نے کیا ہے۔ حدیث جبریلؑ میں حضورؐ سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! مَا الإِیْمَان، ایمان کیا ہے؟ فرمایا، اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے

رسولوں پر، قیامت کے دن پر، اللہ کی طرف سے اچھی اور بری تقدیر پر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان لاؤ۔ اور اسلام کے بارے میں فرمایا کہ اَنْ تَشْھَدَ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوۃَ وَتُؤتِی الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحَجَّ الْبَیْتَ، اسلام یہ ہے کہ کلمے کا اقرار کرو، نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اللہ کے گھر کا حج ادا کرو۔

حدیث جبریل میں حضورؐ نے یہ مطلب بیان فرمایا کہ مومن وہ ہے جس کا ایمانیات پر یقین پختہ ہو۔ مسلم وہ ہے جو اسلام کے احکامات پر عمل کرتا ہے۔ اور مہاجر کسے کہتے ہیں؟ ہجرت کا معنی یہ ہے کہ ایک آدمی ایک جگہ رہتا ہے اور وہاں وہ اپنے دین پر آزادی سے عمل نہیں کر پاتا، تو وہ اس جگہ پر ہجرت کر جائے جہاں وہ اپنے دین پر آزادی سے عمل کر سکے۔ ایک آدمی کو ایک جگہ نماز پڑھنے کی، قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی اور دیگر شعائر اسلام پر عمل کرنے کی اجازت نہیں ہے تو اس کے لیے اسلام کی رو سے وہاں رہنا جائز نہیں ہے۔ وہ وہاں سے کسی دوسری جگہ پر چلا جائے جہاں وہ شعائر اسلام پر آزادی سے عمل کر سکے۔ تو اس طرح ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کے عمل کو ہجرت اور ایسے شخص کو مہاجر کہتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے حضورؐ نے خود مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی، اور بہت سے صحابہؓ نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔

مومن، مسلم اور مہاجر کا اصطلاحی معنی تو وہی ہے جو حضورؐ نے حدیث جبریل میں بیان فرمایا۔ لیکن یہاں ایک اور معنی حضورؐ نے فرمایا، سأخبر کم من المسلم من المؤمن من المھاجر، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مومن کون ہے، مسلم کون ہے اور مہاجر کون ہے۔ فرمایا، المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ کسی دوسرے کو ضرر دینے کی دو ہی چیزیں ہیں۔ یا آدمی زبان سے کسی کو نقصان پہنچائے گا، یا ہاتھ سے نقصان پہنچائے گا۔ اگر مسلمان سلامتی والا ہے اور سوسائٹی کے باقی لوگ اس کے شر سے محفوظ ہیں تو وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہے۔ پھر فرمایا، والمؤمن من امنہ الناس علی اموالھم و دمائھم، مومن وہ ہے جس کو لوگ اپنے مالوں اور جانوں پر محافظ اور امین سمجھیں۔ لوگوں کا اس پر اعتماد ہو کہ یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ والمھاجر

من ھجر الخطایا والذنوب۔ ہجرت کا لفظی معنی ترک کرنا ہے۔ گویا مہاجر وہ ہے جو گناہ اور نافرمانی کو ترک کر دے۔ حضورؐ نے ایک اصطلاح کے دو معنی بیان فرمائے۔ ایک تو ظاہری معنی اور دوسرا اس کی روح۔ مومن ظاہراً وہ ہے جو اللہ رسولوں، فرشتوں، اللہ کی کتابوں، قیامت کے دن، اچھی بری تقدیر اور مرنے کے بعد آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن اپنی روح کے اعتبار سے مومن وہ ہے کہ جس کا ایمان اتنا پختہ ہو اتنا مضبوط ہو کہ لوگ اسے اپنی جانوں اور اپنے مالوں پر امین سمجھیں، اور اس پر اعتماد کریں۔ مسلمان، ظاہراً وہ ہے جو کلمہ پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے اور بیت اللہ کا حج کرتا ہے۔ لیکن اپنی روح کے اعتبار سے مسلمان وہ ہے کہ جس کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

صوفیاء کرام کا فلسفہ

حضرات صوفیائے کرام کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ وہ ایک چیز کے ظاہری معنی کے ساتھ اس کی روح کو بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ جناب نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ مثلاً ایک عمل ہے نماز پڑھنا۔ نماز کے ظاہری ارکان کیا ہیں؟ قیام ہے، رکوع ہے، سجدہ ہے، قعدہ ہے۔ ان کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ لیکن جب آپ کسی اللہ والے سے پوچھیں گے تو وہ آپ کو یہ تلقین کرے گا کہ نماز میں توجہ پوری ہو، خشوع وخضوع ہو، فلاں بات نماز میں ہو اور فلاں نہ ہو۔ وہ نماز کے اور اوصاف بیان کرے گا، اور آپ کو نماز کی روح سے آشنا کرے گا۔ اسی طرح روزہ دیکھ لیجیے۔ روزہ کا عام معنی یہ ہے کہ آدمی سحری سے افطار تک کھانے پینے کی چیزوں سے اور ازدواجی تعلقات سے بچا رہے۔ لیکن اللہ والے آپ کو روزہ کی روح سے آگاہ کریں گے کہ خیالات کو پاک رکھو، ہاتھ کو بھی ٹھیک رکھو، نگاہ بھی صحیح رکھو، کانوں اور زبان کا بھی ٹھیک استعمال کرو۔ تو یہ جناب نبی کریم ﷺ کی سنت ہے کہ جس طرح ایمان اور اسلام کے ظاہری معانی فرمائے اسی طرح ان کی روح بھی بیان فرمائی۔ تو فرمایا کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں، المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ والمؤمن من امنہ الناس علی دمائھم واموالھم، مومن وہ ہے کہ لوگ اسے اپنی جانوں اور اپنے مالوں پر امین سمجھیں۔ والمھاجر من ہجر

الخطایا والذنوب، مہاجر وہ ہے جو نافرمانی اور گناہ ترک کر دے۔ وطن چھوڑنا بھی ہجرت ہے لیکن گناہ چھوڑنا اس سے بڑی ہجرت ہے۔ بسا اوقات وطن چھوڑنا آسان ہوتا ہے جبکہ گناہ چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو مہاجر اس معنی میں کہ گناہ اور نافرمانی کا ماحول چھوڑ کر فرمانبرداری کی طرف آ جائے۔

امت مسلمہ کا اخلاقی بحران

جناب نبی اکرم ﷺ نے باہمی حقوق کے حوالے سے ایک بات اور ارشاد فرمائی۔ دور جاہلیت میں تو اخلاقیات کا بہت بڑا بحران تھا۔ کوئی کسی کے ہاتھ سے اور کسی کی زبان کے شر سے محفوظ نہیں تھا۔ کسی کے پاس کسی کا مال یا امانت آ گئی تو ہڑپ ہو گئی۔ اگر اسے غیر متعلقہ بات نہ سمجھیں تو یہاں ایک بات ذرا سخت سی کہنے لگا ہوں۔ ہمارے آج کے مسلم معاشروں کا سب سے بڑا بحران بھی اخلاقیات کا ہی ہے۔ اگر ہم اس طرف ذرا توجہ دے سکیں تو۔ ہماری آپس کی اخلاقیات کا بھی برا حال ہے اور دوسری اقوام کے ساتھ معاملات بھی ایسے ہی ہیں۔ ہمارے ہاں وہی شخص داؤ نہیں لگاتا جس کا داؤ لگتا نہیں ہے۔ اور جس شخص کا داؤ لگتا ہے وہ معاف نہیں کرتا۔ الا ماشاء اللہ۔ افراد کی بات نہیں کر رہا، افراد ہمیشہ مستثنیٰ رہے ہیں۔ اور افراد کی استثنیٰ سے ہی نظام چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کی برکت سے معاملات چلاتے رہتے ہیں۔ میں اپنے مجموعی حالات کی بات کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں آج کا سب سے بڑا بحران اخلاقیات کا ہے۔ آج ہماری بین الاقوامی سطح پر تجارتوں میں ناکامی کے اسباب میں ایک بڑا سبب بھی یہی ہے کہ ہم اخلاقیات اور دیانت کی پاسداری نہیں کر پاتے۔ ہم مال میں، لین دین میں، معاملات میں اور معاہدات میں مار کھا جاتے ہیں۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں، بتاتے کچھ ہیں اور دیتے کچھ ہیں۔ ایک حالیہ واقعہ ذہن میں آیا ہے، پتہ نہیں ذکر کرنا مناسب ہے یا نہیں، بہرحال یہ اخلاقیات کے حوالے سے ہی ہے، ذکر کر دیتا ہوں۔ پاکستان کا ذکر کر رہا ہوں۔ ایک جگہ گزشتہ سال ایک بڑی یونیورسٹی میں مجھے بلایا گیا لیکچر کے لیے۔ اور لیکچر بھی اخلاقیات پر تھا۔ چنانچہ میں نے وہاں لیکچر دیا۔ ان کا طریقہ ہے کہ وہ آنے والے مہمانوں کو کرایہ وغیرہ دیتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ مولانا صاحب آپ

کیسے آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں پبلک ٹرانسپورٹ پر آیا ہوں۔ پوچھا، آپ کرائے کی گاڑی نہیں لائے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں میں تو نہیں لایا۔ کہنے لگے کہ مولوی صاحب! گاڑی کا کوئی فرضی سا نمبر لکھ دیں، ہم ابھی یونیورسٹی کی مد سے آپ کو ٹیکسی کا کرایہ دے دیتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ خدا کا خوف کرو! میں ایک گھنٹہ کس چیز پر لیکچر دیتا رہا ہوں؟ یعنی میرے اخلاقیات پر ایک گھنٹہ بولنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے؟ میں پبلک ٹرانسپورٹ سے آیا ہوں اور اسی سے جاؤں گا، میں کوئی ٹیکسی ویکسی نہیں لایا۔ تو یہ ہماری آج کی اخلاقی حالت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم جو دنیا کی دوسری اقوام کا مقابلہ نہیں کر پا رہے اس کے ظاہری اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم اخلاقیات کے بہت خوفناک بحران کا شکار ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان ہدایات میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی، جہاں یہ فرمایا کہ دھوکہ نہیں دو گے، خیانت نہیں کرو گے، غیبت نہیں کرو گے، ایک دوسرے پر ظلم نہیں کرو گے، وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا الا لا تظلموا، الا لا تظلموا، الا لا تظلموا، تین دفعہ فرمایا، ظلم کے راستہ پر نہ چلنا، ظلم کے راستہ پر نہ چلنا، ظلم کے راستہ پر نہ چلنا۔ اور یہ کہہ کر پھر فرمایا، اسمعوا منی تعیشوا، اللہ اکبر۔ اس کا محاورہ کا ترجمہ کروں گا۔ ''میری بات سن لو، زندگی پا جاؤ گے''۔ زندگی اسی میں ہے کہ ظلم کا راستہ اختیار نہ کرنا، کسی پر زیادتی نہ کرنا، کسی کے ساتھ ناانصافی نہ کرنا۔ اس کے بعد پھر بالخصوص فرمایا الا لا تظلموا، عمومی طور پر بھی ظلم کا راستہ اختیار نہ کرنا اور بالخصوص آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔ ناانصافی، ظلم اور زیادتی چھوڑ دو گے تو سوسائٹی کی زندگی اسی میں ہے، معاشرے کی حیات اس میں ہے۔ تو فرمایا، اسمعوا منی تعیشوا، میری بات سن لو، زندگی پا جاؤ گے۔

حج کے ساتھ عمرہ کی سہولت

حضورؐ نے اس موقع پر حج کیا تو حج کے ساتھ آپؐ نے عمرہ بھی ادا کیا۔ پہلے آپ نے عمرہ ادا کیا اور پھر بعد میں حج کیا۔ صحابہ کرامؓ نے بھی پہلے عمرہ ادا کیا اور پھر حج کیا۔ لیکن اس میں فرق تھا۔ اس زمانہ میں یہ معمول تھا کہ اصحاب ذوق اپنے گھر سے قربانی کا جانور لے کر چلتے تھے، کہ وہاں منیٰ میں ذبح کریں گے۔ یہ کوئی فرض واجب نہیں ہے، لیکن ایک اچھی بات

ہے۔اس کو ہدی کا جانور کہتے ہیں۔ اور اس کا بڑا ثواب اور اجر ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی ہدی ساتھ لے کر گئے تھے۔ پھر یمن سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ آئے تو وہ بھی حضورؐ کے لیے ہدی کے جانور لے کر آئے۔ آج کل ایسا کرنا مشکل ہے۔ سعودیہ والے تو کر سکتے ہیں لیکن باہر والے نہیں کر سکتے۔ یہاں سے آپ گائے یا اونٹ لے کر جانا چاہیں تو مشکل ہو جائے گا۔ لیکن بہر حال اگر کوئی لے جا سکے تو بڑے اجر و ثواب کی بات ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے باقی صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ جو لوگ ہدی کا جانور ساتھ لائے ہیں وہ تو جب تک ہدی کا جانور قربانی والے دن ذبح نہیں ہو گا، تب تک وہ احرام نہیں کھولیں گے۔ اور ان کا جو حج ہے وہ حج قران ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے عمرہ ادا کیا اور پھر اسی احرام میں حج بھی ادا کیا۔ ایک ہی احرام میں عمرہ اور حج دونوں ادا کرنے کو قران کہتے ہیں۔ اس کی نیت ابتداء میں ہی کرنی ہوتی ہے کہ یا اللہ میں عمرہ اور حج دونوں کی نیت کر رہا ہوں۔ حضورؐ نے خود یہی کیا تھا۔ اور سب سے زیادہ اجر اور ثواب اسی کا ہے۔ یہ کام ہے ذرا مشکل۔ احرام کی پابندیاں قائم رکھنا آسان نہیں رہتا۔ لیکن اس کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہے۔ بہر حال باقی صحابہؓ کو حضورؐ نے حکم دے دیا کہ تم عمرہ ادا کرو، اس کے بعد احرام کھول دو، اور عام کپڑوں میں احرام کی پابندیوں کے بغیر چلو پھرو، یوم الترویہ یعنی آٹھ ذی الحج کو پھر احرام باندھنا اور ارکان حج ادا کرنا۔ اس قسم کے حج کو تمتع کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی ہے، فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ۔ یہ حج ذرا سہولت والا ہے کہ اس حج میں جانے والا صرف عمرہ کی نیت کر کے جائے، اور پھر عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے۔ اس کے بعد حج کے دن آئیں تو حج کے لیے پھر الگ سے احرام باندھے۔ اگر کسی شخص نے حج اور عمرہ کی اکٹھی نیت کر لی ہے تو وہ حج قران ہو جائے گا۔ اور اگر کسی شخص نے صرف حج کی نیت کی ہے تو وہ حج کی تیسری قسم ہے، اسے حج افراد کہتے ہیں۔ اور احرام اس میں بھی نہیں کھلے گا جب تک حج ادا نہ کر لے، چاہے دو مہینے وہاں رہے۔ ہاں اگر پہلے صرف عمرہ کی نیت کی ہے تو پھر عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام کھولنے کی اجازت ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ ہدی کے جانور ساتھ لے کر گئے اور فرمایا کہ میں اگر ہدی کے جانور ساتھ نہ لایا ہوتا تو میں بھی احرام کھول دیتا۔ لیکن میں چونکہ ہدی کے جانور ساتھ لایا

ہوں، اس لیے میں احرام نہیں کھولوں گا، البتہ تم لوگ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو۔ پھر بعد میں حج کے لیے الگ احرام باندھ لینا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یمن سے آئے، آتے ہی وہ حضورؐ سے ملے تو حضورؐ نے پوچھا کہ بھئی احرام ساتھ لائے ہو؟ کہا، یا رسول اللہ! لایا ہوں۔ فرمایا، ٹھیک ہے، تم احرام اب میرے ساتھ ہی کھولو گے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی یمن سے ہی آئے تھے۔ ان سے حضورؐ نے پوچھا کہ ابوموسیٰ کیا نیت کی ہے؟ کہا، یا رسول اللہ! میں نے بھی وہی نیت کی ہے جو آپ کی نیت ہے، میں نے احرام باندھتے وقت نیت کی تھی کہ یا اللہ! جو نیت رسول اللہ ﷺ کی ہے وہی نیت میری ہے۔ حضورؐ مدینہ سے تشریف لا رہے تھے اور ابوموسیٰ اشعریؓ یمن سے آ رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا، ہدی کا جانور ساتھ لائے ہو؟ کہا، یا رسول اللہ! وہ تو ساتھ نہیں لے کر آیا۔ فرمایا، تم احرام کھول دو، تمہاری نیت میرے والی نہیں ہے۔ یعنی حضرت علیؓ کو اجازت دے دی کہ چونکہ تم ہدی کا جانور ساتھ لے کر آئے ہو اس لیے تم میرے ساتھ ہی حج کے بعد احرام کھولو گے۔ اور ابوموسیٰؓ چونکہ ہدی کا جانور ساتھ نہیں لائے تھے، اس لیے ان سے کہا کہ عمرہ ادا کرو، احرام کھول دو، اور پھر حج کے لیے الگ سے احرام باندھنا۔

یہ ایک تبدیلی آئی تھی عرب معاشرے میں حج اور عمرہ کے حوالے سے۔ اس سے پہلے حج کے دنوں میں، حج کے مہینے میں عمرہ ادا کرنے کو لوگ معیوب سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ حج کے دنوں میں صرف حج، اور باقی سارا سال عمرہ کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ کہا کہ پہلے عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو تو لوگوں کو تعجب ہوا۔ لوگوں نے سمجھا کہ چونکہ بہت مدت بعد آنے کا اتفاق ہوا ہے اس لیے حضورؐ نے بطور خاص اجازت دی ہے کہ چلو اس دفعہ ان ایام میں حج اور عمرہ دونوں ادا کر لو۔ لیکن حضورؐ نے حج کے ایام میں صرف حج ادا کرنے کی یہ رسم توڑ دی۔ سراقہ ابن مالکؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ ھی لنا او للأبد؟ یہ رعایت کہ حج کے لیے آئے ہیں تو ساتھ عمرہ بھی کر لیں، یہ صرف اس سال کے لیے خاص ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے۔ فرمایا، بل للابد۔ یہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ ایک ہی سفر میں دونوں کام۔ تو ایک تبدیلی حج کے حوالے سے یہ آئی۔

قریش کی امتیازی روایت کا خاتمہ

ایک اور طریقہ جو حج کے حوالے سے چلا آ رہا تھا، یہ تھا کہ قریشی عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ حج کی ترتیب تو یہ ہے کہ منیٰ میں چند دن رہتے ہیں، اس دوران نو ذی الحج کو عرفات جاتے ہیں، شام کو مزدلفہ جاتے ہیں اور مغرب وعشاء اکٹھی پڑھتے ہیں، پھر رات کو مزدلفہ میں ہی رہتے ہیں، اور صبح کو فجر پڑھ کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ سب لوگ عرفات جاتے تھے لیکن قریشی نہیں جاتے تھے۔ کہتے تھے نحن حُمس، اس کا ترجمہ میں یوں کرتا ہوں کہ ''ہم وی آئی پی ہیں''۔ مطلب یہ تھا کہ ہم بہادر لوگ ہیں، ممتاز لوگ ہیں۔ چونکہ قریش کا ہی وہاں کنٹرول تھا، اور واقعتاً وہ بہت بڑا قبیلہ سمجھا جاتا تھا اور عرب میں ان کو بڑا احترام حاصل تھا۔ چنانچہ قریشیوں نے اپنے کچھ امتیازات رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک یہ تھا کہ وہ حرم کی حدود سے باہر نہیں جاتے تھے۔ منیٰ اور مزدلفہ کا ایک کونہ حرم میں ہے جبکہ باقی عرفات جو ہے وہ حرم سے باہر ہے۔ تو قریشی حرم کی حدود سے باہر نہیں جاتے تھے کہ نحن حُمس، ہم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اور یہ کہ یہ حرم کی حدود سے باہر جانا عام لوگوں کے لیے ہے، ہمارے لیے نہیں ہے۔

جناب نبی کریم ﷺ نے یہ رسم توڑ دی۔ اگر حج میں بھی یہ امتیازات ختم نہیں ہوں گے اور وی آئی پی سسٹم باقی رہنا ہے تو پھر یہ ختم کب ہوگا۔ حج ہی تو وہ موقع ہے کہ جس پر اللہ سب کو دو چادریں پہنا دیتا ہے۔ تھری پیس والا بھی دو چادریں پہنے گا اور لنگوٹی والا بھی دو چادریں پہنے گا۔ یہی تو مقام ہے مساوات کا۔ اس موقع پر صحیح معنوں میں مساوات کا منظر نظر آتا ہے کہ کوئی غریب ہے، کوئی امیر ہے، کوئی گورا ہے، کوئی کالا ہے، کوئی حاکم ہے، کوئی فقیر ہے، کوئی عربی ہے، کوئی عجمی ہے، لیکن ہیں سب دو چادروں میں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں وقوف عرفات کے لیے جاؤں گا، اور پھر آپ تشریف لے گئے۔ جبیر ابن مطعمؓ جو مطعم ابن عدی کے بیٹے ہیں۔ مطعم ابن عدی مشرک سرداروں میں سے تھے۔ جب طائف میں نبی اکرم ﷺ پر پتھر برسائے گئے تھے، آپ زخمی ہو گئے تھے، تو راستے میں مطعم ابن عدی کا ڈیرہ تھا، تو اس نے آپ ؐ کو پناہ دی تھی۔ حضورؐ اس کا بڑا احسان مانتے تھے۔ بدر

کے موقع پر حضورؐ نے اس کے احسان کا ذکر کیا۔ مطعم بڑے سردار تھے، بڑے آدمی تھے لیکن کفر کی حالت میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ جبیرؓ ان کے بیٹے تھے جو مسلمان ہوئے اور صحابی رسول تھے۔ طائف سے جب حضورؐ زخمی ہو کر واپس آئے تو راستے میں اس کا باغ تھا، اس نے حضورؐ کو پناہ دی اور لوگوں کو ہٹایا کہ نہیں بھئی، اب یہ میری پناہ میں ہیں، ان کے نزدیک کوئی نہ آئے۔ بدر کے موقع پر جب قیدیوں کا مسئلہ پیش آیا تو حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا کہ اگر مطعم زندہ ہوتا اور وہ ان قیدیوں کی سفارش کرتا تو میں ان کی سفارش کو قبول کر لیتا۔ یعنی میں ان سے فدیہ نہ لیتا اور ان کو ویسے ہی معاف کر دیتا۔ جبیر ابن مطعمؓ حجۃ الوداع کے موقع پر وہاں موجود تھے اور کہتے ہیں کہ میرے کچھ اونٹ گم ہو گئے تھے، میں ان کی تلاش کے لیے گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمدؐ عرفات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ تو حمس ہیں، یہ عرفات میں کیا کر رہے ہیں؟ یہ تو قریشی اور ہاشمی ہیں۔ قریشی تو ممتاز لوگ ہوتے ہیں اور حرم کی حدود سے باہر نہیں آتے۔ تو میں نے لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بھئی صرف محمدؐ ہی نہیں بلکہ قریش کے باقی لوگ بھی آئے ہیں۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے یہ رسم بھی توڑ دی۔ قرآن کریم میں بھی یہ حکم آیا ہے کہ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ، کہ بھئی تم بھی وہیں وقوف کرو جہاں باقی لوگ کرتے ہیں، کوئی امتیاز نہیں ہے۔

ننگے طواف کی جاہلی رسم

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے ایک رسم اور بھی توڑی۔ اس کا اعلان تو پہلے ہی فرما دیا تھا۔ قریش نے اپنا ایک اور امتیاز قائم رکھا ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ بہت سے قبائل کے لوگ اس زمانے میں بیت اللہ کا طواف کرنے آتے تو ننگے طواف کرتے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ عورتوں نے برائے نام کوئی لنگوٹی پہنی ہوتی تھی جبکہ مرد بالکل ننگے ہوتے تھے۔ دلیل ان کی یہ ہوتی تھی کہ ہم نیچرل حالت میں جا رہے ہیں۔ انہوں نے شاید اسے کوئی نیچرل کلب سمجھ رکھا تھا۔ کہتے تھے کہ جس حالت میں ہم دنیا میں آئے تھے اسی حالت میں ہم اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہیں۔ قریشی جس کو چاہتے تھے لباس پہنا دیتے تھے۔ قریشیوں نے اپنا یہ اعزاز

رکھا ہوا تھا کہ وہ جس کو کرتا، چادر دے دیں وہ پہن لیتا تھا باقی بغیر کپڑوں کے ہی رہتے تھے۔ اس بات کو بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا کہ مجھے قریش نے لباس پہنایا ہے۔ بہرحال نبی اکرم ﷺ نے تو ننگی حالت میں طواف کرنے کو ختم ہی کروا دیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ذریعے اس کا اعلان اس سے پچھلے سال ۹ ہجری کو ہی کروا دیا تھا کہ اگلے سال کوئی مرد یا عورت اس حالت میں طواف نہیں کرے گا۔ عورت کے لیے پورا لباس ضروری ہوگا جبکہ مرد کے لیے دو چادریں۔ تو یہ رسم بھی نبی اکرم ﷺ نے حج کے موقع پر توڑ دی۔

اسلام کا نظام سیاست

رسول اللہ ﷺ نے جہاں حجۃ الوداع کے موقع پر اور ہدایات فرمائیں ان میں ایک ہدایت یہ بھی تھی۔ فرمایا، اسمعوا واطیعوا وان أمر علیکم عبد حبشی مجدع اقام فیکم کتاب اللّٰہ، بات سنو اور بات مانو۔ یہ نہ دیکھو کہ تمہارا امیر کون ہے۔ کالا ہے، گورا ہے، عربی ہے، عجمی ہے، اپنے امیر کی بات مانو۔ اگرچہ تم پر ناک کٹا حبشی غلام امیر بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔ یہ ناک کٹا ہونا ایک محاورہ ہے۔ ہاں شرط یہ ہے اقام فیکم کتاب اللّٰہ، اگر کتاب اللہ کے مطابق تم پر حکومت کرتا ہے تو تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ امیر کے لیے کتاب اللہ کا پابند ہونا ضروری ہے، باقی جو لوگوں کے امتیازات ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑی تبدیلی جناب نبی کریم ﷺ نے پیدا کی۔ علماء سیاسیات اس پر بڑی بحث کرتے ہیں۔ حضورؐ حکمران بھی تھے، جناب نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد کیا سسٹم دیا ہے؟ ہم اس کو خلافت کا سسٹم کہتے ہیں۔ خلافت کا لفظی معنیٰ نیابت ہے۔ لیکن یہ خلافت، نیابت کس کی؟ بڑا لطیف اور بڑا باریک فرق ہے۔ اللہ کا خلیفہ یا رسول اللہ کا خلیفہ؟ دونوں میں بڑا اور بنیادی فرق ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ایک شخص نے کہہ دیا، یاخلیفۃ اللّٰہ، اے اللہ کے خلیفہ! فرمایا ،لیست بخلیفۃ اللّٰہ انا خلیفۃ رسول اللّٰہ، نہیں بھئی میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں، میں رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ اللہ کا خلیفہ ہونے کا مطلب ہے کہ بندہ اللہ کا نمائندہ بن کر حکومت کرے۔ اسی کو تھیا کریسی کہتے ہیں۔ جس طرح کسی زمانے میں پاپائے روم کی حکومت ہوتی

تھی۔ اللہ کا نمائندہ۔ یعنی وہ جو کہہ دے وہ خدا کی طرف سے سمجھا جائے۔ امام کے اللہ کا نمائندہ ہونے کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی اس کو اللہ سے جوڑ ہے، وہ جو کہے گا وہ اللہ کی طرف سے کہا تسلیم ہوگا اور اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دو باتیں بڑی وضاحت سے کہیں۔ پہلی بات یہ کہ لست بخليفة الله، انا خليفة رسول الله، میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ میں رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ مجھے کوئی خدائی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں تم پر امیر بنا دیا گیا ہوں، لست بخير كم، میں تم سے بہتر نہیں ہوں، تمہارے جیسا ہی ہوں۔ یہ ان کی عاجزی اور تواضع تھی۔ امرت عليكم، تم پر امیر بنا دیا گیا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے مطابق چلوں گا۔ اگر میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دو۔ وان انا زغت فقوموني، اور اگر میں ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ میں خدا کا نمائندہ نہیں ہوں، رسول اللہؐ کا نمائندہ ہوں۔ حضورؐ کا خلیفہ ہوں۔ قرآن کریم اور سنت رسولؐ کا پابند ہوں۔ اگر اس کے مطابق چلوں تو تمہاری ذمہ داری ہے کہ میرا ساتھ دو۔ وان انا زغت، اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں، صحیح راستہ سے ہٹ جاؤں، قرآن کریم اور سنت رسولؐ کی پابندی نہ کر سکوں فقوموني، بڑا عجیب جملہ ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے بتا دو کہ میں غلطی پر ہوں۔ کہا، مجھے سیدھا کر دو۔

اسلامی ریاست میں رائے عامہ کا کردار

مطلب یہ ہے کہ رائے عامہ کو یہ اختیار اور قوت حاصل ہے کہ وہ حاکم وقت کو قانون اور دستور کے خلاف نہ چلنے دے۔ گویا خلافت اسلامی شخصیت کی بجائے دلیل اور قانون کی حکومت کا نام ہے۔ یہاں سے اصولیین بہت سے اصول اخذ کرتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اسلام کی حکومت پبلک کے سامنے جواب دہ ہے۔ پبلک کو حاکم کے احتساب کا حق حاصل ہے۔ حاکم اپنی مرضی کا مختار نہیں ہے بلکہ قانون اور دستور کا پابند ہے۔ وہ قرآن وسنت کے دائرہ میں رہے گا۔ اگر وہ اس دائرہ میں نہیں رہے گا تو کسی کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اس سے پوچھے کہ کیا کر رہے ہو بھائی؟

آج اصل صورت حال کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ نے اپنا جانشین نامزد نہیں کیا۔ اشارات بہت کیے، مصلے پر کھڑا کیا، حج کا امیر بنایا، لیکن جب نامزد کرنے کی باری آئی، بخاری شریف کی روایت ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے مجھ سے فرمایا، اپنے والد صاحب کو بلاؤ، بھائی کو بلاؤ، میں تمہیں کچھ لکھ دوں۔ پھر فرمایا، چلو رہنے دو، اس کے بعد ایک عجیب جملہ فرمایا، یأبی اللہ والمؤمنین الا ابا بکر، عائشہ چھوڑو، اللہ بھی ابو بکر کے سوا کسی کو نہیں بنائے گا اور مسلمان بھی ابو بکر کے سوا کسی کو منتخب نہیں کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اہل سنت والجماعت کی تو بنیاد ہی اس پر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا اور اپنے جانشین کا انتخاب کس پر چھوڑ دیا۔ اگر حضورؐ اپنا خلیفہ نامزد کر دیتے، تو پھر اس کے بعد نامزدگی ہی چلتی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ لیکن امیر کی اطاعت تب کرو جب وہ تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق اور میری سنت کے مطابق حکومت کرے۔ اس موقع پر جناب نبی کریم ﷺ نے اس کا دوسرا پہلو ذکر کیا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مسلمان حاکم کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق حکومت کرتا ہے تو اس کی اطاعت کرو، تمہارا مفاد اگر مجروح ہوتا ہے تب بھی اس کی اطاعت کرو، تم پر ظلم کر رہا ہے، تب بھی اطاعت کرو، صبر کرو اور برداشت کرو تا کہ فتنہ و فساد نہ پیدا ہو۔ ہاں اگر کفر کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر اطاعت واجب نہیں ہے۔ اس کی پھر الگ تفصیل ہے جس کا اس وقت موقع نہیں۔

فتنوں سے خبردار کرنا

مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں ہدایات دیں، نصائح فرمائے، تلقین فرمائی، قواعد وضوابط بیان فرمائے وہاں امت کو آنے والے فتنوں سے بھی آگاہ کیا۔ یہ بھی دین کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ سینکڑوں روایات میں جناب نبی کریم ﷺ نے امت کو آنے والے دور کے فتنوں سے آگاہ کیا۔ بخاری کی ایک روایت

میں حضرت اسامہ ابن زیدؓ کہتے ہیں علی الھم من آطام المدینۃ، ایک دن حضورؐ مدینہ میں ایک بڑی حویلی کی دیوار پر کھڑے تھے۔ مدینہ میں بڑی حویلیاں یا چھوٹے قلعے ہوتے تھے۔ ہم دیوار کے اس طرف کھڑے تھے۔ فرمایا، کیا میں تمہیں بتاؤں مجھے دیوار کے اس طرف کیا نظر آ رہا ہے؟ عرض کیا، یارسول اللہ! فرمائیں۔ انی لاری الفتن تقع خلال بیوتکم کوقع المطر، میں فتنوں کو تمہارے درمیان برستا ہوا دیکھ رہا ہوں، ایسے جیسے بارش برستی ہے۔ یعنی فتنے تمہارے درمیان اتنی کثرت سے آئیں گے جیسے بارش کے قطرے آتے ہیں۔ ایک روایت میں یوں فرمایا، کہ جب فتنوں کا زمانہ آئے گا تو فتنے یوں گریں گے جیسے تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور اس میں سے دانے گرنے لگیں۔ یعنی ایک فتنہ کھڑا ہوا، اسے ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ دوسرا فتنہ سامنے آ جائے گا۔ اس سے ابھی نمٹنے کی بات ہو رہی ہوگی کہ تیسرا آ جائے گا۔ تو فرمایا کہ بارش کے قطروں اور تسبیح کے دانوں کی طرح فتنے تم پر برسیں گے۔ ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ فتنوں میں یہ کیفیت بھی آئے گی کہ وہاں دین اور حق کی بات کرنا، اپنے آپ کو مسلمان کہنا اتنا مشکل ہو جائے گا کالقابض علیٰ الجمر، جیسے انگارے ہاتھ میں لینا ہو۔ حضورؐ نے فتنوں کی سینکڑوں نوعیتیں بیان فرمائیں۔

مسیح دجال کا فتنہ

ان میں ایک بڑے فتنے کا ذکر حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر کیا۔ اس کو دجال کا فتنہ کہتے ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ خود بھی دعا میں دجال کے فتنے سے پناہ مانگتے تھے اور ہمیں بھی اس کی تلقین فرمائی ہے۔ اعوذ بك من فتنة المسيح الدجال، میں مسیح دجال کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ مسیح دو شخصیتوں کا لقب ہے۔ دونوں ایک ہی زمانہ میں آئیں گے۔ دونوں کا ٹکراؤ ہوگا۔ ایک مسیح دوسرے مسیح کو قتل کر دے گا۔ دونوں کو مسیح کہا گیا ہے۔ ایک مسیح الدجال اور دوسرے مسیح ابن مریم علیہما السلام والتسلیمات۔ جناب نبی کریم ﷺ نے اس کی بڑی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔ فرمایا کہ ایک بہت بڑا دجال امت میں آئے گا اور دجل اور فتنہ پھیلائے گا۔ وہ امت کی ایک بڑی تعداد کو گمراہ کر دے گا۔ آپؐ نے امت کو خبردار کیا کہ اس سے بچنا۔ راوی کہتے ہیں کہ ذکر المسیح الدجال

وأطنب في ذكره، نبی کریم ﷺ نے دجال کا بڑا تفصیل سے ذکر کیا۔اس کی نشانیاں بیان کیں، اس کی علامتیں بیان کیں۔ اور فرمایا ما بعث الله من نبی الا وقد أنذره قومه، اللہ کے ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو اس فتنے سے خبردار کیا ہے۔ اور میں بھی تمہیں خبردار کرتا ہوں اور تمہیں ایک بات زائد بتاتا ہوں کہ وہ تم میں آئے گا، کیونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ امت میں آنے والے فتنے علم دین کا مستقل شعبہ ہیں۔ حدیث کی کوئی کتاب کھول کر دیکھ لیں، آپ کو ایک مستقل باب ملے گا۔ ابواب الفتن اور کتاب الفتن وغیرہ کے نام سے۔ ان میں جناب نبی کریم ﷺ کے وہی ارشادات مذکور ہیں جو فتنوں کے حوالے سے ہیں۔ اور میں یہ اکثر ذکر کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مختلف لوگوں کو مختلف ذوق عطا فرماتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں یہ ذوق حضرت حذیفہؓ کا تھا۔ جس طرح احادیث کا یاد کرنا ابو ہریرہؓ کا ذوق تھا، قرآن کریم کی تفسیر و تاویل حضرت ابن عباسؓ کا ذوق تھا، استنباط، اجتہاد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا ذوق تھا، قرأت حضرت ابی ابن کعبؓ کا ذوق تھا۔ مختلف صحابہؓ کے مختلف ذوق تھے۔ فتنوں کے حوالے سے باتیں معلوم کرنا اور دوسروں کو بتانا حضرت حذیفہؓ کا ذوق تھا۔

حضرت حذیفہؓ کا ذوق

حذیفہؓ ابن الیمان اپنا ذوق خود ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، کان الناس یسألون رسول الله صلی الله علیه واسلم عن الخیر و کنت اسأله عن الشر، (بخاری) حضورؐ کے باقی صحابہؓ حضورؐ سے جب پوچھتے کوئی خیر کی بات پوچھتے اور میں جب پوچھتا شر کی بات پوچھتا۔ کیا مطلب؟ شر سے مراد یہ ہے کہ یارسول اللہ! خرابیاں کیسے پیدا ہوں گی؟ فتنے کیسے پیدا ہوں گے؟ ان فتنوں اور خرابیوں سے ہم کیسے نمٹیں گے؟ کہا کہ میں اس طرح کی باتیں زیادہ پوچھتا تھا۔ چنانچہ بخاری کی روایت ہے امیر المؤمنین حضرت عمر ابن الخطابؓ بیٹھے ہوئے تھے، صحابہؓ کی مجلس تھی۔ پوچھا، کہ بھئی تم میں سے کون آدمی ہے جو فتنوں کے بارے میں حضورؐ کے ارشادات کو زیادہ جانتا ہے۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا انا، جی میں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ تمہیں ہی اس بارے میں زیادہ پتہ ہو

گا، تو پھر ہمیں بتاؤ کہ فتنوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔ یعنی جب فتنے شروع ہوں گے تو کیا ہوگا؟ حضرت حذیفہ ؓ کہنے لگے، یا حضرت! میں نے حضورؐ سے بہت سی باتیں پوچھی ہیں۔ بعض فتنے ایسے ہیں کہ جن کا کفارہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، صدقہ وغیرہ ہے۔ یعنی کوئی مسلمان شخصی طور پر کسی فتنے کا شکار ہو تو ان کا کفارہ نیک اعمال ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، نہیں بھئی! میں ان فتنوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہا، میں تو اجتماعی فتنوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ تموج کموج البحر، میں جس فتنے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں وہ تو سمندر کی موجوں کی طرح جوش مارتا ہوگا۔ میں تم سے شخصی خرابیوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہا۔ تو حضرت حذیفہ ؓ کہنے لگے، یا حضرت! آپ تسلی رکھیں، آپ کے اور ان فتنوں کے درمیان ایک بڑا مضبوط دروازہ ہے۔ اور وہ دروازہ بند ہے۔ حضرت عمر ؓ سمجھ گئے کہ یہ بات خود ان کی ذات کے بارے میں ہے۔ حضرت عمرؓ خود فتنوں کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ میں حضرت عمر ؓ کو ڈنڈے والا خلیفہ کہا کرتا ہوں۔ اللہ کا ایک پیغمبر ڈنڈے والا (حضرت موسیٰؑ) تھا اور رسول اللہ ؐ کا ایک خلیفہ ڈنڈے والا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا، یہ بتاؤ کہ یہ دروازہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا۔ یہ کورڈ ورڈز میں بات ہو رہی تھی۔ پوچھا، یفتح اویکسر، کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا، بل یکسر، یہ دروازہ توڑا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، اذا الا یغلق ابدا، یہ دوازہ توڑ دیا گیا تو پھر کبھی بند نہیں ہوگا۔ اب باقی صحابہؓ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی نے بعد میں حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے؟ یہ دروازہ اور اس کے ٹوٹنے کا معاملہ کیا تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں حضرت عمر ؓ کو بتا رہا تھا کہ فتنوں کی راہ میں رکاوٹ یہ خود حضرت عمر ؓ کی ذات ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں شہید کیا جاؤں گا یا طبعی موت مروں گا۔ تو میں نے بتایا کہ آپ شہید ہوں گے۔ یہ دروازہ ٹوٹے گا۔ پھر کہنے لگے کہ میں نے حدیث کی رو سے یہ بات کہی ہے، کوئی بجھارت نہیں ڈالی۔ تمہارے لیے شاید یہ بجھارت ہو لیکن جس سے میں بات کر رہا تھا وہ میری بات سمجھ رہے تھے۔

تو حضرت عمر ؓ کا وجود فتنوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ ایک ضمنی واقعہ حضرت عمرؓ کے حوالے سے اور یاد آ گیا۔ خالد ابن ولیدؓ شام کے فاتحین میں سے ہیں۔ جب دمشق فتح

ہوا تو آپ شام میں ہی بس گئے۔ ان کی قبر بھی شام میں ہی ہے۔ ایک دن ایسے ہی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے دوستانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے کہ یار امیر المؤمنین کو دیکھو کہ ہم نے لڑ لڑ کر شام فتح کیا، فلاں لڑائی لڑی، فلاں لڑائی لڑی، اور اب جب شام کا کنٹرول مکمل ہو گیا ہے اور شام نے شہد اور گندم مدینہ بھیجنی شروع کر دی ہے، تو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کسی اور کو شام کا گورنر بنا رہے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تم ہندوستان جاؤ۔ حضرت عمرؓ کا شاید ہندوستان کوئی لشکر وغیرہ بھیجنے کا منصوبہ ہو گا۔ شام کا گورنر بنایا گیا تھا یزید ابن ابی سفیانؓ کو۔ اس پر ایک ساتھی نے حضرت خالد ابن ولیدؓ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ ہندوسان جہاد پر نہیں جانا چاہتے تو آپ انکار کر دیں۔ ایک دوسرا آدمی بولا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، اس طرح امیر المؤمنین کے حکم سے انکار کرنے پر فتنہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر حضرت عمرؓ حکم دیں کہ پرچم پکڑو اور ہندوستان لڑنے کے لیے جاؤ لیکن حضرت خالد بن ولیدؓ ایسا کرنے سے انکار کر دیں تو اس بات سے فتنہ پیدا ہو گا۔ اس نے جونہی یہ کہا تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے فوراً جواب دیا، نہیں بھئی! اما فی عهد عمر فلا، عمرؓ کے زمانے میں فتنہ نہیں پیدا ہو گا۔ یہ بڑا عجیب جملہ ہے۔ حضرت عمرؓ کو اتنا بڑا اخراج عقیدت حضرت خالد بن ولیدؓ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا، تسلی رکھو بھئی۔ عمرؓ کے زمانے میں تو ایسا نہیں ہو گا، بعد میں دیکھا جائے گا۔

تو خیر میں فتنوں کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دجال کے فتنے کا ذکر کیا اور اپنی امت کو خبردار کیا کہ دجال کا فتنہ جب ظاہر ہو گا تو اس کے شر سے اور اس کے دجل سے بچ کر رہنا۔ یہ کیسے ہو گا؟

قرآن وسنت کے ساتھ بے لچک وابستگی

اس پر نبی کریم ﷺ نے ایک اصولی بات فرمائی، اس پر میں جو بات آخر میں ذکر کر رہا ہوں، میری اب تک حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ کے ارشادات کے بارے میں ساری گفتگو کا خلاصہ اس ایک جملہ میں آ گیا ہے۔ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں ہمیں اور بہت سی نصیحتیں فرمائیں تلقینات فرمائیں، وہاں یہ فرمایا کہ فاعلقوا ایھا الناس!

واسمعوا قولی، لوگو میری بات سنو اور میری بات سمجھو۔ انی قدبلغت، میں نے اللہ کا پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو پیغام تمہارے لیے دیا تھا، وہ پیغام میں نے تم لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔ اور اب میں تم میں دو باتیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ترکت فیکم ما ان تمسکتم به فلن تضلوا ابدا، میں تم میں دو چیزیں ایسی چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر ان چیزوں کو مضبوطی سے تھام لوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ چیزیں کونسی؟ فرمایا کتاب الله و سنت نبیه، اللہ کا قرآن اور اللہ کے پیغمبر کی سنت۔ فرمایا کہ قیامت تک کے لیے تمہیں یہ راہنما دے کر جا رہا ہوں۔ ایک دوسرے مقام پر اپنے وصال سے چند دن پہلے بھی یہ جملہ ایک اور موقع پر بھی فرمایا۔ انی ترکت فیکم امرین، لن تضلوا ماتمسکتم بهما، میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک ان دو چیزوں کو تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے، گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت جو قیامت تک تمہاری راہ نمائی کریں گی اور ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہیں ہوگے۔ گمراہ اسی وقت ہو گے جب ان کو چھوڑ دو گے۔ قرآن کریم اور سنت رسول۔

ایک اور روایت میں جناب نبی کریم ﷺ نے یہ بات ایک اور انداز سے بیان فرمائی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یأتی علی الناس الزمان، ایک زمانہ ایسا آئے گا، لا تطاق المعيشة فيه الا بالمعصية، گناہ کے بغیر زندگی بسر کرنا کسی کی طاقت میں نہیں ہوگا۔ ہر طرف گناہ کا دور دور ہوگا۔ زندگی گزارنے کا جو طریقہ بھی اختیار کرو گے، گناہ اس کا گھیرا ڈالے ہوئے ہوگا۔ فرمایا: فاذا کان کذالك الزمان فعليكم بالهرب، جب ایسا زمانہ آ جائے تو تم بھاگ جانا۔ لفظی ترجمہ یہی ہے۔ 'هرب' بھاگنے کو کہتے ہیں۔ اگر ایسا زمانہ آ جائے تو تم پر لازم ہے کہ بھاگ جاؤ۔ اب بھاگ کر کدھر جائیں؟ خرابی اگر کسی شہر میں ہو تو شہر چھوڑ جائیں، ملک میں ہو تو ملک چھوڑ جائیں، ایک براعظم میں ہے تو براعظم چھوڑ دیں، لیکن آپ تو زمانہ فرما رہے ہیں۔ چلو اگر ایک علاقہ میں ایسی بات ہو تو علاقہ چھوڑ دیں، کیونکہ ہجرت تو اسی کا نام ہے کہ ایک جگہ اسلامی تعلیمات کی رو سے زندگی گزارنا ممکن نہ رہے تو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں چلے جائیں۔ لیکن آپؐ تو فرما رہے ہیں: اذا کان کذالك الزمان کہ جب ایسا زمانہ آ جائے۔ تو آپؐ نے اس کی

وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ فعلیکم بالھرب الی اللہ والی کتاب اللہ والی سنۃ نبیہ۔ (الدیلمی، الفردوس بماثور الخطاب، ۸۶۸۷) اللہ کی کتاب اور اللہ کے پیغمبر کی سنت کی طرف بھاگ کر جانا۔ یہ تمہاری پناہ گاہ ہوگی۔ فتنوں اور خرابیوں کے زمانے میں جب ایمان بچانا مشکل ہو جائے گا، جب مسلمان کے لیے اپنا اخلاق بچانا مشکل ہو جائے گا، جب ہر طرف سے فتنے مسلمان کو گھیر لیں گے اور مسلمانوں کے لیے ابتلائیں اور مشکلات ہوں گی، تو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت تمہاری پناہ گاہ ہوگی۔ اس طرف بھاگ کر آؤ گے تو بچ جاؤ گے ورنہ دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

تو یہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایھا النّاس واسمعوا قولی، لوگو میری بات سمجھو، میری بات سنو، انّی قد بلغت، میں نے اللہ کا پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے۔ وترکت فیکم، اور میں نے تم میں ایسی چیز چھوڑی ہے۔ ان اعتصمتم بہ، اگر تم نے انہیں مضبوطی سے تھام لیا۔ لن تضلوا ابدا، کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ فرمایا: کتاب اللہ و سنۃ نبیہ، اللہ کی کتاب اور اللہ کے پیغمبر کی سنت۔

حضرات محترم! جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو ارشادات فرمائے، ان کے کچھ اہم حصے کسی ترتیب کے بغیر چار پانچ مجالس میں، میں نے آپ کے سامنے عرض کیے ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھر کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

انسانی حقوق کا پہلا عالمی منشور

آج دنیا میں انسان کی معاشرتی ذمہ داریوں اور حقوق کے حوالہ سے اقوام متحدہ کا ہیومن رائٹس چارٹر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ سیاسی طور پر ایک بڑے سمبل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور بعض حوالوں سے وہ سمبل ہے بھی، جبکہ بہت سے حوالوں سے یہ اسلامی تعلیمات سے ٹکراتا بھی ہے۔ لیکن اگر ہم اس ارتقا کو دیکھیں جو تیرہ چودہ سو سال میں ہوا ہے، یعنی تیرہ سو سال بعد دنیا جن اصولوں پر آئی ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے انسانیت کی رہنمائی کے یہ اصول تیرہ چودہ سو سال پہلے ہمیں بڑی وضاحت کے ساتھ عطا فرمائے تھے۔ اور یہ انسانی برادری کے حوالے سے تھے کسی علاقائی یا نسلی حوالے سے نہیں تھے۔ آج لوگ گلوبلائزیشن اور

انٹرنیشنلزم کا نعرہ لگاتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ نسل، رنگ، وطن اور قومیت سے بالاتر ہو کر سب سے پہلے جس شخصیت نے دنیا کو خطاب کیا ہے۔ اس کا نام محمد رسول اللہ (ﷺ) ہے۔ حضورؐ نے جب سب سے پہلی دعوت دی تو یہ کہہ کر مخاطب ہوئے: یا ایھا النّاس قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا (مسند احمد، رقم ۱۵۴۴۸) اے لوگو! کہو اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ آپ کے مخاطب عرب اور مکی تھے۔ یہ بالکل ابتدائی دعوت تھی۔ ابھی دو چار لوگ ہی مسلمان ہوئے تھے۔ اس وقت بھی حضورؐ نے نہ عرب کا ٹائٹل اختیار کیا، نہ قریش کا، نہ علاقے کا، بلکہ کہا: ایھا النّاس۔ اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا میں سب سے پہلے گلوبلائزیشن کی بات جناب نبی اکرم ﷺ نے کی۔ آپؐ نے قوم، نسل اور جغرافیہ سے بالاتر ہو کر نسل انسانی کو مخاطب کیا۔ اور صرف مخاطب ہی نہیں کیا بلکہ اس کے اصول بتائے ہیں، اس کے ضوابط بتائے ہیں، اخلاقیات بتائی ہیں، اور پھر عملی طور پر ایک سوسائٹی بنا کر دکھائی ہے۔

جناب نبی کریم ﷺ کا یہ خطبۂ مبارک بین الاقوامیت کا پہلا اور سب سے جامع منشور تھا۔ آج بھی ہمارے لیے اور دنیائے انسانیت کے لیے یہی منشور رہنما منشور ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اس کو پیش کرنے کے قابل ہو جائیں۔ بڑی سخت بات کہہ رہا ہوں۔ ایک یہ ہے کہ شائع کر کے دنیا تک پہنچا دینا، ایک یہ ہے کہ ہم عملی طور پر اس کا نمونہ پیش کر سکیں، حوالہ پیش کر سکیں۔ لوگ ہمیں دیکھ کر سمجھیں کہ یہ لوگ اس منشور پر عمل کرنے والے لوگ ہیں تو پھر آج بھی یہ منشور دنیا کے لیے ہدایت اور امن کا پیغام ہے۔ لیکن یہ موقوف اس پر ہے کہ کس دن ہم اپنے قول، عمل اور کردار کے حوالے سے دنیا کو دعوت دینے کی پوزیشن میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں اور ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معاف فرماتے ہوئے ہمیں قرآن کریم اور سنت رسولؐ پر صحیح طور پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

شادی اور اس کے سماجی اثرات

بعد الحمد والصلوٰۃ!

یہ ہمارے محترم دوست اور بزرگ ساتھی مولانا ڈاکٹر اختر الزمان غوری صاحب کی بیٹی کے نکاح کی تقریب ہے جس میں شرکت اور آپ حضرات کے ساتھ ملاقات و گفتگو کا موقع فراہم کرنے پر میں محترم ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس نکاح کو میاں بیوی اور ان کے خاندانوں میں محبت اور اعتماد میں اضافے کا ذریعہ بنائیں اور باہمی محبت واعتماد کے ساتھ نیکی کی زندگی کی توفیق دیں۔

شادی کو عام طور پر ایک سماجی ضرورت سمجھا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک طبعی ضرورت ہے اور سماجی ضرورت بھی ہے لیکن اسلام نے اسے صرف ضرورت کے دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ زندگی کے مقاصد میں شمار کیا ہے اور نیکی اور عبادت قرار دیا ہے جس سے شادی کے بارے میں اسلام کے فلسفہ اور باقی دنیا کی سوچ میں ایک بنیادی فرق سمجھ میں آتا ہے کیونکہ اگر شادی کو محض ایک ضرورت اور مجبوری سمجھا جائے تو پھر یہ ضرورت جہاں سے پوری ہو اور جس حد تک پوری ہو اسی کی کوشش کی جائے گی لیکن اگر اس کے دائرہ کو وسعت دے کر اسے مقصد اور نیکی بھی شمار کیا جائے تو پھر اس کی حدود اور دائرہ کار کا تعین مقاصد اور عبادت کے حوالہ سے ہوگا اور یہی چیز اسلام کے فلسفہ نکاح اور اس کے خاندانی نظام کے تصور کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے نکاح کو انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت کہا ہے اور یہ سارے پیغمبروں کی مشترکہ سنت ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام پیغمبروں نے شادی کی ہے اور ان کی اولاد بھی ہوئی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں

ہے کہ

''بے شک ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول بھیجے اور انہیں بیویاں اور اولاد بھی عطاء کی۔'' (سورۃ الرعد)

البتہ دو پیغمبروں کے بارے میں صراحت ہے کہ ان کی شادی نہیں ہوئی۔ ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم میں ہے کہ وہ ''حصور'' تھے یعنی عورت کے قریب نہ جانے والے تھے اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں احادیث میں ہے کہ ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کی شادی ہوگی اور اولاد بھی ہوگی۔

اس لیے شادی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے اور عبادت بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے کی جائے تو شادی کے ہر عمل پر جناب نبی اکرم ﷺ نے ثواب کی بشارت دی ہے۔ حتیٰ کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص محبت سے اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالتا ہے تو یہ بھی صدقہ شمار ہوگا اور اس پر اسے ثواب ملے گا۔ ''درمختار'' فقہ حنفی کی معروف کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ دو عبادتیں ایسی ہیں جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام میں مشترک رہی ہیں اور یہ دو عبادتیں جنت میں بھی ہوں گی۔ ایک ایمان باللہ اور دوسری نکاح اور شادی۔ یعنی باقی عبادات میں تو انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں فرق رہا ہے کہ نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کی کیفیات مختلف رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کا ذکر اور نکاح یہ دو عمل ایسے ہیں جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام میں یکساں رہے ہیں اور جنت میں بھی ہوں گے۔

اسلام کی نظر میں شادی انسانی ضرورت بھی ہے، اس کی زندگی کا مقصد بھی ہے، عبادت بھی ہے اور ایک مسلمان کے ایمان اور اخلاق و عادات کی حفاظت کے لیے مضبوط حصار بھی ہے جسے قرآن کریم نے ''احصان'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، ''حصن'' عربی زبان میں قلعہ کو کہتے ہیں اور ''احصان'' کا معنی قلعہ بنانا اور قلعہ بندی کرنا ہے۔ گویا ایک مسلمان جب شادی کر کے گھر آباد کرتا ہے تو وہ ایک نیا قلعہ تعمیر کرتا ہے جو اس کے ایمان، اخلاق اور عادات کی حفاظت کرتا ہے اور اس باطنی تحفظ کے ساتھ ساتھ اسے لوگوں کی نگاہوں، باتوں

اور شکوک وشبہات سے بھی تحفظ مل جاتا ہے اور شادی اس کے لیے بہت سے ظاہری اور باطنی تحفظات کا قلعہ بن جاتی ہے۔ پھر قرآن کریم نے ایک اور بہت خوبصورت اشارہ کیا ہے کہ اس حوالہ سے جہاں مردوں کا ذکر کیا وہاں فرمایا ''محصنین'' یہ فاعل کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے قلعہ بنانے والے اور جہاں عورتوں کا تذکرہ فرمایا وہاں کہا کہ ''محصنات'' یہ مفعول کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے وہ چیزیں جنہیں قلعے کے اندر رکھ کر ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ گویا بنانے والا اور اس پر پہرہ دینے والا مرد ہے اور وہ متاع عزیز جس کی حفاظت کے لیے قلعہ بنایا گیا ہے اور جس کو اس چاردیواری کے اندر رکھ کر اس کی حفاظت مقصود ہے وہ عورت ہے۔

اسی ایک لفظ سے خاندانی نظام کے اسلامی فلسفہ کی وضاحت ہو جاتی ہے اور خاندانی نظام کے حوالہ سے آج کی دنیا کو درپیش صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو اسلام کے اس ''فلسفہ احصان'' کی اہمیت اور زیادہ اجاگر ہوتی ہے کیونکہ آج مغربی دنیا کو جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ ''خاندانی نظام'' کے بکھر جانے کا ہے اور ''فیملی سسٹم'' کے ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہونے کا ہے جس نے پوری مغربی دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس سوچ کا کہ شادی محض ایک سماجی ضرورت ہے اس لیے جس کی یہ ضرورت جہاں اور جس حد تک پوری ہو جاتی ہے اسے اس سے زیادہ اس حوالہ سے کسی اور بات سے دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں شادی مقصد ہے، عبادت ہے اور مذہبی فرائض میں سے ہے جس کے لیے مذہب کے واضح احکام ہیں، رشتوں کا تقدس ہے اور باہمی حقوق و مفادات کا ایک توازن ہے جس نے مرد و عورت کے تعلقات کے گرد تحفظات کا ایک مضبوط حصار قائم کر رکھا ہے۔

اسی وجہ سے ہمارا ''خاندانی نظام'' ابھی تک بحمد اللہ تعالیٰ محفوظ ہے اور اس ''قلعہ'' میں شگاف ڈالنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ حتیٰ کہ امریکہ کی خاتون اول مسز ہیلری کلنٹن چند برس قبل جب اسلام آباد کے دورے پر آئیں تو ان کی طرف سے اخبارات میں ایک جملہ شائع ہوا کہ انہیں مشرق کا خاندانی نظام دیکھ کر رشک آتا ہے، یہی وہ قلعہ بندی ہے جسے قرآن کریم نے ''احصان'' سے تعبیر کیا ہے اور اسی بات کو جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس نے شادی کی اس نے اپنے نصف دین کو مکمل کر لیا اور اب اسے باقی نصف دین کی فکر کرنی چاہیے''۔

ایک دلچسپ تاریخی واقعہ

اس موقع پر ایک دلچسپ تاریخی واقعہ کا ذکر کرنے کو بھی جی چاہتا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شادی کا سماج پر کیا اثر ہوتا ہے اور معاشرتی زندگی کے ساتھ شادی اور نکاح کا کیا تعلق ہے؟ بعض شادیاں ایسی ہوتی ہیں جو سوسائٹی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات ایک شادی پوری سوسائٹی میں انقلاب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی قسم کی ایک شادی کا تذکرہ گزشتہ دنوں تاریخ کی ایک کتاب میں نظر سے گزرا کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب خلافت سنبھالنے کے بعد مقتدر طبقہ کے افراد اور شاہی خاندان کے لوگوں سے بیت المال اور قومی خزانے کے اثاثے اور رقوم واپس لینے کا فیصلہ کیا تو ہر طرف کھلبلی مچ گئی، مورخین کہتے ہیں کہ اس وقت بیت المال یعنی قومی خزانے کے اسی فی صد اثاثے اور اموال شاہی خاندان اور وی آئی پی لوگوں کے قبضے میں تھے جنہیں واپس لینے کے لیے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے سب سے پہلے اپنے گھر سے آغاز کیا، باغ فدک ان کے قبضہ میں تھا اسے واپس کیا۔ گھر آ کر بیوی کے زیورات اتروائے اور بیت المال میں بھجوا دیے، اپنی سواری کے لیے شاہی گھوڑوں کا دستہ واپس کر دیا اور اس کے بعد حکمران خاندان کا اجلاس طلب کر کے انہیں الٹی میٹم دیا کہ دو ہفتے کے اندر اندر بیت المال کے تمام اثاثے اور اموال قومی خزانے میں واپس کر دیے جائیں۔ چنانچہ انہیں سب کچھ واپس کرنا پڑا اور مورخین کے مطابق دو ہفتے کے اندر قومی خزانے کے تمام اموال پھر سے بیت المال میں جمع ہو گئے۔
اس پر خاندان خلافت میں خاصی ناراضگی کا اظہار کیا گیا حتیٰ کہ مسلمہ بن عبد المالک ” کو جو سالار افواج تھے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے برادر نسبتی بھی تھے ان سے گفت وشنید کے لیے بھیجا گیا، انہوں نے امیر المومنینؒ سے سوال کیا کہ جو فیصلے ان سے پہلے خلفاء نے کیے ہیں انہیں وہ کیوں منسوخ کر رہے ہیں؟ مطلب یہ تھا کہ جو عطیات سابقہ حکمرانوں نے دیے ہیں انہیں واپس لینے کا انہیں اختیار نہیں ہے۔ اس پر امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے مسلمہ بن عبد المالکؒ سے دو سوال کیے۔ ایک یہ کہ اگر کسی ایک مسئلہ پر تمہارے پاس دو الگ الگ حکم ہوں۔ ایک حکم تمہارے والد محترم خلیفہ عبد الملک بنت مروان ” کا ہو اور دوسرا آرڈر

خلافت بنوامیہ کے بانی حضرت امیر معاویہ ؓ کا ہو جو اس سے مختلف ہو تو تم کس کے آرڈر کو ترجیح دو گے؟ مسلمہ ؓ نے جواب دیا کہ حضرت معاویہ ؓ کے آرڈر کو ترجیح دوں گا کیونکہ وہ پہلے کا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کہا کہ میرے پاس ان سے بھی پہلے کا آرڈر موجود ہے جو قرآن کریم کا ہے اور میں اسے ترجیح دے رہا ہوں، انہوں نے مسلمہ ؓ سے دوسرا سوال یہ کیا کہ اگر تمہارے علم میں ہو کہ ایک شخص فوت ہو گیا ہے اور اس کی جائیداد پر اس کے چند طاقت ور بیٹوں نے قبضہ کر لیا ہے جس سے دوسرے مستحق افراد وراثت کے حق سے محروم ہو گئے ہیں اور پھر کسی وقت تمہیں یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ تم ان محروم مستحقین کو ان کا حق واپس دلا سکو تو تم کیا کرو گے؟ مسلمہ ؓ نے جواب دیا کہ میں اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے مستحق افراد کو ان کا حق ضرور دلاؤں گا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا کہ میں نے بھی اس سے مختلف کوئی کام نہیں کیا جس پر مسلمہ ؓ کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ خاندان والوں نے جب دیکھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ پر ان کی کوئی بات اثر نہیں کر رہی تو باہمی مشورہ کر کے خاندان کی اس وقت کی سب سے بزرگ شخصیت فاطمہ بن مروان ؒ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا جو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی پھوپھی تھیں۔ اور اس وقت خاندان کی سب سے معمر خاتون تھیں۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ پھوپھی کے کہنے پر عمر بن عبد العزیزؒ اس معاملہ میں شاید نرمی اختیار کر لیں لیکن جب پھوپھی محترمہ نے عمر بن عبد العزیز ؒ کو بلا کر خاندان والوں کی شکایت سے آگاہ کیا اور کچھ نرمی کرنے کی تلقین کی تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے انہیں بھی اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے خاموش کرا دیا۔ اس پر فاطمہ بنت مروان ؒ نے خاندان والوں سے کہا کہ میں نے تو اس وقت ہی کہہ دیا تھا جب اس کے باپ یعنی عبد العزیز بن مروان ؒ کا رشتہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی پوتی سے کیا جا رہا تھا کہ یہ رشتہ سوچ سمجھ کر کرنا شاید تم سے نہ نبھ سکے لیکن کسی نے میری بات پر کان نہ دھرے اور آج اسی کے اثرات سب کے سامنے آ رہے ہیں اس لیے میں عمر بن عبد العزیزؒ سے اس سے زیادہ اب کچھ نہیں کہہ سکتی۔

تاریخی اور دلچسپ ایک اور واقعہ

یہ رشتہ بھی عجیب تھا۔ معروف تاریخی واقعہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک رات مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر کے اندر سے ماں اور بیٹی کی گفتگو سنائی دی۔ ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی الق الماء فی ابلسن کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو تاکہ بازار میں فروخت ہو تو چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ بیٹی نے جواب دیا کہ امیر المومنینؓ نے سختی کے ساتھ اس سے منع کر رکھا ہے۔ ماں نے کہا کہ امیر المومنین کون سا اس وقت ہماری بات سن رہے ہیں۔ اور ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ بیٹی نے جواب دیا کہ امیر المومنین نہیں سن رہے اور نہیں دیکھ رہے مگر اللہ تعالیٰ تو ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری باتیں سن بھی رہا ہے اس لیے میں دودھ میں پانی نہیں ملاؤں گی۔ حضرت عمر بن الخطابؓ گھر واپس تشریف لے گئے، صبح ماں بیٹی دونوں کو بلا لیا اور رات کے قصے کے بارے میں دریافت کیا، دونوں نے تصدیق کی تو حضرت عمر بن الخطابؓ نے اس نیک دل اور دیانتدار بیٹی کا رشتہ اپنے بیٹے حضرت عاصم بن عمرؓ کے لیے مانگ لیا جو طے ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی والدہ محترمہ انہی حضرت عاصمؓ اور ان کی اس نیک دل اہلیہ کی بیٹی تھیں اور فاطمہ بنت مروانؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا کہ اس نے رشتہ کرتے وقت کہہ دیا تھا کہ عمر بن الخطابؓ کی پوتی کو گھر میں لا کر اس کے اثرات بھی قبول کرنا ہوں گے اس لیے اب عمر بن عبد العزیزؒ کے اقدامات پر شکایات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ سوسائٹی پر اچھی شادیوں کے اثرات کیا ہوتے ہیں اور بعض شادیاں کس طرح بڑی بڑی معاشرتی تبدیلیوں کا باعث بن جاتی ہیں، اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اگر اپنی شادیوں میں مقصدیت اور نیکی کے پہلوؤں کو غالب کریں گے اور عبادت اور ثواب سمجھ کر ان کے تقاضوں کی تکمیل کریں گے تو ہمیں ان کی برکات بھی نصیب ہوں گی اور شادی کے جو فوائد اسلام نے بیان کیے ہیں وہ بھی ہمیں ضرور حاصل ہوں گے۔

مگر ہم نے تو شادی کو خرافات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے اور شادی کی تقریبات میں اس

قدر خرافات کو جمع کرلیا ہے کہ بسا اوقات ایسی تقریبات میں خطبہ اور ایجاب وقبول کی سنت کا بجالانا بھی ماحول کے پس منظر میں اجنبی سا کام محسوس ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو شادیوں کی تقریبات سے وحشت ہونے لگی ہے اور اکثر وبیشتر شادیوں میں شرکت سے صرف اس وجہ سے انکار کردیتا ہوں کہ وہاں جا کر عجیب سی اجنبیت ذہن پر سوار ہو جاتی ہے، ان حالات میں ڈاکٹر اختر الزمان غوری صاحب نے اپنی سعادت مند بیٹی کے نکاح پر مسجد میں یہ باوقار اور سادہ سی جو تقریب منعقد کی ہے اسے دیکھ کر واقعتاً بہت خوشی ہوئی ہے اور میں اس پر ڈاکٹر صاحب اور دونوں خاندانوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس شادی کو میاں بیوی اور دونوں خاندانوں میں باہمی محبت اور اعتماد میں دن بدن اضافے کا ذریعہ بنائیں اور ہم سب کو خوشی کی ایسی تقریبات اسی طرح وقار اور سادگی کے ساتھ نیکی اور برکت کے ماحول میں منعقد کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

مسلمانوں میں فکر وشعور کی بیداری:

وقت کا اہم تقاضا

حرمین شریفین کی حاضری کے بعد لندن روانگی سے قبل ایک دو روز جدہ میں قیام رہا اور ایک بزرگ محدّث کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ الشیخ عبداللہ بن احمد الناخبی مدظلہ معمر علمائے کرام میں سے ہیں اور حدیث نبوی ﷺ کے ممتاز فضلاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک سو پندرہ برس ان کی عمر بیان کی جاتی ہے اور اب سے پون صدی قبل کے اکابر محدثین سے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں۔ سماعت کمزور ہو چکی ہے مگر گفتگو بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ شافعی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور زندگی بھر حدیث نبوی ﷺ کی خدمت میں مصروف رہے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی حصے سے حرمین شریفین میں حاضر ہونے والے علم حدیث کے اساتذہ وطلبہ کو ان کا پتہ چلتا ہے تو وہ ان کی خدمت میں حاضری اور ان کی زبان سے حدیث نبوی ﷺ کی سماعت کیساتھ ان کے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہی شوق مجھے بھی ان کی مجلس میں لے گیا۔

میرے ہم زلف قاری محمد اسلم شہزاد جو جدہ میں قیام پذیر ہیں اور میرے میزبان تھے جبکہ جدہ میں ہی ایک عرصے سے قرآن کریم کی تدریسی خدمات سرانجام دینے والے قاری محمد رفیق بھی اپنے فرزند سمیت ہمارے ساتھ تھے۔ شیخ محترم نے چند نصائح سے نوازا۔ ایک حدیث نبوی ﷺ سنائی اور ہماری درخواست پر ہمیں اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جدہ میں ایک معروف پاکستانی عالم دین مولانا صاحبزادہ قاری عبدالباسط بھی مدت سے قیام پذیر ہیں درس قرآن کریم کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں ان کا درس قرآن کریم کا مستقل حلقہ ہے پڑھے لکھے لوگ ان کے درس میں آتے اور ان سے استفادہ

کرتے ہیں۔ جدہ سے شائع ہونے والے اردو اخبار روزنامہ ''اُردو نیوز'' میں دینی عنوانات کے تحت سوال و جواب پر مشتمل ان کا ہفتہ وار کالم شائع ہوتا ہے جو اردو خواں حلقے میں خاصا مقبول ہے، جبکہ ان سوالات و جوابات کا ایک مجموعہ چار جلدوں میں دیو بند سے شائع ہو چکا ہے جس پر اکابر علمائے کرام نے تحسین کی ہے۔

جدہ میں کبھی حاضری ہوتی ہے تو ان کی فرمائش پر ان کے حلقہ درس میں بھی شرکت ہو جاتی ہے اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور انکے ہفتہ وار درس میں فہم قرآن کریم کی ضرورت و اہمیت اور اس کے ناگزیر تقاضوں پر کم و بیش ایک گھنٹہ گفتگو کا موقع ملا۔ خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد اس درس میں شریک ہوتی ہے حاضرین کی تعداد اور ذوق شوق دیکھ کر قاری عبدالباسط کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قاری محمد رفیق کا تعلق کرنال سے ہے قیام پاکستان کے وقت وہاں سے ملتان آئے اور اب سے ربع صدی قبل جدہ آ گئے۔ پرانے مدرس ہیں اور قرآن کریم کی تدریس کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں اس سے بھی زیادہ ان کا خاص ذوق یہ ہے کہ پاکستان بھارت یا بنگلہ دیش سے آنے والے دیو بندی مسلک کے کوئی عالم دین ان کے قابو آ جائیں تو کوشش کر کے انہیں اپنے مدرسے میں لاتے اور جدہ کے علمائے کرام اور احباب کے ساتھ ان کی ملاقات و گفتگو کا اہتمام کرتے ہیں ان کے تقاضے پر میں بھی حاضر ہوا۔

انہوں نے مختلف دوستوں کی ایک خصوصی نشست کا اہتمام کر رکھا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس محفل میں عالم اسلام کے معروضی حالات اور مسلم دانشوروں کی ذمہ داریوں کے حوالے سے گفتگو کروں۔ ایک روز قبل جمعۃ المبارک کی نماز میں نے مسجد حرام میں ادا کی تھی اور امام حرم الشیخ عبدالرحمٰن السدیس کے فکر انگیز خطبے سے شاد کام ہوا تھا۔ انہوں نے اس خطبے میں موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش اور فکر و فلسفے کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے علمائے کرام اساتذہ، صحافیوں اور دانشوروں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ عقیدہ و ثقافت کی اس کشمکش کا ادراک حاصل کریں اور قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں اس ''غزو فکری'' میں کردار ادا کریں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ جنگ جذباتی ردعمل تشدد اور ہتھیاروں کے ساتھ نہیں لڑی جا سکتی بلکہ اس کے لیے عقل و دلیل حکمت اور علم کے ہتھیاروں سے کام لینا ہوگا۔

میں نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی حوالے سے کیا اور کہا کہ مجھے امام حرم الشیخ سدلیس حفظہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے سو فیصد اتفاق ہے کہ عقیدے و فلسفے کی جنگ اور فکر وثقافت کی کشمکش میں دلیل اور منطق کے ہتھیار ہی کام دیتے ہیں اور مسلم اہل دانش کو اس طرف ضروری توجہ دینی چاہیئے۔ میں نے گزارش کی کہ مغرب کم وبیش دوسو برس سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فکر و فلسفے کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اس سے قبل اس کی جنگ ہمارے خلاف مذہب کے نام پر تھی جو صلیبی جنگ کہلاتی تھی مگر اب دوسو برس سے اس نے پینترا بدل کر سیاست ومعیشت ٹیکنالوجی، عسکریت، وسائل اور فکر وثقافت میں غلبے کی جنگ چھیڑ رکھی ہے اور اس حقیقت کے اعتراف میں ہمیں کوئی باک نہیں ہونا چاہیئے کہ سیاست، معیشت ٹیکنالوجی، عسکریت اور وسائل پر قبضے کی جنگ میں ہم مغرب کے ہاتھوں پسپا ہو چکے ہیں۔ اسباب وعوامل کچھ بھی ہوں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ان سب شعبوں میں ہم مغلوب اور بے بس ہیں البتہ فکر و فلسفے اور عقیدے وثقافت کی جنگ میں مغرب کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی اور مغرب اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں عام مسلمان کا خدا اور رسول اکرم ﷺ کے ساتھ عقیدے ومحبت کا تعلق توڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری آخری دفاعی لائن ہے جس پر ہم لڑ رہے ہیں اس کے بعد اور کوئی مورچہ نہیں ہے جہاں ہم کھڑے ہوسکیں البتہ یہ بات اطمینان کی ہے کہ اس دفاعی لائن پر ہم پوری استقامت کے ساتھ کھڑے ہیں اور اس مورچے کو سر کرنے کی کی کوئی صورت مغرب کو دکھائی نہیں دے رہی جس کی وجہ سے مغرب کی پریشانی اب جھنجھلاہٹ کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔

مغرب کو اس بات کی پریشانی ہے کہ عام مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصے سے تعلق رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کو آخری رسول اکرم ﷺ پر آج بھی ایمان رکھتا ہے قرآن پاک اور سنت رسول اکرم ﷺ کو آج بھی ہر معاملے میں آخری اتھارٹی سمجھتا ہے خود ان پر عمل کرے یا نہ کرے مگر ان کے خلاف کوئی بات سننے یا ان کے کسی حکم سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے یہ بات ہمارے نزدیک عقیدہ کہلاتی ہے جبکہ مغرب اسے کمنٹ مینٹ سے تعبیر کرتا ہے اور انتہا پسندی قرار دیتا ہے۔ ہماری آخری دفاعی لائن یہی ہے جسے مضبوط و مستحکم بنانا ہم

سب کی ذمہ داری ہے اور یہ فریضہ سب سے زیادہ علمائے کرام، اساتذہ اور دانشوروں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اس محاذ پر سنجیدگی کے ساتھ محنت کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکر و عقیدے اور ثقافت کی اس جنگ میں ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو تین درجوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔

سب سے پہلی سطح اور درجہ یہ ہے کہ عام مسلمان کا تعلق قرآن و سنت رسول ﷺ کے ساتھ قائم رہے دین کے ساتھ اس کا رشتہ برقرار رہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول ﷺ کے ساتھ اس کا عقیدت و محبت کا ذوق بڑھتا رہے۔ مساجد و مدارس اور دین کے داعی و مبلغ یہی کام کر رہے ہیں۔ یہ سب سے بنیادی کام ہے اور عام مسلمان کو خدا اور رسول اکرم ﷺ قرآن سنت اور دین کے ساتھ جوڑنے کا یہ کام جہاں بھی ہو رہا ہو، ہمیں اسے سپورٹ کرنا چاہئے اسے تقویت دینی چاہئے اور اس کی مدد کرنی چاہئے۔ دوسری سطح اور درجہ پڑھے لکھے لوگوں میں فکری بیداری اور دینی شعور کو اجاگر کرنے کا ہے پڑھے لکھے لوگ خواہ دینی ماحول سے تعلق رکھتے ہوں یا عصری تعلیم سے ان کا تعلق ہو دونوں کی اہمیت یکساں ہے ان میں دینی اور فکری بیداری کا ماحول قائم رہنا چاہئے۔ پڑھے لکھے لوگ کسی بھی قوم میں اعصاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اعصاب میں حس قائم رہے تو پورے جسم میں حرکت موجود رہتی ہے اور تکلیف و اذیت کا احساس باقی رہتا ہے لیکن اگر خدانخواستہ اعصاب بے حس ہو جائیں تو تکلیف، اذیت، درد اور زخم ہر چیز پر احساس ختم ہو کر رہ جاتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں فکری بیداری کو بڑھایا جائے ان کے دینی ذوق میں اضافہ کیا جائے اور اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہے کہ وہ موجودہ عالمی صورت حال سے باخبر رہیں اسلام اور کفر کی کشمکش کی تازہ ترین صورت حال پر ان کی نظر ہو اور انہیں اس بات سے آگاہ رکھا جائے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے؟ یہ بیداری اگر موجود رہے گی اور بڑھتی رہے گی تو ہم اپنے عقیدہ و ثقافت اور ملی وجود و تشخص کی حفاظت کر سکیں گے، لیکن اگر خدانخواستہ یہ احساس اور بیداری ہی ختم ہو گئی تو پھر ہم اپنے تحفظ و دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔

تیسری سطح اور درجہ، علم و دانش کی اعلیٰ سطح سے تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی عقائد اور فلسفہ و ثقافت پر مغرب کی جانب سے جو اعتراضات ہو رہے ہیں اور جو شکوک

وشبہات پھیلائے جا رہے ہیں ان کی اہمیت کو محسوس کیا جائے اور مسلم دنیا کے اکابر علمائے کرام اور اہل دانش عقل و تدبر اور علم و حکمت کی بنیاد پر ان اعتراضات وشکوک کا جواب دیں۔ ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہئے کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور بین الاقوامی اداروں کی یکطرفہ یلغار نے خود ہمارے پڑھے لکھے نوجوانوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کی ایک وسیع دنیا آباد کر رکھی ہے جس کا اظہار وہ زبان سے کریں یا نہ کریں، لیکن یہ شکوک وشبہات ان کے ذہنوں میں موجود ہیں اور ان کے فکر و عقیدے کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں اہل علم و دانش نے اگر اس کی سنگینی کا احساس نہ کیا تو خدا کی عدالت میں تو وہ مجرم ہوں گے ہی دنیا میں تاریخ کی عدالت بھی انہیں معاف نہیں کرے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان تین درجوں میں اپنی مہم کو منظّم کر سکے اور کام کو آگے بڑھا سکے تو اسلام اور مغرب کی اس فکری اور تہذیبی کشمکش میں اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرسکیں گے اور دنیا و آخرت میں سرخروئی سے ہمکنار ہوں گے۔ ان شاء اللہ! حرمین شریفین کی حاضری اور جدہ میں مختلف اجتماعات میں شرکت کے بعد 19 ستمبر کی شام لندن پہنچا تھا۔ برطانیہ میں اندازاً ایک ماہ قیام رہے گا اس کے بعد ہفتہ عشرہ کے لیے امریکہ جانا ہوگا اور 25 / اکتوبر کو وطن واپسی کا پروگرام ہے جبکہ اس دوران قارئین سے حسب معمول رابطہ قائم رہے گا۔ ان شاء اللہ!

عورتوں کے اسلامی حقوق

اور

ہمارا معاشرہ

گذشتہ روز لاہور کے ایک ہوٹل میں ''عورتوں کے اسلامی حقوق اور ہمارا معاشرہ'' کے عنوان پر ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا جس کا اہتمام ''ادارہ برائے تحقیق و تعلیم اسلام آباد'' نے کیا تھا جناب خورشید احمد ندیم اس کے منتظم تھے اور مختلف این جی اوز کے نمائندہ حضرات وخواتین کے علاوہ مقررین میں محترم جاوید احمد غامدی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان بھی شامل تھے مجھے علماء کے روایتی حلقے کی نمائندگی کے لیے اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ مقررین نے جن نکات پر زیادہ زور دیا ان میں عورتوں پر ہمارے معاشرہ میں ہونے والے مبینہ مظالم عورتوں اور مردوں میں امتیاز کرنے والے قوانین حدود آرڈیننس قصاص ودیت کا قانون عورتوں کی شہادت کا مسئلہ اور دیگر امور کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کے لیے ہونے والی جدوجہد میں دینی حلقوں کی عدم شرکت اور عدم دلچسپی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مختلف نقطہ ہائے نظر بیان ہوئے، متعدد مسائل کی نشاندہی کی گئی اور باہمی مکالمہ گفتگو پر زور دیا گیا تاکہ متنازع اور مختلف فیہ معاملات میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھا جائے اور قریب آنے کی کوشش کی جائے۔ سیمینار میں راقم الحروف نے جو گذارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ:

اس وقت ہمارے معاشرہ میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے جو کشمکش نظر آرہی ہے وہ دراصل مغربی کلچر اور ہمارے مقامی کلچر کے درمیان ہے دونوں معاشرتوں کی اقدار آپس

میں ٹکرا رہی ہیں مغربی معاشرت اپنا اثر ورسوخ وسیع کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور مقامی کلچر اپنی اقدار وروایات کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے جبکہ اسلام غریب درمیان میں قابو آیا ہوا ہے اور دونوں طرف جس کو بھی اسلام کی کوئی بات اپنے حق میں نظر آئی ہے وہ اس کا حوالہ دیتا ہے اس لیے میرے نزدیک اسلام اس کشمکش میں خود فریق نہیں ہے بلکہ صرف ایک ہتھیار ہے جسے دونوں فریق اپنے اپنے مطلب کے لیے جہاں موقع ملتا ہے استعمال کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی کلچر نام کی کوئی چیز اس وقت عملاً موجود نہیں ہے دنیا میں اس وقت کوئی معاشرہ خالص اسلامی معاشرہ کہلانے کا حقدار نہیں ہے اور نہ ہی کہیں اسلامی اقدار وروایات کی مکمل عملداری ہے بلکہ اس وقت وہ صرف کتابوں میں ہیں اور علمی ونظری بحثوں میں ہیں جبکہ علاقائی ثقافتوں اور کلچروں کو ختم کرنے کے لیے جو مغربی کلچر آگے بڑھ رہا ہے وہ نہ صرف ایک فکر وفلسفہ کے طور پر منظّم ہے بلکہ اس کا عملی ڈھانچہ لوگوں کے سامنے موجود ہے اور اس کی پشت پر طاقت بھی ہے دوسری طرف اسلامی کلچر کے بارے میں اور اس کی اقدار وروایات کے بارے میں مختلف علمی حلقوں کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے اپنی اپنی تعبیرات ہیں اور اپنی اپنی تشریحات ہیں جس کے باعث اسلامی کلچر کی کوئی واضح شکل یا ڈھانچہ لوگوں کے سامنے نہیں ہے اس ضمن میں ملک کے دینی حلقوں سے میری ہمیشہ یہ گذارش رہتی ہے اور مختلف اہل علم سے یہ عرض کرتا رہتا ہوں کہ معاشرتی اقدار اور انسانی حقوق کے بارے میں ہمیں بالکل اسی طرح باہم مل بیٹھ کر کوئی اجتماعی ڈھانچہ اور فریم ورک دینا ہوگا جیسے قیام پاکستان کے بعد اسلام کے سیاسی نظام کے خدوخال واضح کرنے اور اسلامی دستور کا ڈھانچہ مہیا کرنے کے لیے تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات ترتیب دے کر اہم اور نازک سیاسی مسائل کا حل پیش کر دیا تھا اور ایک اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ واضح کر دیا تھا کہ آج کے دور میں اسلامی نظام حکومت وسیاست کے بنیادی خدوخال یہ ہوں گے۔ بالکل اسی طرح ہمیں انسانی حقوق خاندانی اقدار اور خاص طور پر عورتوں کے بارے میں جدید مسائل کا سامنا کرتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کا اہتمام کرنا ہوگا اور ۲۲ دستوری نکات کی طرز پر انسانی حقوق کا چارٹر بھی قوم کو دینا ہوگا اس کے بغیر ہم ان مسائل میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کرسکیں گے۔

یہ گذارش تو میری دینی حلقوں سے ہے اور علمی مراکز سے ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کریں اور قوم کو اس کنفیوژن سے نکالیں جو ہمارے علاقائی کلچر اور مغربی ثقافت کے درمیان کشمکش میں دونوں طرف سے اسلام کا نام استعمال کرنے سے پیدا ہو رہا ہے اور جس سے فکری انتشار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے دوسری طرف انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں اور اداروں سے میری گذارش ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ علماء کرام اور دینی حلقوں کو عورتوں کے حقوق یا انسانی حقوق سے دل چسپی نہیں ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس معاشرہ میں عورتوں کے حقوق کے لیے سب سے پہلی آواز علماء کرام نے بلند کی تھی۔ ۱۹۳۵ کی بات ہے جب صوبہ سرحد کے علماء کرام اور جمعیۃ علماء ہند کے نمائندوں نے ''شریعت بل'' کے عنوان سے ایک قانون کے نفاذ کی جدوجہد کی جس کا مقصد تھا کہ صوبہ سرحد میں عورتوں کو وراثت میں ان کا شرعی حصہ قانون کے ذریعہ دلوایا جائے اور رواج کے نام سے عورتوں کو وراثت سے محروم رکھنے کی جو روایت چلتی آرہی ہے اسے ختم کیا جائے اس موقع پر یہ سوال بھی اٹھایا گیا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کافرانہ حکومت ہے اور اس کا نظام کفر کا نظام ہے اس نظام اور سسٹم میں شریعت کے کسی قانون کے نفاذ کا مطالبہ درست نہیں ہے مگر مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دھلویؒ نے یہ موقف مسترد کرتے ہوئے عورتوں کو وراثت کا حصہ دلوانے کے لیے ''شریعت بل'' کی حمایت کی تھی اور فتوی دیا تھا کہ حکومت اور نظام اگرچہ کفر کا ہے لیکن اگر شریعت کے کسی قانون پر عمل کا حق مل سکتا ہے تو اسے حاصل کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔ یہ بحث کفایت المفتی کے سیاسیات کے ابواب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہ عورتوں کو وراثت میں شرعی حصہ دلوانے کے لیے پہلی آواز تھی جو علماء کرام کی طرف سے اٹھائی گئی تھی اور اس کے بعد بھی علماء اپنے اپنے حلقوں میں عورتوں کے شرعی حقوق کی بحالی کے لیے آواز بلند کرتے رہتے ہیں اور عورتوں پر ہونیوالے مظالم کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک عورت کے بارے میں دونوں کلچر ظالمانہ رویہ رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بھی ظلم ہے کہ عورت کی رائے کی آزادی سلب کی جائے اور اس کے جائز حقوق سے اس کو محروم رکھا جائے جو ہمارے معاشرے میں عام طور پر ہوتا ہے اور ہمارے نزدیک مغربی معاشرہ میں ''اولڈ پیپلز ہومز'' میں بیٹھی ہوئی وہ بوڑھی خواتین

بھی اسی طرح مظلوم ہیں جو سارا سال دن گنتے گنتے اس انتظار میں گزار دیتی ہیں کہ کب کرسمس کا دن ہوگا اور ان کا بیٹا یا بیٹی کاغذوں کے پھول لیے ان کی ملاقات کو آئیں گے اور انہیں اپنی اولاد کو چند لمحے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں جو تنظیمیں اور ادارے عورتوں کے حقوق کے لیے کام کر رہے ہیں ان کی اکثریت کا ایجنڈا مغربی معاشرت کی عملداری ہے وہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی بنیاد پر کام کر رہے ہیں اور اس کی عملداری کے لیے مصروف عمل ہیں جبکہ ہم اقوام متحدہ کے چارٹر کے بارے میں واضح تحفظات رکھتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیاسی نظام کے بارے میں اس کے طرز عمل کے بارے میں اس کے طریق کار کے بارے میں اور اس کے چارٹر کے بارے میں ہمارے تحفظات میں جو دلیل کی بنیاد پر ہیں اور حقائق کے تناظر میں ہیں اور ان کے بارے میں ہم کسی بھی فورم پر سنجیدگی کے ساتھ بات کرنے کے لیے تیار ہیں ہم عورتوں کے حقوق کے لیے اور معاشرہ کے دیگر طبقات کے حقوق کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کام کرنے والے اداروں اور تنظیموں سے تعاون و اشتراک کے لیے تیار ہیں لیکن اقوام متحدہ کے چارٹر کی بنیاد پر نہیں اور مغرب کے فلسفہ و ثقافت کی عملداری کے لیے نہیں بلکہ قرآن و سنت کی بنیاد پر اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ و ترویج کے لیے یہ بالکل دوٹوک اور واضح بات ہے جس میں لچک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آپ اگر مذہبی حلقوں کو انسانی حقوق کے لیے اور عورتوں کے حقوق کے لیے اپنے ساتھ متحرک دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے تعاون کے خواہش مند ہیں تو ہمیں اس سے کوئی انکار نہیں لیکن اس کے لیے آپ کو واضح طور پر اعلان کرنا ہوگا کہ عورتوں کے حقوق اور انسانی حقوق میں آپ کی جدوجہد کی بنیاد اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اور مغربی فلسفہ و ثقافت نہیں بلکہ قرآن و سنت ہے اور خلافت راشدہ کا نظام ہے اگر آپ اس کے لیے تیار ہیں تو ہمارا تعاون حاضر ہے۔ قرآن و سنت کی بنیاد پر اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی تعلیمات کی روشنی میں معاشرتی حقوق کی جدوجہد کو ہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارے فرائض میں شامل ہے اور ہمیں اس میں شریک ہو کر خوشی ہوگی لیکن یہ جدوجہد اقوام متحدہ کے چارٹر کے نام پر

نہیں ہوگی اور اس کی عملداری کے لیے نہیں ہوگی۔

باقی رہی بات باہمی مکالمہ اور گفتگو کی تو ہم اس کے لیے ہر وقت تیار ہیں بلکہ ہم اس کی خود ضرورت محسوس کرتے ہیں اس لیے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف اداروں اور این جی اوز میں جو مسلمان کام کر رہے ہیں انہیں صحیح صورتحال کا علم ہی نہیں ہے وہ انسانیت کی خدمت سمجھتے ہوئے یہ کام کر رہے ہیں اور قرآن وسنت پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی غلط فہمیاں دور ہوں اور اگر ہم کسی غلط فہمی کا شکار ہیں تو اس کا بھی ازالہ ہو اور ہم سب مل جل کر معاشرہ میں ظلم و جبر اور استحصال وتشدد کے خاتمہ کے لیے موثر جدوجہد کر سکیں۔

لائبریری
الشریعہ اکادمی
۳۸۰۵

واحد تقسیم کار

فاران فاؤنڈیشن

علق پریس بلڈنگ، A-19، ایبٹ روڈ، لاہور۔
فون: 042-6303244